

آپنا اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

ستمبر 2016

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ
لطیف نگار



READING SECTION

Online Library For Pakistan

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ڈائریکٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیر — شادہ خاتون

مدیر — آذر ریاض

نائب مدیر — رضیہ جمیل

مدیر خصوصی — امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات — عدنان

رشتہ راز — خالدہ جیلانی

ذریعہ سالانہ اشتہار کی قیمتیں

پاکستان (سالاہ) — 700 روپے
ایشیا اور آفریقہ — 6000 روپے
امریکہ اور آسٹریلیا — 7000 روپے

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**



14 مسدیر

کہتی سنتی
کرن کرن روتی

15 ادارہ

196 نمبر احمد

نمل
عجربا روتی

272 نادرہ خاتون

142 کیتھن بیوی

110 ام طیبہ

ہوک



20 اشاجی

غزل

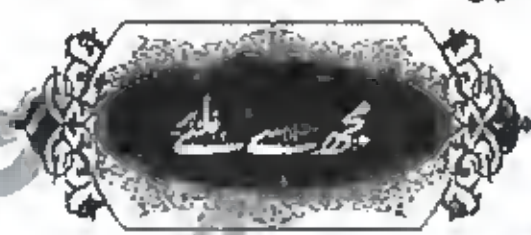


76 امت العزیز شہزاد

قربانی

270 امت (صبور)

میری ڈائری سے



182 سارہ رضا

ہیسرو

284 شاہین رشید

باتیں اکرا عبا سے

61 نازیر جمال

میری قربانی



70 سوید افلاک

بڑا سن

29 ادارہ

چشمن عید مبارک

98 فریح طاہر

خوالوں کے رنگ

26 ایمان رضا

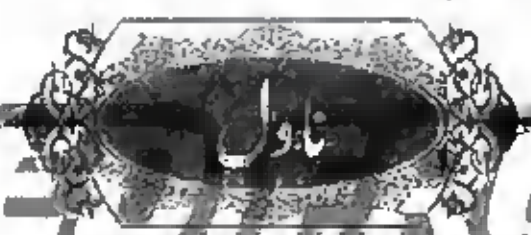
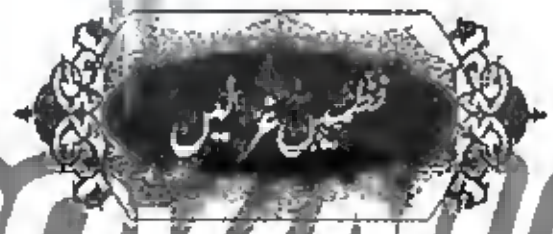
حرف سادہ کو ہوا

104 حاجرہ بیجان

خالی مکان

21 شاہین رشید

شیریں آورا



265 احمد زینم قاسمی

غزل

36 اکملہ ریاض

دشت جنوں

265 مذاق افضلی

نظر

248 عمیر احمد

اب حیا سے

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے مریجوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی لی دی چینل یہ ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلسٹیٹی سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ سبب سے صورت دیگر ادارہ قانونی پارہ کوئی کا حق رکھتا ہے۔

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

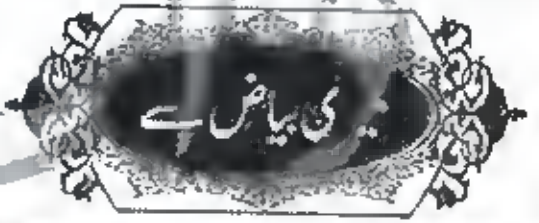
ستمبر 2016

جلد 44 شماره 5

قیمت 60 روپے



266 رنگارنگ سلسلہ شگفتہ جہاں
278 خیریں ویریں، واصفہ سہیل



280 گوشت کے گولان خالدہ جیلانی

269 خالہ جیلانی آپ کی بیاض کے



290 بیوی بکس کے مشورے، امت لہیری

288 عدستان نفسیاتی ازدواجی اچھٹیں

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37، اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ نائٹم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔ یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو عید الاضحیٰ کی آمد آمد ہوگی۔ آپ سب عید الاضحیٰ کی تبادیوں میں مصروف ہوں گی۔

آپ سب قارئین کو ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے عید مبارک۔ ہماری دعا ہے عید آپ کے آنگن میں پہنچی اور حقیقی خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

دین اسلام انسان اور انسانیت کی فلاح اور بہبود کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اس کے تہوار بھی اجتماعیت کا رنگ لیے ہوتے ہیں۔ عید الفطر پر جہاں فطرانے کی ادائیگی کے ذریعے عزت مہوں کو عید کی خوشیوں میں شامل ہونے کا موقع دیا جاتا ہے اور عید الاضحیٰ پر قربانی کے گوشت میں عزت مہوں کو شامل کر کے انہیں گوشت سے لطف اٹھانے کا موقع دیا جاتا ہے جو اپنے حالات کی وجہ سے اس نعمت سے سارا سال محروم رہتے ہیں۔ عید الاضحیٰ قربانی کے ایک عظیم واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے فرزند کو قربانی کے لیے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عزت مہوں کو قربانی کی بھی قربان کی جاسکتی ہے۔ ہمیں بھی اپنے پروردگار کی رضا اور خوشی کے لیے اپنی خواہشات کو اس کے حکم کے تابع کر دینا چاہیے۔ عید کے موقع پر اپنے ارد گرد موجود مستحقین کو ضرور یاد رکھیں۔ یہ ان کا حق اور آپ کا فرض ہے۔

ایک وضاحت ،

قارئین کو مطلع کر رہے ہیں کہ فیس بک پر ہمارے ادارے کا کوئی آفسیشل پیج نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو خواتین ڈائجسٹ، شعاع یا کارکن سے منسلک ظاہر کرتا ہے تو وہ غلط ہے اور اس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قارئین محتاط رہیں اور اس سے کسی بھی قسم کے رابطے سے گریز کریں۔

اس ستمبر شمارے میں ،

- 6 عمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نعل ،
- 6 کنیز نبوی کا مکمل ناول۔ عمر، ماروی ،
- 6 آم طیفور کا مکمل ناول۔ ہونک ،
- 6 امت العزیز شہزاد کا ناولٹ۔
- 6 عمیرہ احمد اور آسما ریاض کے سلسلے وار ناول ،
- 6 ساثرہ رضا، نازیہ جمال، فخر طاہر، حاجہ ریحان اور سوریانک کے افسانے ،
- 6 معروف شیفٹ شیریں انور سے ملاقات ،
- 6 ٹی وی فنکار اکرام عباسی سے باتیں ،
- 6 حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کارنگ۔ ایل رضا کے جواب ،
- 6 کرن کرن خوشبو۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ ،
- 6 نفسیاتی ازدواجی ایلیس اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ آپ کو کبھی آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔ ہمیں اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کون کون روٹی

ادارہ

چاہیے، تاہم کوئی اور شخص بھی فزع کر سکتا ہے۔

4- قربانی کا جانور عمدہ اور خوب صورت ہونا

چاہیے۔

5- قربانی کے جانور کو ذبح کرتے وقت درج ذیل

حدیث میں مذکور دعائیں پڑھنا مستحب ہے۔

6- ذبح کرتے وقت جانور کے جسم پر پاؤں رکھنے کا

مقصد یہ ہے کہ جانور قابو میں رہے اور بھاگنے کی

کوشش نہ کرے۔

قربانی کی دعا

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے انہوں نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن دو

مینڈھے قربان کیے۔ جب انہیں قبلہ رخ کیا تو فرمایا:

ترجمہ: میں نے یکسو ہو کر اپنا چہرہ اس اللہ کی

طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں

مشرکین میں سے نہیں۔ بے شک میری نماز، میری

قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو

قربانی سے متعلق احکامات و مسائل

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو چترکے بکے اور سینٹوں والے ہینڈھوں کی قربانی دیا کرتے تھے اور (ذبح کرتے وقت) بسم اللہ اور تکبیر پڑھتے تھے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی گروں پر قدم مبارک رکھ کر اپنے ہاتھ سے انہیں ذبح کرتے دیکھا۔

(بخاری)

نوآمد و مسائل:

1- عید الاضحیٰ کے موقع پر صاحب استطاعت کو کم از کم

ایک بکری، مینڈھا، گائے یا اونٹ کے ایک حصے کی

قربانی کرنا ضروری ہے۔

2- ایک سے زیادہ جانوروں کی قربانی بھی جائز بلکہ

افضل ہے۔

3- گھر کے فرو کو اپنے ہاتھ سے قربانی کا جانور ذبح کرنا

سارے جانوروں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔ اے اللہ! یہ جانور مجھ ہی سے ملا اور تیرے ہی لیے قربان کیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت کی طرف سے۔“

(ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی

حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کرنا چاہتے تو دو بڑے بڑے موٹے تازے، سینگوں والے، چتکبوں اور خصی مینڈھے خریدتے۔ ایک اپنی امت کی طرف سے ذبح فرماتے، یعنی امت کے ہر اس فرد کی طرف سے جو اللہ کی توحید کی گواہی دیتا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پہنچانے (اور رسول ہونے) کی گواہی دیتا ہو اور رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی طرف سے ذبح کرتے۔ (مسند احمد)

فوائد و مسائل :

- 1- قربانی کے جانور عمدہ ہونے چاہیں۔
- 2- جانور ظاہری شکل و صورت میں بھی اچھا ہونا چاہیے اور موٹا تازہ اور صحت مند بھی۔
- 3- شخص جانور کی قربانی درست ہے۔ اسے عیب شمار نہیں کیا جاتا۔
- 4- گھر کے تمام افراد کی طرف سے ایک جانور کی قربانی کافی ہے۔
- 5- کسی اور کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔

قربانی واجب ہے یا نہیں؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جس کے پاس (قربانی کرنے کی) گنجائش ہو اور وہ قربانی نہ کرے تو اسے چاہیے کہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔“ (مسند احمد)

1- اس حدیث سے بظاہر قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن دوسرے دلائل سے اس کا استحباب و استئذان معلوم ہوتا ہے، اس لیے محدثین نے ان سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ قربانی سنت موکدہ ہے، یعنی ایک اہم اور موکد حکم ہے فرض نہیں، تاہم استطاعت کے باوجود اس سنت موکدہ سے گریز کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

2- قربانی مسلمانوں کی اجتماعیت کا مظہر ہے اور اس سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔

3- قربانی نہ کرنے والا مسلمانوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے نماز عید پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مقصد اسے تنبیہ کرنا ہے تاکہ وہ قربانی ترک نہ کرے۔

واجب

حضرت محمد بن اسیرین رحمۃ اللہ سے روایت ہے انہوں نے کہا: ”میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا

”کیا قربانی واجب ہے؟“ انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمان قربانی کرتے رہے اور یہی طریقہ جاری ہے۔“ (طبرانی)

قربانی کا ثواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”قربانی کے دن آدم کا بیٹا کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اللہ کو خون بہانے (جانور کی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو۔ وہ (جانور) قیامت کے دن اپنے سینگوں، کھروں اور بالوں سمیت آئے گا (اور نیکی کے پلڑے میں رکھا جائے گا) قربانی کے جانور کا خون زمین پر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مینڈھے کے مشابہ قرار دیا۔

فوائد و مسائل :

1- بزرگ آدمی کے ساتھ اس کی ضروریات کے سلسلے میں جانا اس کی خدمت اور احترام میں شامل اور باعث ثواب ہے۔

2- قربانی کا جانور بالکل نکما نہیں ہونا چاہیے، ہاں،

البتہ بہت زیادہ قیمتی اور نمایاں نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔

3- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ کوشش کرتے تھے

کہ ان کا ہر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

عمل سے ممکن حد تک مشابہ ہو، اسی لیے امام ابن ماجہ

رحمۃ اللہ نے باب کے عنوان میں اسے مستحب قرار

دیا ہے۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”بہترین کفن

وہ ہے جو ایک رنگ کی دو چادروں پر مشتمل ہو اور

بہترین قربانی سینکڑوں والا مینڈھا ہے۔“

کتنے افراد کی طرف سے کفایت کر سکتی ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”ہم لوگ ایک سفر میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ

عید الاضحیٰ آگئی، چنانچہ ہم نے دس اونٹ آدمیوں کی

طرف سے ایک ایک اونٹ اور سات سات آدمیوں

کی طرف سے ایک ایک گائے مشترکہ طور پر ذبح کی۔

(ترمذی)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں

نے فرمایا:

ہم نے حدیبیہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ

ایک اونٹ سات افراد کی طرف سے اور ایک گائے

سات افراد کی طرف سے ذبح کی۔“ (صحیح مسلم)

فائدہ :

1- پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ میں

دس آدمی شریک ہو سکتے ہیں اور دوسری حدیث سے

گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں (قبولیت کا) مقام حاصل کر لیتا ہے، اس لیے خوش دلی سے قربانی کیا کرو۔“

(ترمذی)

کون سی قربانی مستحب ہے؟

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

انہوں نے فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں والے

نر مینڈھے کی قربانی دی۔ وہ سیاہی میں کھاتا، سیاہی میں

چلتا اور سیاہی میں رکھتا تھا۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1- قربانی کا جانور دیکھنے میں بھی خوب صورت ہونا

چاہیے۔

2- ”نر“ (فجھل) سے مراد یہ ہے کہ وہ خصی نہ تھا۔

3- نر اور خصی دونوں قسم کا جانور قربانی میں دینا جائز

ہے۔

4- سیاہی میں کھانے، چلنے اور دیکھنے کا مطلب یہ

ہے کہ اس کا منہ بھی سیاہ تھا، اس کے پاؤں بھی کالے

تھے، اور اس کی آنکھوں کے ارد گرد کی جگہ بھی سیاہ

تھی۔ اس طرح کا مینڈھا خوب صورت سمجھا جاتا ہے،

نیز دیکھنے میں بھی خوب صورت اور بھلا لگتا ہے۔

قربانی کا جانور

حضرت یونس بن میسرہ بن حلبس رحمۃ اللہ سے

روایت ہے، انہوں نے کہا۔

”میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی

حضرت ابو سعید رزقی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قربانی

کے جانور خریدنے لگا۔

یونس بن میسرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو سعید

رضی اللہ عنہ نے ایک اسے مینڈھے کی طرف اشارہ

کیا جس کے کانوں اور گلے کا کچھ حصہ سیاہ تھا۔ وہ

جسمانی طور پر نہ زیادہ اونچا تھا نہ زیادہ پست تھا۔ انہوں

نے فرمایا۔

”میرے لیے یہ خرید لو، گویا انہوں نے اسے

معلوم ہونا ہے کہ اونٹ میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے متعدد احادیث روایت کی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج میں بھی اور عمرے میں بھی سات آدمیوں کو ایک اونٹ میں شریک کیا۔ لیکن ان دونوں احادیث میں باہم کوئی تعارض نہیں، کیونکہ اونٹ میں دس آدمیوں کی شرکت کا واقعہ عام قربانی کے موقع کا ہے جب کہ سات آدمیوں کی شرکت کا تعلق حج و عمرہ سے ہے۔ بنا بریں حج و عمرہ میں گائے اور اونٹ دونوں میں صرف سات سات افراد ہی شریک ہوں گے جب کہ عام قربانی میں گائے میں سات اور اونٹ میں دس۔ افراد شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ فرق حدیث سے ثابت ہے۔

گائے کی قربانی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔ (ابوداؤد)

کس عمر کے جانور کی قربانی درست ہے؟

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کچھ بکریاں دیں جو انہوں نے قربانی کے لیے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے) صحابہ کرام میں تقسیم کر دیں۔ (ان کے پاس) بکری کا ایک سالہ بچہ (باقی) رہ گیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو انہوں نے فرمایا: ”اس کی قربانی تم دے دو۔“ (بخاری)

فائدہ :

1- حدیث میں عتود کا لفظ ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے: ”جو بچہ خود چارہ چرنے کے قابل ہو جائے اور ماں کا محتاج نہ رہے۔“

2- نواب وحید الزمان خان رحمۃ اللہ نے عتود کے

یعنی ایک سال کا بکرا کا بچہ کیے ہیں۔ (ترجمہ حدیث زیر مطالعہ) ہم نے اپنے ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

جذعہ کی قربانی

حضرت ام بلال بنت بلال رحمۃ اللہ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بھیڑ کے جذعہ کی قربانی جائز ہے۔“ (مسند احمد)

فوائد و مسائل :

1- ٹنہ یا مسنہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دانت ٹوٹ کر روئے دانت آجائیں۔

2- جذعہ اس جانور کو کہتے ہیں جس کے دودھ کے دانت نہ ٹوٹے ہوں۔

3- مذکورہ بالا حدیث اور ام بلال رحمۃ اللہ سے مروی حدیث: ”بھیڑ کے جذعے کی قربانی کرو اس لیے کہ اس کی قربانی جائز ہے۔“ (مسند احمد 3/378) سے

معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں بھی بھیڑ کا جذعہ قربانی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت جو کہ صحیح مسلم (1923) میں ہے ”کی رو سے مسنہ (دودانتا) جانور کی قربانی کرنا افضل ہے نیز راجح قول کے مطابق جذعہ صرف بھیڑ میں جائز ہے، یعنی دنبہ اور چھترا اور دیگر جانوروں کے اس عمر کے بچوں کی قربانی کرنا جائز نہیں۔“

4- شیخ زینیر شاویش لکھتے ہیں ”بھیڑ بکری اور گائے نیل میں مسنہ وہ ہوتا ہے جو تیسرے سال میں لگ جائے اور اونٹوں میں جو چھٹے سال میں لگ جائے۔ بھیڑ کے جذعے کے متعلق علما کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ (بھیڑ کا بچہ) ہے جو پورے سال کا ہو جائے۔“

لیکن یہ بات حتمی نہیں، الگ الگ ملکوں کی الگ الگ آب و ہوا کی وجہ سے اس میں فرق بھی ہو سکتا ہے اس لیے اصل اعتبار بکرے گائے نیل اور اونٹ میں دودانتا ہونا ہے اور دنبے چھترے کا ایک سالہ ہونا۔

دودانت والے جانور کی قربانی

دودانت والے جانور کی قربانی

دودانت والے جانور کی قربانی

نے فرمایا: ”ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم (قربانی کے جانور کی) آنکھیں اور کان اچھی طرح دیکھ لیا کریں۔ (ترمذی) فوائد و مسائل :

- 1- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کے کان سلامت ہونے چاہئیں۔
- 2- آنکھیں دیکھ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جانور کی دونوں آنکھیں سلامت ہوں۔ جس کو ایک آنکھ سے نظر نہ آتا ہو اس کی قربانی درست نہیں۔
- 3- قربانی کا اصل مقصد اللہ کے لیے اچھی چیز قربان کرنا ہے اس لیے بے عیب جانور ذبح کرنا چاہیے۔ گوشت کھانا یا غریبوں کو کھلانا ایک اضافی فائدہ ہے اصل مقصد نہیں۔ ورنہ آنکھ یا کان کا عیب گوشت کھانے کے مقصد میں رکاوت نہیں بنتا۔

قربانی کی کھالیں

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا کہ وہ آپ کے (قربانی کے) تمام اونٹوں کا گوشت کھان لیں اور جھولیں غریبوں میں تقسیم کر دیں۔

فائدہ : قربانی کا گوشت کھانا اور کھالیں اپنے استعمال میں لانا اگرچہ جائز ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ غریبوں اور مسکینوں کو دیا جائے۔

قربانیوں کا گوشت کھانا

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہر اونٹ کی ایک ایک بولی لے کر ہندیا میں ڈالی گئی (اور یکائی گئی) تب انہوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے) کچھ گوشت کھایا اور کچھ شوربایا۔ (مسند احمد)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”دودانے کے سوا کوئی جانور (قربانی میں) ذبح نہ کرو“ سوائے اس کے کہ تمہارے لیے (دودانے جانور تلاش کرنا) مشکل ہو جائے تو بھیڑ کا جذعہ ذبح کرو۔“ (مسلم)

فائدہ :

- 1- علامہ البانی رحمۃ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جذعہ سے مراد بھیڑ کا جذعہ ہے بکری کا جذعہ نہیں۔

حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے نماز عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ گوشت کی بکری ہے۔ قربانی کی نہیں۔“ انہوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایک بکری کا جذعہ ہے۔ (کیا میں اس کی قربانی کرے دوں؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قربان کر دو لیکن تمہارے سوا کسی اور کے لیے درست نہیں۔“ علامہ البانی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کی روشنی میں بکری کا جذعہ ذبح کرنے کی اجازت نہیں البتہ حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ کی حدیث کی روشنی میں بھیڑ کا جذعہ (ایک سال کا بچہ جس کے دانت نہ ٹوٹے ہوں) جائز ہے۔

جس جانور کی قربانی دینا مکروہ ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

” رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جانور کو ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو یا جس کا کان چرا ہوا ہو یا جس کے کان میں (گول) سوراخ ہو یا اس کا ہونٹ کٹا ہوا ہو۔“ (ابوداؤد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:



فگنہ

انشائیج

کس کو پارا اتارا تم نے، کس کو پارا اتارو گے
ملا جو تم پر دلیسی کو بیچ بھنور میں ہمارو گے

مندی کھے کی میٹھی باتیں سننے آہنی عمر ہوئی
آنکھ سے اوجھل ہوتے ہوتے جی سے ہمیں بسا رو گے

آج تو ہم کو پاگل کہہ لو، پتھر پھینکو، طنز کرو
عشق کی بازی کھیل نہیں ہے، کھیلو گے تو ہارو گے

اہل وفا سے ترک تعلق کر لو پراگت بات کہیں؟
کل تم ان کو یاد کرو گے، کل تم انہیں پکارو گے

اُن کا ہم سے پیار کا رشتہ، اے دل چھوڑو بھول چکو
وقت نے سب کچھ میٹ دیا ہے، اب کیا نقش اُبارو گے

انشا کو کسی سوچ میں ڈوبے، درپر بیٹھے دیر ہوئی
کب تک اس کے بخت کے بدلے اپنے بال سوارو گے





کو کنگ چینل پہ آپ دن رات مختلف سٹیشن سے ملتے ہیں۔ لیکن کچھ شیفت ایسے ہوتے ہیں جو آپ کے دلوں میں بھی گھر کر لیتے ہیں۔ انہی میں ایک ”شیرین انور“ ہیں۔ اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر انہوں نے ہمیں انٹرویو دیا اس کے لیے ان کا بے حد شکریہ۔

”کیا حال ہے جی....؟“

”اللہ کا کرم ہے۔“

”آپ کے پروگرام دیکھتی ہوں اور آپ کی ریسیبیونز آزما بھی چکی ہوں۔ بلاشبہ آپ بہترین شیفت ہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ کے لہجے میں جو مٹھاس ہے، کیا نام کا اثر ہے یا....؟“

”اب اگر کسی کا نام ”سجیدہ“ ہے تو کیا وہ سجیدہ ہو گی۔“

”جی۔“

معروف شیفت

شیرین انور کے ملاقات

شاہین رشید

خواتین آپ کو زیادہ نظر آئیں گی اور جب سے یہ چینل آیا ہے اس شعبے میں آپ کو خواتین کی تعداد زیادہ نظر آئے گی۔ کافی رجحان بڑھ گیا ہے، کافی مٹھاسے انسٹی ٹیوٹ کھل گئے ہیں جہاں کو کنگ کی ٹرنگ دی جاتی ہے اور بہ نسبت لڑکیوں کے آج کل لڑکیاں اس فیلڈ میں زیادہ نظر آ رہی ہیں۔“

”ماشاء اللہ سے لڑکیاں تو ہر فیلڈ میں آگے نکل رہی ہیں، یہ بتائیں کہ کورس پورا ہونے پر آپ سند دیتی ہیں لڑکیوں کو؟“

”جی بالکل دیتی ہوں.... یہ ان کا حق ہے کہ ان کے پاس ایک ثبوت ہو کہ انہوں نے کچھ سیکھا ہے۔“

”میں نے ایک مرتبہ زبیدہ آپا کا انٹرویو کیا تو انہوں نے بتایا کہ شادی ہو کے جب سسرال آئیں تو انہیں کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا۔ آپ اپنے بارے میں بتائیں کہ....“

”مجھے ابھی کچھ نہیں آتا تھا.... مجھے تو بچنے کی ڈال اور

”بہت مصروف رہتی ہیں آپ.... تو کیا مصروفیات ہیں آپ کی....؟“

”مصروفیات یہ ہیں کہ صبح کے وقت میرا لایو ہوتا ہے ایک چینل پر اور دوسرے کو کنگ گھر کو کنگ کلاس لیتی ہوں، شام کو بھی گھر پر ہی کو کنگ کلاس لیتی ہوں۔“

”گویا لڑکیوں کو سکھانا رہی ہیں.... باقاعدگی سے کلاسز لیتی ہیں لڑکیاں؟“

”بالکل سکھو رہی ہیں اور بہت باقاعدگی سے اور بڑے شوق سے کلاسز لیتی ہیں.... اور سسرال میں سرخرو ہوتی ہیں۔“

”شعبہ خواتین کا ہے مگر بڑے بڑے ہونٹوں اور ریسٹورنٹس میں مرد شیفت ہوتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟“

”شوق کی بات ہے.... مرد بھی ہر شعبے میں نام کما رہے ہیں اور خواتین بھی.... اور ایسا نہیں ہے کہ بڑی بڑی

چٹھوں پر خواتین نہیں ہوتیں اب تو آپ جا کر دیکھیں

سوئگ کی وال کی پچاس تک نہیں تھی۔ لیکن شادی کے تیسرے دن میری جودو مندیں بھی انہوں نے کہا کہ آپ کو کھانا پکانا ہے آج مجھے تو کھانا پکانا آتا نہیں تھا۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی۔ اپنے کمرے میں گئی اور اپنی ای کو کال کی کہ میری مندیں کہہ رہی ہیں کہ آپ کھانا پکائیں اور مجھے تو کچھ نہیں آتا تو بتائیں کہ میں کیا کروں۔ بہت روئی دھوئی۔ تو امی نے کہا کہ پریشان نہ ہو، میں بتاتی ہوں کہ کیا اور کس طرح پکانا ہے انہوں نے مجھے قیمہ پکانے کی اور وال پکانے کی آسان سی ترکیب بتائی۔ پرانا زمانہ تھا پاز بھی خود ہی سنہری کر ٹی پڑتی ہے۔۔۔ جدید مشینیں بھی نہیں تھیں۔ مسالا بھی خود ہی پیسنا پڑتا تھا۔ جب چالیس سال پہلے میری شادی ہوئی تو کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ اور ک لسن بھی خود چھیلو، پاز بھی خود ہی کاٹو اور پھر ”سل بنے“ یہ پیسو۔۔۔ بہر حال پھر جب سرری پڑی تو سب کچھ کرنا پڑا۔۔۔ میں شادی کے وقت 19 سال کی تھی اور لہجن چھیلنے وقت بھیج سا لگتا تھا کہ ہاتھوں میں بو ہو جاتی تھی۔۔۔ تو بڑی مشکل ہوئی تھی۔۔۔ تو سرری پڑے تو کرنا تو پڑتا ہے سب کچھ۔۔۔ خواہ آج کا دور ہو یا گزرے وقت کا۔“

”مندوں نے کہا۔ آپ نے حکم کی بجا آوری کی، آپ کہہ تو سکتی تھیں کہ مجھے پکانا نہیں آتا۔۔۔؟ ویسے کھانا صحیح پک گیا تھا؟“

”مندوں نے اس لیے کہا کہ میری ساس حیات نہیں تھیں اور میں نے انکار اس لیے نہیں کیا کہ یہ میری عزت کا سوال تھا۔ اور ہاں کھانا اچھا پک گیا تھا۔“

”ماؤں کو تو بڑی فکر ہوتی ہے بیٹیوں کی کہ وہ پرانے گھر جائیں گی تو انہیں سب کچھ آنا چاہیے۔۔۔ تو آپ نے کیوں نہ سیکھا؟“

”اصل میں بات یہ تھی کہ ہماری فیملی ماشاء اللہ کافی بڑی تھی، ہم جو اسٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے، چچان کے بچے ہم سب مل کر رہتے تھے اور ہمارے گھر میں دو تین خانسائے بھی ہوتے تھے تو ہماری ای اور ہماری دیگر بزرگ جوان بچیوں کو مردوں کے درمیان کچن میں نہیں جانے دیا کرتی تھیں۔۔۔ کہ نوکروں کے ہونے ہوئے کچن نہ آکرنا تو

اس وجہ سے کچھ سیکھنے اور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔۔۔ مگر خیر جب سرری پڑی تو سب کچھ آگیا۔۔۔ آج کل کی لڑکیاں ماشاء اللہ ہوشیار اور عقل مند ہیں اور انہیں شوق بھی ہے تو کچھ کر سسرال جاتی ہیں۔“

”سسرال میں مندوں نے کہا تو شرمندگی کی وجہ سے سیکھا، مگر کامیابی کی جس منزل پہ آپ آج ہیں اس کی بھی کوئی وجہ تھی کیا؟“

”مجھے موقع نہیں ملا، لیکن مجھے کوئنگ کا شوق تو بچپن سے ہی تھا۔۔۔ اور شادی سے پہلے میرے شوہر نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں ہمارے گھر میں سب کچھ ملے گا مگر کھانا پکانے کے لیے خانساں نہیں ملے گا، کھانا تمہیں خود ہی پکانا پڑے گا۔۔۔ کیونکہ ہمارے گھر میں خانساں رکھنے کا رواج نہیں ہے۔۔۔ اور پھر جب میں باہر آئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ اب مجھے ہی پکانا ہر گا تو پھر میں نے کوئنگ کلاسز لیں، ٹریننگ لی۔ بہت ساری جگہوں سے۔۔۔ میں ٹریولنگ بہت کرتی تھی اور جن جن ممالک میں جاتی تھی تو جہاں جہاں جاتی تھی وہاں کے کھانے پکانا ضرور سیکھتی تھی۔ اور سز کرتی تھی اور یوں آہستہ آہستہ مجھ میں کھانا پکانے کا جنون کی حد تک شوق ہو گیا۔۔۔ اور میں نے بہت کچھ سیکھ لیا اور پھر ایک دن اپنے شوہر سے کہا کہ میں نے اتنا کچھ سیکھ لیا ہے کہ میں بڑے آسانی کوئنگ کلاسز لے سکتی ہوں اور اگر آپ کی اجازت ہو تو گھر پر ہی کوئنگ کلاسز شروع کر دوں اور ان کی اجازت سے 1982ء سے میں نے اپنے گھر سے کوئنگ کلاسز کا آغاز کیا۔ جون کا مہینہ تھا اور 29 تاریخ تھی۔۔۔ اور تب سے لے کر اب تک الحمد للہ میرے گھر میں پچاس ساٹھ لڑکیاں ہر وقت موجود ہوتی ہیں سیکھنے کے لیے۔۔۔ اور الحمد للہ جو لڑکیوں نے سیکھنا چاہا، جس ملک کا کھانا پکانا سیکھنا چاہا۔۔۔ میں نے سکھایا۔“

”زیادہ تر لڑکیاں کیا سیکھتی ہیں۔ دسی کھانے یا کانٹی نینٹل کھانے؟“

”لڑکیوں کو ”میٹھا“ پکانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔۔۔ مختلف جگہوں پر جا کر کھاتی ہیں اور پھر ہم سے ”ریسیپی“ مانگتی ہیں۔۔۔ اور کھانے کے لیے کہتی ہیں اور میں

سیکھاتی ہوں۔ اسی طرح ”چائیمیز“ ”انالین“ اور فاسٹ فوڈ بھی بہت سیکھتی ہیں۔ جیسے برگر، پزا، پاستا وغیرہ۔
 ”شوق سے زیادہ ٹرینڈ بھی چل پڑا ہے شاید؟“
 ”جی۔۔۔ ٹرینڈ بھی چل پڑا۔۔۔ لڑکیاں اب سب کچھ سیکھنا چاہتی ہیں۔“

”چینل سے وابستگی کس طرح ہوئی؟“

”پندرہ سال قبل جب کوکنگ ٹی وی چینل کا اجرا ہوا تھا تو سلطانہ آپا نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ تم آؤ اور ہمارا چینل جوائن کرو۔ لیکن اس وقت چونکہ میرے بچے چھوٹے تھے تو میں نے انہیں منع کر دیا۔۔۔ اور پھر جب ماشاء اللہ میرے بچے بڑے ہو گئے ان کی شادی ہو گئی تو انہوں نے کہا کہ اب تو آ جاؤ۔۔۔ اور یوں میں نے کوکنگ ٹی وی کو جوائن کیا اور اب آٹھ سال ہو گئے ہیں مجھے اس چینل پہ کام کرنے ہوئے۔ روزانہ صبح گیارہ بجے سے دوپہر ساڑھے بارہ بجے تک میرا شو ہوتا ہے اس دوران مجھے دیگر چینلز سے بھی انٹرویوز آتے ہیں مگر مجھے نہیں جانا تھا کہ میں اسی چینل پہ سیٹ تھی۔۔۔ بہت اچھا چینل ہے کام کرنے میں مزہ آتا ہے اور دل بھی لگ گیا ہے۔ دیگر لڑکیاں اور خواتین بھی ہوتی ہیں تو ایک ٹیلی ماحول بن گیا ہے۔“

”کوکنگ چینل پہ سارا دن پکوان پکتے ہیں۔ یہاں سب کہاں جاتے ہیں یا آپ سب انجوائے کرتے ہیں؟“
 ”یہ سب میٹنگ کے پاس جاتے ہیں اور وہاں سے کہاں جاتے ہیں مجھے۔ میں پتا اور الحمد للہ ہم سب کبھی انجوائے کرتے ہیں۔“

”کسی میگزین کے لیے بھی آپ نے کام کیا۔ اور پیسہ ہے اس فیلڈ میں؟“

”جی۔۔۔ میں نے ”میگ“ کے لیے 20 سال لکھا ہے اور ہاں۔۔۔ اس فیلڈ میں پیسہ ہے اور ہر پروفیشن میں پیسہ ہے اگر آپ دل لگا کر اور ایمان داری کے ساتھ کام کریں تو۔۔۔ اپنے پروفیشن کے ساتھ سنجیدہ ہونا پڑتا ہے۔۔۔ ویسے لڑکیوں سے میں کم لیتی ہوں۔ ہزار روپے ایک کلاس کے ہوتے ہیں جس میں چین آٹھ ڈشمن سکھاتی ہوں اور ستارا سپانن میرا لپنا ہوتا ہے اور جو پکاتا ہے وہ لڑکیاں کھاتی کر جاتی

شعاع

ستمبر 2016

ستمبر 2016
 کا شمارہ
 شائوشو گیا ہے



- ۱۰ ”پال ساڑ“ دیل رشا کا عمل ناول،
- ۱۰ ”شب آرزو“ نور طاہرہ کا عمل ناول،
- ۱۰ نبیلہ عزیز کا ناول ”زین بسل“،
- ۱۰ عفت سحر طاہر کا ناول ”خواب شیشے کا“،
- ۱۰ نایاب جیلانی کا ناول ”شہر خطا“،
- ۱۰ عمیرہ عارف کا ناول ”زور و ہٹ کے“،
- ۱۰ عشنا کوثر سردار کا ناول ”اخفاق“،
- ۱۰ بنت سحر کا ناول ”الاج“،
- ۱۰ ریوا علی سیّد، قرۃ العین کرم ہاشمی، عبدالعزیز زہرا،
- ۱۰ میونہ صدف، فرزانہ کھرل اور ام سعدی کے افسانے،
- ۱۰ نی وی فنکار ”علی عباس اور حسد علی“ کا ہزن،
- ۱۰ عید الاضحیٰ کے موقع پر قارئین سے سروے،
- ۱۰ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ قارئین کا سلسلہ،
- ۱۰ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ”دشک“،
- ۱۰ ”بیارے نبی ﷺ کی بیماری باتیں“ احادیث نبوی ﷺ،
- ۱۰ خط آپ کے، مسکرائشیں، آئینہ خانے میں، مہندی کے ڈیزائن،
- ۱۰ گوشت کے کدوان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا شمارہ آج ہی شائع ہوگا

ہیں... اور مزید لڑائیوں آنا چاہیں تو آپ میرا ممبر شائع کر

دیں۔ اور میں آپ کو بتاؤں کہ پیسے سے بھی زیادہ شہرت ہے اس فیلڈ میں... ہم دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں لوگ ہمیں پہچان لیتے ہیں اور بہت عزت کرتے ہیں لوگ ہماری ہمیں پہچان لیتے ہیں اتنے مسالا جات آگئے ہیں۔ کیا اس کے باوجود کوکنگ سیکھنا ضروری ہے؟“

”بازار میں جو مسالے ملتے ہیں وہ صحت کے لیے اچھے نہیں ہوتے۔ اس میں کئی ایسی چیزیں شامل ہوتی ہیں جو صحت کے لیے بالکل بھی اچھی نہیں ہوتیں... اور آپ دیکھیں کہ ان مسالوں سے پکے ہوئے کھانوں اور گھر کے مسالوں سے پکے ہوئے کھانوں کے ذائقوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر اتنے مسالے کیوں ہیں بازار میں؟“
”دیکھیں جو بیچلرز ہیں۔ ملک سے باہر بڑھنے کے لیے گئے ہیں ان کے لیے وقتی طور پر یہ مسالے صحیح ہیں مگر گزرا کرنا ہے۔ بس سب کی اپنی اپنی سوچ ہے۔“
”تھننا ہے کہ شیفت اپنا ایک ”گر“ چھپا کر رکھتے ہیں؟“
”آپ بھی...؟“

”نہیں نہیں... میری یہ نیچری نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ 1982ء سے میں اسٹارٹ لیا اور جو میری ریسپیسی آزماتے ہیں وہ یہی بتاتے ہیں کہ آپ کی بتائی ہوئی ترائیک کے ذائقے بہت عمدہ ہوتے ہیں... یہ تو بہت ہی غلط اور بے ایمانی ہے کہ آپ کوئی کر جھیا لیں... یہ بھی تو دیکھیں کہ سانسے والے کا پیسہ ٹائم آپ کتنا ضائع کریں گے... آپ نے اللہ کو جواب نہیں دینا ہوتا کیا...“

کسی کو اپنا ہنر سکھانا بھی تو صدقہ جاریہ ہے نا...
”لائیو کالز میں کبھی گزبڑ ہوئی یا لائیو پکوان میں کوئی گزبڑ ہوئی؟“

”میں یہ نہیں کہوں گی کہ گزبڑ نہیں ہوتی ہے۔ ہوتی ہے مگر سنگین گزبڑ نہیں ہوتی... کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ میں گھر سے کوئی چیز لانا بھول جاتی ہوں... تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا... بریک میں ہم وہ چیزیں منگوا لیتے ہیں۔“

”لائیو پکوان گرام اینڈری رہتے ہیں یا ریکارڈ؟“

”مجھے تو لائیو پکوان زیادہ اینڈری لگتے ہیں ویسے میرا تو روز لائیو پکوان ہی ہوتا ہے۔ وقت کی پابندی بھی ہو جاتی ہے اور وقت پر ختم بھی ہو جاتا ہے... اور مجھے وقت کی پابندی کی بہت زیادہ عادت ہے اور ہم سیزن کے حساب سے ہی پکوان سکھاتے ہیں۔ جیسے اب بقرہ عید آنے والی ہے... عید الفطر پہ کیا ہو... تو اس طرح سے پروگرام ترتیب دیتے ہیں۔“

”بقر عید پر گوشت کو اسٹور کرنے کا کیا طریقہ ہے؟“
”بقر عید پر گوشت کو اسٹور تو کرنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ غریبوں اور رشتے داروں کا حق ہوتا ہے۔ ہاں دس پندرہ دن کے لیے اپنے لیے بھی رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں... اور اسٹور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چربی وغیرہ صاف کر کے پلاسٹک کی تھیلیوں میں حصے بنا کر رکھ دیں اور لکھ دیں کہ یہ چانپیں ہیں یہ گوشت ہے تاکہ نکلنے میں آسانی ہو اور دھو کر نہ رکھیں بلکہ پکانے سے پہلے دھو لیں۔“
”گوشت کی وجہ سے پورے گھر میں بو ہو جاتی ہے تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے؟“

”آپ اسپرے بومل میں پانی ڈالیں اور لیو نمو نمو کر ڈالیں اور پھر پورے گھر میں اسپرے کریں بو ختم ہو جائے گی۔“
”بچہ بچہ گھر کے اسپرے پائے... صحت کے لیے کتنے نقصان دہ ہیں؟“

”کثرت سے کچھ بھی کھائیں نقصان دہ ہے۔ ان میں کولسٹرول زیادہ ہوتا ہے... سال میں ایک دو بار کھانے سے کوئی نقصان نہیں ہے۔“

”اگر شیفت نہ ہوتیں تو اس وقت کیا ہوتیں؟“
”ہنستے ہوئے... یہ بات تو میں نے کبھی سوچی ہی نہیں

تھی، انٹر کے بعد میری شادی ہو گئی۔ پڑھائی کا مجھے بہت زیادہ شوق نہیں تھا۔ ہاں میں نے شادی سے پہلے مونیٹورنگ کورس کیا ہے اور سوچا تھا کہ اسکول کھولوں گی... مگر پھر شادی ہو گئی۔“

”آپ کے بچے ماشاء اللہ سے؟“

”چار بچے ہیں... میری ایک بیٹی بالکل میری طرح ہے۔ بی بی پروگرام بھی کرتی ہے... گھر میں میرے

”ہونٹوں تک کبھی نہیں؟“

”بہت شوق سے.... اور کھانے میں اس کے ڈانٹے میں جو کمی بیشی ہوتی ہے مجھے فوراً پتہ چل جاتا ہے.... اس پروفیشن میں 32 سال سے ہوں۔ کوئی مذاق کی بات تو نہیں ہے نا....“

”لوگ پہچان کر پریشان کرتے ہیں؟ سیلفیاں بنواتے ہوں گے؟“

”نہیں اب تو عادت ہو گئی ہے۔ البتہ میرے بچے گھبراتے ہیں کہ پرائیویسی نہیں ہے.... مگر کیا کریں....“

لوگوں کی محبت کو بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“
”ملک سے باہر بھی تو جاتی ہیں۔ وہاں کیا صورت حال ہوتی ہے؟“

”وہاں.... بھی ایسا ہی ہوتا ہے.... بیٹا پریشان ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی آپ کے چاہنے والے آپ کو نہیں پہچوڑتے۔“

”اور آخر میں کتنا چاہیں گی؟“

”بھی کتنا چاہوں گی کہ لڑکیاں جو بھی کام کریں سچے دل سے کریں۔ ایمان داری سے کریں.... ایمان داری میں بہت برکت ہے اپنے پروفیشن کے ساتھ انصاف کریں.... اور لڑکیوں کو ضرور کام کرنا چاہیے۔ صرف مردوں پر ہر کام کا بوجھ نہ ڈالیں.... کیونکہ مہنگائی کا دور ہے گھر میں سب کو کام کرنا چاہیے۔“



ساتھ کلاں بھی پہنتی ہے میرا نام ہے اس کا باقی کو بھی شوق ہے مگر خون کی حد تک نہیں.... بیٹا میرا دہی میں چاب کرنا ہے ماشاء اللہ سے۔“

”کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ مطلب فیملی بیک گراؤنڈ؟“

”میں 14 اپریل 1957ء میں پیدا ہوئی۔ میرے والد بزنس میں تھے.... اب تو دونوں حیات نہیں ہیں۔“

”مزاج کی کیسی ہیں اور آپ کے میاں صاحب آپ کی اس ایکٹیوٹی کو پسند کرتے ہیں؟“

”ہمیشہ سے مزاج کی خوشگوار ہی رہی۔ بتایا نا کہ لگتا ہے کہ نام کا اثر ہے اور میرے میاں صاحب بہت اچھے ہیں، انہوں نے کبھی میری اس ایکٹیوٹی پر اعتراض نہیں کیا.... اور بہت شوق سے میرے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھاتے ہیں.... اور میرے میاں کا اپنا بزنس ہے۔“

”اپنے لیے سب سے اچھی چیز کیا پکاتی ہیں؟“

”سج بناؤں.... مجھے اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہی پسند نہیں ہے کھالتی ہوں.... مگر بہت شوق سے نہیں.... شاید پکا پکا دل بھر جاتا ہے۔“



ایمل رضا

اللہ کے بابرکت نام سے شروع جس کی رحمانیت ہمیشہ میرے ساتھ رہی۔

رائٹر کے طور پر شاید اپنے بارے میں بات کرنا مشکل ہوتا ہے اور میرے لیے مشکل تر۔ کیونکہ پہلا تعارف ہیج سے نکلنے والی ابتدائی منہمی کو نپلوں کی طرح ہوتا ہے۔ جس میں تادور رخت کی پوری باس کو منتقل کرنا پڑتا ہے۔

میری ذات کسی ایک پیراہن میں قید نہیں۔ مکمل اور ادھورے خاکے ہیں۔ جن کی تعداد گلا تعداد ہے۔

کسی ایک خاکے کی جھلک آپ کو دکھاوی تو باقی سب کے ساتھ نا انصافی ہو جائے گی۔ میں نے ایک شیفت بننے کی بھی کوشش کی ہے۔ بچپن سے اسکی چیز بنانے کا بھی شوق رہا ہے۔ پیئڈی کرافٹ کا کام بھی آتا ہے۔

پیال ساز میں نانو کا کردار کسی حد تک میں ہی ہوں۔ میرے کمرے میں بھی میرے ہاتھ سے بنا ہوا ایک ”نگار خانہ“ موجود ہے۔ درختوں، پھولوں، پتھروں، آلات موسیقی، ان سب سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔

(1) ”میں نے لکھنا ہے“ یہ بات تو شاید پہری پیدائش کے وقت طے پا گئی تھی۔ اور یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ سمندر کے دہانے پر نیچے دریا کی طرح میرے ڈیلٹا کی شاخیں خواتین کے اوارے سے نکرا گئیں۔ کینٹ پارک کی وہ سفید عمارت مجھے آج بھی یاد ہے جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

”یہ لاہوری ہے۔“ کسی نے بتایا تھا۔
”یہاں بچے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔“ مجھے ہال کے اندر نہیں جانے دیا گیا۔

لیکن مجھے خوشی تھی۔ شیلفوں میں لگی ہزاروں کتابیں نظر سے گزری تھیں۔ مجھے اس عمارت نے سب سے پہلے محصور کیا جس کے اندر ہزاروں کتابیں

موجود تھیں۔ لفظوں نے جوان کتابوں کے اوراق میں قید تھے مجھے اپنی طرف اتنی دور سے بھی کھینچ لیا تھا۔ کم عمری میں ہی کم گوئی کے لبادے میں لپٹے میرے رجحانات نے کتاب کے دو رنگوں سفید اور سیاہ کو ”کل“ سمجھ لیا۔ نفسیات کے علم نے مجھے حساس بنا دیا۔ دیکھنا، محسوس کرنا، سوچنا، سوچتے رہنے کی عادت نے میرے رائٹر بننے کی داغ بیل ڈالی۔

گھر میں کتابوں، رسالوں کا ذخیرہ تھا۔ کچھ حصہ خاندانی تھا۔ کچھ خریدا گیا اور کچھ رشتے داروں کی طرف سے آیا ہوا اور کچھ مانگ کر دلایں نہ لگایا گیا۔ (ہی) لاہوری والوں نے تو مجھے روک دیا تھا لیکن گھر کا ذخیرہ میرا تھا۔ اس ذخیرے میں سب سے زیادہ اہتمام میں نے کیا۔

بچوں کے رسالے بے تحاشا پڑھے۔ لکھنے کی ابتدا بھی ان ہی سے کی۔ ابتدائی دور میں احمد یار خان اور عنایت اللہ مرحوم کو پڑھا۔ پہلی کتاب ”رات کاراہی“ پڑھی۔ دلوں اس کتاب کے سحر نے مجھے خود میں جکڑے رکھا۔ راجہ گدھ میں نے ساتویں جماعت میں پڑھ لی تھی۔ یہ عمر کا اثر تھا یا کتاب کا کہ بانو قدسیہ کے علاوہ مجھے مدحتوں کی خاتون مصنفہ کا لکھا کچھ پسند آ ہی نہ سکا۔ چند سال پہلے میری بہن نے کہا کہ میں نے ہر مصنفہ میں بانو قدسیہ کو ڈھونڈنا چاہا ہے۔ اسی لیے مجھے کوئی اور پسند نہیں آتا۔“ اس کی بات نے میرے دل پر اثر کیا اور میں نے دوسری مصنفین کو کھلی نظر سے پڑھنا شروع کیا۔ ان کی الگ ثقافت، الگ حیثیت سے۔ مجھے چند اچھے نام ملے۔

بانو قدسیہ جیسا ہی مزاج رکھنے والی بنگال کی سیتا جی، از امیل آسمندے اور بشری سعید۔ ان سب کی کہانیوں کا دار اور اندازنا صرف الگ تھا بلکہ ان کی کہانیوں میں ایک ”بڑے پن“ کی جھلک بھی تھی۔ اہل فن شوق کی

کتاب 'بلیک ملک' کے قلم نے مجھے متاثر کیا۔ ہمارے یہاں ایسی کتابیں نہیں لکھی جاتیں۔ لکھی جائیں بھی تو ان کی ایسے پذیرائی نہیں کی جاتی۔

(3) اطمینان۔۔۔ اطمینان کا لفظ ابھی تو دور دور تک نظر نہیں آتا۔ لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔ کہانیاں بھی زیادہ نہیں ہیں۔ یہ تو وہی بات ہو گئی جیسے بقول بانو قدسیہ "اوس سے کسی کی پیاس کیا بجھے" اب تک جو لکھا وہ اوس کے اس تھے سے قطرے سے ہی مشابہ ہے۔ اس تھے قطرے نے میرے دل کو ترکیا ہے لیکن بھگویا نہیں۔

گھر میں ہر کوئی اپنے اپنے طے کر رہا مقصد کے تحت چلتا جا رہا ہے۔ ایک بھائی کا کچھ عرصہ پہلے ایک البم نکالنے کا بھی پکا ارادہ تھا۔ (ویسے وہ یہ البم نکال چکا ہے اور ہٹ بھی ہو چکا ہے۔) (خواب میں) اس سے پہلے وہ اپنا ڈیری فارم بنا کر سارے لاہور کو خالص دودھ سپلائی کر چکا ہے۔ (خواب میں ہی - ہا ہا ہا) ایک بہن سنگت سمجھ رہی ہے۔ آج کل یہ بہن ہمیں ہر چھوٹے بڑے ہٹ فلاپ سنگر کی آواز کے اسکیل لے اور فیمپو کے بارے میں بتاتی پائی جاتی ہے۔

تاہم "مرگ سیاہ" اور "وڈا کھیل" لکھ کر اچھا ضرور لگا تھا۔ آج کل پیال سا زریہ قلم محبت اور محنت سے۔ پھر بھی ہر بار امتل آئی تو قسط بھجوا دینے کے بعد بار بار ارادہ کیا کہ قسط واپس منگوا لوں۔ اور آئی ہے کہہ دوں کہ آئی اس بار قسط کی جگہ شائع کریں کہ "بھل کی قسط ان کی ناسازی طبع کے باعث موصول نہیں ہو سکی۔" اور میں اس ایک ماہ میں "خواب طبیعت کے باوجود قسط کو نئے مریے سے پھر لکھوں۔" خوب محنت کروں۔ دل کی تسلی کروں اور بس دل کو تسلی ہی نہیں مل پاتی۔ شاید تمام مصنفوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مصنف کے لیے اطمینان وہ مستحیونی بونی ہے جسے بڑے جتنوں کے بعد حاصل کیا جاتا ہے۔ لمبا سفر کرنا پڑتا ہے۔ پھر ابھی وہ قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔

اس کے ساتھ بیٹھ کر کسی کا گانا سننا مطلب اس سنگر کی آواز پر ایک لیکچر سننا ہے۔ دعا ہے کہ یہ جلد سنگر بن جائے تاکہ ہماری تو خلاصی ہو۔ لوگوں کو سنائے لوگوں کے کان پر گائے ہمیں تو بخشتے۔ کیونکہ اگر یہ جلد از جلد سنگر نہ بنی تو ہم ضرور از ضرور ہرے بن جائیں گے۔ پھر بڑی بھی پوچھتے ہیں یہ آپ کے گھر سے چیخوں کی آوازیں کس کی آتی ہیں۔ اب انہیں کیا بتائیں یہ چیخوں کی نہیں۔ "سنگر" کی آوازیں ہیں۔

آپ دیکھ ہی سکتے ہیں کہ جب گھر میں "فن کار" موجود ہوں تو یہ بتانا اور طے کرنا کہ کوئی کب کیا کر دکھائے اور کیا سر پر تزدے دے ممکن نہیں۔ کچھ کچھ امید تو نظر آرہی ہے کہ فنکاروں کے اس ہجوم میں سے کوئی نہ کوئی کچھ کر ہی دکھائے گا۔ (ہا ہا)

(2) نہیں۔۔۔ اس سوال کے ہر جز کا جواب ہے نہیں۔۔۔ یہ بات گھر والوں کے علم میں نہیں کہ میری کہانیاں شائع ہو رہی ہیں۔ جب بچوں کی لکھی تھیں تب بھی اور اب بھی۔ کچھ عرصے پہلے خواتین ڈائجسٹ گھر میں باقاعدہ آنے لگا تو انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ شاید اس میں میری کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ راز کی بات ہے ان کا اندازہ سو فی صد درست ہے۔ ویسے کبھی ان کے نزدیک یہ کوئی ایسا معرکہ

میری کہانیوں کے بارے میں اکثر ریڈرز کہتے ہیں کہ وہ ڈارک ہوتی ہیں۔ شاید میرے اندر کچھ ایسا ہو۔ میری ذات کے رنگ میری کہانیوں کے رنگوں سے مختلف ہیں۔ میری کہانیوں سے مجھے سچ نہ کریں تو مجھے اچھا لگے گا۔ ریڈرز کہتے ہیں کہ میں ہلکی پھلکی کہانیاں لکھوں۔ یقین کریں کہ کہانی لکھتے ہوئے میں نے کبھی اس کو میزان میں نہیں رکھا کہ کون سی ہلکی پھلکی سے۔ غبارے کی طرح کہ خود بھی اڑ جائے اور پڑھنے والے کو بھی اڑا کر لے جائے (ہا ہا ہا)۔ مجھے لگتا ہے کہ راسٹر کی کہانیاں کسی سربراہ کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ خود راسٹر اور ریڈرز دونوں کو چونکا سکتی ہیں کہ

اوہ! کیا واقعی میں نے لکھا ہے۔۔۔ (رائٹر)۔
 اوہ! کیا یہ واقعی اسی رائٹر نے لکھا ہے۔۔۔ گریٹ۔۔۔

(ریڈر)۔

(4) پسندیدہ مصنفین اور کتابوں کی فہرست تھوڑی طویل ہے۔ بانو قدسیہ پسند تھیں، ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ان کے انٹرویوز کو بھی پانچ پانچ بار پڑھا ہے۔ جلد یادیر ان کے اعزاز میں لکھا گیا ناول ”قدسیہ کہانی“ بھی آپ پڑھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ جلالی بانو، رام لعل، کرشن چندر، قاضی عبدالستار، ابو الفضل

صدیقی، گلزار، محمد الیاس اور محمد اشرف۔ محمد اشرف جن کی ایک پیدماشری ایوارڈ یافتہ کہانی ”آرمی“ اور ”رنگ“ نے مجھے دنگ ہی کر دیا تھا۔

زندگی میں ابھی تک دو کہانیاں ایسی پڑھیں جنہوں نے مجھے بری طرح سے جھنجھوڑا (چونکا) تو بہت سوں نے) ایک یہ کہانی ”رنگ“ اور دوسری منوج داس کی ”جنگل میں“ ہے۔ ایسی کہانیوں کا سوچا جانا اور پھر لکھ دیا جانا، تاریخ رقم کرنے کے مترادف ہے۔ (تیسری کب مجھے جھنجھوڑنے آتی ہے مجھے اس کہانی کا انتظار ہے۔) ایک کہانی ہے میں نے بار بار پڑھا، ”رومانوف کی وجود“ ہے۔ اردو میں آپ اسے عورت نامہ کہہ سکتے ہیں۔ ویسے تو عورت کی یہ وفائی پر بہت لکھا گیا۔ جس میں گستو فلانیر، لیونٹاشالی اور طلعت ضیا گل کے ناولوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ لیکن بی رومانوف کی یہ کہانی جیسے ان سب ضخیم ناولوں کا جواب ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کو پڑھا لیکن کم۔ پھر خود لکھنا شروع کیا تو پڑھنا بھی شروع کیا۔ جس ادارے کے ساتھ ہم منسلک ہوں اس کے بارے میں آگاہی ہونی چاہیے۔

تشریحہ ریاض کا ”عمد الست“ ایک عمد کی مانند ہے۔ ”اوہ ری جھنجھوڑی“ پڑھا تو ساہرہ رضا سے

تعارف ہوا۔ نمبر احمد اور سمیرا جمید نے دور کی آواز میں ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو لفظوں کے پیراہن میں ڈھالنا

چانتی ہیں۔ منصباح علی شاید مہموں کے حساب سے لکھتی ہیں۔ سال میں چار۔ گزارش ہے کہ زیادہ نہ لکھیں تو اتنا کم بھی نہ لکھیں۔ ”جو زیست کو“ پڑھا تو میونہ صدف سے واقفیت ہوئی۔ جواب غائب ہیں۔ فریدہ فرید اپنی کہانیوں میں ہمیشہ نئے پہلو دیتی ہیں۔ عفت سحر طاهر، نازیہ، شازیہ جمال طارق، قانتہ، رابعہ سب بہت اچھا لکھتی ہیں۔

(5) بچپن سے ہی عادت ہے جو کتاب پڑھی، اچھے لفظوں، اچھی باتوں کو نوٹ بک میں نوٹ کر لیا۔ ان ہی نوٹ بکس میں سے کچھ اقتباسات جو مجھے اچھے لگے۔

”کوئی شخص مضبوط نہیں۔۔۔ جب اس کی جبلت اسے برہنہ کر کے پتھر اور دھات کے زمانے میں لے جاتی ہے۔ ساری تہذیب، آورش، مذہب، دھرم اکادھرا رہ جاتا ہے اور وہ صرف خواہش اور ضرورت کا غلام رہ جاتا ہے۔“ (بانو قدسیہ)

”حد کے کائنات بنتے ہوئے بنائی ہوگی اور محبت میں۔ اس لیے کہ چیزیں غصے یا انتشار میں نہیں بنائی جا سکتیں۔“ (اسد محمد خان)

”پتا نہیں لوگ بیٹیوں کے نام زینب، مریم کیوں رکھ دیتے ہیں۔ بڑے ناموں کے ساتھ دکھ بھی بڑے ہی وابستہ ہوتے ہیں۔ عیسیٰ، عباس، حسین، اتنے بڑے نام، عورت میں کچھ نہ کچھ خراج تو وصول کرتے ہی ہیں۔“ (محمد الیاس)

”جب محبت کا یوسف، ہجر کے کنوئیں میں گرتا ہے تو اس کے چاہنے والے کی آنکھیں یعقوب ہو جایا کرتی ہیں۔“ (طارق بلوچ صحرائی)

”اڑو کہ اڑنے کا حق صرف پر والوں کے پاس ہی نہیں۔“ (سمیرا حمید)



لنڈن عید ذہن میں آتے ہی خوشیوں، مسکراہٹوں، اہتمام اور دوستوں کا تصور پروہ ذہن پر ابھر آتا ہے اور بات عید قربان کی ہو تو خوشیوں اور بلے گلے کے ساتھ ساتھ بچن سے اٹھتی اشتہا انگیز خوشبو میں اور بارونق دسترخوان کا خیال آتا ہے۔ سنت ابراہیمی پر عمل کر کے جہاں ایک فریضہ ادا کیا جاتا ہے۔ وہیں اس خوشی میں دوستوں اور احباب کو شامل کر کے اس کے لطف کو دو بالا کرنے کا اہتمام بھی زبرد شور سے ہوتا ہے۔

اس دفعہ کے عید سروے پر ہمارے سوالات بھی اس عید کی تیاری سے لے کر قربانی، پکوان اور دعوت طعام سے متعلق تھے۔ سروے کے سوالات یہ تھے۔

- (1) عید الاضحیٰ پر آپ کے گھر میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے یا آپ خود مہمان بن کر جاتی ہیں۔ گھر پر دعوت ہو تو آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟ کوئی خصوصی ڈش جو مہمان شوق سے کھاتے ہیں۔
 - (2) گوشت کی کوئی ایسی ڈش جسے آپ کے گھر، خاندان یا علاقے کی خاص ڈش کہا جاتا ہے۔
 - (3) کیا عید قربان پر آپ کے گھر کے مرد گوشت کی تقسیم یا کھانے پکانے میں آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔
- آئیے دیکھتے ہیں قارئین نے ان سوالات کے کیا جوابات دیے ہیں۔

پاک سوسائٹی

جشن عید مبارک

ادارہ

اشعریہ لاہور

بے کھا کر۔

بیہفت بوٹی

پڑا گوشت کیرٹ میں لپی ہوئی بوٹیاں ممکن حسب ذائقہ، لال مرچیں حسب ذائقہ، لیمن جوس حسب ذائقہ گرم مسالا حسب ذائقہ

گوشت میں ان سب چیزوں کو اچھی طرح مکس کر دیں اور کچھ دیر پڑا رہنے دیں تاکہ مسالا اچھی طرح رس بس جائے۔ اب توے پر گھی ڈالیں یا آئل، آئل گرم ہو جائے تو بوٹیاں ڈال دیں اور ہلکی آنج پڑا رکھ دیں۔ کچھ دیر بعد پلٹیں اور پھر ڈھانپ کے رکھ دیں۔ لیس جی، امزید، اربیف، بوٹی تیار ہے۔ ویسے یہ میں نے خود نام دیا ہے، میں یہ بچپن سے بنانی آ رہی ہوں شاید ہی کوئی بناتا ہو اسے ٹھنڈی بوتل کے ساتھ نوش فرمائیں۔

3۔ ہاں کچھ حد تک تو بات ٹھنک ہے۔ مرد چھوٹی عید پر تو بالکل ساتھ نہیں دیتے تو اسے حکم چلانے کے بعد کہ بقر

1۔ ہاں جی بالکل اس عید کے تو تینوں دن ہی مصروفیت میں گزر جاتے ہیں۔ پہلے دن حسب معمول داد کے گھر سب چاچو، تانا اور پھوپھو کی فیملیز اکٹھی ہوتی ہیں اور بہت رونق لگتی ہے۔ سال میں یہ ہی تو دن ہوتے ہیں جب سارا خاندان اکٹھا ہوتا ہے۔ اور جناب دوسرے دن ساری فیملیز ہمارے ہاں تشریف لاتی ہیں تو سارا دن بس مہمانوں کے آگے پیچھے گزر جاتا ہے اور تیسرے دن پھر کسی تانا کے گھر جاتے ہیں بس اسی طرح مصروفیت میں دن گزر جاتے ہیں۔

کوئی خاص ڈش تو نہیں ہوتی۔ لاسٹ عید پہ امی نے دعوت میں ہماری اور اسٹو بنایا تھا جو کہ بہت ہی لذیذ تھا۔ تو یہ دونوں ڈش بہت ہی شوق سے سب نے کھالی تھیں۔

2۔ نہیں جناب ایسا کچھ نہیں ہے کہ کوئی خاص ڈش ہو، مگر ایک ڈش ہے کہ شاید آپ لوگوں کو بہت عجیب لگے، مگر اچھے بہت پسند ہے۔ یہ بہت سادہ سی ہے اور بس مزہ آجاتا

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

عید پر کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹائی دیتے ہیں۔ خاص طور پر بیسٹ والد محترم جیسا کہ سلاہ بناؤنی گوشت کی بوٹیاں بنا دیں وغیرہ۔۔۔

سرت الطاف احمد کراچی

1 - عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی سے فارغ ہونے کے بعد سب کزنز کو پہلے کلچی کا ناشتا کرایا جاتا ہے جب کہ رات کو بارنی کیو کا پروگرام ارتج کرتے ہیں۔ ہم ہر سال اپنے حصہ کا گوشت باہر ہماری بونی بنانے کے لیے بھی دیتے ہیں۔ دعوتوں کا سلسلہ تو عید کے دوسرے دن سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن دادا ابو کے گھر اور تیسرے دن نانی اماں کے گھر سب اہل و عیال جمع ہو جاتے ہیں اور اس دن خوب بلا گلہ، مستی کرتے گزارتے ہیں۔ ہر طرف گھما گھمی اور رات نظر آتی ہے۔

سب ہی عید کی خوشیاں منانے میں مگن نظر آتے ہیں۔ وقت کے سمندر میں کچھ خوب صورت لمحات یاد بن کر ہمیشہ زندگی کو رنگین کرتے ہیں۔

2 - ہر سال عید الاضحیٰ کے موقع پر ہمارے گھر ایک خاص روایتی ڈش ضرور بنتی ہے یہ ڈش صائمہ اور میری فیورٹ ڈش ہے ہمارے گھر قربانی کا گوشت اتنا نہیں کھایا جاتا۔ ندا گوشت سے ایسے بھانکتی ہے جیسے گائے بکرے قصائی سے اور ام رباب بھی ندا کے نقش قدم پر سبک روی سے گامزن ہے۔ یہ کوالٹی ابو کی طرف سے انہیں وراثت میں ملی ہے۔ خیر چھوڑیں بد ذوق لوگوں کو! ای خاص طور پر ہمارے لیے بہت ہی پیار سے بنائی ہیں اس ڈش کا کوئی خاص نام تو نہیں بس ابھی حال ہی میں لکھا ہے۔ ریشمی گوشت بہت ہی مزے دار اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔

ریشمی گوشت

اجزا :

گوشت دو کلو نمک حسب ذائقہ اور کالسن دو چائے کاچچہ ہری مرچ اور پودینہ کا پیسٹ دو چائے کاچچہ لال مرچ پاؤڈر دو چائے کاچچہ کٹی ہوئی لال مرچ دو چائے کاچچہ گرم مسالا ایک چائے کاچچہ چاٹ مسالا دو چائے کاچچہ

ترکیب :

گوشت کو اچھی طرح دھو کر اہل لیں۔ ساتھ میں نمک اور اور کالسن کا پیسٹ بھی ڈال دیں جب گوشت اچھی

طرح نکل جائے اور زینہ زینہ ہو جائے اور دورا سا پانی رہ جائے تو اس میں ہری مرچ اور پودینہ کا پیسٹ بھی ڈال دیں اور ساتھ میں لال مرچ پاؤڈر کٹی ہوئی لال مرچ گرم مسالا اور چاٹ مسالا ڈال کر تھوڑا سا پکنے دیں اس میں آئل

نہیں ڈالتے کیوں کہ قربانی کے گوشت میں چکنائی ہوتی ہے جب ذرا سا شور پارہ جائے تو ڈش آؤٹ کر کے دوسروں کو کھلائیں اور تعریفیں وصول کریں۔

3 - عید الاضحیٰ یا کسی بھی تہوار سے زیادہ عام دنوں میں میرے پیپا انواع و اقسام کے ڈشز بہت ہی ذوق و شوق سے پکاتے ہیں۔ بریانی ہو یا کڑاہی، قورمہ ہو یا تلمکہ یہ کوالٹی میرے پیپا میں دادا جان کی وجہ سے منتقل ہوئی ہے۔ دادا جان کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے ایک بار دادا جان نے ہمارے لیے اسپگیٹھی بنائی تھی آج بھی وہ ذائقہ نہیں بھولتا۔

وردہ گل طارق۔ کوئٹہ

1 - ای ابو منزہ (بہن) اور عمر (بھائی) یہ لوگ تو صبح بارہ بجے تک سب سے عید ملنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں (بھئی سب سے چھوٹے جو ہیں نا) اور رہی بات ہماری اور لارنس کی (بھئی ہماری دوسری بہن) تو وہ اور میری ماما، دادی اور دادا ابو ہم گھر میں ہی ہوتے ہیں اور ماما اور دادا سے ملنے ان کے دوہرے پوتے پوتی آجاتے ہیں مگر کھانا وغیرہ نہیں کھاتے لیکن دوسرے روز پچھو اپنے پورے کنبے سمیت آن وارد ہوتی ہیں تو دعوت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہماری مشہور ڈش یعنی پلاؤ بنا ہے جو کہ پورے خاندان میں مشہور ہے (بھئی ہمارے ناٹھ میں ذائقہ بہت ہے نا) تو وہ دیگر لوازمات کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

2 - کوئی اتنی خاص ڈش تو نہیں ہے البتہ دادا ابو کو اور ہمیں بھی۔ کلچی بہت پسند ہے جسے ہم بھون کر بتاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پلاؤ ہوتا ہے تو یقیناً یہ سب کو آتا ہوگا تو لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

3 - یہ تو آپ نے بڑا چنگا سوال کی تا اسے (یہ تو آپ نے بڑا اچھا سوال کیا ہے) بس رچی کیا بتاؤں۔ آپ کو ہمارے گھر کے مرد حضرات یعنی دادا ابو سے لے کر چھوٹے عمر تک کوئی ہل کر پالی تک نہیں پیتا تو کھانے بنا جانے میں مدد کرنا تو کی بڑی بات ہے۔ سیر ہاں میرے پچھو کے شوہر یعنی میرے

پچھیا اور ان ٹکے بنیے یعنی میرے کزنز وہ بڑی اچھی کوکٹ کرتے ہیں تو ان کے ہاتھ کی کڑاہی اور باربی کیو بہت پسند کیے جاتے ہیں۔

نادیہ علی۔۔۔ سرحدی ٹاؤن، کراچی

1۔ عید الاضحیٰ پہ تو ہم کہیں نہیں جاتے۔ ہاں آپنی عید کے پہلے دن ضرور آتی ہیں اور دوسرے یا تیسرے دن سب سے چھوٹی خالہ آتی ہیں۔ ہمارے گھر دعوت ہو تو میں بریانی اور پائے کو ترجیح دیتی ہوں اور ساتھ میں سلاد والا راستہ۔ ہمارے مہمان پائے بہت شوق سے کھاتے ہیں اور بیچ جائے تو فرمائش کر کے لے بھی جاتے ہیں۔ (ویسے ہمارے ننھیال میں کہیں بھی دعوت ہو ساتھ میں پارسل کا بھی انتظام ہوتا ہے۔)

2۔ ہمارے گھر کی گوشت کی خاص ڈش جو آتی بہت فرمائش سے ہوتی ہیں وہ چھوٹی کے ہاتھ کے ٹکے اور بابدست کے ہاتھ کی بریانی اور نہاری ہے اور آپنی کے علاوہ پانی میرے ناموں، انکل، خالہ وغیرہ ہمارے گھر کے پائے بہت پسند ہیں اور اگر ہمارے گھر پائے کی دعوت ہو تو سب بہت ذوق دشوق سے قبول کرتے ہیں۔

ہمارے خاندان کی تو کوئی خاص ڈش نہیں ہے۔ ہاں ہمارے علاقے کی ایک ڈش بہت مشہور ہے، لیکن وہ گوشت کی نہیں آلو کی ہے یعنی آلو کی بریانی چٹنی اور ذائقہ دار وہ بھی صرف 60 روپے کلو۔ ہونے نا حیران۔ جو بھی سنتا ہے یہی کہتا ہے کہ بریانی ساٹھ روپے کلو ناممکن اور کراچی جیسے شہر میں بالکل ناممکن۔ مزے کی بات کہ بریانی لینے اور کھانے کے بعد بھی یقین نہیں آتا کہ بریانی ساٹھ روپے کلو ہے۔

3۔ بھئی عید بھی ہوا نمکین ہمارے تو دونوں تھوڑے چکن کی نذر ہوتے ہیں۔ ہم کیوں کہ بریانی میں حصہ لیتے ہیں تو گوشت آنے تک دیا مینج جاتے ہیں پھر بعد کا کام میں اور مہمان سنبھالتے ہیں۔ سب کے حصے بنا کر بونا اور اپنا حصہ ٹھکانے لگانا۔ مہمانوں سے میں لسن، پیاز وغیرہ ضرور بنواتی ہوں مگر کاتی میں خود ہوں۔ بابا کہتے تھی ہیں کہ میں پکاؤں مگر میں منج کر دیتی ہوں۔

روینہ شاہد۔۔۔ کراچی

قہر۔۔۔ عید کے پہلے روز ہم اپنے لیے ہی اہتمام کرتے ہیں

اور عید کے دوسرے روز قربانی ہوتی ہے۔ ہماری چونکہ جو اسٹ فیملی ہے اور ہماری اکلوتی مند صاحبہ پہلے روز اپنے گھر قربانی کر کے ہمارے گھر ہی آجاتی ہیں سو ہم سب خود ہی میزبان اور خود ہی مہمان کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

عید کے دوسرے روز قربانی بھی ہوتی ہے اور ڈھیروں کزنز رشتے دار آتے ہیں کیوں کہ رات کو ہمارے گھر کی

چھت پر ہر سال باربی کیو کا انتظام ہوتا ہے اور باربی کیو کے مزے دار ذائقے کے چٹکارے لینے کے لیے ہی سب عید کے دوسرے دن رات گئے تک ہمارے گھر میں محفل جمائے رہتے ہیں۔

2۔ عید کے پہلے روز تو تمام آسٹم چکن کے ہی بنتے ہیں کیوں کہ قربانی دوسرے روز ہوتی ہے۔ قربانی کے فوراً بعد کچھی بنتی ہے جسے کوئی بچہ چھو تا تک نہیں اور قربانی وال چاول بنتے ہیں۔

کیوں کہ رات میں ہم تمام خواتین کی ہمارے اپنے ہی گھر میں دعوت ہوتی ہے بلکہ یوں کہہ لیں کہ باربی کیو کا لنگر عام ہوتا ہے۔ سال ہا سال سے ہمارے گھر عید کے دوسرے روز تک بونی، بیج کباب، چیلی کباب، گولہ کباب، ہباری پونی اور اس کے ساتھ چپاتی، پرائے، رائیہ، سلاد، چٹنی اور کولڈ ڈرنک کا بھی انتظام ہوتا ہے۔

یہ ہمارے گھر کی خاص دعوت ہے جس میں سب خود بخود آتے ہیں ہمارے کزنز اور دیگر رشتے دار، گلی کے چوکیدار، دکان کے ملازم وغیرہ۔ رات گئے تک لوگ آتے رہتے ہیں اور گرم گرم لوازبات سے شکم پری کرتے ہیں۔

ہمارے گھر میں تو گوشت بڑے پیلوں میں رکھا ہوتا ہے۔ سالے بھی اندازے سے لگائے جاتے ہیں اور ہمارے دیور بار بار سالے لگا کر بھابھیوں کو پکھلاتے ہیں پھر پہلی بیج بھی بھابھیوں کے پاس ہی آتی ہے کہ سب سیٹ ہے، کوئی کمی تو نہیں اور ساری بھابھیاں گرم گرم بوشیاں منہ میں رکھے، گڈ! ایک سیلیفنا زبردست! کیا بات ہے بھئی! امزہ آگیا ہے۔ جیسے جملے بولتی ہیں حالانکہ کئی بار زبانیں جل جاتی ہیں مگر کیا کیا جائے دیورجی کی تعریف کرنا بھی تو مقصود ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ بے چارے کیا کیا کرتے ہیں یہ اگلے سوال کے جواب میں آئے گا۔

زلیں میں ہم ایک کلو بونی بنا نے کی ترکیب لکھ رہے ہیں۔ بے حد آسان ترکیب ہے۔

طرف بچھرت لگا دیا جاتا کہ کوئی بزرگ آرام کرنا چاہیں تو لیٹ جائیں۔ دیوار کے ساتھ کرسیاں لگادی جاتی ہیں اور درمیان میں بہت برفا فرشی انتظام ہوتا ہے اور مستقل دستر خوان بچھا ہی رہتا ہے۔ آتے سہیے کھاتے سہیے کے مترادف۔

تمام ہی مرد آرام وہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس میزبانی کے فرائض انجام دے رہے ہوتے ہیں۔

کوئی سخیوں پر بوٹیاں برد رہا ہے تو کوئی سچ کباب پر تھکا گیا لیٹ رہا ہے۔ کوئی چٹھا بھل رہا ہے تو کوئی سیخیں گھما گھما کر سینک رہا ہے اور جسے کی مدد سے پلیمنوں میں ڈال رہا ہے دوسری طرف کوئی چھلی کباب کی ٹکیاں بنا رہا ہے تو کوئی مل رہا ہے اور کوئی مستقل تمام لوازمات سرو کر رہا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہاتھ پر کوئی شملن نہ اظہار تحسین بلکہ تمام اور انتہائی عمدہ پیشانی سے منبتے مسکراتے بحسن خوبی انجام دیتے جانتے ہیں اور تمام خواہشیں پابا ہوا ہو ہو ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا اور ہنسنا۔

کیوں کہ ہم خواتین کو اپنے گھر میں یہ ایک شام یا رات ایسی ملتی ہے جب اپنے ہی گھر میں ہم مہمان بن جاتی ہیں اور گھریلو ذمہ داریوں سے ہمیں چند گھنٹوں کے لیے چھٹی مل جاتی ہے۔ یعنی مرد ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتے بلکہ پوری ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ عید الاضحیٰ کے روز یہاں میں عید الاضحیٰ کے خواہشوں سے ایک واقعہ آپ سے شلیہ کرنا چاہوں گی۔

یہ اب سے پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ جب سنہری رنگت براؤن بالوں ستارہ آنکھوں کیونے رخساروں اور چہرے پر بلا کی معصومیت رکھنے والی زینب کی عمر صرف چار برس تھی۔ یہ ہمارے سب سے چھوٹے دیور زریاب کی بیٹی ہیں۔ گھر بھر کی لاڈلی زینب کا خمیر تو جیسے شرارت اور جتس سے مل کر گوندھا گیا ہے۔ صحت مند زینب ہماری سے ہماری وزن یوں اٹھاتی ہے جیسے معمولی بات ہو انتہی سی عمر سے ہی.... ہمارا گھر کمرشل ایریا میں ہے نیچے دکانیں اوپر رہائش۔ چھٹی کے دنوں میں تمام دکانیں بند ہوتی ہیں۔ ہماری گلی کے سامنے کئی کئی گلیاں ہیں وہاں سائڈ پر کئی دکانیں ہیں جن پر خاصے بیویوں ڈھکن موجود ہیں۔ "دکٹ گلیاں ہماری کھڑکیوں سے صاف دکھائی دیتی ہیں۔

ضروری اشیا (گائے کے گوشت کی) ایک کلو پسی لال مرچ ایک چائے کا چمچہ کئی لال مرچ ایک چائے کا چمچہ پسا کر مسالا ایک چائے کا چمچہ ہلدی پاؤڈر ایک چوتھالی چمچہ لوسن پسا ہوا ایک چائے کا چمچہ اور ک پسی ہوئی دو چائے کے چمچے لمبوں کرس چار چائے کے چمچے کچا پیتا پسا ہوا دو چائے کے چمچے گھی حسب ضرورت نمک حسب ذائقہ (دیئے تو تمام اشیا حسب ضرورت اور حسب ذائقہ ہی رکھی جاتی ہیں کیوں کہ کچھ لوگ چنینا پسند کرتے ہیں اور کچھ ہلاکا۔)

ترکیب

تمام مسالے پیٹے سمیت۔ بوٹیوں پر لگا کر کم از کم تین سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر سخیوں پر لگا کر بارہی کر لیں۔ اوپر سے گھی سے پرش کریں۔ سیخیں گھما کر سینکیں اور۔۔۔۔۔ چھٹی اور رات کے ساتھ نوش فرمائیں۔

1۔ عید خواتین کا اور عید قریاں مردوں کا ہوا ہے یہ بات سو بلکہ دو سو فیصد درست ہے۔ عید الفطر میں ماہ رمضان کی ابتدا سے ہی یا بلکہ اس سے پہلے سے ہی تمام تر ذمہ داریاں خواتین کے ناتواں کاندھوں پر ہوتی ہیں۔ ساتھ ساتھ گھریلو امور، شاپنگ، مختصر یہ کہ تمام امور خواتین کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے ہوتے ہیں۔ عید کی دعوتوں کے انتظامات بھی خود ہی لگنے ہوتے ہیں۔

اور عید الاضحیٰ میں قریاں کے جانور کی خریداری سے لے کر رکھوالی، خاطر داری، ناز برداری وغیرہ کی تمام تر ذمہ داری مرد حضرات کے سر ہوتی ہے۔ قریاں اور گوشت کی تقسیم کے بعد بھی کہاں چین سے بیٹھتے ہیں پھر ہوتی ہے جٹ پنی، مزے دار بارہی کیوپارہی کی تیاری۔ جس کی لے رکھی ہے ہمارے گھر کے مردوں، خود بخود ساری کی ساری ذمہ داری۔ ہم خواتین تو شام سے پہلے تک بس ہیلپر کے فرائض انجام دیتی ہیں۔

جیسے ہی دن ڈھلتا ہے اور شام چمکے چمکے چمکے چمکے کی آغوش میں چھپنے لگتی ہے۔ ہمارے گھر کی تمام خواتین توج سنور کر مہمان بن کر جمیت پہنچ جاتی ہیں۔ جمیت کو برتی قمقموں سے اقدار نور بنا ہوا ہے ایک

عید سے دو تین روز پہلے ازینب نے میں ہوں سے کسی آدمی کو نکلنے دیکھا۔ اس نے فوراً ”آگرا اپنی امی سے پوچھا۔“
 ”زمین کے اندر کون لوگ رہتے ہیں؟“
 اس کی امی بے حد مصروف تھیں۔ کہہ دیا۔ ”بھوت رہتے ہیں“

ازینب نے خوشی خوشی سب کو بتایا کہ آج اس نے ایک بھوت دیکھا ہے اگر کسی دن اسے موقع ملا تو وہ بھوت کے گھر جائے گی ”اس نے اپنے ہم عمر بچوں کو بتایا۔ بڑے بے خبر تھے یا کسی نے نیچی کی بات کا نوٹس ہی نہ لیا۔ کیونکہ ایسے تو بچوں کو اکیلے نیچے اترنے کی اجازت ہی نہیں ملتی۔ بڑوں کے ساتھ ہی اترتے ہیں۔ مگر جب بچوں نے کوئی کارنامہ انجام دینا ہو تو وہ بڑوں کی موجودگی میں بھی دے لیتے ہیں بس وہ سب جیسی پھرتی اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پانچ سال پہلے عید کا دوسرا دن تھا اور قربانی ہو رہی تھی۔ گائے کی گردن پر دعا بڑھ کر چھری پھیری جا رہی تھی۔ تمام گھر کے مرد نیچے نیچے سوئے بھی نیچے اتر گئے تھے۔ اس پانس کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے گھر کی کچھ خواتین جا قربانی دیکھنا چاہتی تھیں اور فرسٹ اور سیکنڈ فلور سے یہ نظر دیکھ رہی تھیں۔ کمزور دل والیاں کمروں میں دبی ہوئی تھیں۔

اچانک ہی نیچے سے ازینب زینب کی صدا میں بلند ہونے لگیں۔ تمام ہی خواتین فرسٹ اور سیکنڈ فلور کی کھڑکیوں میں لٹک گئیں جیسے ہمیں سے نیچے نکل جائیں گی۔ اور نیچے جیسے ہی زینب نے زمین ہول کا بھاری ڈھکن ہٹایا اور نیچے کی راہ لی۔ ساتھ کھڑے کزن زید (جو بلا کے تو تلے ہیں) نے شور مچا دیا زینب زینب (زینب) ڈینب دئی بوت نے در (زینب گئی بھوت کے گھر)۔

تب کسی بڑے کزن نے پوچھا ”کیا ہوا؟“ کیونکہ زید کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں تب زید نے اشارہ کیا اور بتایا۔ (شکر تھا کہ اندر اوہے کا جال تھا) پھر شور مچا اور ہمارے مندر دی جو گائے کی بندھی ہوئی ٹانگیں پکڑے ہوئے تھے گھبرا کر پلٹے اور گائے گلے پر چھری پھرنے کے بعد چلی اور وہ بیچارے بیلنس برقرار نہ رکھ سکے اور گر پڑے۔ معمولی چوٹ بھی لگی۔

خیر انہوں نے فوراً ”ہی زینب کو باہر نکال لیا جب زینب گھبرائی داخل ہوئی تو بالکل بھوت کا بچہ لگ رہی تھی۔

زینب کو دیکھ کر ہی تمام خواتین کا رونانا جینا بند ہوا۔ خبر سنی یا جھٹل کی۔ آگ ان کی آن میں دو دو درجہ تک کے ٹوٹوں کو بریکنگ نیوز مل گئی کہ ”ایک نیچی گھر کا ڈھکن نہ ہونے کے سبب اندر گر گئی۔“ زینب کو سلا دھلا کر خوشبو بیات میں بسایا گیا۔ خدا کا شکر تھا کہ زینب کے معمولی سی خراش بھی نہیں آئی تھی صدقہ دیا گیا۔ لرزتے کانچے دل قابو میں آئے تو سوال جواب کا سیشن شروع ہوا۔
 مختلف سوالات پر زینب کے جوابات یہ تھے۔
 کسی نے پوچھا۔ ”تم گریں کیسے؟“

”میں گری نہیں تھی میں نے تو خود چھلانگ لگائی تھی۔“
 ”پھر؟“ کسی نے ایک لفظ میں آگے کی کہانی چاہی۔

”مجھے لگا مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔“
 ”ہائے اللہ رے!“ دادی گھبرا گئیں۔ ”پھر کیسے نظر آنا شروع ہوا۔“

”وہ دادی ہیں نے چھلانگ لگاتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔“ تو کھولنا پھول گئی تھی جیسے ہی آنکھیں کھولیں کالا کندہ پانی دکھائی دیا جو بھوت پیٹے ہیں۔ یہ سوال جواب کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا اور کئی روز بلکہ اب تک انہیں خیال سے سب ہی لرز جاتے ہیں کہ اگر پاناہ چلتا کہ زینب نے زمین ہول میں چھلانگ لگادی ہے۔ پھر رب کا شکر ادا کرتے ہیں۔ کہ نیچی کے معمولی خراش تک نہ آئی تھی۔ اور نہ ہی وہ گھبرائی تھی۔ بلکہ سوالوں کے جوابات جو زینب اس روز سے وہ آج بھی سب ہی کو بہت محفوظ کرتے ہیں۔

نیچے جب بھی سوال کریں انہیں مکمل اور درست جواب دینا چاہیے اور شریر بچوں کو ہر لمحہ کڑی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے یہ بھول تو نہ جائے کیا کیا گل کھلا دیتے ہیں لمحہ بھر میں وہ تو فرشتے ہیں جو ان کی حفاظت کرتے ہیں۔“
 آج بھی اس واقعے کو یاد کر کے ہم سب نم آنکھوں سے مسکراتے ہیں۔

شہزادہ احمد شمس پتوکی

1۔ کبھی کسی کے ہاں مسلمان بن کر نہیں جاتی اور نہ ہی جانا

عید الاضحیٰ پر عید چیت چاہ آتی ہے اور جیسے ہسرا کی دھوپ تھوڑی دیر گھنٹوں کے ذریعے کمرے میں آئی ہو بس اتنی ہی خاموش بلکی سے آہٹ سے دبے پاؤں گزر جاتی ہے اور میں عمرہ احمد سعید جو اپنی ذات میں ہی ایک انجمن کی طرح ہوں۔ سنہری شام کو الوداع کہتی ہوں اور خاموشی سے سونے کی تیاری کرتی ہوں ہوتی ہیں کچھ لوگوں کی عیدیں ایسی ہی اتنے ہجوم میں تنہا تنہا!

3۔ آپ ہی اپنے مہمان 'سادہ گوشت بغیر لہسن پیاز کے نمکین ذائقے دار ہمراہ سفید چاول۔ زیادہ سے زیادہ بغیر نمک مرچ کے گوشت کو اسی کی چربی ضائع کیے بغیر بھون لیا

کیونکہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں لیکن پھر بھی خوش ہوں ہر گوشت میں گو بھی ڈال کر کھانا بہت اچھا لگتا ہے یا پھر متلغم ملا کر خاص طور پر کیونکہ میں سبزیاں بہت پسند کرتی ہوں اگر سردی کا موسم ہو تو مٹر گوشت تلی ہوئی اشیاء مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں ہیں بیک شدہ اور ہلکی آج پر اپنے پانی میں کی غذائیت سے بھرپور سبزیاں گوشت ڈال ہی میرے خصوصی پکوان ہیں اور والوں میں ماش کی وال میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے نرم ٹکڑے بہت بھلے لگتے ہیں ساتھ نان والی خمیری روٹی گرم گرم + سفید نرم مگر کھلے کھلے ابلے چال جو مزا سادہ غذا میں ہے۔ وہ الم غلم میں حقیقتاً نہیں ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہم نے کھانے بنائے یا کھائے نہیں ہیں۔ ہم شمیری لوگ کھا کھا کر بیمار ہونے والی قوم ہیں ہاں اب چالیس سالہ زندگی میں رونق خالق کائنات نے کم کر دی ہے اور ایسے بڑے سونے کا نوالہ بھی گزارے حلق سے بھر گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ خاص خاص مواعظ پر گھر خاندان اور علاقے میں بہت سی مماثلت پائی جاتی ہے کھانوں کے سلسلے میں وال چاول گوشت پلاؤ شای کباب، قورمہ پائے، تگہ بونی، کچے قیے کے کباب، سادہ گوشت، ہارنی کیوانگہ نیوں پر ہواؤں کے ساتھ دور دور تک اڑتی خوشبو میں (بھوک لگی ہو تو) بھوک کو برہماتی ہیں۔

ہمارے علاقوں میں اکثر عید کی دعوتیں شام کے کھانے بڑے ذوق شوق سے عید الاضحیٰ پر بنتے ہیں لیکن سسرال + میکہ دونوں میں آنا جانا دعوتوں پر اب ختم ہو چکا ہے۔ اتنے برسوں میں اب تنگ چکن ہوں اب آرام کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کسی شام میں آرام کرنے لیٹوں تو لاناگ ریٹ

یہی چلی جاؤں یعنی سفر آخرت مبارک ہو (آمین)۔ دنیا کی محفلوں سے آتا گیا ہوں یاد رہ گیا لطف انجمن کا جب دل ہی مجھ گیا ہو خیال بڑے اونچے مثلاً "دنیاوی نہیں بلکہ اس دنیا سے بہت آگے کے ہیں مگر سادی ہوں حلیہ بھی، مزاج بھی، انداز بھی، طبیعت بھی، عمل بھی، خیال بھی، چال ڈھال بھی۔ بہر حال اب زندہ دلی سے ایک پکوان تحریر کرنے لگی ہوں امید ہے کھانے میں مزادے گاد عوت کے لیے جسے بنایا بھی کبھی اور کھایا بھی اور وہ دن یاد آگئے شکر یہ آپ کا یادوں کے چراغ روشن کرنے کا۔

دہی منٹن اسپیشل۔

ضروری اجزا :

گوشت بکرے کا، چار یا پانچ کلو، دہی ایک کلو، ہری مرچ کئی ایک یا دو کال مرچ حسب ذائقہ، کالی مرچ، کالی مرچ، دو پیچہ بڑی الائچی، بارہ عدد دار چینی، بارہ عدد ہراوحنیا، ایک ٹمھی اور رک کٹی ہوئی آوہا پاؤ، زیرہ، ثابت بڑے چھتے چھتے سوکھا وحنیا بڑے چھتے چھتے

ترکیب :

سوائے دھنئے کے تمام اجزاء گوشت + دہی میں ملائیں گوشت کے ٹکڑے مناسب ہوں درمیانہ سائز کی بولی کھانے میں بھی آسان اور دیکھنے میں بھی اچھی لگتی ہے تمام اشیاء بکریوں ڈالیں (دلی سے کھر نہیں بھرنا ورنہ بولی قیہ قیہ ہو جائے گی اور مہمان خوش سبکی محسوس کرائیں گے) گوشت کا اپنا پانی ہوتا ہے۔ گاؤٹ کے لیے اندازے سے بس ایک کلاس بھر کے ڈال دیں اور زیادہ سے زیادہ دس منٹ دس دے لیں۔ کھولیں گوشت اپنی چربی + آدھ پاؤ گھی میں بھونیں۔ پانی خشک گھی اوپر اور بھنائی میں بھی طویل وقت نہیں لگتا۔

پانچ دس منٹ بھنائی کے بعد گوشت کی شکل اور ذائقہ قابل دید لذیذ ترین ہو جاتا ہے اب اسی کو سرد کرنے سے پہلے باریک باریک انتہائی محنت سے کٹا ہوا دھنیا چھڑک کر اس کی استہنا میں اضافہ کریں اور اسے گہرے ڈونوں میں مت سرد کریں بلکہ کھلی گہری ڈشمنز خصوصاً "شیشے کی

بقیہ صفحہ نمبر 283

ہستیا

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیو شمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈاڑھی ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور
وجیہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح
محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے، آئے کت اور
وسامہ معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیو شمتی کی روح ہے لیکن معاویہ سبب اعصاب کا
مالک ہے اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دو سراٹریک جہاں تین بھائی جو اسٹیم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی مباحثہ تالی جان ہیں اور تین بچے، راجین، کیف اور فہمینہ
ہیں۔ راجین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملا بیٹیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ بیٹی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔
دو بیٹیاں، صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہ جہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا
ہے۔

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

باریہ احمد تیسرے بھائی کا انتقال کا ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔۔۔ خوش نصیب کو سب منٹوس سمجھتے ہیں، حسن کی وجہ سے وہ تک مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کمائی کا تیسرا ٹریک منفر اور ٹیسی ہیں۔ منفر امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفر اکی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی فحاشی اور بے حسی ہے۔ منفر چونک سی جاتی ہے۔

آنکھوں کی قسط

اور خوش نصیب بالکل ساکت سی ہو گئی۔

”میرا نونا نہ مانو یہ سب بابا جی کی کرامات کا نتیجہ ہے۔ مجھے پتا ہے تم اور تمہاری روشن امی بیروں فقیروں کو نہیں مانتیں لیکن ہمارے خاندان میں کئی سالوں سے بیروں فقیروں کی قدر کی جاتی ہے۔ ہم انہیں اللہ لوک مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ ہمیں ان ہی کے فضل سے عطا کرتا ہے۔“ فریحہ بولتی جا رہی تھی۔

”اللہ مہمانی۔“ خوش نصیب ایک دم ہوش میں آ کر بولی۔ ”بس قدر کنو ایمان سے تمہارے خاندان والوں کا۔ میں مانتی ہوں اس دنیا میں اللہ کے نیک بندے موجود ہیں لیکن ان ڈھونڈنے کی باہوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر جو میری روشن امی نے یہ بات سنی ہوتی تو ضرور تمہیں ایک زوردار تھپڑ لگائیں۔“

”اور اگر میری اماں نے ان کے پیر کے بارے میں تمہارے خیالات سن لیے تو وہ صرف ایک تھپڑ نہیں لگائیں“

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

گی۔ پاپوں سے جیل اتار لیں گی اور ایسی پٹائی کریں گی کہ ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ فریحہ بھی جذباتی ہو کر بولی۔

”آہا۔۔۔ جیسے تمہاری اماں میری پٹائی کریں گی اور میں تو تمہیں بخش دیتی گی؟۔۔۔ یاد رکھنا میں پتھر کا جواب اینٹ سے دینے کی قائل ہوں۔“ وہ بھی خوش نصیب تھی اور کبھی نہیں چوکتی تھی۔

فریحہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی اور اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ جانتی تھی کہ وہ رہی ہے تو بدلہ ضرور لے گی۔ سو دل میں ذرا سا سہم گئی پھر مصلحت آمیز لہجے میں بولی۔

”ایک تو تم کو غصہ بڑی جلدی آجاتا ہے۔“

”میرا غصہ نہیں کر رہی۔ لیکن مجھے واقعی حیرانی ہوتی ہے تم جیسے لوگ کیسے ان بابوں پر یقین کر لیتے ہو۔“

”ہم یقین کیسے نہ کریں۔ کوئی پریشانی کوئی مسئلہ ہو، ایک بار بابا جی کے پاس آکر عرض کرنے کی دیر ہوتی ہے۔ وہ تعویذ لکھ دیتے ہیں یا گندم، چینی، نمک وغیرہ دم کر کے دے دیتے ہیں۔ دنوں میں مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔“

”مسئلہ اس لیے حل ہو جاتا ہے کیونکہ تم لوگوں کا اعتقاد بہت مضبوط ہے۔ یقین کر دیکو اگر اللہ سے رکھو اور صرف اسی سے مانگو۔ تم دیکھنا کیسے تمہاری پریشانیاں تمہارے مسائل حل نہیں ہوتے۔“

”اگر ایسی ہی بات ہے تو صرف اللہ سے دعائیں کر کر کے تمہارے مسائل حل نہیں ہوتے۔“

اچانک سے فریحہ نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آج تک تمہیں ماہ نور اور تمہاری امی کو جو بھی پریشانیاں لاحق رہی ہیں۔ ان کے لیے تم لوگوں نے دعا مانگی ہی کی ہیں۔۔۔ وہ دعائیں قبول کیوں نہیں ہوئیں؟ اس لیے کیونکہ تم نے کسی نیک برگزیدہ بندے کو اللہ سے مانگنے کا وسیلہ نہیں بنایا۔“

”نیک بندوں سے صرف دعا کرائی جاسکتی ہے۔“ لیکن ہم مانگتے تو اللہ سے ہی ہیں۔“ منہ بنا کر بولی۔

”اور کیا پتا تمہیں پچھاننے کا سلیقہ ہی نہ آتا ہو۔“ فریحہ بھند تھی۔

”مجھے نہیں آتا جو کچھ لیکن کیا روشن امی اور نانی کو بھی نہیں آتا ہوگا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دونوں تو تہجد گزار بھی ہیں۔“

”میں شاید اپنی بات تمہیں سمجھا نہیں پا رہی۔ یہ بڑی لمبی بحث ہے۔ ہمارے امی ابو نے تو ہمیں بچپن سے اب تک یہی سکھایا ہے کہ اللہ سے بھی مانگنا ہے تو نیک بندوں کے ذریعے سے مانگو۔ ان کی برکت سے ہی اللہ ہمیں نوازتا ہے۔ لیکن تم نہیں سمجھو گی۔۔۔ میں ابو سے کہو، اگلی کسی دن تمہیں سمجھائیں۔“

”معاف کر دو مجھے۔ ایسی سمجھ اللہ تمہیں اور تمہارے خاندان والوں کو ہی مبارک کرے۔ خوش نصیب نے چیز کر کہا۔ فریحہ برا مان گئی۔

”نہیں تو نہ سہی۔۔۔ میں نے تو سوچا تھا اب تک زندگی میں تمہیں کچھ اچھا نہیں ملا تو کم سے کم تم اپنا مستقبل ہی محفوظ کر لو لیکن تم جیسے لوگ کبھی عقل سے کام نہیں لیتے خوش نصیب۔ جا رہی ہوں میں اور جبردار جواب دو بارہ ایک بھی لفظ تم نے ہمارے پیر صاحب کے بارے میں کہا۔ اماں تو پٹائی بعد میں کریں گی پہلے میں ہی تمہیں سیدھا کر دوں گی۔“ اس نے انگلی اٹھا کر ہتھی دی اور تن فن کرتی چلی گئی۔

خوش نصیب اس کی حرکت پر پہلے حیران ہوئی۔ پھر اسے آواز دے کر روکنے کی کوشش کی لیکن اگلے ہی پل اس کی بے نیازی عمو کر آئی اور اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہر جگہ کا پیر شاخا اور فضل منزل کی طرف پلٹ گئی۔

www.paksociety.com اس روز صبح بیدار ہوئی تو آسمان کے چہرے پر دھند کا عکس پھیلا تھا۔ یہ ڈوبتے ہوئے اکتوبر کے دن تھے اور درختوں کے پتے تازہ سردی کے بوجھ سے اپنے آپ میں سستے اور جھکتے تھے۔

مکان کے داخلی دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے معاویہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ طالب ماموں کے اس دو منزلہ چھوٹے سے گھر پر اترنے والی آج کی صبح ہمیشہ جتنی روشن ہرگز نہیں تھی۔ اس کا بوجھل دل مزید اداسی سے بھر گیا۔ حلق میں آنسوؤں کا کڑوا پن اترتا تو اس نے دو تین گہرے سانس لیے۔ آنسوؤں کو اپنے دل میں اتار اور خود کو جی بھر کر لٹاڑا۔ وہ یہاں آنسو بہانے نہیں آیا تھا۔ ان پیارے لوگوں سے ملنے آیا تھا جو سامہ سے وابستہ تھے۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے سے زیادہ ان کے دلوں کا بھاری پن اپنے کندھوں پر اٹھانے کا ارادہ کر کے نکلا تھا۔

لیکن عین اس وقت جب وہ دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بھی بجا چکا تھا۔ تو اسے اور اک ہوا وہ اتنا بہادر ہرگز نہیں تھا۔ کسی کے آنسو صاف کرنے کے لیے اپنے آنسو پینے پڑتے ہیں۔ صبر کی تلقین کرنے سے پہلے خود صبر کرنا پڑتا ہے۔ اس بے چارے سے تو اپنا ہی غم نہیں سنبھالا جا رہا تھا، کسی کو کیا دلا سادتا۔ اس کا دل چاہا وہ لپٹ جائے اور اس نے ایسا کیا بھی۔ آنکھ میں آنسو لے کر جوں ہی واپسی کے لیے پلٹا اسی وقت دروازہ کھل گیا۔

معاویہ کے پلٹتے قدم جیسے وہ لپٹنے جکڑ لیے تھے۔ آنسو اس کی آنکھ سے پھسل کر گال پر بہتے چلے گئے۔ آئے کت ششدر سی اسے دیکھے گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ ان دونوں کے دل زخمی تھے۔ وسامہ کی موت کا یہ ایسا تھا جو شاید کبھی مندمل نہ ہوتا۔ لیکن یکایک آئے کت کی آنکھوں میں سرد مری سی جاگ اٹھی۔ اس نے دروازے سے ہاتھ ہٹایا جو ایسی کا تھک گیا ہی تھا کہ عقب سے صاعقہ ممانی کی آواز سنائی دی۔

”کون سے آئے کت؟“ وہ پوچھنے کے ساتھ ساتھ اس کے پیچھے بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ معاویہ! ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ سرعیت سے آئے کت کے عقب سے نکلیں اور ننھے بچوں کی طرح معاویہ کو خود سے لپٹا لیا۔

”وسامہ بھی چلا گیا۔ تم نے بھی اتنا چھوڑ دیا۔“ وہ اسے اپنے بازوؤں میں سیٹھے بچوں کی طرح ہی سسک رہی تھیں۔

معاویہ بھی رونے لگا یہ دیکھے بنا کہ آئے کت اس پر ایک زہر خند مسکراہٹ اچھال کر واپس مڑ گئی۔ اس کے آنسوؤں کی یہی قدر بھی آئے کت کی نظر میں۔

”آؤ اندر آؤ۔ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ ممانی اسے اندر لے آئیں۔ وسامہ کی موت کے

تین مہینے بعد آیا تھا وہ تین صدیوں بعد نہیں کہ گھر کے اندر تک بلانے کے لیے اسے باقاعدہ دعوت دی جاتی۔ اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ بچپن کا بیشتر حصہ اس نے یہیں گزارا تھا۔ وسامہ کے ساتھ۔ طالب ماموں اور صاعقہ چچی کا بیٹا بن کر۔

لیکن اب وسامہ نہیں رہا تھا تو جیسے ہر چیز اس کے لیے اجنبی ہو گئی تھی۔ صاعقہ ممانی اسے لیے اندر آئیں۔ طالب ماموں نے وی کے سامنے چپ چاپ بیٹھے اس ٹاک شو میں دھیان لگانے کی کوشش کر رہے تھے جو اب تقریباً ختم ہونے والا تھا اور ماموں کا چہرہ صاف بتاتا تھا کہ ایک بھی لفظ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔

معاویہ آگے بڑھا اور چپ چاپ ان کے قدموں کے پاس بیٹھ کر اپنا سہرا ان کی گود میں رکھ دیا۔ طالب ماموں چونکے اور پھر ساکت سے ہو گئے۔ چند لمحے بعد انہوں نے اپنا کانٹا ہوا ہاتھ معاویہ کے سر پر رکھا۔ آہستہ سے جھکے اور اس کے بالوں پر ایک شفقت بھرا بوسہ دیا اور پھر اپنے آنسوؤں کو بننے سے روک نہیں سکے۔ بنا آواز دے چلے گئے۔

اسی وقت آئے کت اندر آئی۔ اس کے انداز میں سرد مہری تھی لیکن طالب ماموں کو روتا دیکھ کر آنکھوں میں غصہ بھر گیا۔

”اس سے اچھا تھا تم یہاں کبھی نہ آتے۔۔۔“ اس نے بنا اسے مخاطب کیے کہا۔ لہجہ پر تپش تھا۔ ”ان تین مہینوں میں ہمیں وسامہ کے بغیر رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ کچھ دن اور گزرتے تو سب تمہیں بھی بھول جاتے۔“

”اللہ نہ کرے۔۔۔ کیسی باتیں کر رہی ہو۔“ صاعقہ ممانی دہل کر بولیں۔

”ٹھیک ہے تو کہہ رہی ہوں۔۔۔ یہ نہ آتا یہاں۔۔۔ کم سے کم آپ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تو نہ آتے۔“ اس نے تلخی سے کہا تھا۔

”میں شرمندہ ہوں۔“ معاویہ نے کہا۔

”کیا فائدہ اس شرمندگی کا۔۔۔ وسامہ تو واپس نہیں آسکتا۔“ اس نے کڑوے لہجے میں کہا۔

”بھریں گے۔“ معاویہ پر ڈالی اور پلٹ کر سرعت سے باہر نکل گئی۔

کمرے میں موجود نفوس اس کی بات پر ساکت رہ گئے تھے۔ انہیں آئے کت کی بات کے اثر سے نکلنے میں چند سیکنڈ لگے۔ پھر صاعقہ ممانی نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا تو وہ چونکا۔

”مجھے ہوک لگی ہے۔“ اس نے کسی بچے کی معصومیت سے کہا۔ ممانی مسکرائیں۔

”دم فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“

وہ اٹھا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔



فضل منزل میں داخل ہوتے ہی اس کی منڈ بھیر شامیر سے ہو گئی۔

شام کا قہقہہ رنگ رات کی سیاہی میں گھلنے لگا تھا اور مسجدوں سے مغرب کی اذان کی صدا آہیں سنائی دینے لگی تھیں۔ سیاہ پڑتے آسمان پر سب ہی پرندے اپنی آخری اڑان میں بھر رہے تھے۔

خوش نصیب دے قدموں اور احتیاط سے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اتنی دیر سے واپس آنے پر ڈانٹ تو پڑنی ہی تھی (دیر سے واپس آنے پر نہ پڑتی تو کسی اور بات پر پڑ جاتی۔ اسے ڈانٹنے اور کونے کے لیے اب گھر والوں کو کسی بہانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ خوش نصیب کو یقین تھا جب کسی کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں

ہوتا تو وہ اسے ڈانٹنا شروع کر دیتا ہے کہ چلو تھوڑی دیر کے لیے ٹائم ہی پاس ہو جائے گا۔ یوں ڈانٹ ڈیٹ اور کونے

معمول کی بات تھی جو وہ بچپن سے سنتی آرہی تھی اور جیسی اس کی حرکتیں تھیں، کوئی بھی مستقبل کی پیش گوئی کرنے والا بتا سکتا تھا کہ اگلے کئی سال بھی اس کے ساتھ یہی ہوگا) ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ دیر سے گھر واپس

آنے پر اسے ڈانٹ پڑ سکتی تھی۔ لیکن کیا پتا آج کوئی معجزہ ہو جائے اور وہ ڈانٹ کھانے سے بچ جائے۔ اس نے

بڑی رجائیت سے سوچا۔ کبھی ایسی رجائیت پسندی کا مظاہرہ بھی کر سکتی تھی۔

لیکن جو اسے بڑا دروازہ عبور کر کے اندر داخل ہوئی۔ شامیر اسے اجاڑے میں چھل قدمی کرتا ہوا نظر آ گیا۔ وہ

کوئی کتاب لکھ رہا تھا اور اس کا نسخہ مخالف سمت میں تھا۔ خوش نصیب نے موقع غنیمت جانا اور دو بے قدموں وہیں سے بغلی گلی کا راستہ اختیار کیا جہاں سے بنا شامیر کی نظر میں آئے وہ اوپری منزل تک جا سکتی تھی۔ اسی وقت شامیر پلٹا اور خوش نصیب کو دیکھ کر اس کے لب مسکرائے۔

لیکن اگلے پل وہ کھٹکا۔ خوش نصیب کی گریہ پائی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے چند لمحے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی پھر زور سے گلا کھنکھار کر اسے متوجہ کیا۔ خوش نصیب اس آواز پر یوں بدک کر پلٹی جیسے بے دھیالی میں بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

”ہیلو۔“ شامیر خوب صورتی سے مسکرایا۔

خوش نصیب نے سر کے اشارے سے اس کے ہیلو کا جواب دیا۔ اپنے ہونق تاثرات چھپانے کی تمک دو دو میں اور بھی ہونق لگنے لگی تھی۔

”گڈ آفٹرنون!“ وہ بات کرنا چاہتا تھا۔

خوش نصیب نے پھر سے سر کو خفیف سا جھکا دیا اور دانتوں کو یوں مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمایا کہ غلطی سے بھی نہ کھلیں۔ شامیر اس کے تاثرات سے تھوڑا سٹپٹا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

”آئیے جائے پیس گی آپ؟“

خوش نصیب نے اب غور کیا۔ وہیں برآمدے کی میز پر چائے کے برتن بڑے تھے اور یہ وہ ٹی سیٹ تھا جو فضیلہ اپنی خاص الخاص مہمانوں کی آمد پر ہی نکالتی تھیں۔ ایک بار خوش نصیب کو کسی بات پر اتنا غصہ آیا تھا کہ اس نے اس ٹی سیٹ کی ایک ساسر نکال کر چھپا دی تھی۔ کئی دن تک وہ دل ہی دل میں پلان بناتی رہی کہ اس ساسر کو کس طرح توڑا جائے۔ سب سے بہترین طریقہ جو اس کی سمجھ میں آیا وہ یہی تھا کہ ساسر کو چھت پر لے جا کر اینٹ مار کر توڑ دیا جائے۔ اس سے اس کے جذبات کو بھی سکون ملتا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے کئی پلان بنائے لیکن کبھی بھی پلان پر عمل در آمد نہیں کیا جاسکا کیونکہ خوش نصیب ہمیشہ سے پلان بنانے میں ماہر رہی تھی ان پر عمل در آمد کرنے میں نہیں۔

ابھی بھی ٹی سیٹ دیکھ کر اسے وہ پھیلا واقعہ یاد آ رہا تھا اور پھیلے سارے زخم ہرے ہو گئے۔ وہ برتنوں کو دیکھ کر ذرا تپس رہی تھی اور شامیر بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”آپ اگر میرا ساتھ دین گی تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”شکریہ... میں چائے نہیں پی۔“ بے ساختگی میں بولا گیا جملہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ سارے زخم ہرے ہو گئے۔ کیوں کہ عین اسی وقت فضیلہ چچی اور صیام کی انٹری ہوئی تھی اور فضیلہ چچی نے خوش نصیب کو دیکھتے ہی بڑا برا سامنہ بھی بنایا تھا۔

”خوش نصیب چائے نہیں پیتی۔“ صیام نے جلدی سے کہا۔

”کیا واقعی؟“ شامیر نے اسے دیکھا۔

اسی پل خوش نصیب کی انتہائی حس جاگ اٹھی۔ وہ ہونٹ پھیلا کر مسکرائی اور خوش اخلاقی کی حد پار کرتے ہوئے بولی۔

”چائے نہیں پیتی تو کیا ہوا؟ مہمان کو انکار تو نہیں کیا جا سکتا نا۔“ جہاں اس کی مسکراہٹ نے شامیر کے دل کو چھو اور وہیں فضیلہ چچی اور صیام کی مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔ اس سے قبل کہ فضیلہ چچی اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں قتل کرتیں خوش نصیب بڑے اعتماد سے آگے بڑھی اور کرسی گھسیٹ کر شامیر کے مد مقابل بیٹھ گئی۔

خدا بعض اوقات انسان سے وہ کام بھی کرا لیتی ہے جنہیں نہ کرنے کا وہ تہیہ کر چکا ہوتا ہے۔
 ”صیام! ایک کپ میرے لیے بھی بنا دینا، پلینز۔“ بڑا مسکرا کر کہا۔ صیام کے پاس دانت پینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن شامیر کی موجودگی میں یہ نہیں کیا جاسکتا تھا سو اس نے مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق کپ میں چائے انڈیلنا شروع کی۔

دوسری طرف شامیر بچہ نہیں تھا کہ فریقین کے درمیان موجود کھینچا تانی کو سمجھ نہ سکے۔ صیام، فضل منزل کی بیوی کو عین تھی اور خوش نصیب۔ وہ کیا تھی؟ اب تک شامیر فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ لیکن ہاں جب بھی وہ سامنے آتی شامیر مسکرانے لگتا تھا۔ خود کو بیٹھے خان سمجھنے والی یہ لڑکی دل میں گدگدی سی کرتی تھی۔
 اور ایسی لڑکیاں ہمیشہ اس جیسے لڑکوں کو بڑا متاثر کرتی ہیں۔ جو آسانی سے بات کرنے پر راضی نہ ہوں۔ جب دیکھیں تو چیلنج کرتی ہوئی محسوس ہوں۔ اس کے مقابلے میں صیام تو بڑی عام سی لڑکی تھی۔ خزاں کے موسم میں سوکھے پتے کی طرح جھاڑ سے ٹوٹ کر گود میں آگرنے والی لڑکی۔

فضیلہ، چچی سے جب کچھ نہ بن پڑا تو وہیں بیٹھ رہیں۔
 خوش نصیب بھول گئی تھی کہ شامیر کو انور کرنے کا عہد کر چکی ہے اس وقت اس نے ساری جوانی اخلاقی اور زمانے بھر کے موضوعات پر گفتگو کرنے کا تہیہ کر ڈالا اور پھر جب بولنا شروع ہوئی تو اسے چپ کرانا مشکل ہو گیا۔
 اور یوں ایک دھلتی ہوئی شام خوش نصیب کے انتقام کی پہلی قسط کی نذر ہو گئی۔

کمرے کے دروازے پر دن ختم سا گیا۔ اس گھر میں جگہ جگہ وسامہ کی یادیں بکھری ہوئی تھیں اور ان یادوں سے پیچھا چھڑانا ناممکن تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا دل مضبوط کیا اور ہنڈل گھما کر کمرے میں داخل ہو گیا۔
 کمرے میں دن کا اجالا نیم تاریکی کی شکل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ معاویہ نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو صبح کی چمکیلی روشنی جھانگ لگا کر اندر آئی اور سب طرف پھیل گئی۔ یہ طالع ماموں کے گھر میں اس کا اور وسامہ کا گھر تھا۔ ان دونوں کے منگول بچے ساتھ ساتھ تھے۔ درمیان کی چھوٹی بچائی پر اب بھی وہی ٹیبل لیپ رکھا تھا جو وسامہ کے زیر استعمال رہا تھا۔ اس کی اسٹون ٹیبل اس کی کرسی اس کی لمبا رہی۔

معاویہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنی سسکیاں روک رہا تھا۔ کتنی ہی یادیں ماضی کی کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ اس سے قبل کہ وہ زمین پر بیٹھ جانا اور آنسوؤں کو ہسہ جانے دیتا کمرے کا دروازہ کھلا۔ معاویہ نے جھٹکے سے گردن موڑ کر دیکھا۔ آئے کت اپنی جھونک میں اندر داخل ہو رہی تھی۔ جوں ہی اس کی نظر معاویہ پر پڑی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”یہ میرا کمرہ ہے۔“ وہ اس سے نظر س ملانے بغیر بولا۔

”یہ وسامہ کا کمرہ تھا۔“ غصے سے کہا گیا۔

”ہم دونوں کا تھا۔“ وہ پھر تحمل سے بولا۔

”تھا۔ اب نہیں ہے۔“ سختی کچھ اور بڑھ گئی۔ ”اس گھر پر اس کمرے پر وسامہ سے وابستہ کسی بھی چیز اور فرد

پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔“ اس نے ایک ایک لفظ جیا کر ادا کیا تھا۔

معاویہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھا اور اناری کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن اس سے پہلے کہ کھولتا

آئے کت نے ساری کے پٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”ہٹو سامنے سے۔“ وہ ذرا جھنجھلا کر بولا۔ ”یہ میرے بھائی کا کمرہ ہے اور تم مجھے یہاں کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے نہیں روک سکتیں۔“

”یہ تمہارے بھائی کا کمرہ تھا۔ اب یہ میرا کمرہ ہے۔“ وہ دانت کچکچا کر بولی۔
 ”اور اب یہ میرا بھائی میرا بھائی کرنا بند کرو۔ اب تو وہ بے چارہ اس دنیا میں بھی نہیں رہا۔ آخر کب تک یہ محبت کا ڈھونگ رچانے رہو گے۔“ اس نے جتنی نفرت سے کہا تھا اتنی ہی تیزی سے معاویہ کے ماتھے پر پڑے بلوں میں اضافہ ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھیج گئی تھیں۔ عین ممکن تھا اگر آئے کت عورت نہ ہوتی تو اب تک وہ ایک بیچ مار کر اس کے دو تین دانت تو ضرور توڑ دیتا۔
 ”تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی۔“ اس نے تقریباً ”غرا کر کہا تھا۔

”میرے سامنے اونچی آواز میں بات مت کرنا معاویہ! تمہاری اصلیت میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اس نے معاویہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بنا ڈرے کہا تھا۔ آئے کت کا اعتنا معاویہ کی آنکھوں میں ہر اس بن کر پھیل گیا۔

یگانیک ان دونوں کے ارد گرد سے ہر منظر غائب ہونے لگا اور کھڑکیاں دروازے سب اڑن چھو ہو گئے اور ان دونوں نے خود کو فلک بوس میں کھڑے پایا۔ وہی اسرار جو دھند کی مانند رگ دیے میں اترتا تھا اس وقت معاویہ کے خون میں بوڑھے لگا۔

”معاویہ! معاویہ!“ اس نے اپنی آواز ان دونوں کو فلک بوس سے کھینچ لائی۔ ان دونوں نے ہی جیسے اس لمحے کسی راز کی باج داری کی تھی کہ اپنے اپنے تاثرات بدل لیے تھے۔
 ”معاویہ! کھانا کھا لو۔“ آواز دوبارہ آئی۔

”آ رہا ہوں۔“ اس نے اونچی آواز میں جواب دیا اور ایک تیز نظر آئے کت پر ڈالی اور انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں بولا۔

”میری اصلیت کی بات دوبارہ مت کرنا۔ تمہارا اصلی چہرہ تو میں سب کو دکھاؤں گا۔“ آئے کت نے زہر خند نظر ڈالی کر رخ بدل لیا تھا۔



رات کو سونے لیٹی تو گزری بات یاد کر کے خوش نصیب کو برا مزہ آیا۔ وہ خود بخود مسکرا رہی تھی بلکہ باقاعدہ ہنس رہی تھی۔

”تمہیں ہوا کیا ہے؟“ ماہ نور نے چڑ کر پوچھا۔
 ”صیام اور فضیلہ چچی کی شکل دیکھنے والی تھی۔“ اس نے ہتھیلی سے تالی بھائی اور خوب تمقہ لگا کر بولی۔
 ”اب کیا نیا کارنامہ کر آئی ہو؟“ ماہ نور اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔
 خوش نصیب کو ہمہ وقت کوئی نہ کوئی سامع درکار ہوتا تھا۔ منٹوں میں ساری روداد کہہ سنائی۔

ماہ نور نے ساری بات غور سے سنی اور زیر لب مسکراتی رہی۔
 ”اب دیکھنا۔ اس پر بھی فضیلہ چچی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔“ اس نے مسکرا کر پیش گوئی کی تھی۔
 ”نہیں! اور آتا ہی کیا ہے۔“ وہ لا روائی سے بولی۔

ماہ نور کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ”لیکن محتاط رہا کرو خوش نصیب! ان لوگوں کو ناراض کر کے ہم بھی اطمینان

www.paksociety.com
 نہیں رہ سکتے۔“
 ”نہیں ہم رہ لیں گے۔ مطمئن اور خوش رہنے کا ایک نیا طریقہ پتا چلا ہے مجھے۔“ وہ لحاف جھاڑتے ہوئے بولی۔ ”سنا ہے بڑا کارآمد ہے۔“
 ”کون سا طریقہ؟“ ماہ نور کون سا متحس ہو کر بولی۔ خوش نصیب کی ہر نئی بات اسے کسی نئے اندیشے میں مبتلا کر دیتی تھی۔

”وہ فریج ہے ناں۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی پیر صاحب سے تعویذ لے لو۔ سارے مسئلے حل ہو جائیں گی۔“
 ”اب تم اس نئے جینجھٹ میں مت پڑ جانا۔“
 ”لو جینجھٹ کیسا؟“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔ ”سارا زمانہ تعویذ لیتا ہے۔ ہم بھی لے لیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔“

”ہمیں کیا پتا وہ پیر صاحب جو تعویذ لکھ کر دیں گے اس کے اندر کیا لکھا ہوگا۔“ ماہ نور نے کہا۔
 ”ہاں تو تعویذ لیں گے تو پتا چلے گا نا۔“

”تم رہنے دو۔۔۔“ اس نے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ لہرایا۔
 ”ایک بار تو میں ضرور لوں گی۔“ وہ ماہ نور کو چڑانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ ”سنا ہے بڑے کارآمد ہوتے ہیں ایسے تعویذ۔ دشمن کا دل فوراً نرم ہو جاتا ہے اور پتھر سے پتھر دل محبوب بھی موم بن جاتا ہے۔“
 ”میں صبح روشن امی کو بتاؤں گی۔“
 ”ایک تو میری کامیابی کے راستے میں تم سب سے بڑی رکاوٹ ہو۔“ خوش نصیب نے چڑ کر کہا۔ ”جب کوئی بہادری کا کام کرنے کا سوچوں تم جاکر مخبری کر دیا کرو۔“
 ”تم اٹنے کام سوچتی ہی کیوں ہو؟“

”کیونکہ مجھ سے سیدھے سیدھے کام سوچے ہی نہیں جاتے۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”اب یہی دیکھ لو۔ شام سے دل چل رہا ہے کہ پیر صاحب کے آستانے پر جا کر حاضری دوں اور دو چار تیر ہدف تعویذ لکھوا کر لاؤں پھر انہیں فضیلہ چچی کے پورشن کی وہلینز میں چھپا دوں۔“ وہ آنکھیں گھما گھما کر ماہ نور کا خون خشک کر رہی تھی۔
 ”اور اس سے ہو گا کیا؟“

”وہی ہو گا جو فضیلہ چچی کے چھپائے ہوئے تعویذوں سے ہوتا ہے۔ یعنی سب ہمارے اثر میں آجائیں گے اور سارے خاندان میں ہماری بات چھی ایسے ہی مانی جانے لگے گی جیسے فضیلہ چچی کی مانی جاتی ہے۔ تم مانویا نہ مانو، ماہ نور! کوئی نہ کوئی کراہت تو ہوتی ہے ان تعویذوں کی۔۔۔ ایسے ہی تو سارا خاندان نہیں ڈرنا فضیلہ چچی سے۔“
 ”تو تم کیا چاہتی ہو؟ سب تم سے بھی ڈریں؟ ایسا مرتبہ کس کام کا خوش نصیب! جو صرف آپ کو آپ کے ڈر کی وجہ سے دیا جائے۔ ایسی عزت کا کیا کرنا کسی کو۔“ وہ نرمی سے بول رہی تھی۔ ”عزت ہو تو عرفات ماموں جیسی ہو۔۔۔ دل خود بخود ان کی طرف مائل ہو۔۔۔ یہ نہیں کہ کوئی ڈر خوف ان کے پاس جا کر بیٹھنے باتیں کرنے پر مجبور کر دے۔“

”بات تو صحیح ہے۔“ وہ سوپنے لگی پھر ایک دم کوئی خیال آیا تو بولی۔

”ماہ نور! یہ شامیر تمہیں کیسا لگا؟“

”یہ کیسا بے تکا سوال ہے؟“ ماہ نور بنے گھور کر اسے دیکھا۔

”نہم بتاؤ تو۔“ وہ بھند ہوئی۔

”ٹھیک ہے۔ اچھا ہے، میرا مطلب یہ ہے۔“ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ ”ارے یار! میں نے اسے اتنے غور سے دیکھا ہی نہیں ہے کہ بتاؤں کیسا ہے۔ ویسے بھی فضیلہ چچی اسے اپنے پروں سے باہر نکلنے دیں گی تو بتا چلے گا کیسا ہے۔“ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

”چار دن ہو گئے ہیں اسے آئے ہوئے۔ ہر وقت یا تو صیام اس کے ساتھ چکی بیٹھی ہوتی ہے یا فضیلہ چچی اس پر سپردے رہی ہوتی ہیں۔“

”پھر تو دینا ہی پڑے گا۔ صیام کے بجائے اگر اس نے کسی اور کو پسند کر لیا تو۔۔۔؟“ خوش نصیب مزہ لے کر بولی پھر ایک دم سے کچھ خیال آیا تو بولی۔

”ماہ نور! کتنا مزہ آئے۔ اگر واقعی شامیر صیام کے بجائے کسی اور کو پسند کر لے۔“

”اچھا۔ مثلاً“ کسے؟“ وہ بھی ذرا دلچسپی لے کر بولی۔

”مثلاً“ تمہیں۔۔۔ یا مجھے۔“ اس کے لہجے میں ذرا بھی سنجیدگی نہیں تھی۔

”اللہ نہ کرے۔“ ماہ نور وہل کر بولی۔ ”ایسا ہوا تو فضیلہ چچی کو ہم سب کے سر پر ایک اور طوفان اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔“

”ارے ایسے کئی طوفان آئے اور گئے۔ یہاں پروا کسے ہے؟“ وہ حسب سابق لا پرواہی سے بولی رہی۔

”نہیں خوش نصیب! ایسا سوچنا بھی مت۔“ ماہ نور فوراً ”ہی سنجیدہ ہو گئی۔“ ”میرا دل چاہتا ہے روٹن ابی اور تالی اب ہر پریشانی سے دور رہیں۔ اور اگر خدا انخواستہ شامیر نے ہم دونوں میں سے کسی کا نام بھی لیا تو ان کے لیے ایک نیا ختم ہونے والی پریشانی کا آغاز ہو جائے گا۔ بلکہ اچھا ہوا۔“ نے یہ بات کہہ دی۔ مجھے تو اب تک ایسا کوئی خیال بھی نہیں آیا تھا۔

خوش نصیب چونکہ اس کی کسی بات سے متفق نہیں تھی سو بڑے بڑے منہ بنا کر اس کی بات سن رہی تھی۔ اس کے چپ ہوتے ہی بولی۔

”ہاں اور اصل تم میرے جیسی ذہین نہیں ہوتا۔ اس لیے تمہیں ایسا کوئی خیال نہیں آیا۔“ اس نے کروٹ لی اور سر تک لحاف تان لیا۔

ماہ نور اس کی بے ساختگی پر اپنی مسکراہٹ چھپا نہیں پائی۔ ایک چپت اس کے کندھے پر لگائی اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

دوسری طرف لحاف کے اندر گو کہ خوش نصیب کی آنکھیں بند تھیں لیکن سونے سے پہلے داغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اور ہر غلط کام کا آغاز کرتے ہوئے اس کا داغ ایسے ہی تیزی سے کام کرنے لگتا تھا۔



معاویہ بدلتی سے کھا رہا تھا اور صاعقہ ممانی خاموشی سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔

”بہت کمزور ہو گئے ہو۔ کھانا نہیں کھاتے کیا؟“ فکر مندی سے پوچھا۔

معاویہ ایک دم کھاتے کھاتے رکا۔ اس کا دل چاہا انہیں بتائے کہ اسے کھانے سے رغبت نہیں رہی۔

”بابا کاگک آپ کے جیسا اچھا کھانا نہیں پکا نا۔۔۔ میں سوچ رہا ہوں کچھ دن کے لیے اسے آپ کے پاس بھیج دوں۔۔۔ دو چار اچھے کھانے ہی پکا نا سکھائیں اسے۔“ صرف انہیں دکھانے کو وہ اب جلدی جلدی کھانے لگا تھا۔

”یہ چکن بہت اچھی بنی ہے۔۔۔ آپ شام میں میرے لیے امپہٹنٹی بنا دیں گی؟ آپ جیسی اچھی امپہٹنٹی

www.paksociety.com کوئی نہیں بنا سکتا۔ اٹلی کا کوئی ماہر شیفٹ بھی نہیں۔“
صاعقہ ممانی اداسی سے مسکرائیں۔

”تمہاری یہ عادت بالکل وسامہ جیسی ہے۔ وہ بھی مجھے خوش کرنے کے لیے ایسے ہی میری جھوٹی تعریفیں کیا کرتا تھا۔“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ آپ واقعی۔“

”وسامہ بہت ناراض تھا، ہم نے ناراض ہی دنیا سے چلا گیا۔“ یکا یک وہ رونے لگیں۔ معاویہ نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”وہ ناراض نہیں تھا۔“
”اگر ناراض نہیں تھا تو گھر واپس کیوں نہیں آیا؟“

”اے تو ماموں نے گھر سے نکالا تھا۔ آپ سے ناراض ہونے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ۔“
”آجاتا۔ باپ کے پیروں میں گر جاتا۔ وہ معاف کر ہی دیتے۔ آئے کت کو بھی تو اب کیسے سینے سے لگا کر

رکھا ہے۔“
وہ دکھی تھیں، ٹالاں تھیں اور اس لیے بھی زیادہ پچھتا رہی تھیں کہ اب جتنی مرضی کو شش کرتیں۔ وسامہ کو واپس نہیں لا سکتی تھیں۔ موت وہ آخری حد ہے جس سے گزر جانے کے بعد کسی کے واپس آنے کی توقع ہی باہل پن ہے۔

معاویہ کے تاثرات ایک دم سے سخت ہو گئے۔ اس نے ممانی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔
”اس سارے فساد کی جڑ ہی آئے کت تھی۔ نہ وہ وسامہ کی زندگی میں آئی۔ نہ ماموں وسامہ کو گھر سے نکالتے نہ اسے فلک بوس جا کر رہنا پڑتا اور نہ۔“ ایک دم غصے سے بولتا ہوا وہ چپ ہو گیا۔ صرف شک کی بنیاد پر وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

”اور نہ؟“ ممانی اس کے لفظوں میں الجھ گئی تھیں۔
”کچھ نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”یہ سب ایسے ہی ہونا تھا ممانی! یاد ہے بچپن میں آپ نے ہی مجھے قسمت کا فلسفہ سمجھایا تھا۔“
انہوں نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ معاویہ نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔ چند منٹ بعد صاعقہ ممانی کی حالت سنبھلی تو بولیں۔

”معاف کرنا۔ میں تمہیں بتانا بھول گئی۔ وہ کمرہ اب آئے کت کے زیر استعمال ہے۔“
”کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ کو وہ کمرہ اسے نہیں دینا چاہیے تھا۔“ معاویہ نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔
”وسامہ چلا گیا لیکن مجھے تو واپس آنا ہی تھا۔“

”اس نے بہت منت سے کہا تھا معاویہ! میں انکار نہیں کر سکی۔“
معاویہ نے غور سے ان کی بات سنی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
”ہاں وہ منت سے ہی کہتی ہے۔“ اس نے زیر لب کہا اور رغبت سے کھانا کھانے لگا۔



صبح وہ دیر سے اٹھی۔ تھوڑی دیر چھت پر پھرتی ادھر ادھر کے گھروں میں جھانکتی رہی۔ پھر نیچے آئی تو شامیر کچن ٹیبل پر بیٹھا ناشتہ کرنے میں مشغول تھا۔ ساتھ ساتھ اخبار پڑھ رہا تھا۔

www.paksociety.com
 ماہ نور چولہے کے پانس گھڑی بد تیزی کی حد تک سنجیدہ شکل بنائے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کر چکی تھی۔

شامیر خوش نصیب کو دیکھ کر حسب عادت مسکرایا اور ساتھ ناشتے کی دعوت دی۔
 ”کیا وجہ ہے کہ ہمارے کھانے کے اوقات اکثر ہی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں؟“
 ”محض اتفاق ہے۔ کوئی خاص وجہ نہیں۔“ اس نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔ اپنا آئیٹھ پر اٹھے میں رول کرتے ہوئے ماہ نور کو آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا اور شامیر کو بڑی طرح نظر انداز کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔
 شامیر نے زیر لب مسکراتے ہوئے آنکھیں سکیڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی دلچسپ تھی۔ اس نے سوچا اور یونہی گردن موڑتے ہوئے ماہ نور پر نظر پڑی تو وہ بغور اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ شامیر چونکا۔ ماہ نور نے سپٹا کر نظریں پھیر لیں اور جلدی جلدی سبزی کاٹنے لگی۔

”یہ آپ کی بہن!۔۔۔ سب کو ہی ایسے اگنور کرنے کی عادی ہیں یا یہ رویہ بطور خاص میرے لیے ہے؟“
 ماہ نور کو بے حد شرمندگی ہوئی۔ پتا نہیں یہ خوش نصیب ہمیشہ شرمندہ کرنے والے کام ہی کیوں کرتی تھی۔
 اور وہ بھی کیسا منہ پھٹا تھا۔ سیدھا منہ پر ہی سوال دے مارا۔ یہ نہیں کہ انسان مروتا ہی نظر انداز کر دے۔
 ”جیسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ آپ کو غلط قسمی ہوئی ہوگی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔
 ”میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں ماہ نور بی بی کہ روپوں کو محسوس نہ کر سکوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔
 ”لیکن خیر۔۔۔ آپ کہہ رہی ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔۔۔ خوب صورت چہرے ویسے بھی جھوٹ کے فن میں طاق نہیں ہوتے۔“ اس نے سادگی سے کہا ”خبر جھاڑا اور شہ سڑخیوں میں کم ہو گیا۔“
 ماہ نور بے چاری ہنر بلاسٹ کے عالم میں پیاز کے ساتھ ساتھ اپنی انگلی بھی کاٹ بیٹھی۔



کھانا کھا کر معاویہ اس کمرے میں آ گیا جو صاعقہ ممانی نے اس کے لیے تیار کیا تھا۔
 وہ تھکا ہوا تھا اور وزن پر بوجھ بھی تھا اسی لیے فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ لیکن نیند ابھی آنکھوں کی دہلیز پر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کروٹیں بدل کر تھک گیا۔ تو یہ کوشش ہی ترک کر دی اور چت لیٹ کر بھت پر گول گول گھومتے پٹھے کو دیکھنے لگا۔ منو آم بدل گیا تھا۔ اب پٹکھا جانے سے خنک رہتی تھی لیکن معاویہ کو اس موسم کی عادت نہیں تھی۔ وہ آسانشات کا عادی تھا جو اس گھر میں ہرگز اسے میسر نہیں آ سکتی تھیں۔
 جہاں اسے آسانشات ملتی تھیں وہ اس کے باپ کا گھر تھا اور جو چیز باپ کے گھر میں نہیں ملتی تھی وہ وہی سکون تھا۔ اسی ذہنی سکون اور محبتوں بھری فضا کی تلاش اسے اس گھر میں کھینچ لاتی تھی۔ لیکن اب یہاں بھی سکون نہیں تھا۔

دسامہ نہیں تھا تو جیسے کچھ بھی نہیں تھا۔

پٹکھا ست روئی سے چل رہا تھا۔ صاعقہ ممانی اس کی عادات سے واقف تھیں۔ اسی لیے پٹکھا کھول گئی تھیں، انہیں پتا تھا اس کے بغیر وہ سونے نہیں پائے گا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں پٹکھا چلا کر بھی اسے نیند نہیں آئے گی۔
 جب پٹھے کو دیکھ کر بھی وہ تھک گیا تو اس نے کروٹ بدل لی۔ مزید کچھ دیر کی تک دو دو کے بعد بالآخر اسے نیند آ گئی۔ کئی گھنٹے سونے کے بعد اس کی آنکھیں اپنے سیل فون کی مدد ہم پ سے کھلی تھیں۔ اس نے آنکھیں مسل کر سر ہانے دائیں بائیں ہاتھ مار کر موبائل فون تلاش کیا۔ نیند گھری آنکھوں سے نمبر ٹیک کیا۔ اسکرین پر اجوا نمبر

چمک رہا تھا وہ بابا کا تھا۔ معاویہ نے بیزارگی سے منہ بنایا لیکن بابا کی کال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے مرنا کیانہ کرنا کے مصداق اس نے فون اٹھایا۔

”السلام علیکم بابا!“

”تم کہاں غائب ہو؟“ اس کے سلام کا جواب دے بنا انہوں نے رکھائی سے پوچھا اور اتنی رکھائی کو وہ ان کا حق سمجھتا تھا۔ انہیں بنا اطلاع دیے آگیا تھا اور ایسا کر کے بلاشبہ اس نے ان کی ناراضی میں اضافہ کیا تھا۔

”میں ماموں کے پاس آگیا ہوں۔۔۔“ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”مجھے کچھ دن یہیں رہنے دیں۔“ وہ التجا کر رہا تھا۔

”تم لاہور میں ہو؟“ انہیں سن کر اچنبھا ہوا۔ ”اور تم نے وہاں جانے کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔“ اب ان کی آواز میں درشتی تھی۔

”میں پہلے بھی یہاں آتا تھا۔۔۔ کوئی پہلی بار نہیں آیا کہ آپ سے اجازت لیتا۔“

”پہلے کی بات اور تھی۔۔۔ اس وقت و سامہ تھا وہاں۔۔۔“

”اب ماموں ہیں سمجھائی ہیں اور۔۔۔ اور آئے کت ہے۔“

”اس کا نام نہ لو میرے سامنے۔“ انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔ ”وہ کرپٹ لڑکی مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔۔۔ بہتر ہوگا تم جلد از جلد۔۔۔“

معاویہ نے فون کٹ دیا اور سرہانے ڈال ڈالا۔ بابا جب بھی آئے کت کو برا بھلا کہتے تھے۔ معاویہ جب ہو جاتا تھا اسے ذرا اچھا لگتا تھا نہ برا۔ لیکن اس وقت اس سے سنا نہیں گیا تو اس نے بابا کے رد عمل کی پروا نہ کی۔ کال کٹ دی۔

دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اس نے آنکھیں مسلتے ہوئے سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کتنی دیر تک سو رہا ہے تب ہی کھڑکی کے باہر مائل زور سے گرجے تو وہ چونک گیا اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ پردہ ہٹایا تو آسمان گہرے کالے بادلوں کی زد میں تھا اور بارش تڑا تڑا برس رہی تھی۔ معاویہ نے نوال کلاک ٹیس ٹائم دیکھا۔ شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے ابھی۔ اور باہر دیکھو تو لگتا تھا رات بس زمین پر اترنے کو ہے۔ اس نے پردہ ہٹا لیا اور کمرے سے باہر آگیا۔

تھکن میں بارش خوب زور شور سے برس رہی تھی۔ اور سارے گھر میں پکوریوں کی خوشبو پھیلی تھی۔

معاویہ سیدھا کچن میں آگیا۔ صاعقہ ممانی پکوری سے تپ رہی تھیں۔ جوں ہی وہ کچن میں داخل ہوا اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

”میں بس تمہیں جگانے ہی آرہی تھی۔“

”آپ کے پکوریوں کی خوشبو نے جگا دیا۔“ وہ پاس آیا اور پلیٹ سے اٹھا کر پکوری کھانے لگا۔ ”ساتھ چائے بھی مل جائے تو کیا بات ہے۔“

”بیٹھو۔ میں بنا رہی ہوں۔“

وہ پکوریوں کی پلیٹ اور راستہ لے کر کچن نیبل پر بیٹھ گیا اور مزے سے کھانے لگا۔ یکایک اسے احساس ہوا کھانے سے بے رغبتی کی ایک وجہ واقعی یہ بھی تھی کہ بابا کے خانساماں کے ہاتھ میں صاعقہ ممانی کے ہاتھ والا ذائقہ ہی نہیں تھا۔

”ناسیوں کہاں ہیں؟“

”عصر کی نماز پڑھتے مسجد گئے تھے۔ اب میرا خیال ہے بارش کے رکنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”اور۔۔۔ آئے کت کہاں ہے؟“ وہ پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں پوچھ بیٹھا۔
 ”ہمیں کہیں ہوگی۔۔۔ وہ کہاں جائے گی۔“ وہ گہری دکھ بھری سانس بھر کر بولیں۔ ”بڑی مشکل سے اس نے اس
 حقیقت کو قبول کیا ہے کہ وسامہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ مجھے افسوس ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ ہم اس لڑکی کو
 پہچان کیوں نہیں سکے۔ آئے کت تو بہت اچھی ہے معاویہ! وسامہ سے بہت محبت تھی اسے۔“ وہ بڑے دکھ سے
 بول رہی تھیں۔

معاویہ معاویہ کو بچپن کے دروازے سے باہر زرافا صلے پر برآمدے میں کھڑی نظر آگئی۔ اسکن کھر کے سادہ سوٹ
 پر اس نے کالی چادر اس طرح اوڑھی ہوئی تھی جیسے خود کو چھپانا چاہتی ہو۔
 معاویہ بلاوجہ اسے دیکھتا چلا گیا۔

”میرا خیال تھا یہ اپنی ماما کے پاس چلی گئی ہوگی۔“ اچانک اس نے کہا۔
 ”تمہیں نہیں پتا۔ آئے کت کی ماں کا تو چند مہینے پہلے ایک روڈ ایکسپڈنٹ میں انتقال ہو چکا ہے۔“
 معاویہ نے حیرت سے ممانی کو دیکھا۔ ”یہ کب کی بات ہے؟ مجھے اس بارے میں بالکل نہیں پتا۔“
 ”افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آئے کت کو بھی اس بارے میں نہیں پتا تھا۔“ ممانی چائے لے کر دوسری کرسی پر
 بیٹھیں۔

”جب ہم شام سے واپس آئے تو تمہارے ماموں نے آئے کت کی ماں کو فون کیا تھا۔ لیکن وہ بڑبڑیں نہیں ہويا
 رہی تھیں۔ بڑی کوشش کے بعد کسی پرانی لینڈ لائنی نے بتایا کہ ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔“
 ”اوہ۔۔۔ افسوس ہوا۔“

”آئے کت کی حالت بہت بری تھی۔ پہلے شوہر اور پھر ماں کی ایسی ناکامی موت کی اطلاع۔ نقصان ہمارا بھی
 چھوٹا نہیں ہے لیکن آئے کت کی تو پوری دنیا ہی ویران ہو گئی ہے۔ وہ ابھی تک سنبھل نہیں پائی۔“
 معاویہ نے تاسف سے اسے دروازے کے باہر دیکھا۔

اس کے چہرے کا رنگ ریخ بتاتا تھا کہ وہ ابھی بھی رو رہی ہے لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ کچھ لوگوں سے ہمیں جتنی
 چلے ہمدردی محسوس ہوتی رہے ان کے دکھ دور کرنے کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔



خوش نصیب ایسے ہی پوری فضل منزل میں گھومتی گھومتی فضیلہ چچی کے پورشن میں آنکلی۔ برآمدے میں
 ٹیلی فون سیٹ پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے پرائٹھارول کھاتے ہوئے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں سمجھائی ہونے
 لگی۔ اس نے احتیاط سے گردن گھما گھما کر سب طرف دیکھا۔ جب یقین ہو گیا کہ کوئی بھی موجود نہیں ہے تو
 جست لگا کر فون تک پہنچی۔ فون سیٹ اٹھا کر گود میں رکھا اور وہیں برآمدے کے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

جلدی جلدی فریجہ کا نمبر ڈائل کیا اور کال اٹینڈ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ رات بھر فریجہ کی ناراضی کے خیال
 سے اسے عجیب عجیب خواب آتے رہے تھے۔ تبھی ایسا لگتا فریجہ اس کے ساتھ ناراض ہو کر کسی پل سے چھلانگ
 لگا کر خود کشی کر رہی ہے۔ خوش نصیب اسے بچانے بھاگتی ہے لیکن تب تک فریجہ چھلانگ لگا چکی ہوتی ہے۔

کبھی فریجہ کو ناراض شکل کے ساتھ بیری پیر کے درختوں پر مرے ہوئے کوئے کی طرح الٹا لٹکا ہوا پایا۔ اور چونکہ
 یہ خوش نصیب کے خواب تھے تو ان سے کسی قسم کی سنجیدگی کی توقع فضول ہی تھی۔

خیر کھنٹی بچتی رہی لیکن فون اٹینڈ نہ ہوا تو خوش نصیب نے ہانوس ہو کر ریستور رکھ دیا۔ ”لو بتاؤ۔ اتنا رنگ بھی
 لیا اور خاکہ بھی کوئی نہ ہوا۔“ ابھی فون سیٹ واپس رکھ کر اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



خوش نصیب ایسے سٹیٹائی جیسے وہ خوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اس کے جلدی سے ریسیوز اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہیلو!“

”آہا... کیا بے سُرئی آواز ہے، لیکن یقین کرو۔ کال ملانے سے پہلے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کتنا مزہ آئے اگر آج کی تاریخ میں تمہاری آواز سننے کو مل جائے۔“

”اوہ... تم۔“ اس نے پہچان کر راسا منہ بنایا۔ ”تمہیں یہاں سے جا کر بھی سکون نہیں آیا؟“

”سکون تو شاید مرتے دم تک نہ آئے... بشرطیکہ تم میرے ساتھ نہ ہو میں تو...“ وہ کیف تھا چوک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”مجھے پتا ہے تم ہمیشہ یہ مرنے مارنے کی باتیں اس لیے کرتے ہو... تاکہ میں فلمی ہیروئنوں کی طرح ڈیل کر کہوں... ہائے اللہ نہ کرے... کیسی باتیں کرتے ہو... غیرہ وغیرہ... اور تمہیں میرا مذاق اڑانے کا موقع مل جائے۔“

وہ سن کر زرب مسکرانے لگا۔

”تم کہہ کر تو دیکھو... کیا پتا میں مذاق نہ اڑاؤں۔“

”لو اور سنو...“ اس نے صاف مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”قیامت کا دن ہی ہو گا وہ۔“

”تم مجھ سے اتنی بدگمان کیوں رہتی ہو۔“ وہ نہیں کر پوچھ رہا تھا۔

”نہیں بدگمانی کیسی۔“ وہ لاہروالی سے بولی پھر سوچا اور بولی۔ ”اچھا سنو کیف! تمہارا کیا خیال ہے... یہ جو پیر فقیر

ہوتے ہیں... یہ کتنے سچے ہوتے ہیں؟“

”ہیں نہیں ہیں... تم کیا کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنے والی ہو؟“

”پہلے میرے حوال کا تو جواب دے دو۔“ وہ چڑ کر بولی کیونکہ کیف کا لہجہ اس کا سوال سنتے ہی غیر سنجیدہ ہو گیا تھا

اور اسی بات سے خوش نصیب کو چڑھی۔

”دیکھو میں بیروں فقیروں کو نہیں مانتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ اللہ کے پست اور برگزیدہ بندے ہوتے ہیں،

ان کا احترام کرنا چاہیے لیکن یہ درباروں پر حاضری دینا، قبروں پر چادریں چڑھانا اور جھولیاں پھیلا پھیلا کر ان سے

مدد کی درخواست کرنا میرے نزدیک گنہگار ہے۔“ اس نے ذرا سنجیدہ ہو کر روک کہا۔

”لیکن کیف! جو اتنے لوگ ان بیروں فقیروں کو مانتے ہیں... آخر کچھ نہ کچھ تو ہو گا تاں ان کے پاس... کوئی

تو ایسی کرامت ہوگی جو انہیں بھاگ بھاگ کر ایسے بابوں کے پاس لے جاتی ہے۔“ وہ الجھن بھرے انداز میں بول

رہی تھی۔

”تم نے دیکھا ہے کبھی ایسے عاملوں نے اپنے بڑے بڑے بورڈ بنا رکھے ہوتے ہیں اور ان پر کیسی کیسی باتیں

لکھی ہوتی ہیں... سخت سے سخت دل دشمن بھی آپ کے آگے جھک جائے گا، محبوب آپ کے قدموں میں اور...“

”یار! میں تو پہلے ہی اپنے دل سمیت پورے کا پورا تمہارے قدموں میں ہوں اور کسی کو جھکا کر کیا کروگی؟“ اس

نے ایک دم سے بہت سنجیدگی سے کہا اور ساتھ ہی بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ یہ ہنسی ایسی تھی جیسے وہ اپنے

قہقہے کو روک نہ پایا ہو۔

خوش نصیب حسب معمول فوری طور پر تو سبھی نہیں اور جب تکھی تو اس کا پارہ ایک دم سے سوائیزے پر پہنچ

گیا۔

”کیف کے بچے! تم۔ تم۔“ ایسا لگتا تھا اس کا نام نہیں اس کی گردن دانتوں سے چبا رہی ہو۔
 ”ارے کیوں ان معصوموں کو کوس رہی ہو۔۔۔ کیسی ظالم ماں ہو پیار!“ اس نے پھر سابقہ انداز میں کہا۔
 اور عین اس وقت جب خوش نصیب غصے سے لال پٹی ہو رہی تھی صیام وہاں آگئی۔
 ”یہ تم ہمارے فون کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟“ اس نے سوچ کر کہا۔

خوش نصیب کھڑی ہوئی اور صیام کا ہاتھ پکڑ کر ریسیور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
 ”کیف کی کال ہے۔۔۔ مبارک ہو صیام! کیف نے تم سے اظہار محبت کرنے کے لیے فون کیا ہے۔“
 صیام کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دوسری طرف کیف کے سر پر جیسے پہاڑ گرا تھا۔ وہ ہیلو ہیلو کرنا رہ گیا اور خوش
 نصیب مزے سے کھسکی۔



اس روز رات گئے تک بارش برستی رہی۔

انتاسو لینے کے بعد اب نیند معاویہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔
 وہ آنکھیں بند کرتا تو ایسا لگتا و سامہ اسے مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ معاویہ بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیتا۔
 سب کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تو اٹھ بیٹھا اور پی وی کھول کے ایک فضول سا ٹاک شو دیکھنے لگا۔ پی وی دیکھتے ابھی
 اسے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب ایسا لگا دروازے پر دستک ہوئی ہے۔
 ”کون ہے۔۔۔؟ آ جاؤ۔“ معاویہ نے پی وی کی آواز کم کرتے ہوئے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا۔ اس کی
 آواز اتنی بلند تو ضرور تھی کہ باہر کھڑا ہوا فرد بہ آسانی سن لے لیکن دروازہ کھولنے کے بجائے ایک بار پھر دستک وی گئی
 اور اس بار آواز زیادہ واضح تھی۔

معاویہ قدرے حیران ہوا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

”کون ہے بھئی؟ آ جاؤ۔“ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باہر کوئی بھی نہیں
 تھا۔ ٹیرس کا اندھیرا منہ کھولے اسے تک رہا تھا۔ معاویہ بے ساختہ تھوڑا آگے ہوا اور اس نے دروازے سے
 باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ ٹیرس دور تک سنسان اور رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔
 بارش رک چکی تھی لیکن ٹیرس پر جگہ جگہ بارش کا پانی کھڑا تھا جبکہ آسمان ابھی بھی بادلوں کی تہ تلے رہا تھا۔
 گیلی ہوا کی مایٹی مایٹی معاویہ نے اپنے کانوں میں محسوس کی تھی۔

”جیسے غلط فہمی ہوتی ہوگی۔“ اس نے دل میں خود سے کہا اور واپس کمرے کی طرف مڑا اسی وقت اسے
 سیڑھیوں کی جانب سے کوئی چیز گرنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی سیڑھیوں پر کسی نے تیزی سے بھاگنا شروع کر
 دیا۔

معاویہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ! سرعت سے سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ سیڑھیاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں
 لیکن نیچے والے لاؤنج کے زیر پاؤں بلب کی روشنی اتنی تو تھی کہ سیڑھیوں کے اختتام پر اس نے کسی کو مڑتے
 ہوئے اور دوسری طرف غائب ہوتے دیکھا۔ وہ دو دو سیڑھیاں پھلا نکلتا ہوا نیچے آیا اور باہر گیٹ کی طرف بھاگا لیکن
 یہ دیکھ کر وہ شاکڈ ہی رہ گیا کہ کھڑا داخلی دروازہ بند تھا۔ اسے پار کیے بغیر کوئی گیٹ تک نہیں جاسکتا تھا اور نہ اس
 دروازے کو اندر سے لاک کیا جاسکتا تھا۔

اس کا مطلب جو کوئی بھی تھا ابھی گھر سے باہر نکل نہیں پایا تھا وہ ابھی گھر میں اور وہیں کہیں موجود تھا۔
 معاویہ چونکا ہوا مڑا اور اس نے ہوسیااری سے بنا گردن کھمکائے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ ساتھ ہی اس نے کارڈز

پر ڈالوئے کا ایک قدیم گل دان بھی اٹھایا تھا۔

گلدان پر اپنی گرفت مضبوط کئے وہ چونکا انداز میں آگے بڑھنے لگا ساتھ ساتھ ادھر ادھر کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا تاکہ پورے گھر میں جہاں بھی کوئی مشکوک انسان نظر آئے فوراً اسے دبوچ لے۔
معاویہ ایک وجود سے کچن کے اوہ کھلے دروازے سے اندر حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ بلکہ وہ حرکت نہیں کر رہا تھا ہنس نے جیسے دروازے کی اوٹلی تھی۔

معاویہ نے دونوں ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط کی اور محتاط قدموں سے چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آہستہ سے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا سلیب کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس کے اتنے پرسکون انداز پر معاویہ کو ذرا دیر کے لیے تعجب ہوا۔ وہ اگر کوئی چور اچکا ہوتا تو اسے یہاں سے بھی فرار ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کا پرسکون انداز معاویہ کو کشمکش میں مبتلا کر رہا تھا۔ بہر حال اس نے گلدان پر گرفت مضبوط کی اور دو بے پایاں اس کی طرف چلنے لگا۔

اس دوران اس کا ذہن مختلف وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گل دان اسے مارتا۔ آئے کت اپنی جھونک میں اس کی طرف پلٹی اور معاویہ کو یوں اپنے اتنے قریب کھڑا دیکھ کر اس نے چیخ مار دی۔
معاویہ نے بوکھلا کر اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ اپنی اپنی جگہ وہ دونوں ہی گھبرا بلکہ سٹپٹا گئے تھے۔ معاویہ کو فکر تھی کہ آئے کت کی چیخ سن کر ماموں یا ممانی جاگ نہ جائیں۔ اور آئے کت کو ڈر تھا معاویہ ہاتھ میں پکڑا گلدان اسے نہ کھینچ مارے۔ وہ بند منہ کے ساتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے معاویہ کو دیکھ رہی تھی۔
چند منٹ بعد صورت حال واضح ہوئی تو معاویہ نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا دیا لیکن اس سے پہلے دھمکانا ضروری تھا۔

”میں ہوں۔ آواز مت نکالنا۔“

اس کا ہاتھ منہ سے ہٹتے ہی آئے کت بدک کر پیچھے ہٹی اور اپنا تنفس بحال کرنے کو چند گہرے سانس لیے۔ اس دوران وہ معاویہ کو بڑی متنفر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ معاویہ نے ناراضی سے اور الجھن بھرے انداز میں پوچھا۔
”اپنے لیے کافی بنانے آئی تھی۔ لیکن تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اس نے معاویہ کے ہاتھ میں پکڑے گلدان کے طرف دیکھتے ہوئے مزید ناراضی سے پوچھا۔ اس کے پوچھنے پر ایک دم معاویہ کو احساس ہوا اگر بروقت آئے کت نہ پلٹی ہوتی تو یقیناً ”معاویہ وہ گلدان اس کے سر پر مار چکا ہوتا۔ اپنی حماقت کا احساس ہوتے ہی اس نے گلدان کچن سلیب پر رکھ دیا تھا۔

”کچھ نہیں وہ بس۔“

”ہوں۔“ آئے کت نے ایک تیکھی نظر اس پر ڈال کر اپنا منگ اٹھایا اور جانے لگی۔ معاویہ کو ایک دم سے کچھ خیال آیا تو اسے پکار بیٹھا۔

”اوپر میرے گمرے کے دروازے پر کیا تم نے دستک دی تھی؟“

آئے کت نے اس سوال پر ایسے اسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو یہ کیسا سوال ہے۔

”کس قدر احمقانہ سوال ہے۔ رات کے اس پہر میں تمہارے دروازے پر کیوں دستک دوں گی؟“

”لیکن دستک کی آواز بہت واضح تھی۔ میں نے سیڑھیوں پر کسی کو بھاگتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔“ معاویہ نے

الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

”ضرور فلک بوس کا آئینب ہو گا۔ وہ بدروح۔۔۔ وسوسہ کے بعد ممکن ہے اب وہ تمہارے پیچھے پڑ گئی ہو۔“

آئے کت نے طنز سے کہا، سر جھٹکا اور لیکن سے باہر نکل گئی۔ معاویہ کے ماتھے پر ان گنت الجھنیں تھیں جو تمہ در تمہ بچھی تھیں۔



انگلی صبح وہ بیدار ہوا تو ناشتے سے پہلے وہ سارے گھر میں پھرتا رہا۔ طالب ماموں کا گھر کچھ زیادہ وسیع و عریض نہیں تھا مشکل سے پندرہ مرلے کا ہو گا۔ فلک بوس کی طرح نہیں کہ شروع ہو تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لے۔ لہذا ایساں کوئی ایسا کونا بھی نہیں تھا جو اس کی نظروں سے پوشیدہ ہو۔ ویسے بھی اس کا بیشتر بچپن یہیں گزرا تھا۔ وہ اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ایسے میں اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ رات کو اگر گھر میں کوئی داخل ہوا اور اس نے معاویہ کے دروازے پر دستک بھی دی تو پھر وہ اچانک غائب کہاں ہو گیا۔

گھر میں داخل ہونے کا راستہ بھی ایک ہی تھا۔ جو پوری رات مقفل رہتا تھا۔ پورے گھر کا تین بار جائزہ لینے کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ تھی ضرور۔ لیکن کیا؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”رات مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے دروازہ ٹاک کیا ہو۔ لیکن جب میں باہر نکلا تو باہر کوئی بھی نہیں تھا۔“ ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے اس نے طالب ماموں اور صاعقہ ممانی کو بتایا۔

”تمہیں غلط نہیں ہوئی ہوگی۔“ ماموں نے کہا۔
 ”میں بھی غلط نہیں سمجھتا اگر میں نے کسی کو سیڑھیوں پر بھاگتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہوتا۔“
 ”کیا کہہ رہے ہو؟“ صاعقہ ممانی ایک دم سے پریشان ہوئی تھیں۔ ”اس کا مطلب رات کو کوئی گھر میں گھسا تھا۔ یہ تو بہت پریشانی کی بات ہے۔“

”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ممانی! میں سارا گھر چیک کر چکا ہوں۔ تو چوریاں کے آثار ہیں نہ کسی کے بھاگ نکلنے کے۔ باہر کے دروازے کو ویسے ہی لاک لگا ہوا ہے جیسا رات آپ نے لگایا تھا۔“
 ”تو پھر کون ہو سکتا ہے؟“ طالب ماموں فکر سے ہی بولے ان کے لہجے میں الجھن تھی۔
 ”ہو سکتا ہے اور نعمتی ہو۔“ آئے کت نے آلیٹ کی پلیٹ میز کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔
 ”سنا ہے آسیب بہت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرے گی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا پتا وہ بھی فلک بوس سے یہاں آگئی ہو۔“

معاویہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ آئے کت کو یہ بات ماموں اور ممانی کے سامنے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کم سے کم معاویہ کا یہی خیال تھا۔

”وسامہ کے بعد اب وہ معاویہ کے پیچھے ہوگی۔ آئی تھنک معاویہ! تمہیں کسی عامل کے پاس جانا چاہیے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ طنز کر رہی ہے یا نہیں۔
 ”تم تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہو گی؟“ معاویہ نے سختی سے کہا۔
 ”نہیں۔“ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے آئے کت نے ترنت کہا۔

”فلک بوس تمہارا ہے تو وہاں رہنے والے آسیب کا سب سے زیادہ حق بھی تم ہی پر ہے۔ وسامہ بے چارہ تو غلط فہمی میں مارا گیا۔“

”آئے کت! اس طرح کی باتیں مت کرو۔“ صاعقہ ممانی اس کے تیور پہچان کر منت سے بولی تھیں۔

”میں اس طرح کی باتیں کیوں نہ کروں۔ آپ اس دن پوچھ رہی تھیں نا، وسامہ کیوں چلا گیا دنیا سے۔ میں بتاتی ہوں آپ کو۔ وہ اس لیے چلا گیا کیونکہ معاویہ نے اسے موت کے منہ میں دھکیلا۔“ وہ ایک دم سے پھٹ پڑنے کے انداز میں بولی۔

معاویہ کے سر پر جیسے آسمان آگرا تھا۔

”کیا بکو اس کر رہی ہو۔“ وہ غضب ناک ہو کر گر جا۔

”کاش یہ بکو اس ہوتی۔۔۔ کاش میں بکو اس ہی کر رہی ہوتی لیکن یہی سچ ہے مسٹر معاویہ شیرازی! ایسا سچ جو تم کبھی کسی کے سامنے آنے نہیں دو گے۔ تم اچھی طرح جانتے تھے فلک بوس آسیب زہ ہے۔ اس کے باوجود اس کے باوجود تم نے مجھے اور وسامہ کو وہاں جانے دیا۔ تم نے ہمیں مجبور کیا کہ وہاں جا کر رہیں جہاں کوئی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا۔“

”یہ سچ نہیں ہے۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”یہ سچ ہے۔“ وہ چلائی۔ ”تم جلتے تھے وسامہ سے ہم ہمیشہ اس جیسا بننا چاہتے تھے۔ یاد کریں انکل! یہ بات آپ نے خود مجھے بتائی تھی کہ معاویہ بہت چھوٹی عمر سے وسامہ کو فالو کیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا میں وسامہ جیسا بننا چاہتا ہوں اور جب یہ ویسا نہیں بن سکا۔ ویسا ہر دل عزیز نہیں بن سکا تو اس نے وسامہ کو فلک بوس بھجوا دیا۔ کیونکہ یہ جانتا تھا وہ آسیب کسی کو بھی وہاں نکلنے ہی نہیں دے گا۔“

”اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے وسامہ کی موت کا ذمہ دار مجھے مت ٹھہراؤ۔“ معاویہ چیخ کر بولا تھا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ وسامہ کی موت کی ذمہ دار تم ہو۔ محبت کی شادی کرنے کے باوجود تم کبھی اسے وہ خرابی دے ہی نہیں پائیں جو اس جیسا اچھا انسان دیزرو کرتا تھا۔“

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

”اچھا۔۔۔ میں اسے خوشی نہیں دے پائی اس لیے میں نے وسامہ کو اپنے شوہر کو قتل کر دیا۔۔۔؟ واقعہ! اس قدر بے تکا الزام ہے۔“ آئے کت نے سلگ کر کہا۔

”مجھے نہیں پتا کیا ہوا کیا نہیں۔۔۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کی موت میں کہیں نہ کہیں تمہارا ہاتھ ہے۔“

”ٹھیک ویسے ہی جیسے میں مانتی ہوں وسامہ کے اس دنیا سے پہلے جانے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔“ وہ سابقہ انداز میں بولی۔

”تم نے محبت کے نام پر اسے موت کے گھاٹ اتارا۔“ وہ غرایا۔

”اور تم نے بھائی بن کر۔“ وہ بھی چلائی۔

کچھ دیر کے لیے ڈاکٹنگ روم میں سناٹا چھا گیا پھر طالب ماموں نے شاک سے نکلتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیوں ایک دوسرے پر کیچڑا چھال رہے ہو۔“

”کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ جب تک زندہ رہیں گے اسی طرح ایک دوسرے کو ذلیل کرتے رہیں گے۔“ آئے کت نے دونوں کو انداز میں کہا۔ ایک چھ جھلتی ہوئی نگاہ معاویہ پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

معاویہ نے اپنا غصہ دبانے کے لیے دانت بھیج لیے۔ مٹھیاں کس لیں۔ اس کی کپٹی کی ایک رگ مسلسل پھڑک رہی تھی۔ اس نے ایک نظر صاف ممانی اور طالب ماموں پر ڈالی۔ وہ دونوں ہی عجیب طرح کے تاثرات کا شکار ہو گئے تھے۔

”میں اسے قتل کروں گا۔ میری بات لکھ کر رکھ لیں۔ میں واقعی اسے قتل کروں گا۔“ اس نے ہاتھ مار کر میز پر زے بڑھ کر اتنے اور تین فن کرنا باہر نکل گیا۔

”معاویہ!۔ معاویہ! میری بات سنو۔“ طالب ماموں اپنی جگہ سے اٹھے لیکن گھبراہٹ میں فوری طور پر ان سے اٹھا نہیں گیا۔

”اسے روکیں۔ کہیں غصے میں کچھ کرنے بیٹھے۔“ صاعقہ ممائی حواس باختہ اس کے پیچھے دوڑی تھیں۔ معاویہ سیدھا بچن میں آیا۔ اسے تیزوہار چھری یا کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جس سے آئے کت کو قتل کر سکے۔ اس نے ہجالی انداز میں الماریاں اور درازیں کھولنا شروع کر دی تھیں۔ لیکن فوری طور پر اسے کچھ بھی نہیں مل رہا تھا۔

اسی اثنا میں صاعقہ ممائی اور طالب ماموں تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے آئے۔

”معاویہ۔۔۔ بیٹا! تم یہ کیا کر رہے ہو؟“ صاعقہ ممائی کی آواز گھبراہٹ کے مارے کپکپا رہی تھی۔

”میں آئے کت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ غصے سے یہاں وہاں ہاتھ مار رہا تھا۔

”غصہ تھوک دو معاویہ! وسامہ جا چکا ہے۔۔۔ اس طرح جذباتیت کا مظاہرہ کر کے وہ واپس نہیں آجائے گا۔“ طالب ماموں نے اسے پکڑ کر روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ معاویہ نے زبردستی اپنا آپاں سے جھڑپا۔

”مجھے چھوڑ دیں ماموں! مجھے روکنے کی کوشش مت کریں۔۔۔ آپ صحیح کہتے تھے آئے کت اس قابل نہیں تھی کہ وسامہ جیسا لڑکا اس سے شاوی کر لے۔ ہم اسی وقت روک لیتے وسامہ کو تو آج وہ ہمارے درمیان ہوتا۔“ وہ ہجالی انداز میں زور زور سے بول رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں اور ان سے آنسو بہ رہے تھے۔ لیکن ایسا لگتا تھا معاویہ کو اس بارے میں علم نہیں ہے۔

وہ غم و غصہ سے ہانگل ہو رہا تھا۔ اسے تیزوہار چھری مل گئی تھی۔ اسے لے کر وہ باہر کی طرف لپکا۔ طالب ماموں نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

”تمہارے پاس ثبوت ہے؟“ وہ اسے باہر نکلنے سے روکنے کی ٹیک دوڑ کر رہے تھے اور ہلکان ہو رہے تھے۔

”تمہارے پاس ثبوت ہے معاویہ کہ وسامہ کو آئے کت نے قتل کیا ہے؟“

شور کی آواز سن کر آئے کت دوڑی چلی آئی اور سماں کا منظر دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

”مجھے چھوڑیں ماموں! میں اب زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ ان کی بات سے بغیر وہ خود کو چھڑا کر تیزی سے آئے کت کی طرف بڑھا۔ عین نکلن تھا وہ اسے چھری سے زخمی کر دیتا کہ طالب ماموں نے سرعت سے اسے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا اور ایک زوردار کھپڑ اس کے چہرے پر مارا۔ اس ایک کھپڑ نے جیسے جاری کائنات کو ساکت کر دیا تھا۔

آئے کت نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو روکا۔ صاعقہ ممائی الگ صم بکم کھڑی تھیں۔ جبکہ معاویہ کے ہجالی کاغلبہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ ایک کھپڑ کھا کر پتھر کا جسمہ بن گیا تھا۔

”تمہارے پاس گواہ ہے جس کی گواہی یہ ثابت کرے کہ آئے کت وسامہ کی قاتل ہے؟ کوئی ایسا ثبوت جو آئے کت کو سزا دلانے کا سبب بن سکے؟ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہے تمہارے پاس۔۔۔ صرف شک کی بنیاد پر دوسروں کو سزا نہیں سنائی جاتی معاویہ اور اگر صرف شک کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صادر کرنا ہے تب تو ہمیں آئے کت کی بات بھی مان لینی چاہیے۔۔۔ وہ جھمکتی ہے وسامہ کو تم نے موت کے منہ میں دھکیلا تھا اس حساب سے کوئی نہ کوئی فرد جرم تو تم پر عائد ہوتی ہے۔ ایک کے شک کو بیچ ماننے کا مطلب ہے دوسرے کے شک کو بھی سچ مان لیا جائے۔۔۔“

معاویہ نے شک سے تو ثبوت لے کر آؤ۔ اس کے جرم کو ثابت کرو۔ اس کے گناہ پر سے پردہ اٹھاؤ۔ یہ نہیں کہ

معاویہ نے شک سے تو ثبوت لے کر آؤ۔ اس کے جرم کو ثابت کرو۔ اس کے گناہ پر سے پردہ اٹھاؤ۔ یہ نہیں کہ

معاویہ نے شک سے تو ثبوت لے کر آؤ۔ اس کے جرم کو ثابت کرو۔ اس کے گناہ پر سے پردہ اٹھاؤ۔ یہ نہیں کہ

خود سے سزا دینے نکل کھڑے ہو۔ ”وہ جیسے غصے سے بولتے بولتے ہانپنے لگے۔ ”فریحہ نے ذرا غصہ مانڈا پڑا تو انہوں نے ایک نظر معاویہ اور آئے کت پر ڈالی اور بولے۔

”میں اور صعقہ کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں کہ سمجھ نہ سکیں۔ صاف نظر آ رہا ہے تم دونوں کے درمیان وجہ اختلاف صرف وسامہ کی موت نہیں ہے۔ جھگڑے کی بنیاد کچھ اور ہے۔ تم دونوں لڑو۔ ایک دوسرے کے سر پھاڑ دیا ایک دوسرے کو قتل ہی کر دو۔ گزارش صرف اتنی سی ہے کہ ہماری زندگیوں میں اپنے بیٹے کے بعد کچھ بھی نہیں بچا۔ ہم پہلے ہی غم سے نڈھال ہیں ہمیں اور ریشانیوں میں مت دھکیلو۔ سکون ہوے نہیں سکتے تو رہا سہا سکون برباد بھی مت کرو۔“ آخری جملہ بولتے بولتے ان کی آواز آنسوؤں سے رندھ گئی تھی۔

انہوں نے صعقہ ممانی کا ہاتھ پکڑا اور کچن سے باہر نکل گئے۔

معاویہ ایسے ہی سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کا چھری والا ہاتھ پہلو میں تقریباً ”بے جان سا گرا ہوا تھا۔

آئے کت نے معاویہ کو دیکھا اور سر جھکا کر، نظریں چرا کر لپٹ گئی۔

معاویہ نے ہاتھ اٹھا کر اس تیز دھار چھری کو دیکھا۔ بے بسی کا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس نے چھری کو فرش پر پھینک دیا تھا۔



شام ہونے تک خوش نصیب ذہنی طور پر اتنا تھک چکی تھی کہ ساری خودداری ایک طرف رکھ کر فریحہ کے گھر پہنچ گئی۔ دل گویا کہہ کر سمجھا لیا کہ بچپن کی سبیلی کو ناراض نہیں رکھا جا سکتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ فریحہ کے چھوٹے بھائی کو گول گپے لے جانے دیکھ لیا تھا۔ اب تو جب تک پوری پلیٹ نہ ختم کر لیتی، ناراض رہا جا ہی نہیں سکتا تھا۔ سو بچ گئی فریحہ کے گھر اور خوب بانہیں پھیلا کر لاؤ تھا کہ فریحہ کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کی۔

”تم ایسے ہی منہ پھلا کر بیٹھی ہوئی ہو ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے پیر صاحب کے خلاف نہیں ہوں۔“

”لیکن تم انہیں بانہیں بھی نہیں ہو۔“ فریحہ ناراضی سے بولی۔

”جیسی ان کی شکل ہے وہ خواہ اپنے آپ کو مان لیتے ہیں، یہی بڑی بات ہے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی پھر جلدی سے بولی۔

”دیکھو میں انہیں پیر و مرشد نہیں مان سکتی۔ مر جاؤں گی لیکن ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کروں گی۔ لیکن تم کہو گی تو ان کے آستانے پر چلی جاؤں گی۔ ان سے تمیز سے بات بھی کر لوں گی۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“ اس نے دو ٹوک کہا۔ اور ایک بڑا سا گول گپا چن کر پانی سے بھرا اور منہ میں ٹھونس لیا۔

”تم تو ایسے شرطیں گنوار ہی ہو جیسے پیر صاحب سے شادی کرنے کی بات کر دی ہو میں نے۔“ فریحہ منہ بنا کر بولی۔

”تو بس۔ میں کیوں کروں تمہارے پیر صاحب سے شادی، میرے لیے تو کوئی شزاہ آئے گا۔“ وہ اترا کر بولی۔

”فکر نہ کرو۔ وہ شزاہ بھی آتے ہی، تمہیں دیکھ کر بھاگ جائے گا۔“ فریحہ نے دانت نکال کر کہا۔

”ارے وہ تو شکرانے کے نفل پڑھے گا کہ مجھ جیسی لڑکی اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ ابھی بھی بے چارہ پتا نہیں کہاں بیٹھا میرے لیے دن رات وظیفے کرتا ہو گا۔“ اس نے تصور کی آنکھ سے اس شزاہ کو دیکھا جو ابھی پتا نہیں کہاں تھا۔

”تمہاری یہ جو خوش فہمیاں ہیں ناں۔ دیکھ لینا ایک دن مراد میں گی تمہیں۔“ فریحہ نے کہا۔

”اچھا بابا ناراض ہو کر بددعا میں تو مت رو۔“
 ”نہیں دیتی۔۔۔ لیکن خدارا! تم یہ گول گپے کھانا تو بند کرو۔ میں نے اپنی لیے منگوائے تھے، سارے تم ہڑپ کر گئی ہو۔“

”ارے اگر دو چار کھا ہی لیے تو کون سی قیامت آگئی۔۔۔ آخر میں تمہاری دوست ہوں اور۔۔۔“
 ”اور میں کھاؤں یا تم ایک ہی بات ہے۔“ فریحہ نے اس کا جملہ اچک کر لقمہ دیا۔ بجائے شرمندہ ہونے کے خوش نصیب مسکرانے لگی اور بولی۔
 ”کیا ہوا جو تم بد صورت ہو۔ لیکن ہو ذہین۔“ ایسی تعریف خوش نصیب ہی کر سکتی تھی۔
 ”ہونہ۔۔۔“ فریحہ نے ناک چڑھائی۔

”تم ایک باری پیر صاحب کے پاس چلو تو سہی۔ ایسی اچھی باتیں کرتے ہیں کہ تم اگلی بار خود کھینچی جاؤ گی۔“ فریحہ خوش ہی ہو گئی تھی۔ دراصل عام انسانی نفسیات ہے، ہم جسے عزت دیتے ہیں، جس کی عقیدت میں مبتلا ہوتے ہیں، چاہتے ہیں دوسرے بھی اس کی چاہ میں مبتلا ہو جائیں۔ عشق میں دوئی کا تصور نہیں ہے لیکن عقیدت میں ہے۔ تو خوش نصیب نے اطمینان سے گول گپے کھائے اور فریحہ کے ساتھ بیری پیر کے آستانے پر آ گئی۔
 ”نکلنے ہوئے فریحہ نے اپنی اماں کو اطلاع دینا ضروری سمجھا۔

”ہم مزار پر جا رہے ہیں۔۔۔ تھوڑی دیر میں آ جا میں گے۔“
 ”ہاں ضرور جاؤ۔۔۔ لیکن آدھ گھنٹہ راک جاتیں تو میں بھی کاموں سے فارغ ہو کر تمہارے ساتھ ہی چلتی۔“
 ”مجھے مخرّب سے پہلے گھر واپس جانا ہے خالہ جی! خوش نصیب نے کہا۔
 ”آپ بعد میں آ جانا اماں! یہ تو آکر اے مزار۔ ہم چلے جائیں گے۔“ فریحہ نے کہا۔
 ”اچھا چلو ٹھیک ہے۔“ وہ راضی ہو گئیں۔

”وہ۔۔۔ خالہ جی! خوش نصیب نے جھجکتے ہوئے کہا۔“ اگر میرے گھر سے کوئی مجھے پوچھنے آئے تو انہیں یہ مت بتائیے گا میں مزار پر آئی ہوں۔۔۔ میری روشن امی کو پسند نہیں ہے۔“
 ”ہاں جانتی ہوں۔ تمہاری اماں کو ہر وہ کام ناپسند ہے جو سارا زمانہ کرتا ہے۔۔۔ صحیح کہتی ہے تمہاری چاچی، اسے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کا شوق رہتا ہے۔“ ناک چڑھا کر بولیں لیکن اس سے زیادہ ناک خوش نصیب نے چڑھالی۔ غلط خیالات تھے یا صحیح۔ اسے اپنی روشن امی کے خلاف کچھ بھی سننا ناپسند تھا۔
 فریحہ اگر اپنی اماں کی بیٹی تھی تو خوش نصیب کی سہیلی بھی تھی۔ فوراً صورت حال بھانپ گئی۔
 ”ہم جا رہے ہیں۔۔۔ چلو خوش نصیب۔“ جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔



”اچھا سنو۔۔۔“ اچانک ساتھ ساتھ چلتے خوش نصیب نے کہا۔
 ”اسی اماں سے کہنا، میری روشن امی کے بارے میں اس طرح بات نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم پیروں فقیروں کو نہیں مانتے تو بس نہیں مانتے۔“ اسے بہت ہی برا لگا تھا۔
 ”چھوڑو اس بات کو۔ تمہیں پتا ہی ہے میری اماں کا۔“ فریحہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔ ”ویسے تو تمہاری امی کی بیٹی سہیلی ہیں لیکن تمہاری فضیلہ، چچی کو پیر بن مانتی ہیں اور ہمارے ہاں سگے رشتوں کے ساتھ ساتھ پیروں سے وابستگی کی بنا پر بننے والے رشتوں کو بھی بہت اہمیت دی جاتی ہے۔“
 ”ہائیں۔۔۔ اب ان رشتہ داریوں کا کیا مطلب ہے؟“ اس نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ اسی اثنا میں وہ دونوں مزار کے

”پیری پیر کے مجاور بڑے پیر صاحب ہیں۔ ان کا گاؤں ساہیوال سے آگے ہے۔ کبھی کبھار وہ پیری پیر بھی تشریف لاتے ہیں تو ہم لوگ اماں ابا کے ساتھ ان کی خدمت میں سلام پیش کرنے جاتے ہیں۔ ابھی تم باباجی سے ملو۔ کبھی بڑے پیر صاحب تشریف لائے تو میں تمہیں ان سے ملوانے بھی لے جاؤں گی۔“ دربار میں داخل ہوتے ہوئے فریحہ اسے بتا رہی تھی۔

”اگر ایسی بات ہے تو اپنے باباجی سے کہنا، مزار کے کسی فقیر سے سر کے بل رقص کروا کر دکھائیں۔“

فریحہ نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔ تو جلدی سے بولی۔
 ”میں... میرے کہنے کا مطلب تھا سر کے بل رقص کرنا بھی کسی کرامت سے کم تو نہیں ہے۔“ فریحہ مسلسل اسے غضب ناک نظروں سے گھور رہی تھی۔ خوش نصیب نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

مزار پر زائرین کا معمول کا رش لگا ہوا تھا۔ پیر صاحب کے آستانے کے بالکل سامنے وہ باباجی براجمان تھے جن کی فریحہ وراس کی اماں معتقد تھیں۔ سادھوؤں والا چولا گندے میلے کچھیلے بال۔

خوش نصیب کو دیکھ کر باباجی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ دوسری جانب خوش نصیب کو نکالی سی آنے لگی۔ باباے کا حلیہ تھا ہی اتنا گندا۔

”اگر فریحہ ساتھ نہ ہوتی تو خوش نصیب برملا اس بات کا اظہار کرتی۔“

”السلام علیکم باباجی!“ فریحہ نے حسب عادت گھنٹوں کو ہاتھ لگایا۔ ساتھ ہی شوکا خوش نصیب کو بھی دیا لیکن وہ اس سے اس نہ ہوئی البتہ داہنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر اور سر کو ذرا سناخم دے کر باباجی کی خدمت میں سلام پیش کرنے لگی۔ داری ادا کر دی تھی۔

”اللہ تمہارا مالک ہے۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔ اللہ ہو، حق اللہ۔“

”سادھو بابا نے اس کے سلام کا جواب کچھ اس طرح دیا کہ وہ ماؤں کا انبار لگا دیا اور سر کو اتنی زور سے جھکادے دے کر ”اللہ“ بول رہے تھے کہ ایک لمحے کو خوش نصیب کو شک گزرا کہ باباجی جھک کر کہا کر اب گرے تو تب گرے۔“ آپ نے خوش نصیب کو بلایا تھا بابا! بس اس سے لے آئی ہوں۔“ فریحہ نے اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔

”کوئی اپنی مرضی سے نہیں آتا۔ بندے کی ضرورت اسے پہنچ لاتی ہے۔ اللہ کھینچ لانا ہے۔“ باباجی نے ایک بار پھر سردھتے ہوئے جیسے اپنی طرف سے بڑی ”بچی“ ہوئی بات کی تھی۔

خوش نصیب نے بابا کو پرکھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اور اپنی اس ”پرکھ“ پڑا سے ہمیشہ سے ہی بڑا اعتماد رہا تھا۔ دوسرے اسے ہمیشہ سے ایسا سچ بولنے کا شوق رہا تھا جو اگلے بندے کو شرمندہ کر کے رکھ دے۔ تو اس وقت پیر صاحب کے آستانے کے صحن میں کھڑے ہو کر اس نے عمد کیا وہ پیر صاحب کا راز فاش کرے گی اور فریحہ اور اس کی اماں کو ان باباجی کی عقیدت کے چنگل سے آزادی دلانے گی۔ سو وہ باباجی کے سامنے سراٹھا کر بیٹھ گئی اور ایسے باباجی کی طرف دیکھا جیسے آنکھوں سے ان کی حقیقت کا پتا چلانا چاہتی ہو۔

”بول بچی! کیا چاہتی ہے۔ بابا تیرے من کی ہر مراد پوری کرے گا۔“ بابا نے اپنی جتنی منی سی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور ایک بل میں خوش نصیب اس دنیا سے غافل ہو گئی۔ اسے لگا جیسے وہ خلا میں بھٹک رہی ہو۔ بظاہر وہ وہیں بیٹھی تھی۔ سب سن رہی تھی دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ جو خود کو تیس مارخان، ذہن و فطین اور پتا نہیں کیا کیا سمجھتی تھی، اس وقت ایک بے جان مورت بن گئی تھی۔

بات یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ اعتماد بھی انسان کو لے ڈالتا ہے اور شاید خوش نصیب بھی ڈوبنے کو تھی۔
 (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

میری زندگی

سے باہر آتے تو پھینچی ہوئی مٹھیوں سے جھڑبھڑخٹک
مندی نیچے گرنے لگتی تھی۔
”اونہوں۔ اٹھو جا کر پہلے کیاری میں ہاتھ دھو
آؤ۔ جگہ جگہ مندی جھڑنے سے گناہ ہوتا ہے۔“
ساتھ چارپائی پہ رضائی ٹانگوں یہ ڈالے ہل ہل کر تسبیح

”کل رچ۔ ارج بوٹیوں کا رچ۔“
”یک ہے۔“ بچپن کی بقر عیدیں بھی واقعی عیدیں
ہوتی تھیں۔ خوشی، مستی، ترنگ سے بھرپور۔ دس
ذی الحج کی پالے پڑنی ٹھنڈی تیج صبح میں اس کے سٹھے
مندی رچے ہاتھ انگریزی لیتے ہوئے گرم گرم رضائی



**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر دھتی ڈاوی بے ساختہ اسے ٹوکے۔

”جی ڈاوی!“ وہ تاج واری سے رضائی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ خالص رسی مہندی کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو سرور آمیز احساس بخش رہی ہوتی۔
”اور ادھر آ ہاتھوں پہ سرسوں کا تیل مل دوں۔ دیکھنا رنگ کیسا گہرا ہوتا ہے۔“ اور پھر واقعی تیل ملنے سے ہتھیاسیاں راج کے شوخ شوخ ہو جاتیں اور وہ سب بسن بھائیوں کا پھرہ سٹخوں میں بھر بھر کے پلجی کے ٹکڑے پر کر چولے یہ رکھنا۔ گوشت کے حصے — کرتے ہوئے اماں بیچ بیچ کر کہتیں۔

”میری بے صبری اولاد! سالن کے لیے تو کچھ کچی چھوڑ دو۔“ مگر تاں کچی بھنی نمک چھڑکی کچی کا مزا، رات کی کڑا ہی میں کہاں۔

اور وہ کسرہ ہاں ہاں وہ ڈبائیک یا شیکا کا کیمرو۔ جو ابا کے دوست سعودی عرب سے تحفہ لائے تھے۔ چکنی مٹی کی لپائی والے پرانے سازو سامان سے بھرے صاف ستھرے کمرے میں ان سب کے لیے بے حد خوشی، اشتیاق اور نخر کا سامان جستی ٹنک میں رکھا وہ کیمرو تھا جسے وہ اکثر اسکول کی دوستوں اور کزنز کے سامنے کھول کے بیٹھی ہوتی تھی۔

”بالکل نیا ٹیبلو ہے۔ میرے ابا کے دوست لائے ہیں۔ پوری بیسی تصویروں والا رول لیتا ہے یہ۔“ اس کے انداز سے شیخی جھلکتی تھی۔ مگر یہ بیسی تصویریں کس کس کی ہوں گی اور کب نہیں گی؟ وہ یہ

سوال اکثر دلا ر سے ابا کے گھٹنے پر سر رکھ کر کیا کرتی تھی۔
”ہاں میرا پترا! بس یہ بڑی عید آنے والی ہے نا۔ اس یہ تم سب کی تصویریں بناؤں گا؟“ خود ابا کو بھی اس کیمرے سے بے حد لگاؤ تھا۔ نئی چیزیں انوکھا تجربہ۔ ذی الحج کا چاند نظر آتے ہی کیمرے میں رول ڈلو کر لے آئے۔

نئے کپڑے، جوتے، ہار، کنگن، رومال، سویاں، رائس ٹیک لٹکاتے نئے کالے چشے، خوشی، کھلکھلا بیسی، بڑی عید اپنے تمام تر رنگوں اور لوازمات کے ساتھ ان کے کچے کنگن میں اتری تھی۔

سب ایک دم سے ریڑی۔ آخر کو ابا نے کھنا کھٹ تصور میں جو بنانی تھیں۔ تصویریں بنانے کی جگہیں تو بہت پہلے سے منتخب کر لی تھیں۔ اناروں کے چھنڈ کے نیچے، پھولوں کے پاس۔۔۔ کمرے کے ساتھ لگی تیل سے لگ کمرے۔ کبھی سنجیدہ، تو کبھی بانچھوں تک چری مسکراہٹ والے پوز، مگر اماں کا موڈ بے حد خراب تھا۔
”ساری زندگی قربانی قصائی کے ہاتھوں کروائی۔ اب چلے ہیں خود براق گلا کاٹنے، نہ صاحب! ہمیں نہیں پسند یہ غیر ضروری اعتماد۔ اور شو بازی۔۔۔“

”شو بازی کیوں؟“ ابا بھڑکے۔ ”کیا میں کسی جانور کو ذبح نہیں کر سکتا؟ مرحوم اماں کا بڑا سار یوڑ ہوا کرتا تھا ان بکریوں اور بھینٹوں کا۔ رات کے کسی بھی پہر جانور کی طبیعت بگڑتی تو ابا اماں کے ساتھ چل کر میں ہی چھری پھوایا کرتا تھا اور اب گھر کا ایلا ایلا بکڑا۔ اور سے بھلا ہو حاجی رفیق کا، جس کے طفیل آج ایک قیمتی اور اعلا درجے کے کیمرے کے مالک بن گئے ہیں۔ موتے کو خود ہی خوب صورت اور یادگار کیوں نہ بنایا جائے اور یہ بات کرنی ہیں اجرت کے قصائی کی۔“ اور پھر فونو سیشن کا آغاز ابا نے خود سے شروع کیا تھا۔ بکرے کے گلے پر چھرا پھیرتے ہوئے، دھریک کے درخت کی موٹی توانا شاخ پر بکرے کو لٹکا کر کھال اتارتے ہوئے۔ غرض قربانی کے تمام مراحل کی تصاویر عبدال نے ابا کی وی ہونی ہدایات کے مطابق بنا میں اور جب کھال اتارتے ہوئے ابا سے تیز دھار چھری سے کھال پہ ہاتھ

جتنا کٹ لگ گیا تو اماں جل کر بولے بنا رہ نہ پائی تھیں۔
”ہمیں نہ راس آ میں اس آدمی کی شوخیاں۔۔۔ اچھی بھلی کھال کی قیمت گھٹادی۔ بھلا کٹ لگی کھال کی کیا قیمت وصول پائیں گے مدرسے والے؟“ مگر ڈیوں والی دھوتی اور نئی سفید بنیان میں ملبوس یکسر بے نیاز اور مددگار بنے ابا پر بکرا ذبح کرنے سے لے کر گوشت کے حصے کرنے تک کیمرے کا فلیش مسلسل پڑتا رہا اور ادھر۔۔۔ یہ سب اس سوچ سے ہلکان کمرے۔

”ابا تو دھڑا دھڑا اپنی تصویریں بنانے جا رہے ہیں۔ رول ختم ہو گیا تو ہم سب تو ایسے ہی رو جائیں گی۔“ مگر

شام ڈھلنے سے قبل ابانے ان تمام بچوں کی ڈھیروں
تصاویر بنائیں اور بچپن کی بے شمار عیدوں میں یہ
کیرے والی عید سب سے نمایاں اور یادگار تھی اور
اب بھی مصوفیت بھرے ایام میں کبھی کوئی چیز حبشی
ٹرینک میں ڈھونڈتے ہوئے یہ پرانا پیلاہٹ والا فوٹو البم
ہاتھ لگتا تو چہم سے یہ عید مکمل تابناکی کے ساتھ ذہن
کے پردے پر نقش ہو کر دل و دماغ کو ناقابل بیان سرور
سے ہم آہنگ کر دیتی تھی۔



”دھڑاز زنی!“ باہر کوئی چیز قوت سے گری تھی۔
وہ جو ہاتھ میں شیشے والا پتا اور پھندے والی زنجیر ہاتھوں
میں تھامے سرشار سی دھیان کی کھڑکی سے ماضی میں
جھانک رہی تھی۔ چونک کر حواسوں میں پلٹی۔ یہ پتا اور
زنجیر اسے عبدل کچھ دیر پہلے وے گیا تھا کہ شام کو بکرا
آئے پر اس کا سنگھار مکمل کیا جائے گا۔ وہ ہاتھ میں
پکڑی چیزیں ایک طرف رکھ کر فطری جتس کے
مارے باہر نکل آئی۔ تمبرکی چمکی اور چھبستی دھوپ
نے لمحہ بھر کو اس کی آنکھیں چندھیادی کھیں۔
سامنے صحن میں برتن دھرے ہوئے تھے۔ جو ابھی کچھ
دیر پہلے اس نے ڈھو چکا کر نوکرے میں منڈر پر رکھے
تھے۔ اس کے اندر سے پیش کی ایک تیز آواز ابھری
تھی۔ صحن میں ٹونٹنی ٹونٹنی کا میدان سجا تھا۔ گھر
کے سارے بچے اپنی اپنی پوریشنز پر مستعد کھڑے تھے۔

وہ دانت بیستی ہوئی آگے بڑھی اور اونچے اونچے
شائش لگاتے وکی کا کان پکڑ کر زور سے مروڑ دیا۔
”بد تمیزوں۔۔! یہ گھر ہے یا کوئی پلے گراؤنڈ؟ ابھی
برتن دھو کر فارغ ہوئی ہوں۔ اب پھر سے سمیٹوں اور
دھوؤں؟ اتنا فارغ سمجھ رکھا ہے مجھے؟“ غصے سے اونچا
اونچا بولتے ہوئے وہ ایک ہاتھ سے وکی کا کان پکڑے
اور دوسرے سے اس کی پشت پہ دھموکے جڑتی
جا رہی تھی۔

”لوئی آیا! قسم سے میری شائش سے نوکر نہیں گرا
میں تو ابھی ابھی بینگ پر آیا ہوں۔ مجھ سے پہلے صحن

بینگ گرا رہا تھا۔ افس۔۔ میرا کان۔۔“ کان چھڑانے کی
سعی میں مصروف وکی درد کے مارے دہرا ہوا جا رہا تھا
اور خوب واویلہ کر رہا تھا۔

”چھوڑو وکی کوس۔ کیا اس کا کان اکھاڑ کر دم لوگی؟“
پشت پر ایک جان دار اور رنگ آواز ابھری تھی۔ وہ بل
تکھا کر پلٹی۔ سامنے ار ترضی فہمائشی نظروں سے کھڑا
گھور رہا تھا۔

”نہیں۔۔ اتنے سستے میں نہیں چھوڑوں گی۔
صرف کان نہیں اکھاڑوں گی، ساتھ میں اس کی
ٹانگیں، ہاتھ، پاؤں سب توڑوں گی۔“ غضب سے
کھولتے ہوئے اس نے وکی کے ہاتھ سے بلا چھینا اور
اس سے پہلے کہ وہ دوتن پھٹے خوب جمائے لگاتی،
ار ترضی نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے حسرت لگا کر بلا
اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

”پاگل ہوئی ہو؟ کیا جان لوگی اب؟ ذرا اسے برتن ہی
تو بکھرے ہیں۔ سمیٹ کر پھر سے دھو لو۔“

”اچھا۔۔ اتنا فارغ سمجھ لیا ہے کہ کئیے ہوئے کام کو
پھر سے کروں۔۔ دھونے کی خوب کھی۔ یہ جو اتنے کپ
ٹوٹے اور پلٹیں ترخی ہیں ان کا حساب کون دے گا؟“
نازک گنیز دونوں ہاتھ جمائے وہ گہرے طنز سے بولی۔

”اچھا برتنوں کا اتنا وان؟ تو چلو اس سولر پلیٹ کا
حساب نکالو۔ جو دو دن پہلے صحن سے سائیکل کی ٹھوکر
سے توڑ دی تھی۔“ وہ بھی فوراً ”حساب کتاب۔ اتر آیا
تھا۔ آخر کو آکنا ٹکس میں ماسٹرز تھا۔ جمع و تفریق کا ماہر۔۔

”ایسی ہی بینگ کرتے ہوئے رزم نے ہمارے
پر آمدے کا سیور توڑ دیا تھا۔ روشن میری ریفریوم کی
شیشی لگانے کے لیے لے گیا اور ابھی تک واپس نہیں
کی۔“

”کیا کیا؟ تم میرے بھائیوں کی معصومیت اور
بھلاکپن کو اپنی منہی ذہنیت سے ندیدے پن میں لا
رہے ہو؟“ وہ اس الزام پر جیسے غصے سے تھرا اٹھی
تھی۔ ”ایسے تو بیسیوں نقصان تمہارے بہن، بھائی
ہماری طرف آکر کر جاتے ہیں۔ ابھی کل ہی دشمن نے
فرنگ سے گھیر کا ڈونگا نکالتے ہوئے ساری کھیر گرا دی۔“

کتنی محنت اور شوق سے بنائی تھی۔ پیسے الگ ضائع ہوئے۔

ہوئے باہر کی جانب لپکا۔
”کوئی ضرورت نہیں چاچی کی طرف جانے کی۔“
کڑک آواز میں بولتے ہوئے اس نے رزم کو ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔
”میں خود تمہیں سوچی کا حلوہ بنا کر کھلاتی ہوں۔“
وال کلاک میں سیل لگاتے ہوئے وہ حتمی انداز میں بولی تھی۔

”مگر آئی! حلوہ کھانے کا مرا تو بلال، مغیث لوگوں کے ساتھ آتا ہے۔“ رزم منہ بسور کر بولا۔
”میں نے کہہ دیا نا، حلوہ تو کیا پانی کا گھونٹ بھرنے بھی ادھر نہیں جاؤ گے۔ صرف تم نہیں بلکہ صفی، شایان، وردہ، حسن کوئی بھی ادھر گیا تو گردن مروڑوں گی میں سب کی۔“ کتے کتے دانت کچکچائے تھے۔
”کیسے جتا جتا کے موصوف کہہ رہے تھے یہ آئیں گے نہ کھائیں گے، نہ پیئیں گے۔“ اس کے حلق تک کڑواہٹ بھری ہوئی تھی اس دن کے ٹاکرے کے بعد۔

”دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا! کیوں بھائی کو روک رہی ہو؟“ اماں نے اسے گھر کا۔ ”نہ فرق، نہ تمیز، تو پھر کیوں نہ بچاچے کے گھر جا کر سوچی کا حلوہ کھائے۔ تم بیڑے بنا لو۔ ابھی ان کے بچے اوھر آ کے کھالیں گے۔ کوئی تفریق تھوڑی ہے۔ ایک ہی گھر کے پلے بچے تمہاری وہولیں ہیں اگر بھلا بیٹھ جائیں گے۔“

”وہی تو اماں! نہ یہ جائیں نہ وہ آئیں۔ ان کی آنی جانیوں سے میری جان عذاب میں پڑی ہوئی ہے۔ صبح رگڑ رگڑ کر پونچھا مارا، مگر چاچا کے ارسلان نے آکس کریم کھلتے ہوئے سارا فرش گندا کر دیا۔ وہ پیر کا کھانا اپنے حساب سے بنایا، مگر ان سب کو قورمہ پسند آیا تو روٹیاں کم پڑ گئیں۔ مجھے پھر سے آٹا گوندھ کر پھر روٹیاں بنانی پڑیں۔ کتنے خوب صورت لگ رہے تھے گملے میں پھول۔ اس وکی کے بچے نے گملا توڑ دیا۔ اماں میں تھک گئی ہوں۔ ان شیطان بچوں کے بکھرے کام سمیٹ سمیٹ کرتے بولتے بولتے وہ روہا سی ہو گئی۔“

”ہاں تو خود اٹھنے کی زحمت کر لیتیں۔ میری معصوم ننھی سی بہن اتنا بھاری ڈونگا اپنے قد سے اونچے فریج سے نکال سکتی تھی؟“ وہ آرام سے دفاعی انداز میں بولا تھا۔
”بس بہت ہو گیا۔ تم ار تفضی امین! اپنے بہن، بھائیوں کو اچھی طرح سمجھا لو اگر آج کے بعد یہ ہماری طرف بھٹکے، کوئی نقصان کیا یا میرے کیے ہوئے کاموں کو خراب کیا تو اپنی شامت کے یہ خود ذمہ دار ہوں گے۔“ انگلی اٹھا کر دھمکی دینے کے انداز میں وہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔

”او کے ڈن خوباں رحیم! اپنے بہن، بھائیوں کو تو میں سمجھا لوں گا۔ مگر اس بات کی یقین دہانی کون کرائے گا کہ تمہارے بہن، بھائی بھی ادھر ہماری جا بڑے آ کے شور مٹانا نہیں کریں گے۔ گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ میرے سیٹ سٹم کو استعمال نہیں کریں گے۔ فریج سے چیزیں نکال کر مزے سے نہیں کھائیں گے۔ میری امی سے فرمائشی کھانے نہیں بنوائیں گے۔ نہ مجھ سے اونٹنگ لے جانے کی ضد کریں گے، ہوں بولو؟ منظور ہے؟“ ایک بھر نور پتانی والی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ چیلنجنگ انداز میں پوچھ رہا تھا اور خوباں زمین پہ پڑے سیٹ کو اٹھا کر اس کے لمبے چوڑے وجود پہ دے مارنے کی خواہش کو بدقت دل میں دباتے ہوئے خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔



بادل صبح سے کسی پرانے قرض خواہ کی طرح ڈٹ کر کھڑے تھے۔ سہ پہر کے وقت شمال کی جانب سے آنے والی ہواؤں نے ذرا سا گدگدایا تو کھلکھلا کر برس پڑے۔ موسم ایک دم دلفریب اور سہانا ہو گیا تھا۔ معا ”چاچا امین والی سائڈ سے اشتہا آمیز خوشبو میں آنے لگیں۔“

”آخا! چاچی تو پرا سوچی کا حلوہ بھون رہی ہیں۔“
رزم نے ایک لمبی سانس کھینچی، پھر مزے سے بولتے تھی۔

”تو پیشا! تو نہ کڑھا کر تیرے بہن بھائی بھی تو تیرے چاچا والی سائڈ پہ یہ ہی کچھ کرتے ہیں۔ تیری چاچی تو پیار محبت سے سب کچھ سمیٹ لیتی ہے۔ کبھی غصہ نہ شکایت۔“

”وہ کیا شکایت کریں گی۔ ان کے صاحب زاوے جو ہیں جتانے اور شانے کے لیے۔“ وہ کلس کر بولی۔
 ”ہاں ار تفضی جیتا رہے گھر کے بچوں میں محبت اور دوستی اسی کے دم سے تو ہے۔“ اماں کے لہجے میں اس کے ذکر پہ شیرینی سی گھل گئی تھی۔

”گھر میں جو چیز لا رہا ہے سب کے لیے ایک جیسی کہیں سیر کرانے لے جا رہا ہے تو اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ ہمارے بچے بھی ساتھ میں لے لیے اسکول کے استادوں سے ملنا پڑھائی کی رپورٹ لینا جیتا رہے ورنہ تو کون سی دیورانیوں جھٹائیوں کے بچے ہیں جو آپس میں لڑ جھگڑ کر بہنوں کے درمیان کشیدگی پیدا نہیں کر رہے۔ جس مشترکہ گھر میں جاو بچوں کی وجہ سے ناراضی غصہ قطع رحمی اکثر کلی محلے میں سیانے سمجھ دار شخص بچوں کی وجہ سے باہم دست و گریباں ہیں اور ایک ہمارا گھر ہے مثالی اور قابل تعریف جو سراسر ار تفضی بچے کی محبتوں اور دوستانہ رویے کی مرہون منت ہے۔“ اماں کو موقع ملے اس کی تعریف کرنے کا۔ دو بہن گھنٹے تو آرام سے نہیں جاتے پھر۔

”ہاں وہی ہے میری تمام درد مری کا باعث۔ ورنہ میرے بس میں ہوتا تو کب کا یہاں کا یہاں اور وہاں کا وہاں کر چکی ہوتی۔“ ہتھیالی پہ مکا مارتے ہوئے وہ بے بسی سے بولی۔

”کیا مطلب۔۔۔ تو بیچوں بیچ دیوار اٹھاتی؟ گھر کے دو ٹکڑے کرتی؟“ اماں کی تیوری چڑھی تھی۔
 ”ہاں بالکل۔۔۔ جب چوسے لہے و جل رہے ہیں تو صحن بھی تو دو ہو سکتے ہیں۔“ وہ بے خوبی سے بولی۔
 ”نا ممکن ایسا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تیرا باا اور چاچا بس دو ہی بھائی۔ ان میں بھی تفریق ہو؟“ انوں میں

محبتیں ہوں، زویوں میں عزت ہو، تو ایسی خواہش کوئی بد خواہ بھی نہ پالے جو تو پال رہی ہے اور تو بھی اپنے دل میں وسعت پیدا کر۔ مزاج میں نرمی لاس۔ زبان کو مٹھاس سے ترک۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلنا کڑھنا چھوڑ دے۔ ساری زندگی تو نے یہیں بتالی ہے۔ اسی گھر میں۔ ان ہی رشتوں کے درمیان۔“
 وہ جو جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اماں کی بات پہ کھم سی گئی۔

”کیا مطلب اماں!“ اور پھر لمحوں میں ان کی بات کی تہ میں چھپے مفہوم کو سمجھتے ہی اس کے سارے حواس جھٹکا کھا کر رہ گئے تھے۔



ماہی آوے گا تے بھیاں نال و سہری سجاولاں گی اونوں دل والے رنگے پٹنگ تے بھیاں گی شوخ گنگنا نہیں لبوں پہ سجائے خواباں نے گھر کے کونے کونے کو خوب رنگا کر حکایا تھا۔ ساتھ میں اپنا چہرہ بھی۔ بھنوں کی گناہیں ٹیکھی کیں۔ شوخ گلانی ڈیزائنوں کاٹن کے سوٹ کے ساتھ گلانی گلوں سے لبوں کو تزئینا۔ آخر اماں کی امیر کبیر کزن قندیل آنٹی اپنے دیور کے لیے اس کا رشتہ لے کر آرہی تھیں۔ پسند تو اسے خاندان کے کسی فنکشن میں کر چکی تھیں، مگر آج تو باقاعدہ طور پر رشتہ لے کر آئی تھیں۔ یہ لمبی سیاہ چمکتی کار میں کیا کیا اہتمام نہیں کر ڈالا تھا خواباں نے۔

”قورمہ، بریانی، مکھن چکن، کسٹور سب کچھ دل اور لگن سے بنایا اور شرمگین اداؤں سے قندیل آنٹی کے پہلو میں بیٹھ کر ایک ایک چیز بڑے اصرار و محبت سے انہیں پیش کی۔“

”آنٹی! یہ سب کچھ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے تیار کیا ہے؟“ اماں کو اس موقع پر اس کے سکھراپے و ہنرمندی پر روشنی ڈالنی چاہیے تھی، مگر کیا کیجیے وہ ایسی بے نیازی بیٹھی تھیں کہ ناچار اسے ہی اپنے لیے تحریریں پیرا گراف پڑھنا پڑ گیا تھا۔ قندیل

آئی کی خوش اخلاقی تو دل کی خوش محمی کو پکھ لگا کر اڑائے جا رہی تھی مگر کھانا کھاتے بلکہ چکھتے ہوئے ان کے تاثرات ہرگز بھی حوصلہ افزا نہ تھے۔ خیر الوداعی مصافحہ خوب بھیج بھیج کر کیا گیا۔ (صرف اس کے ساتھ) مگر دروازے پہ کھڑی اپنی سیاہ چمکتی کار کا حشر دیکھ کر قندیل تو قندیل خود خوباں بھی چمکا کر رہ گئی تھی۔ کار کے بونٹ پر لمبی لمبی کھروچیں پڑی ہوئی تھیں۔

”گاڑی کے ساتھ کس نے اتنا ہیمانہ سلوک کیا ہے؟ کس نے اپنی موت کو آواز دی ہے؟“ دو چار تھپڑوں سے اس نے لمحوں میں بچوں سے سچ اگلا لیا۔ ”ار تفضی بھائی جان نے کہا تھا کہ تم لوگوں کی ڈرائنگ بہت اچھی ہے۔ ساہ پیپر تو کچھ بھی بنانا آسان ہے۔ بونٹ یہ کچھ تخلیق کر کے دکھاؤ تو لائیں۔“ ضعی نے دہکتے گال پر ہاتھ رکھ کر روتے روتے کہا تھا۔

”ار تفضی امین! آئی دل کل یوں۔“ غصے سے کھولتے ہوئے وہ لوس کی تلاش میں چاچا جوائی ساڈیہ آئی جتنا وہ بریانی کے بڑے بڑے نمے نمے سے لیتا نظر آگیا۔ ”واہ کرن! تمہارے ہاتھوں کے سواد کا جواب نہیں۔ واللہ مہربان گرامی یقیناً“ خوب سیر ہو کر کھانے کے بعد کھانا ساتھ میں بھی لے گئے ہوں گے۔“ وہ اس کے بیوی سے پر خ پڑتے چہرے کو محفوظ کن انداز سے دیکھتے ہوئے تخریبی انداز میں بولا۔

”ہائیں! اسے کیسے پتا چل گیا کہ مسانوں نے کھانا اچھی طرح نہیں کھایا۔ صرف چکھ کر چھوڑ دیا اور یہ اس وقت کھا بھی میرے ہاتھوں کی مکی بریانی رہا ہے۔“ اس کے ذہن میں کچھ غلط ہونے کا سنگل بجاتا تھا۔ ”ورا“ لائے قدموں بچن میں لوٹی۔ چپ چاپ پرسکون تاثرات کے ساتھ سارے کھانے چھپے، مٹکین فروٹ، کسٹرز، مٹھی بھر نمک سے زہر بنا قورمس۔ ”ار تھو۔“ یہ کھانا تو اس نے نہیں بنایا تھا۔

”اماں!“ وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی۔ ”آج فیصلہ ہو کر رہے گا کہ اس گھر میں یہ ذلیل شخص رہے گا یا پھر میں۔“ نارے غضب کے اس کے سرخ چہرے سے

پیسندہ ٹپک پڑا تھا۔

”اس کڑکتی روپہ میں تم کہاں جاؤ گی؟“ اماں کو یوسفی صاحب بروقت یاد آئے تھے۔ اوھر خوباں نے اپنے بال دونوں مٹھیوں سے بھیج ڈالے، حالانکہ خواہش اس وقت ار تفضی کے بال کھینچنے کی ہو رہی تھی۔

”قندیل آئی نہیں تو ناسی۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ خوش شکل ہوں۔ اچھا پکا لیتی ہوں۔ بچپن سے گھر سنبھالتی آئی ہوں۔ اپنے مستقبل کی چنداں فکر نہیں، بس اس منحوس انسان کی شکل مجھے نہیں دیکھنی۔“ قندیل آئی! بے چاری کا اتنا نقصان کر دیا اس کھٹیا انسان نے۔“ بولتے بولتے اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔

”قندیل کے ساتھ تو خوب ہوا۔ بڑی مائی شوبان۔۔۔ ہماری ایسی گاڑی، ہماری ویسی گاڑی۔ جیسے ہم نے تو کبھی گاڑی دیکھی نہ ہو۔ ہونٹ۔“ اماں نے نخوت سے سر جھٹکا تھا۔

”ہاں تو کہاں سے دیکھ لی آپ نے ایسی سپر لگژری کار؟ ساری زندگی تو ابا کے ساتھ اسکول پر سفر کیا۔ اسے اماں کی یہ بے نیازی پسند نہ آئی۔

”اتنی لمبی حیاتی میں کوئی گاڑی نہیں دیکھی۔ گھر کے سامنے بازاروں میں بولی دی میں ہزار دفعہ گاڑیاں دیکھی ہیں اور وہ تو کس خوشی میں دوڑ دوڑ کر قندیل کی خاطر تو واضح کر رہی تھی۔ ہماری طرف سے صاف انکار ہے۔ بقرہ عید کے تیسرے دن تیرے ابا کا تجھے ار تفضی

کے ساتھ وداع کرنے کا ارادہ ہے۔ تو اپنا ذہن بنا لے۔“ اماں کا انداز حتی اور دو ٹوک تھا۔

”اماں! تیری اور چاچی کی پلٹن کی غلامی مجھ سے ساری عمر نہیں ہوگی۔ ہر وقت حج حج، شور، ہنگامہ، زندگی میں ایک لمحہ یاد نہیں جو میں نے سکون سے گزارا ہو۔ ایک برس سکون، خاموش، قرینے اور سلیقہ والا خوب صورت سا گھر میرا خواب ہے۔ جہاں کوئی ڈسٹربنس نہ ہو۔ کوئی اٹھنا نہ ہو۔ آپ اور ابا کا بکرے کے ساتھ ساتھ میری بھی قربانی کا ارادہ ہے۔ گویا۔“ وہ

نروٹھے پن سے بولی۔ "ماں کا اندازہ ہنوز سابقہ تھا۔"

سلمان اور پچھل لاڑ۔ "اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سامنے دیوار پہ نظریں جمائے وہ بیگانگی سے بولی تھی۔"



براؤن شلوار سوٹ میں ارتضیٰ کی بلند قامتی نمایاں ہو رہی تھی۔ سلیٹھ سے جمے بال، لباس سے ارتضیٰ مسحور کن خوشبو اور اس پہ مستزاد اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں اس کے لیے جمع ہوتی توجہ دوڑ گئی۔

"اچھا تو مہمانان گرامی کیا چیز شوق سے کھانا پسند کریں گے۔ وہ بھی بتا دو، تاکہ لینے میں آسانی رہے۔"

خوش دلی سے بولتا ہوا وہ دو قدم آگے آیا۔ نظریں اس کے تروتازہ صاف ستھرے مہکتے سراپے پہ جمی تھیں۔

وہ ہمیشہ اسے ایک ہی حلیے اور ایک ہی سراپے میں صبح شام نظر آتی تھی۔ میلے کھچے کپڑے، کچھے بکھرے بال، ابھی ہاتھ میں جھانڈا اور اگلے نلکے والے ہنڈیا

شڈاپ، شڈاپ، شڈاپ، فرش کے ساتھ ساتھ جوں کی بھی خوب دھلائی کرتی۔ ان کی شرارتوں پہ

خوشی، کلسٹی، بیڑا، آرام سکون کی کمی، ہر وقت شور مچانے اور کام کی زیادتی، نالہ و فریاد بلند کرتی۔ مگر آج معمول سے ہٹ کر اتنی مختلف، منفرد اور دل آویز لگ رہی تھی کہ ایک اچھوتے، انوکھے اور دلچسپ احساس نے ارتضیٰ کے دل کو محسوسات کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ دل کی دھڑکنوں سے ارتضیٰ کو بھی دھبی مٹھی

سلی تال ایک عجیب سی خواہش اس کے من میں جگائے جا رہی تھی کہ وہ اس سامنے کھڑے سر بالوں نواز کو کچھ دیر اور دیکھے۔ دیر تک دیکھے۔ اور وہ اس کے دیکھنے پہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔

شام کے چار بجے ہی بچوں کا میلہ ایک ساتھ گھر میں داخل ہوا ٹوکیٹ زور سے دھڑو دھڑایا تھا۔ جیسے بنیاد سے اکھڑنے کو ہو۔

"یا وحشت! بچے ہیں یا طوفان۔۔۔" کوفت سے بدبو داتے ہوئے اس نے خشک ہوتے بال پونی میں باندھے اور باہر نکل آئی۔ مہمان ابھی تک نہیں آئے تھے اسے عجیب سی بے چینی نے آن گھیرا۔ باہر کے

قدیل آنٹی اگلے ہفتے پھر ایک چمکتی دکھتی گاڑی کے ساتھ ان کے گھر آئیں۔ اس دفعہ گاڑی کا رنگ سفید اور ہمراہ آسٹریلیا پلٹ اکلوتی نند شیریں تھی جو دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کے چھوٹے لاڈلے بھائی کے لیے کون سا جوہر خاص تلاش کیا گیا۔

"پچھلی بار کی اتنی عزت افزائی کے باوجود بھی دوبارہ آمد کی وجہ۔۔۔؟" ماں کو اچنبھا ہوا۔

"دیر ماں! اسے کہتے ہیں دل کی سچی لگن اور مراد کو پانے کی جستجو۔ میں انہیں پسند آئی ہوں تب تو سنا ہے۔"

پچھلی بار انہوں نے دل میں لائے بغیر پھر آپ کی چونکھٹ پہ حاضر ہیں۔ اس نے خوشی سے جھومٹے ہوئے ماں کو کندھوں سے تھام لیا تھا۔ فوراً "خوب صورت اور"

اشافلیٹ سٹائلا اور گاڑی کنٹرول سوٹ نکال کر زیب تن کیا۔ غسل کے بعد لے سلی لائے بال سلجھا کر یوں ہی کھلے چھوڑ دیے تھے۔ ہلکی سی خوشبو میں خود کو بھگوایا۔

"کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ کا خرچہ۔ آج ذرا انکار کھل کر اور واضح طریقے سے کرتی ہوں۔" اس کی تاروں پہ پھل پھل ہوتی انال نے رکھائی سے کہا تھا۔

"ہاں آج خود کچھ لگ نہیں کرتی۔ بازار سے کچھ

منگوا لیتی ہوں۔ وہ خبیث انسان گھر پہ موجود ہے۔ نظر بچا کے کوئی بھی کیننگی کر سکتا ہے۔" صد شکر بچے

اکڈمی پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ سوان کی طرف سے اطمینان تھا۔ مگر سامان منگوانے کے لیے بھی تو کوئی بندہ درکار تھا نا۔ وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی چاچا کے پورشن کی طرف چلی آئی۔ ارتضیٰ کہیں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ کف کا بٹن بند لگاتے ہوئے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"وہ ہمارے کچھ گیسٹ آرہے ہیں۔ کچھ بیکری کا

”خوبان!“ ایک بیٹھی، ڈھیلی اور دل نشین آواز اس کی پشت پہ ابھری تھی۔ بالکل میکانکی انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ قندیل آئی بیٹھی مسکان چہرے پہ سجائے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک بے حد قیمتی شارٹ ایئر ایڈڈ کرتے اور پینٹ میں ملبوس کوئی بے حد مارڈرن خاتون تھیں۔ جن کے چھوٹے چھوٹے بال سُرخ رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ رنگ بے حد گورا اور چینی چینی آنکھوں میں حیرت ہلکورے لے رہی تھی۔

”ہا! یہ لوگ آ بھی گئے۔“ حیرت، صدمہ، دکھ نہ جانے کون کون سی کیفیات نے اسے سیڑھی پہ کھڑے کھڑے منجمد کر دیا تھا۔ نہ سر ہونٹا، نہ پاؤں میں چپل، ہوا سے اچھے بکھرے بال، پسینے سے تر سر، سُرخ چہرہ۔ اماں مہمانوں کو اندر لے گئیں اور بیٹھی میٹالی ڈبیر میں شام کا سلونا رنگ گھانا توہے جان قندیل سے چلتی ہوئی رانی اور عین صحن کے بیچ پھسکا مار کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد چاروں اطراف میں مضمون، عمل، افراد خانہ کے خوباں رحیم کو زار و قطار روتے ہوئے دکھاتا ہتھیلیاں سُرخ فرش پہ جمائے، سر جھکا کر وہ پناہ آفسو بہنا رہی تھی۔ کسی میں اس کے قریب آنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ ماسوائے دو مضبوط پیروں کے جو مضبوط چال چلتے ہوئے اس کے تعجب آئے اور آکر رک گئے۔

”اٹھو شاہاش۔ جا کر منہ دھو لو۔ بچے تو بچے قربانی کے بکرے بھی تمہیں حیرانی سے دیکھ رہے ہیں۔“ پچکارتا ہوا نرم، دوستانہ، انداز۔ آنسو تو ٹھم گئے، مگر وہ ہنوز ساکت بیٹھی براؤن لیڈر چپلوں میں مقید صاف ستھرے پیروں کو گھورتی رہی۔

”یقیناً تمہارا دل اس وقت میرے سر کے گھنے بال نوچنے کو چاہ رہا ہوگا۔ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ کھسوٹنے کی خواہش دل میں مچل رہی ہوگی۔ تو چلو پوری کر لو اپنی خواہش۔ کہتے ہوئے وہ سامنے جم کر بیٹھ گیا۔ نکالو اپنی کھولن اور کھاؤ اپنا غصہ۔“ وہ چپ رہی تھی۔ ”تمہاری قندیل آئی کی بدلیسی سندھیریں

منظر نے تو لمحہ بھر کے لیے اس کی بصارت الجھالی تھی۔ سارے بچے چکن سے برآمد ہو رہے تھے اور ہر بچے کے ہاتھ میں گھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز تھی۔ کسی کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کائن تو کسی کے ہاتھ میں برگس۔ ارضی نہ جانے کب سامان لے آیا تھا جس پہ بچوں نے ہا ایل ریاتھا۔

”کینے، ذلیل، ناہنجار!“ مارے دکھ کے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ ”تم لوگوں نے میرے مہمانوں کی خاطر کاسلمان نہیں اڑایا، بلکہ اپنی شامت کو آواز دی ہے۔“ غصے کی آندھی نے اسے بگولے کی طرح گھما دیا تھا۔ بھاگ بھاگ کر بچوں کو پکڑا۔ خوب پھٹ کر بڑے بال نوچے۔۔۔

”نایہ تم لوگوں کی دعوت کے لیے میں نے سنگوا گئے تھے۔“ دکی جس کے منہ میں برگر پھنسا ہوا تھا۔ خواہوار تیوریوں کے ساتھ اسے اپنی جانب پھرتا دیکھ کر گھٹھیا ماہوا پیچھے ہٹا۔

”آپا! تمہیں تو ارضی بھالی بنے کہا تھا کہ آپ کی اور ان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔ اس خوشی میں وہ یہ سارا سامان ہم بچوں کے لیے لائے ہیں۔“ اس کی بے رحمانہ تاثرات والی آنکھوں میں سہمے سہمے انداز سے دیکھتے ہوئے دکی دیوار کے ساتھ لگی بانس کی سیڑھی سے جاگتا تھا۔

”کھہر تجھے بتاتی ہوں یہ کسی کی منگنی کی ضیافت تھی

یا تمہاری موت کا اہتمام۔“ دانت کچکاچتے ہوئے وہ دکی پر جھپٹی۔ دکی سیڑھی پہ چڑھا اور چڑھتا گیا۔ جان کو لالے جو پڑ چکے تھے۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔ سر پہ خون سوار ہو چکا تھا۔ پاؤں سے دوٹی چپل کب کی نکل چکی تھی۔ چوتھے قدم پر دکی تو نہیں البتہ اس کی ایک ٹانگ ضرور اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ ایک کندھے پہ ڈالا ہوا ریشمی سبک دوپٹا ہوا کی تندی سے پھر پھڑاتا ہوا اڑا اور ساتھ والی منڈیر پر جا کر اٹک گیا۔

”اب بول۔۔۔ کس کی منگنی کی دعوت اڑائی ہے تم نے؟“ زور سے ٹانگ کھینچتے ہوئے وہ زور سے چلتی آئی تھی۔ خود کو چھڑانے اور وہ کھینچنے میں مصروف تھی۔

صاحبہ کو ایسی لڑکی اپنے بھائی کے لیے بالکل پسند نہیں آئی جو محض کھانے پینے کی اشیاء کی خاطر اپنے بس بھائیوں اور کزنز کی پٹائی کر ڈالے۔ ایسی لینگھوٹج ایسے درڈز نوٹو بچوں کے سامنے بالکل بوز نہیں کرنے چاہئیں۔ ایسی لڑکی ہماری جزییشن کو کیا سکھائے گی جو گھر کے بچوں کو ایسے نیگٹو لیئرٹ کر رہی ہو۔“ وہ شیرس کے الفاظ — دہرا رہا تھا۔

”بس لڑکی نے تھپڑ مار دیا، بھانگم دوڑ میں دوڑنا دوتی گم ہوئے تو لڑکی ٹوٹتی رہی کٹکت۔ چہ چہ پسند کا دائرہ اتنا سٹچی اور محدود۔ اور ایک ہم محبت کرنے والے۔۔۔۔۔ ہماری محبتوں کی دسمتوں کو بھلا کون ناپ سکتا ہے۔“

”محبت؟“ خواباں نے چونک کر کافی دیر سے جھکا ہوا سر جھکے سے اٹھایا تھا۔

”میں محبت جو میں نے تم سے بے حد بے حساب کی ہے۔ آج سے نہیں روز اول سے۔۔۔۔۔ وہ اس کی سُرُخ سُنَاک آنکھوں میں چھانکتے ہوئے گھرے گئے میں بولا تھا۔“ بڑوں کی خواہش اور ارادے سے قبل ہی مجھے محبت کی دلفریب خوشبو نے اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا تھا۔ ماں البتہ اس خوشبو کی لپٹیں تم تک کبھی شاید اس لیے نہ پہنچ سکیں کہ تم بچوں کی شرارتوں کا کام کے کھیلوں کی دکھن کے دھوئیں میں ہی چھپی رہتی رہیں۔“

ایک تو لفظ محبت اور سامنے والے کا جان لیوا حد تک دل نشین اظہار وہ دل کو بگٹ بھاگنے سے کیسے روکتی۔ کم بخت سلمے جو اظہار محبت کرتا تو کم از کم بچوں کے دیے دکھ تو جھیلنے میں آسانی ہوتی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

”اور قربان جاسے اس محبت کے جس کے صدقے محبوب کے سب ظلم وجود معاف ہر خطا سر آنکھوں پر۔ جان سے عزیز بس بھائی پٹ رہے ہیں۔ ان کے مقصوم سے گال سُرُخ کیے جا رہے ہیں۔ بال نوچے جا رہے ہیں، مگر کوئی حرف شکایت زبان پہ نہیں۔“ بولتے بولتے ار تضحی شرر ہوا تھا۔

”ہو نہ مقصوم! مجھ سے پوچھو ان مقصوموں نے میری زندگی کس حد تک اجیرن کر رکھی ہے۔ ناک تک عاجز کر رکھا ہے مجھے۔“ وہ ایک دم سے تڑخ کر بولی تھی۔ ”آخر ہونا ان شیطانوں کے ٹولے کے بڑے بھائی، سائڈ بھی ان ہی کی لوگے، ار تضحی بے ساختہ بس رہا تھا۔

”یار! کیوں ان بچوں کی شرارتوں کو دل پہ لیتی ہو۔ منتے بستے گھروں میں سو بکھیڑے ہوتے ہیں پھر انہیں ہسی خوشی سمیٹ بھی لیا کرو۔ ہم دونوں کے مشترکہ بس بھائی ہیں۔ ذرا پیار و محبت سے ڈیل کرو تو دیکھو میری طرح یہ تمہارے بھی گن گاتے نظر آئیں گے اور ویسے بھی تمہاری یہ سُنیشن بالکل بے جا ہے کہ بچے ساری زندگی یوں ہی بچے بے تمہارے لیے پراہلمز کھڑی کرتے رہیں گے۔ نہیں بچہ ہی ایک دن بڑے ہوں گے۔ سمجھ اور شعور آجائے گا۔ پھر کا پے کی پریشانی۔۔۔۔۔ وہ بڑے بچے اور دلنشین انداز میں اسے سمجھا رہا تھا، قائل کر رہا تھا۔ خواباں کا سر بے توجہی میں اشارت میں ہل گیا تھا۔

”ویسے ایک سُنیشن اور بھی ہے۔“ مکن کی لہجہ کھجائے ہوئے وہ بولا۔

”وہ کیا؟“ خواباں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”تمہیں بچوں کی شرارتیں ہی لگتی ہیں، مگر جب میرے اور تمہارے ماں ابابا کی اولاد جان ہو رہی ہوگی تو اس وقت تو ہمارے اپنے ذاتی بچے بھی تو اس گھر میں ان ہی چاچاؤں اور ماموں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ضرور تمہیں دق کریں گے۔“ بولتے بولتے ار تضحی کا لہجہ گھپھ اور شرر ہوا تھا۔ نظریں اس کے سُرُخ چہرے پہ لگی تھیں۔

”بد تمیز نہ ہو تو۔ بے شرم۔“ چہرے پہ اچانک در آنے والی حیا کو چھپانے کی خاطر خواباں نے سُرُخ دوسری طرف موڑ لیا۔ پھر چلا کر بولی۔ ”رزم! اس بکرے کو روکو، جو رسی تڑوا کر گھاس کھیتے ہوئے ہماری سائڈ پہ آ رہا ہے۔ ان اس کی میٹنیاں۔“

طراپس

اور وہ چاہ کر بھی اماں کو سمجھا نہیں پاتی کہ دل اور دماغ تو اللہ نے اسے بھی عطا کیے ہیں، جب ہی تو وہ عمو آپائی دہری چالوں کو سمجھ جاتی ہے، بس اس کا مزاج عمو آپا کی طرح دودھ ماری تلوار نہیں تب ہی تو وہ عمو آپا کے تابدنوڑ حسلوں کا جواب نہیں دے پاتی، مگر اس نے خود کو ”زنی“ جان کر اور اماں کی عزت اسے کو ”نثار خانہ“

تسلیم کر کے خاموشی کا سینن یاد کر لیا۔ مگر عمو اتا نے اپنی روش نہیں چھوڑی تھی۔ کیونکہ وہ کسی کو ہاتھ نہ دیا تھا، سے گنوا کر اس کی نظروں میں چھوٹی بننا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ لاکھ دامن بچا کر نکھنا چاہتی، مگر عمو آپا کا نشانہ تھا کہ جو کتا ہی نہیں تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے وہ بیوی کوئی من پسند ڈراما دیکھنے میں مگن تھی کہ عمو آپا اس کے سر پر آ پھینچیں۔

”قاریہ! اب آگے ہیں۔ ذرا ان کو دو گرم روٹیاں تو ڈال دو۔“

”آپا تمہیں پتا ہے میں بس یہ ہی ایک ڈراما دیکھتی ہوں۔ یہ میری پسندیدہ ڈائجسٹ رائٹر کا ڈراما ہے۔ تم ابھی روٹی ڈال دو۔“

”تمہارے رات کے برتن بھی میں دھو دوں گی۔“ اس نے بی بی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے لجا جیت بھرے لہجہ میں منت کی۔

”میں ضرور ڈال دیتی، مگر اماں کا ذرا بی بی ہائی ہوزیا ہے تو میں ان کے سر میں تیل ڈالنے جا رہی ہوں۔ تم ریسیٹ میں دیکھ لینا۔“ عمو آپا تو عمو آپا تھیں۔ کہہ کر نکل گئیں اور وہ لب بلبھیختے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور کچھے دل کے ساتھ روٹی ڈالنے کچن میں چلی آئی۔ اسے قسط نکل جانے کا افسوس تو تھا، کیونکہ چن دو بارہ قسط لٹر ہوئی تو اس وقت وہ خود کالنج میں ہوتی تھی۔ بسا تھ ہی

دماغ پر لاکھ زور دینے کے باوجود بھی اسے خاک بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر عمو آپا کو اس سے یہ اذلی قسم کا بیری کیوں تھا اور وہ اس سے پورے پانچ سال بڑی ہونے کے باوجود اس بڑے پن کا عملی ثبوت دینے کے بجائے ناصر ف اپنے بڑے ہونے کا اسے خوب احساس دلاتیں بلکہ مکمل فائدہ بھی اٹھاتیں۔ کبھی کبھی عمو آپا اسے کسی سیاست دان کی طرح دکھائی دیتیں جو انتہائی مہارت سے اپنے مہرے چلتے ہیں اور پھر بھی اپنے لیے ہر محصومیت کا خول چڑھاتے رکھتے ہیں۔ قلق تو اسے برا بھی تھا کہ اماں جان بچ اور غلط کا فرق جانے کی تصدیق کیے بنا صرف کمروں کے فرق کے باعث عمو آپا کو سچا اور درست اور اسے جھوٹا اور غلط ثابت کر دیتیں اور کبھی جو وہ احتجاجاً آواز حق بلند کرنا بھی چاہتی تو اماں اپنا خانہ اس اماں پر دکھاتے ہوئے یا اسے گھوریوں سے نوازتے ہوئے صاف صاف کہہ دیتیں۔

”بات سنو فارسی لہی! مجھے نہ لنگھاؤ کیا عطا ہے؟ کیا صحیح۔ میری بھی آنکھیں ہیں۔ عمارہ گھر کی بیوی بیٹی ہے اور وہ عمر میں بھی تم سے بڑی ہے۔ اس لیے اس کی بات ماننا اور اس پر عمل کرنا تم پر فرض ہے۔“

”لو جی کر لو گل!“ اور جو بھی اماں کی ممتا اس کے آنسو دیکھ کر جاگ جاتی تو وہ اسے سینے سے لپٹا کر جسمانی طور پر اپنے قریب تو کر لیتیں، مگر دل ان کا عمو آپا کی حمایت میں دھڑکتا رہتا۔

”ارے میری گڑیا رانی۔ نہ میں تمہاری دشمن ہوں نہ وہ۔ اب دیکھو وہ تم سے بڑی ہے۔ سمجھ دار ہے جو کہتی ہے تمہارے بھلے کے لیے یہی کہتی ہے تمہاری اپنی بلا جو دل میں بغض لیے بیٹھی ہو۔“

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو اسے لگا کہ اس کے دل کی ساری کلفت دھل گئی اور اس نے دل ہی دل میں خود کو گھر کا ڈرامے کا کیا ہے۔ وہ تو آتے ہی رہتے ہیں، مگر ابا کی یہ دل سے نکلی دعائیں قدر انمول ہے، شکر خدا کہ وہ اس دعا سے محروم نہ تھی۔ پھر اسے اماں کا خیال آیا تو وہ اٹھ کر اوپر کی منزل کی جانب چلی گئی،

یہ دکھ ابھی تھا کہ ہر بار اسے عمو آبا کی ہی کیوں مانتی بیٹی تھی۔ اسی سوچ کے ساتھ اس نے ایک چولہے پر لوکی گوشت کا سالن گرم کیا اور جلدی جلدی دو روٹیاں ڈال کر چنگیری میں رکھیں اور پھر کھانا ٹرے میں لگا کر تخت پر بیٹھے ابا کے پاس چلی آئی۔
 ”جیتتی رہو میری پیاری بیٹی۔“ ابا نے شفقت

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**



”خدا کو مانو فاربیہ۔ تمہیں تو بالکل کپڑے کی پہچان نہیں۔ ان کس قدر داہیات کھر ہے یہ اور فلاں رنگ تو تم پر سوٹ ہی نہیں کرے گا۔“ جیسے جملے کہتے کہتے آخر انہوں نے اس کی پسند کو سرے سے پس پشت ڈال دیا اور اپنی پسند کی شاپنگ سے شاپنگ بیگز بھر لیے۔

”ارے عمو بیٹا یہ تو بہت مہنگے کپڑے ہیں۔ کراچی میں کون سا پورا سال سر دیاں رہتی ہیں اور اتنے سوئیٹر کیوں لے لیے اتنے تو تم لوگ استعمال کرنے والے بھی نہیں۔“ ابا نے تین تین سوئیٹر اور دو دو سوٹ دیکھ کر استفسار کیا تو وہ بول اٹھی۔

”میں نے آپا سے کہا تھا کہ اتنے کپڑے نہ لیں، مگر آپا کو تو ڈیزائنر سوٹوں اور کپڑوں کے علاوہ کچھ پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ ایسے ہی کپڑے اور سوئیٹر عام دکانوں پر نسبتاً سستے تھے۔ ہم چاہتے تو پیسے بچا سکتے تھے۔“ ابا نے کالج کو کہہ دیا، ”عمو آپا کا وار کاری تھا۔“

”رہنے دو فاربیہ! تمہیں ابھی کپڑے کی کوالٹی کا پتا نہیں۔ ان کے پیسے اتنے اور عام دکانوں والے سوئیٹر ایک سال بھی ساتھ نہیں دے پاتے۔ ارے ڈیزائنر سوٹ اسی لیے تو مہنگے ہوتے ہیں کہ ان کا عرصہ چلتے ہیں۔ قیمت کی بھی خوب وصولی ہو جاتی ہے۔“

”بیٹا کیا ڈیزائنر سوٹ سونے کے تاروں کے بنے ہوتے ہیں جو ری سیل ہو کر قیمت کی وصولی ہو جاتی ہے۔“ ابا نے مضحکہ خیز انداز میں، ”عمو آپا کی تصحیح کرنا چاہی۔“

”ارے میری عمو سمجھ دار ہے۔ وہ بڑی ہے۔ فاربیہ ابھی کم عمر ہے، اسے ایسی باتوں کی سمجھ کہاں۔ لاؤ بیٹا، واقعی رنگ تو بڑے شان دار ہیں۔“ اماں نے حسب روایت عمو آپا کو حق کی سند جاری کر دی تو ابا نے اور اس نے کھسک جانے میں ہی عافیت جلی اور عمو آپا فاتحانہ انداز میں پورے تقاضے کے ساتھ اماں کے پہلو میں جا گزریں ہو کر اپنی شاپنگ دکھانے لگیں۔

جہاں اماں اور ابا کا مشترکہ لہرے تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔ اماں سلانی کر رہی تھیں۔

”اماں! آپ کی طبیعت خراب تھی تو آپ آرام کرتیں نا۔“ وہ ان کے برابر میں جا بیٹھی تھی۔

”اے ہائے مجھے کیا ہو گیا۔ میں ٹھیک ہوں اللہ کے کرم سے۔۔۔ یہ عمو کی قمیص سی رہی تھی۔ اس کی دوست فرح کی بہن کی شادی ہے نا پرسوں، تو فرمائش کر کے خاص ڈیزائن بنوایا ہے مجھ سے۔ کوئی رسالہ لائی تھی۔ وہاں الماری میں رکھا ہے۔ تم بھی دیکھ لو کوئی پسند ہو تو تمہارا بھی سی دوں۔“ اماں نے حسب عادت بنا پوچھے ہی سب تفصیل بتادی۔ وہ یوں ہی تفصیلی گفتگو کرنے کی عادی تھیں۔

”تو کیا کہاں ہیں؟“ اس نے دل میں آئے شبیر کی تصدیق کرنا چاہی۔

”وہ فرح کے باں ڈھولکی ہے وہاں گئی ہے اور ہاں اسے دیر ہو جائے گی۔ تم ذرا برتن دھو لینا رات کے۔ میں یہ سلانی ختم کر کے نماز پڑھ کر سو جاؤں گی۔ فرح اور اس کا بھائی بچھوڑ جائیں گے عمو کو۔“ اماں اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے واپس سلانی میں جُست کیں وہ ہمیشہ کی طرح صرف کلس کر رہ گئی۔ کیونکہ اماں کے آگے دکھڑا رونابے سوو تھا، وہ اسے کام چور کے القابات سے نواز دیتیں، سو وہ چپ چاپ اٹھ کر واپس کمن میں آگئی اور سنک میں بھرے برتن دھونے لگی۔



موسم بدل رہا تھا۔ اماں کے جوڑوں کا درد بھی زور پکڑ رہا تھا۔ شام کی خنکی سرما کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ اسے میں اماں نے دونوں بہنوں کو موسم کے حساب سے کپڑوں کی شاپنگ کے لیے بھیج دیا۔ عمو آپا تو ویسے بھی شاپنگ کی دلدادہ تھیں۔ البتہ اسے افسوس ہوا کہ وہ کیوں چلی آئی، کیونکہ ہمیشہ کی طرح اور ہر بار کی طرح عمو آپا کو اس کی پسند کی ہوئی ہریشہ عیب دار نظر آ رہی تھی۔

دوستینیں جیسی بھی انسانی لمس و جذبات کا نعم البدل نہیں ہو سکتیں، مگر میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں اماں۔ کیونکہ والدین کی رضامندی میں ہی اللہ کی خوشنودی ہے۔ وہ سر جھکا کر کہہ کر چلی گئی اور عمو آپا نے فخر سے گردن اکرالی، کیونکہ دراصل ان کی دانست میں انہوں نے اپنے بڑے پن سے مسئلہ حل کر دیا تھا۔



”اللہ کا بڑا کرم ہے، اس نے میری عمو کو اتنا اچھا برا دیا۔“ عمو آپا کے لیے بابا کے کزن کے بیٹے علی کا رشتہ آیا۔ جو اعلا تعلیم یافتہ تھا۔ صورت شکل میں بھی ہیرو سے کم نہ تھا اور اوپر سے ماں، باب کا اکلوتا بیٹا اور ماں، باب سال بھر قبل کے بعد دیگرے گزر گئے تھے۔ اماں تو شکرانے کے نوافل ادا کرتے نہ تھکتی تھیں۔ عمو آپا بھی تقدیر کی اس مہربانی پر خوشی کے مارے کھلی جا رہی تھیں۔ وہ بھی آپا کی خوشی میں بہت خوش تھی اور دل سے انہیں خوش رہنے کی دعا بھی دیتی تھی اور کیونکہ شکرانہ اللہ کو پسند ہے تو اماں کے نوافل اللہ نے ایسے نوافل کیے کہ آپا کی رخصتی سے بھی پہلے ان کی منگنی میں ہی فارغ ہو گئیں۔ ایک پرانی عزیزہ نے پسند کر لیا۔ مگر وہ عمو آپا جتنی خوش نہیں تھی۔

”دیکھو فاریہ اب ہر ایک کی میری جیسی قسمت نہیں ہونی کہ سسرال کے نام پر فقط ایک شوہر ہی ہو۔“ ویسے تو عمو آپا بھی بڑھا لکھا برس روزگار ہے، اب تم سسرالیوں سے گھبرا کر انکار کرو گی تو اماں، بابا کا موڈ تو خراب ہو گا۔ ساتھ میرے جیسی سسرال کے ارمان میں بیٹھی رہ جاؤ گی۔“ جانے عمو آپا اسے کتنی بھاری تھیں یا ڈرا رہی تھیں۔ وہ بس اپنی بڑی آپا کو دیکھ کر اتنا ہی کہہ سکی۔

”میں جانتی ہوں آپا جس کی قسمت میں جیسا اور جتنا ہوتا ہے اسے اتنا ہی ملتا ہے۔ اس لیے میں ہرگز اپنے سسرالیوں کی موجودگی کی وجہ سے انکار نہیں کر رہی، بلکہ میں دور نہیں جانا چاہتی اماں، بابا سے۔“ ”اوہ ہوسے۔ آج کل کے دور میں کراچی سے اسلام آباد کی دوری ہی کتنی ہے اور بے وقوف لڑکی اس کا سب اور واپس کے دور میں تم کیا یہ بووے ہمانے تراش رہی ہو۔“

”ارے ٹھیک تو کہہ رہی ہے عمو۔ روز بات کر لینا، دیکھ لینا ہمیں۔“ اماں نے عمو آپا کی دلیل کو مضبوط لہجے میں بدل لیا ثابت کیا۔

سب سے بڑا استاد وقت ہے جو بڑے بڑے استادوں کو سکھلا دیتا ہے۔ چاہے جھوٹا، کھرا، کھوٹا سب سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ یہی سب اس کی زندگی میں بھی ہوا۔ جب وہ پورے ڈیڑھ سال بعد اماں سے ملنے آئی۔ کیونکہ نئے کی آمد کی خوش خبری دیتے ہوئے اسے ڈاکٹر نے یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ وہ سفر سے پرہیز کرے، ورنہ اس کے سسرالی ماں پٹی کے رشتے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

300/-	راحت جنیں	ساری بھول ہماری تھی
300/-	راحت جنیں	او بے پروا جن
350/-	تزیلہ ریاض	ایک میں اور ایک تم
350/-	نسیم سحر قریشی	بڑا آدمی
300/-	صائمہ اکرم چوہدری	ایک زندہ محبت
350/-	سیمونہ خورشید علی	کسی راستے کی تلاش میں
300/-	عمرہ بخاری	ہستی کا آہنگ
300/-	سائرہ رضا	بل موسم کا دیا
300/-	نفیسہ سعید	ساڈا چڑیا دا چنبا
500/-	آمنہ ریاض	ستارہ شام
300/-	نمرہ احمد	مصحف
750/-	فوزیہ یاسمین	دست کوزہ گر
300/-	سمیرا حمید	محبت من محرم

بذریعہ ذاک سکھوانے کے لیے
 مکہ محمدان ڈائجسٹ
 37، اردو بازار، کراچی

جب میں چیزیں ڈھنگ سے نہیں برت سکتی تو ان کا بچہ بھی ڈھنگ سے نہیں پال سکوں گی۔ بہت چھوٹا کرویا ہے انہوں نے مجھے اپنی نظروں میں اور شاید میں اسی قابل ہوں، کیونکہ اسی بڑے پن کے گھنڈ میں، میں کیسے تمہیں ہر موقع پر نیچا دکھانے کی کوشش کرتی تھی۔ ندامت اور شرمساری سے ان کی آنکھیں اور چہرہ تر تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ عمو آپا سے کچھ کہتی ماں جو عشاء کی نماز بڑھ کر سونے سے پہلے ایک نظر اپنے نواسے کو دیکھنے آئی تھیں اور آج پہلی بار عمو آپا کے دل کا حال فاربیہ کی بدولت جان پائی تھیں تڑپ کر اندر آئیں اور عمو آپا کو گلے لگا لیا۔

”میری بچی تو نے مجھ سے کیوں نہ کہا یہ سب۔ کتنا پوچھا میں نے اس سے فاربیہ! مگر یہ بہ وقت ایک جملہ کہہ کر مجھے چپ کرادیتی کہ آپ کا وہم ہے غلطی میری نہیں میری بچی، میں سے جو تجھے غلط سمجھ کا فرق بتانے کے بجائے صرف تائید کو ہی صحیح عمل سمجھ کر کرتی رہی۔“

اماں کو اور بہن کو یوں تڑپتے دیکھ کر اس کا ذہل بڑی طرح بیٹھنے لگا، اس نے بیک وقت دونوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”اماں یہ وقت غلطیوں کے اعتراف کا نہیں۔ ان غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے ان کا نشان

مٹانے کا ہے۔ میری آپا عورت کا اصل مقام اس کے شوہر کا گھر ہی ہوتا ہے اور یہ گھر عورت کی قربانیوں سے ہی بنتا اور قائم رہتا ہے۔ تم خود کو بدل لو آپا! محبت کی خاطر، علی بھائی جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کرو۔ تم یوں خود سے لا پرواہ ہو کر ان کے دل میں بچا کچھا متام بھی کھو دو گی۔ یاد رکھو آپا! قربانی کا عمل صرف عورت کے حصے میں ہی آتا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ اس ایثار کا بدلہ تمہیں ضرور ملے گا۔“ عمو آپا اور اماں حیرت سے اپنے سے چھوٹی فاربیہ کو اتنی بڑی باتیں کرتے دیکھ رہے تھے۔

میں فاصلہ پیدا کرنے کے حق میں نہ تھی۔

اماں اتنے عرصے بعد بیٹی اور نواسے کو دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ آپا کا بھی بس نہ چل رہا تھا کہ اتنی دور سے اتنے عرصے بعد آنے والی بیٹی اور نواسے پر اپنی محبت کے ساتھ اور کیا کیا بچھاؤ کر ڈالیں۔ اماں بھی اسے یوں خوش دیکھ کر سدا خوش رہنے کی وعادے رہی تھیں۔ ایسے میں عمو آپا بھی اس کے آنے کی خبر سن کر دوڑی آئیں۔ آخر کو خون کا رشتہ تھا اور پھر اس سے لپٹ کر یوں روئیں کہ وہ انہیں سنبھالتے سنبھالتے خود بھی ہلکان ہو گئی، پھر جب ذرا دل کا غبار چھٹا تو دونوں مل کر بیٹھے اور وہ قدم قدم پر حیران ہونے لگی، کیونکہ یہ وہ عمو آپا تھیں ہی نہیں جنہیں وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

عمو آپا کا ذہل ظاہر باطن اور خالی گووا سے بے حد متفکر کر رہی تھی اور آخر کار جب کھاسے وغیرہ سے فارغ ہو کر اسے آپا کے ہمراہ اکیلے بیٹھنے کا وقت ملا تو اسے لگو لگو میں جلاتے سواتے اس نے پوچھ ہی ڈالا۔

”آپا! کیا بات ہے۔ آپ نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ کیا حالت ہو رہی ہے آپ کی۔ آپ خوش تو ہیں نا۔ اس قدر چپ چپ کیوں رہنے لگی ہیں؟“ وہ ان کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ بہن کی محبت پر عمو آپا کی آنکھیں جھاملا گئیں اور وہ بھی شاید دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھیں سو منا کچھ چھپائے اپنی ماں جانی سے دل کا تمام حال کہہ ڈالا۔

”فاربیہ! ڈاکٹر کے مطابق مجھ میں کوئی فالٹ نہیں۔ لیکن علی کی نظروں میں عیبوں کا مجموعہ ہوں میں، کیونکہ علی جیسے پرفیکٹ دیکھتے ہیں اسی قدر پرفیکٹ وہ اپنے ارد گرد موجود ماحول کو بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے وہ چیزیں ہوں یا انسان۔ انہیں ہر چیز جگہ پر چاہیے۔ وہ اپنے آگے کسی کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ گھر میں ملازم ہونے کے باوجود وہ جانتے ہیں کہ میں ان کا ہر کام خود کروں اور اتنے بڑے گھر کو جب میں ان کی مرضی کے مطابق نہیں رکھتی یا تو انہوں نے کہہ دیا کہ نہ



تُرکائی

”دو دہل مل رہے ہیں۔ مگر چپکے چپکے۔“
لاؤنج کے سفید اور کتھنی پرنٹڈ صوفے پر
اطمینان سے براہمان، ایک عالم جذب میں ڈوبا بے
دھنگے انداز سے گٹار پکڑے، وہ اپنی بے سُری اور
بھگدڑی آواز کا سُربکھیرنے کی ناکام کوشش میں بلکان
تھا۔

تھیک اس کے سامنے والے سنگل صوفے پر

ناولٹ

بظاہر دلچسپی مگر درحقیقت کوفت زدہ سے انداز میں
ہاتھوں کے پیالے میں اپنا خوب صورت چہرہ گرائے
ایس بڑے ضبط سے بیٹھی تھی۔

”سب کو ہو رہی ہے۔ ہاں سب کو ہو رہی ہے
خیر۔“ آنکھیں بند کیے وہ جھوم رہا تھا تب ہی وہ اپنے
کمرے سے خونخوار تاثرات سمیت برآمد ہوئی اپنی
داوی محترمہ سلطانہ بانو بند دیکھ پائی۔

انہیں اپنی جانب آنکھیں کر ایس بڑا کراہ کر
ہوئی اور اس نے جھومتے جھامتے ایان کو متوجہ کرنے
کی اپنی ہی کوشش بھی کی تھی مگر بے سود۔ کہ وہ
”اور جمل فنکار“ دکھائی دینے کی کوشش میں نہ جانے
سُر سلیت کے کون سے بحر میں ڈوبا ہوا تھا۔

سلطانہ آئیں۔ ایک ناراض۔ نگاہ ایس پر ڈالی
اس سے قبل کہ آنکھوں کی ناراضی زبان تک پہنچ
پائی۔ آن واقعہ میں ایس وہاں سے کھسکی۔ اب
ان کا روئے مبارک اس عظیم فنکار کی جانب ہوا۔

”دو دہل۔ ہاں دو دہل۔“

”بھاڑ میں گئے دو دہل۔“ وہ دہاڑیں۔ ”غضب خدا
کا۔ میں پوچھتی ہوں آخر کب تم ہوگا تمہارا یہ
بچپنا۔“ وہ شدید طیش میں تھیں۔ دوپہر کا وقت ان کے
آرام کرنے کا تھا اور اس وقت ایان کی آنکھیں۔

”ارے! داوی آئی۔“ جھٹ سے بڑی بڑی ساحر
آنکھیں کھل گئیں، کچھ بوکھلایا بھی، مگر خود پر قابو پا کر
گٹار کو سینے سے لگا بڑی متاثر کن جذباتیت سے گویا
ہوا تو آواز سے عزم جھلکتا تھا۔

”یہ بچپنا نہیں۔ میرا شوق ہے۔ میرا جنون ہے اور
میں اسی شوق پر مستقل میں اپنا پرویشن بنانے کا ارادہ



WWW.PAKSOCIETY.COM



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوبہری سمجھو وہ کیا خاک رات کے آٹھ بجے کھانا کھائے گا۔ بس اٹھنے کے بعد سارا دن اول جلول حلیمے میں وہ موگٹار پکڑے ہماری ساعتوں کا امتحان لیتا رہتا ہے۔ تابندہ میں تم سے پوچھتی ہوں آخر تم اپنے بیٹے کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس کب دلاؤ گی؟" سلطانہ تو صبح سے منتظر ہی تھیں۔ تابندہ از حد شرمندہ سی ہو کر وضاحت پیش کرنے لگیں۔

رکھتا ہوں۔" بہت خوب۔ اور تمہارے باپ کا چھوڑا ہوا برنس، اسے کون سنبھالے گا۔" وہ طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ "او فوہ وادی۔ مام ہیں نا۔" اس نے جیسے انہیں نا سمجھ جان کر اطلاع دی۔

"بیٹیجی وادی۔ یہ ٹھنڈا ٹھنڈا شربت صندل پیجیے۔ میں نے خاص آپ کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔" ایمین نے وادی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی سعی کی۔

"ہا ہا ہا۔ شربت ہاتھوں ہی سے بنایا جاتا ہے۔ یہاں سے تو بننے سے رہا۔" ایمین نے موقع کی نزاکت دیکھ کر اپنے غلیظ جھاڑنی ضروری سمجھی۔ "جو اب" ایمین نے اسے سخت ملا متی کھوری سے نواز کر سر کے کنارے سے وہاں سے جانے کے لیے کہا تو جیسے وہ

سب سمجھ کر وہاں سے کھسک لیا۔ سلطانہ جو "جستی رہو میری بیٹی" کہہ کر شربت کا گلاس لبوں سے لگا چکی تھیں، شربت کا خالی گلاس ایمین کو تھما کر چوٹکیں۔

"چلا گیا؟" پھر کسی قدر شکیلیگی سے بولیں۔ "آج آنے دو اس کی ماں کو۔ کرتی ہوں اس کا کچھ علاج۔" اور ایمین نے معصومیت سے سر اثبات میں ہلا دینے پر اکتفا کیا۔ ایک مرتبہ پھر ایمین نے اسے بچایا تھا۔



مگر رات ڈانگنگ ٹیبل پر پھر وہی موضوع اتفاقاً چھڑ گیا۔ اور ایمین چاہنے کے باوجود بھی موضوع تبدیل نہ کر سکی۔ بس یونہی ذرا سے چاول اپنے آگے رکھے انہیں پیچھے سے آگے پیچھے کرتی رہی۔

"بھئی ایمین کو تو بلاؤ۔ گیا وہ کھانا نہیں کھائے گا؟" یہ سنجیدہ و برو بار شخصیت، محمد علی تھے۔ ایمین کے والد۔ ایمین کے تایا۔

"جو دن کے ایک بجے ناشتا کرتا ہو۔ اس کی تو ابھی

"اماں سب کچھ آپ کے سامنے ہی تو ہے۔ میں تو خود پچھلے ڈیڑھ سال سے اسے مسلسل سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اب تو میں خود اس کی لا ابالی طبیعت سے عاجز آگئی ہوں۔ آپ ہی بتائیں کیا کروں۔" وہ چیخ چھوڑ کر سلطانہ کی شکل دیکھنے لگیں۔ "برامت ماننے گا بھابھی۔" تابندہ تھیں تو رشتے میں ان سے چھوٹی مگر وہ انہیں بھدا احترام بجائے نام لینے کے بھابھی ہی بلاتے تھے۔ مگر اب اسے مزہ ہیل و ہیل کسی طور مناسب نہیں۔ وہ جوان ہے اپنی تعلیم مکمل کیے بھی است۔ دو سال گزر چکے ہیں پھر ہی تو مناسب ترین وقت ہے اپنا کاروبار سنبھالنے کا۔ ابھی سے کام شروع کرے گا تب ہی تو دو تین سال میں اسٹیبلش ہو سکے گا۔" امیر سلاہ کا پیالہ اپنے قریب کھسکاتے ہوئے اپنے مخصوص سنجیدہ و متین لہجے میں بولے۔ مانوں۔ کچھ ناخوشگوار سا ہو چلا تھا تب ہی۔

"نام عبدال ہے میرا سب کی خبر رکھتا ہوں۔" ہاتھ میں گرم چپاتیوں کی چنگیر اٹھائے ٹمک ٹمک کر کنکلتا ہوا عبدال المعروف معصوم بچن سے نمودار ہوا۔ جس نے ہمیشہ کی طرح اپنے اچھے خاصے سر اے کی۔ "گت" بنا رکھی تھی۔ کاسنی موری بند جینز پہنی نی شرت کہ جس پر بنے چاقو کی نوک سے لہو ٹپکتا تھا اور نکتے لہو سے لکھا تھا "Kill Me"۔ کندھوں تک آتے تیل میں چڑے بال (کہ جیل وہ انورڈ نہ کر سکتا تھا) ہاتھوں کی کلائیوں میں سجے رنگ پرنگے بینڈز۔ گلے میں موٹی سی کالی ڈوری سے لٹکتا نقلی ٹکیے جڑا دل کی شکل کا بینڈنگ۔ وہ ان کے پرانے نوکر شرف

معصوم ہو۔ شکل سے پورے خبیث اور حرکتوں میں کسی پھانسی کٹنی سے ہرگز تم نہیں ہو۔
 ”میری تو کسی کو قدر ہی نہیں ہے یہاں۔ جا رہا ہوں میں کچن کی صفائی کرنے۔“ وہ منہ بسورتے ہوئے اٹھ کر چھپت ہو گیا۔

”اور تم؟“ اب وہ اس کی جانب متوجہ ہوئی جس کی خاطر یہاں چل کر آئی تھی۔
 ”ایان میں تم سے پوچھ رہی ہوں، آخر تم چاہتے کیا ہو؟“

”مجھ سے پوچھتی ہو کہ کیا چاہتا ہوں؟“ ایان نے بڑی گہری نظروں اور جان دار مسکراہٹ سے اسے دیکھا تھا۔

ایمن اس کے آن واحد میں بدلتے لہجے سے کچھ گڑبڑا سی گئی۔ سنجیدہ تاثرات کی جگہ پچھلے ہٹا ہٹا پچھو جیابنے لے لی۔
 ”ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے۔“ وہ لپکت جھپکت اپنا کنارے سے لگا کر شروع ہو چکا تھا۔ ایمن نے سخت بے بسی محسوس کی۔

”اے مومن۔ یہاں پر ہی مٹی تھے دکھائی نہیں دے رہی کیا؟“ سلطانہ نے بے دلی سے فرش پر جھانڈ چیرتے معصوم کو جھجکا۔

دن کی مخصوص مصروفیات جاری تھیں۔ امجد اور تابندہ آفس جا چکے تھے۔ ایمن چونکہ اپنا ماسٹرز مکمل کر چکی تھی اس لیے آج کل دوپہر کے کھانے بنانے کی ذمہ داری سلطانہ نے اسے سونپ رکھی تھی اور وہ یہ ذمہ داری بخوشی نبھاتی تھی۔ ان کی جزوقتی ملازمہ زری نہیں آئی تھی سو آج معصوم کی ڈبل شامست آئی ہوئی تھی۔

”کہاں ہے مٹی؟“ لگتا ہے آپ نے اپنی آنکھوں پر خوردبینی شیشے لگوا رکھے ہیں۔“ وہ از حد بیزار اور ناراضی سے بولا تو سلطانہ نے اسے جھانڈ کر رکھ دیا۔
 ”میری آنکھوں کو نظر مت لگا۔ گھر کا بنا خالص

الدين کا بیٹا تھا۔ بچپن سے یہیں تھا۔ اب شرف الدین تو رٹائر ہو چکا تھا اس کی جگہ معصوم نے چارج سنبھال لیا تھا۔ اس نے لا کر بڑے اسٹائل سے چنگیر میز پر امجد کے عین سامنے رکھی۔

”میاں عبدل“ امجد نے ایک روٹی چنگیر سے اٹھا کر بغور دیکھی ”بہتر ہے کہ تم سب کی خبر رکھنے کے بجائے اپنے کاموں پر دھیان رکھا کرو۔“ اور واپس چنگیر میں رکھ کر چاولوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”سب کی خبر گیری بھی تو میرے فرائض منصبی میں داخل ہے حضور۔“ وہ جھک کر ادب سے بولا۔ تو اس کے لب و لہجے رنہ چاہتے ہوئے بھی سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔



”وہ تو میں نے بروقت انٹری مار کر سب کی توجہ آپ پر سے ہٹا دی نہیں تو آپ کی پیشی ہو جانی بھی آج۔“ اور اب وہ اپنی کار گزار کی اسے ”پرو مشد“ کے ساتھ لیس پر پھسکا اٹارے ان کے گوشن گزار رہا تھا۔ ایان نے اپنا کنارہ پاس ہی کنارہ کیا تھا۔ رات بھیک رہی تھی۔ شفاف چاندنی چٹک چٹکی تھی۔ ماحول میں جھگی گھاس کی باس رچی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ معصوم کی ساری بات سن کر اس نے تمکنت سے سر اٹات نہیں ہلاتے ہوئے شاہانہ انداز سے کہا۔

”ہیلے ہیل دنیا عظیم فنکاروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک گیا کرتی ہے۔ مگر تم دیکھنا۔ وہ دن دور نہیں جب یہی لوگ تخریب ہر جگہ میرا حوالہ دیا کریں گے۔“

”اور وہ دن کم از کم تمہاری زندگی میں تو ہرگز نہیں آئے گا۔“ عقب سے ایمن کی غصیلی آواز سنائی دی تھی وہ دونوں اچھل پڑے۔

”اور تم! اس نے سامنے آکر کڑے توروں سے یہاں وہاں ”معصومیت“ سے دیکھتے معصوم کو دیکھ کر دانت پیسے۔“

”ذیادہ بھیک ہی کہتے ہیں تمہیں صرف نام کے ہی

سہمہ لگاتی ہوں اور تیری طرح آدھی آدھی رات جاگ کر فلمیں دیکھ کر اپنی آنکھیں نہیں پھوڑتی۔ چل، جلدی جھاڑو لگا۔ پھر میرے کمرے کی تفصیلی صفائی بھی کروانی ہے میرے ساتھ مل کر۔“

”دادی! معصوم صدمے سے چور آواز میں احتجاجاً چلایا۔ تب ہی اپنے مخصوص حلیے یعنی پیرنگی جینز جو بڑے اہتمام سے گھٹنوں سے پھاڑی گئی تھی۔ ٹی شرٹ کی آستینیں تقریباً نڈارو تھیں جس سے اس کے کسرتی بازو جھلکتے تھے۔ گلے میں واٹ گولڈ کی موٹی سی زنجیر ہاتھ میں اسٹیل کا کف جس پر اس کا نام کندہ تھا۔ کندھوں پر لہراتی زلفیں جنہیں ماتھے پر بینڈ لگا کر قابو کیا گیا تھا۔ سمیت ایان منظر کا حصہ بنا۔ منہ بسورتے معصوم نے از حد متاثر نگاہوں سے اسے بغور دیکھا کہ خود اس کا حلیہ ایان ہی سے مستعار لیا گیا تھا۔“

”خیر تو بے یہ آج سورج کدھر سے نکل آیا؟“ سلطانہ بھی چونک گئیں۔

کہ وہ سحر خیز نہ تھا اور اس کی صبح بیداری عموماً اس کے اپنے کسی کام سے ہوا کرتی تھی۔ پوچھنے کی دیر بھی وہ ایسے شروع ہوا جیسے اسے دعوتِ خطاب دیا گیا ہو۔

”آج کا دن میری زندگی کا یادگار دن بنے والا ہے۔ اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ایان علی ایک عام انسان ہے۔ مگر میرا دعویٰ ہے کہ آج شام میں جب لوٹوں گا تب دنیائے میوزک کے افق پر میرا نام کسی روشن ستارے کی مانند جگمگا رہا ہوگا اور میں ایک راک اسٹار بن چکا ہوں گا۔“

”ارے واہ اچھا۔“ معصوم کو بڑی معصوم سی خوشی ہوئی۔

”مگر ایان بھائی رات میں آپ مجھے پہچان تو لیں گے نا؟ ایسا نہ ہو کہ آپ اشارتے ہی مجھ جیسے کم حیثیت آدمی کو بھول جائیں اور آپ اشار بن کر بدل جائیں۔“ ہاتھ میں جھاڑو پکڑے وہ بہت تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

”او پیڈ انٹی کام چور۔“ سلطانہ نے ایان کی بات کا

تو کچھ خاص نوٹس نہ لیا البتہ معصوم کو اتنا ڈانا ضروری سمجھا۔

”تیرے خدشات ختم ہو گئے ہوں تو میرے کمرے میں چلا چل۔ یہاں کی جھاڑو تو دل چکی۔“ وہ آگے بڑھنے لگیں۔

ایان ایک بردبار مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا کر متانت سے بولا۔

”فکر مت کرو معصوم۔ میں تمہیں کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔ ایک تم ہی تو میرے فن کے قدردان میرے بڑے دنوں کے ساتھی ہو۔ یہ تم ہی تو ہو جسے میری۔“

”ختم کرو اپنی تقریر میاں۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہاں خالی خولی تقریریں کرتے رہ جاؤ اور وہاں تمہارے انتظار میں بیٹھے لوگ اٹھ کر چل دیں۔“ سلطانہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے ٹوک کر اندر بڑھ گئیں۔ معصوم نے ہڑبڑا کر تقلید کی۔ وہ کندھے پر گٹار لٹکائے باہر نکل گیا۔

پھر وہی ہوا جو آج تک ہوتا آیا تھا جس کے وہ منہ اور کندھے لٹکائے لاؤنج میں داخل ہوا تمام افراد خانہ وہاں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اس کا بھانڈا زور دیکھ کر سمجھ گئے کہ آج پھر اس کا دل ٹوٹ چکا ہے۔ خالی تھا اسے یوں اداس لہول اور ہارا ہوا دیکھ کر سب ہی گودھ ہوا تھا۔ کیسے نہ ہوتا؟ وہ ان سب کے دل کی دھڑکن تھا۔ سلطانہ بکے بہت پیارے چھوٹے بیٹے ساجد علی کی اکلوتی نشانی جو بھری جوانی میں انہیں داغِ مفارقت دے گیا تھا۔ وہ ہو بہو ان کی کالی تھا۔ نہ بھی ہوتا تب بھی انہیں اتنا ہی پیارا تھا کہ جگر گوشہ تو بہر حال وہ ساجد علی ہی کا تھا نا۔

امجد علی اس کی پیدائش پر اپنی سات سالہ بے اولادی کا دکھ بھول گئے تھے۔ یہ الگ بات کہ چند سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمن کی صورتِ رحمت سے نوازا دیا تھا۔ مگر ایان کی حیثیت نہ بدلی تھی۔ ان کی بیگم فرحانہ بھی اسے سگی اولاد ہی کی طرح چاہتی اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں۔ پھر ساجد کے بعد تو جیسے امجد ہی کو اس کی براہ راست سرپرستی کرنا تھی اور انہوں نے کی

”سوچنا کیا ہے۔“ اس نے ایک انداز بے نیازی سے ہیٹرہ بینڈ بالوں سے نکال کر ان میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

”اب میں ان سارے لوگوں کو اپنی Rejection (ریجکشن) کا جواب مارکیٹ میں دوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ اچھنبے سے پوچھنے لگی۔
 ”مطلب یہ ڈیسرکزن کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اب خود اپنی میوزک البم لانچ کروں گا۔“ اس نے پراسراریت سے مسکرا کر کہا۔
 ”کیا؟“ اور ایمن نے صدے سے دوچار ہو کر چلائی تھی۔

بھی۔ اور رہیں تابدہ۔ اس کے محبوب شوہر جب ان سے پچھڑے تو ایان ہی وہ سہارا تھا وہ جینے کا آسرا تھا کہ جس کی صورت دیکھ کر ان کے دل کی دھڑکن نے دوبارہ رفتار پکڑی تھی۔ اور ایمن۔

اسے خود ساجد نے ایان کے لیے مانگا تھا۔ شعور کی منازل طے کرتے ہوئے وہ دونوں اپنے مابین رشتے سے آگاہ ہوتے گئے۔ اور یہ رشتہ دل کے تاروں سے کب جڑا کچھ خبر نہ ہوئی بس خبر تھی تو اتنی کہ ایک دوسرے کے سنگ زندگی بتانے کا خواب دل کے ان ہی تاروں کو پھیڑ دیتا تھا اور ایک ایسا دھڑکنہ تخلیق پاتا کہ دونوں مسحور رہ جاتے۔



زندگی اپنی مخصوص ڈگری پر رواں دواں تھی۔ گھر کے ٹیکس اور ان کی روز کی مخصوص مصروفیات میں خلل انداز ہوا تھا اور اسٹیشن سے آنے والا وہ فون۔

جو ظاہر ہے وائٹ ہاؤس سے تو خیر نہیں آیا تھا۔ سلطانہ نے گھر میں کچھ ایسی ہی ایمر جنسی نافذ کر رکھی تھی گویا کہ امریکی صدر ان کے ہاں قیام کرنے کے ارادے سے آ رہا ہو۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ سلطانہ خاتون کی بھانجی نمبر تین امریکہ بیاہی گئی تھیں۔ جب بچہ چھوٹا تھا تو پاکستان کے چکر بھی لگ جایا کرتے تھے بعد میں اس کی تعلیمی مصروفیات نے ان متواتر لگتے چکروں کو توڑا۔ بعد میں جب ان کی والدہ دردانہ بانو اس دنیا سے کوچ کر گئیں تب وہ پاکستان کو جیسے بھلا ہی بیٹھی تھیں۔ کچھ سال پہلے آئیں تو سلطانہ بانو ہی کے ہاں ٹھہری تھیں۔ اور اب ان کا بیٹا داؤد ابراہیم ان کے گھر کو رونق بخشنے آ رہا تھا۔ کہ اچانک ہی اس کے دل میں بقر عید پاکستان میں منانے کا خیال در آیا تھا۔ خیال اسے آیا تھا اور جان معصوم کی عذاب ہوئی تھی۔

”دیکھ معصوم۔ اگر تو نے مہمان خانے کی صفائی میں ذرا جو تیزی ماری تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔“

”گویا تم پھر مسترد کر دیے گئے؟“ ایمن اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ایان جو گٹھار کو عین سے بیڈ پر پھینک کر خود بھی بیڈ پر اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں پھنساے بیٹھا تھا اس کے دل سوڑی سے پوچھنے پر بھڑک اٹھا۔

”ہاں۔ انہوں نے میرا گانا سننے بغیر ہی مجھے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ مجھ میں Singing (سنگنگ) کا ٹیلنٹ ہی نہیں۔ اور ساتھ ہی مفت مشورے سے بھی نڈا دیا کہ ٹیڑھے میں کوئی اور کام کروں۔“

”کہتے تو وہ ٹھیک ہی ہیں۔“ بے ساختہ ہی ایمن کے لبوں سے نکلا تھا مگر دوسرے ہی پل اس کی خنکی سے گھورتی نگاہوں سے گھبرا کر وہ بات بدل کر بولی۔

”کہتے تو سب ٹھیک ہی ہیں کہ یہاں بنا سفارش کے کوئی کام نہیں بنتا۔ خیر دفع کرو ان قدر ناشناسوں کو۔ اور بتاؤ۔ تم نے آگے کا کیا سوچا ہے۔“ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ دل کو امید تھی لوہا گرم ہے۔ موقع بھی ہے اور محل بھی آج تو وہ اسے قائل کر کے ہی لٹھے گی کہ اب بہت ہو گیا۔ آخر کب تک وہ اپنا قیمتی وقت بے کار ضائع کرتا رہے گا مگر۔

سلطانہ لاؤنج کے صوفے پر پر اجماع بیچ پڑھتے ہوئے مہمان کی آمد کی تیاریوں کے سلسلے میں کیے جانے والے کاموں پر نظر رکھے ہوئے تھیں۔ معصوم جو جھاڑن اٹھائے گیٹ روم کی جانب بڑھ رہا تھا منہ بسور پیرچ کر بولا۔

”کیا ہے داوی۔ آپ نے تو سب کو ایسے الرٹ کر رکھا ہے جیسے امریکہ سے بش تشریف لا رہا ہو۔“
 ”او فوہ۔“ کچن سے نکلتی ہوئے ایمین اس کی بات پر بے ساختہ ہنس کر بولی۔

”امریکہ کا صدر اب بش نہیں آوہا منہ ہے اور اس بات کو بھی زمانے گزر چکے ہیں۔“

”بش ہو یا اوہا۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو داوی کو کہہ رہا ہوں کہ ہتھ ذرا ہولار کھیں کام کروا کروا کے جان نکال دی ہے۔“ وہ روہانسی آواز میں بولا۔

”تو تو ہے ہی سدا کا کام چور۔ کام کا نام سنتے ہی تجھے موت پڑنے لگتی ہے۔“ سلطانہ ناراضی سے بولیں تو وہ پیرچ کر اندر چل گیا۔

”اور ایمین بیٹا“ اب وہ ایمین کی جانب متوجہ ہو کر بولیں۔

”تم ذرا وہ کیا پاتی ہو چائینر وائینر۔ وہ بنا لینا۔ کیا پتا سے ہمارے مہنگے کھانے پسند نہ آئیں۔“

”داوی جان۔ آپ کیوں فکر کر رہی ہیں۔ اطمینان رکھیں میں پہلے ہی دو تین چائینر ڈشز بنا چکی ہوں۔

بعد میں جو اسے پسند ہو گا اسی حساب سے مینو ترتیب دے لیا کریں گے۔“ وہ انہیں مطمئن کرنے کو تفصیلی انداز میں بولی۔

”جیستی رہ میری بچی“ سلطانہ کو اس کی ذہانت نے خوش کر دیا۔ ”ناشاء اللہ بڑی سمجھداری کی بات کی تم نے۔ ایک تم ہو۔ اور ایک وہ ایمین ہے۔ نجانے بے

عقلیے کو کب محفل آئے گی؟“ آخر میں وہ کچھ افسردگی سے بولیں۔ اور اس سوال کا جواب تو خود ایمین کے پاس بھی موجود نہ تھا سو ڈھیلے ڈھالے انداز میں لاعلمی سے سرزنی میں ہلا کر رہ گئی۔

”مگر اتنا سب لاپنے کی کیا ضرورت تھی بیٹا۔ تم خود جو آ رہے تھے ہمارے لیے یہی تحفہ بہت تھا۔“ تابندہ

گورا چٹا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی۔ آنکھوں پر لگی نفیس سی سنک لبائند۔ چوڑے شانے۔ براؤن آرام وہ پینٹ اور نیلی شرٹ میں بلبوس وہ داؤد برابر ایم تھا۔

سب ہی سے بڑے تیاک، احترام اور وضع داری سے ملا۔ لمبے سفر کی تکان کے باوجود وہ ان کے درمیان بیٹھا رہا۔ کھانا لگا تو اس نے دسی کھانے کو ترجیح دی اور خوب خوب تعریف کر کے کھانا کھایا۔

جو بھی تھا۔ وہ سادہ دل نوجوان سب ہی کو پسند آیا تھا۔ سوائے ایمین کے۔ جو نجانے کیوں اس کی آمد پر کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔

دوسرے دن وہ تازہ دم بنا سلطانہ بانو کے کمرے میں بیٹھا سب کے لیے لائے تھا کف ان کے حوالے کر رہا تھا۔ سب اس کے خلوص پر شکر مند ہوئے

جا رہے تھے۔ سلطانہ بانو کے لیے وہ بڑا خوب صورت ڈیکھل قرآن، ڈیکھل بیچ، خوب صورت ترین تینٹی میں موجود خالص صندل کا عطر لیدر کے آرام دہ

تھیں جو تے کے لے لیا تھا۔ اسی طرح تابندہ اور امجد صاحب کے لیے بھی تحائف ان کے مزاج اور عمر کو

سامنے رکھ کر خریدے گئے تھے اور اب وہ لوگ بیٹھے اس کی سمجھداری کو بے ساختہ سراہ رہے تھے۔ ایمین

بھی ڈھیروں امپورٹڈ چوڑی کاسٹیکس، خوب صورت ٹاپس، پرفیوم وغیرہ پا کر از حد خوش سی اور تو اور جب اس نے معصوم کے حوالے دو شاپر اور آفٹ پیکٹ کیا

تو معصوم کی شکل دیدنی تھی۔ وہ آبدیدہ سا ہو کر بولا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا داؤد بھائی کہ آپ نے وہاں سے میرے لیے چیزیں خریدی ہیں۔“ سب ہی اس

کے جذبات کو سمجھ کر مسکرائے۔

”یقین کر لو یار۔ امی سے یہاں کے افراد خانہ کے متعلق کافی معلومات ملتی رہی تھیں۔ کچھ اپنی سمجھ اور

امی کے مشوروں سے میں نے سب کے لیے خریداری کی ہے۔“ اس نے معصوم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

کہا۔

”مگر اتنا سب لاپنے کی کیا ضرورت تھی بیٹا۔ تم خود جو آ رہے تھے ہمارے لیے یہی تحفہ بہت تھا۔“ تابندہ

”تخفے مروانا نہیں دن کی خوشی کے لیے اور محبت بردھانے کی خاطر دیے جاتے ہیں۔“ اس کے مدلل جواب پر امجد نے بے ساختہ اسے پسندیدگی سے دیکھا تھا۔ سلطانہ بھی اس سے اتفاق کرتے ہوئے گردن ہڈا رہی تھیں۔

”یہ بات ہے تو پھر ہم بھی اپنی وہی خوشی پوری کرنے کے لیے آپ کو تحائف دیں گے تب پھر آپ انکار مت کیجیے گا۔“ ایمن شریر انداز میں بولی تو وہ ہنس پڑا۔ ”ہوں۔ بہت شہارپ ہو مگر فی الحال تو اپنے ہاتھ کی بنی مزید اسی چائے پیادو۔ میرے لیے یہ بھی کسی تحفے سے کم نہیں ہوگی۔“ وہ بولا۔

”کیوں نہیں ضرور۔ ابھی لیجیے۔“ ایمن اٹھنے لگی۔ سب پھر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ معصوم بھی کمرے سے باہر چل پڑا۔

”یہ دیکھیے ایان بھائی۔ وہ داؤد ابراہیم میرے لیے بھی امریکہ سے تحفے خرید کر لایا ہے۔“ معصوم وہاں سے سیدھا ایان کے کمرے میں چلا آیا اور بے حد مسرت سے اسے ملے جانے والے تحائف دکھانے لگا۔

”تمک حرام ایان نے سرعت سے اس کی گردن دبوچی۔“

”وہ تحفے کیا مل گئے تو نے اپنی وفاداری تبدیل کر لی۔“

”ارے۔ ارے چھوڑیں میری گردن ایان بھائی قسم لے لیں۔ میں تو آپ ہی کے حکم کے مطابق داوی کے کمرے میں ٹوہ لینے کے لیے گیا تھا۔ اور انہوں نے مجھے تحفہ پکڑا دیا تو کیا میں اب تحفہ بھی نہ لیتا۔“ وہ اپنی گردن چھڑانے کے لیے وہاں رہنے لگا۔

”اچھا تو کیا ہو رہا تھا وہاں؟“ اس نے گردن چھوڑ کر خشکیوں نگاہوں سے اسے گھورا۔ اور معصوم فر فر شروع ہو گیا۔ اور آخر میں اس نے اپنا۔ پہلا گجزیہ بھی پیش کرنا ضروری سمجھا۔

”میں کسے دیتا ہوں ایان بھائی ان کی یوں اچانک

آمد کے وجہ نہیں۔ پھر میں بے خود نہ کھاؤہ ایمن باجی سے خواہ مخواہ فری ہونے کی کوششوں میں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ایان نے سوچتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”مطلب یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ایمن باجی کو پسند آجائیں اور آپ۔“ مگر اس کی بات مکمل ہو پاتی اس سے قبل ہی ایک مرتبہ پھر اس کی پتی گردن ایان کے ہاتھوں میں بھی۔



پھر اس کے بعد تو داؤد نے ایسا رنگ جمایا کہ جسے دیکھو داؤد کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا۔

”بإشَاء اللہ کیسائیک اور سعادت مند ایچہ سے صوم و صلوة کا پابند، مشرقی روایات کی پاسداری کرنے والا۔“ یہ سلطانہ بانو تھیں۔

”پھر کھاؤ لکھا، منڈت ذمہ دار، بروہار و ہسروں کا احساس کرنے والا۔ مجھے کہنے لگا کہ ”آئی اگر میں آپ کا بیٹا ہوتا تو آپ کو بالکل کام نہ کرنے دیتا۔“ تابندہ کی حسرت میں ڈوبی آواز۔

”ڈی سینٹ، سوہر، سنجیدہ رکھ رکھاؤ والے داؤد بھائی کتنے اچھے ہیں نا۔ لگتا ہے ان کے پاس معلومات کے خزانے ہوں جیسے سچ ان کی کمپنی میں وقت گزارنے پر فائدہ بھی بوریات کا احساس نہیں ہوتا۔“ ایمن کے خیالات۔

اور ان سب سے الگ تھے امجد صاحب کے محسوسات۔ وہ ان کے ساتھ جمعہ بڑھے جاتا۔ واک کرتا۔ ان کے مسائل ڈسکس کرتا، بزنس میں نئے رجحانات کا ذکر کر کے کاروباری پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا وہ ان کی سوچ کو نئے زاویے عطا کر گیا تھا۔

”نجانے کیوں آج مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں نے ایمن کو منسوب کرنے میں بڑی جلد بازی سے کام لیا۔“ وہ اس وقت سلطانہ کے کمرے میں ان کے بیڈ پر ان کے ساتھ بیٹھے پر سوچ انداز میں

بولنا شروع ہوئے۔ سلطانہ نے بڑی طرح چونک کر ان کا فکر مند اور اداس چہرہ دیکھا۔

”یہ کیا بات کی تم نے؟“ انہوں نے تھیر سے پوچھا۔
 ”ہاں اماں اور یہ احساس مجھے داؤد کو دیکھ کر ہوا ہے۔ کیا میرا حق نہیں کہ میں اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کے محفوظ مستقبل کے بارے میں سوچوں؟“ وہ ان سے پوچھنے لگے تو وہ جلدی سے بولیں۔

”مگر بیٹا، وہ لاکھ گن والا سہی مگر کیا وہ ہمارے ایان کی جگہ لے سکتا ہے؟“

”بات کسی کی جگہ لینے کی نہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ ایان کے ساتھ میری بیٹی کے محفوظ مستقبل کی ضمانت دے سکتی ہیں؟“ سلطانہ نے کہا۔
 ”جی نہیں تو وہ زخمی سے انداز میں مسکرا کر بولے۔

”تو میں اب مزید اس کے سدھرنے کا انتظار نہیں کر سکتا جبکہ آپ جانتی ہیں کہ وہ سب کچھ ہرنا ہی نہیں چاہتا۔ میں بہت جلد کوئی فیصلہ کر لینا چاہتا ہوں۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے گئے۔ ان کے نکلنے سے قبل ہی دروازے سے چپک کر کن سوئیاں لیتا معصوم وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ سلطانہ پر تغلر سی بیٹھی رہ گئیں۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ ایان حسب معمول اپنے کمرے میں بیٹھا کنارے کے ساتھ مصروف عمل تھا تب ہی معصوم نے آکر اس کے سر پر یہ دھماکہ لڑایا۔ ایان یہ سب سن کر ششدر رہ گیا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ یا ہو سکتا تھا؟

”جی ایان بھائی! اب کچھ کرنے کی سوچیں ایسا نہ ہو کہیں آپ یہ گناہ ہی بجاتے رہ جائیں اور۔“ معصوم سابقہ بگڑے کی بنا پر احتیاط ”دو قدم پیچھے سرکا“ اور وہ داؤد ابراہیم اپنی ایمین بی بی کو لے آئیں۔ میں نے تو آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ ان کی یوں اچانک آمد بے سبب نہیں یقیناً ”دال میں کچھ کالا ہے۔“ وہ دیدے گھما گھما کر نور ہاتھ نچا نچا کر اپنے درست تجربے پر بے حد مسرور سا کھتا چلا گیا۔ مگر اس کی توقع کے

برخلاف ایان نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہ کیا۔ نہ ہی کچھ بولا۔ وہ تو ابھی تک بس یہی سوچے چلا جا رہا تھا کہ۔

”کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا؟“



”میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تم اس فرنگی سے دور رہنا۔“ دو دن صدمے کے زیر اثر رہنے کے بعد وہ اپنی پرانی جون میں واپس لوٹا، کہیں جانے کے لیے تیار ہوئی ایمین کے سر پر کھڑا چلا رہا تھا۔

ایمین جو بالوں میں برش کر رہی تھی چونک کر پلٹی اور اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر از حد اظہارِ اہمیت سے بولی۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ فرنگی نہیں۔ امریکن ہے۔“

”تو اب تو اور بھی دور رہو۔“ وہ تھکنے پھلا کر بولا۔
 ”دوسری بات وہ ہمارا اسمان ہے۔“ ایمین نے فونٹس لیے بنا اپنا بیان جاری رکھا۔

”اور تیسری بات یہ کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم اپنے ہم عمر ہونے کی بنا پر اور کزن ہونے کے ناطے اسے کمپنی دیتے نظر تم ایسے کمپنی دانا تو درکنار اس سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتے۔ اب اسے میں اگر میں بھی اس سے دور ہو جاؤں گی تو وہ کتنا شمس کرے گا۔“ بات ختم کر کے وہ مڑی برش لگا کر لمبے سلکی براؤن بالوں کو سفید پونی میں جکڑا۔ چمکدار گلابی لپ گلوں بھرے بھرے ہونٹوں پر پھیلا اور شیشے میں دکھائی دیتے اپنے عکس کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھ کر واپس مڑی ہی تھی کہ زری نے آکر مطلع کیا۔

”وہ بی بی جی۔ داؤد صاحب باہر لان میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”تم جاؤ میں آتی ہوں۔“ ایمین نے اپنا سفید اور ہلکا نیلا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے کہا تو زری سر ہلا کر پلٹ گئی۔ ایمین مسلسل غصے میں کھڑے ایان کو نظر انداز کر رہی تھی مگر وہ ہرگز بھی نظر انداز ہونے کے ملوڈ میں

چاکلیٹ فوج سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب ہی اچانک
داؤد نے یہ بات کہی۔

”ارے نہیں نہیں۔“ اس نے جلدی سے آکس
کرم نکل کر نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔
دراصل وہ ہے ہی لیے رہنے والی عادت کا
انسان۔ آپ نے دیکھا ہو گا وہ ہمارے درمیان بھی
زیادہ نہیں بیٹھتا۔“ اس نے بدافغانہ انداز اختیار کیا۔

”ہو سکتا ہے۔“ اس نے خالص امریکن انداز میں
کندھے اچکا کر کہا۔ ”مگر مجھے ایسا لگا تھا۔ ریزرو ہونا
الگ بات ہے، کسی کو ناپسند کرنا دوسری۔ پر اس نے
میرا لاپا ہوا تحفہ بھی نہیں لیا۔“

”نہیں داؤد بھائی۔۔۔ وہ اتنی پیاری بچی کا ہے کہ کسی
کو ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔“ وہ بناوٹی کجے میں بولی جسکے
دل ہی دل میں داؤد کے انداز سے کی درسی ملی داؤد نے
زہنی کھی۔

”خیر۔۔۔ خیر ہو سکتا ہے تم درست کہتی ہو۔“
”آپ یہ سب چھوڑیں نا یہ بتائیں کہ پاکستان آکر
کیا محسوس ہو رہا ہے۔ کچھ الگ سا ایسا ایوین؟“ وہ
شوخ سے انداز میں بات بدل کر بولی۔ تو وہ کچھ چونک کر
اس کی جانب متوجہ ہوا تھا جیسے کہیں کھویا ہوا ہو۔

”آل۔۔۔ ہاں ایمن بہت بہت اچھا محسوس ہو رہا
ہے۔۔۔ وہاں سب کچھ ہے مگر یہ تو وہ روایتی ماحول اور
روایوں کی گرم جوشی ہے جو ہم دیکھنے میں لسنے والے
بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں حالانکہ میں یہاں کے
ماحول سے ناواقف تھا مگر رام ڈیڈ ہر عید، رمضان، بقر

عید وغیرہ پر یہاں کی اتنی چیزیں مس کرتے ہیں کہ میں
جتا نہیں سکتا اور ان ہی کی زبانی تو مجھے یہاں کے
تہواروں کے بارے میں سن سن کر یہاں آکر وہ سب
اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شوق ہوا تھا۔“ اس نے
تفصیلاً بتایا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ بس چاند نظر آنے کی دیر
ہے پھر دیکھیے گا آپ۔۔۔ چاروں طرف اتنی گہما گہمی
ہو جائے گی کہ شاید آپ اپنے ملک کی عید کو مجبوراً
من کرتے لگیں۔“ ایمن ہنس کر بولی۔

نہیں تھا۔
”تم کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے درشتی سے پوچھا۔
”داؤد کو شاپنگ کروانے۔“ وہ اسے چڑانے کو
”بھائی“ کا لہجہ ہٹا کر بولی۔

”کیوں وہ کوئی بچہ ہے؟“
”بچہ تو نہیں ہے مگر ظاہر ہے یہاں کے راستے اور
شاپنگ مالز وغیرہ اس کے لیے قطعی نئے ہیں۔ پھر وہ
ہمارے لیے اتنے تحائف لے کر آیا ہے تو ہمارا بھی
فرض بنتا ہے تاکہ جواباً اسے تحفہ دیں تو بس وہی
دلانے جا رہی ہوں۔“ وہ اب سفید سینڈلز پہن کر پوری
طرح تیار تھی سو اسے اطمینان سے جواب دے کر
اس کی بات سننے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ ایان
اس کے اجنبی انداز پر ہکا بکارہ گیا۔

”یعنی کہ۔۔۔ یعنی کہ حد ہو گئی۔ ایمن نے داؤد کی
خفاطر میز پر بات ماننے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ
میری ناراضگی کی پروا کیے بغیر اس کے ساتھ بھی چلی
گئی۔ یعنی کہ بس اب حد ہو گئی۔ ایان میاں اس سے
زیادہ تو بین تمہاری ہو نہیں سکتی۔ جلد ہی کچھ کر کے
ایں داؤد نامی جاو کا نوڑ کر لو نہیں تو واقعی معصوم کے
بقول۔ نہیں نہیں۔“ وہ بڑبڑا کر ہوش میں آیا پھر
دیوانوں کی طرح معصوم کی تلاش میں لپکا۔

”میں نے محسوس کیا ہے کہ ایان مجھے کچھ خاص
پسند نہیں کرتا۔“

ایمن نے داؤد کے لیے سب کی طرف سے مگر داؤد
کی پسند سے مختلف تحائف کی خریداری کی تھی۔ خود
اس نے اپنی طرف اور اپنی ہی پسند سے ایک برانڈڈ
اسٹور سے روایتی کرتا شلوار اسے خرید کر لیا تھا۔ وہ گہرا
نیلا کرتا جس پر ایسکن کلر کے دھاگے سے نازک سی
کڑھائی کی گئی تھی داؤد کو از حد پسند آیا تھا۔ بعد میں
ایمن ہی نے اصرار کر کے اسے لائٹ براؤن پشوری
جین بھی گفٹ کی اور اب داؤد اسے آکس کرم کھلانے
لے لیے پار لڑ میں لیے بیٹھا تھا۔ اور وہ اپنی پسندیدہ

وہ بھی ہنس دیا مگر ایسے جیسی پھر کہیں سوچ کا خاطر
اڑان بھر چکا ہوا اور وہ ایمن کو دیکھ رہا تھا۔ گہری
جاچختی۔ تولتی نظروں سے۔

”کیا میں اس سے وہ سب کہہ دوں۔ کیا یہ
مناسب ہوگا؟“ وہ سوچتا رہا یہاں تک کہ ایمن کی
آنکس کہ ہم ختم ہو گئی اور وہ لوگ شاپر تھاے اٹھ
کھڑے ہوئے۔



اپنے حریف کا مقابلہ انسان دو طرح سے کرتا ہے۔
ایک تو خود کو مقابل سے ہر لحاظ سے بہتر ثابت
کر کے۔

دوئم اسے سب کی نظروں سے گرا کر۔
چونکہ موخر الذکر حربہ عموماً ”آسان اور کارگر ثابت
ہوا کرتا ہے اس لیے اکثر ”سہل پسند“ اسی کو اختیار
کرنے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔ لہذا ایان علی صورت
حال کے ہر ”پہلو“ پر جناب معصوم کے ساتھ مل کر
اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچ
سکے تھے کہ سب سے مناسب یہ ہے کہ داؤد کی
اصلیت (جو ان کے نزدیک داؤد نے اپنی نیک چلنی کے
بارے میں چھپا رکھی تھی) سب کے سامنے ظاہر کر دی
جائے۔

”مگر آخر کیا تو چلے کہ ہم یہاں ڈھونڈ کیا رہے
ہیں؟“ معصوم پچھلے آدھے گھنٹے سے ایان کے ساتھ
مل کر رازداری سے داؤد کے کمرے میں گھسا کوئی
نامعلوم چیز ڈھونڈتے ڈھونڈتے اکتا کر لولا۔

”کوئی ایسی چیز۔ جو اس کے خلاف پکا ثبوت مہیا
کر سکے۔“ ایان نے سرگوشی میں کہا۔

”مثلاً“ کیا؟“ مارے جوش کے معصوم کی
آنکھیں پھٹ گئیں اور ان میں بے زاری کی جگہ
اشتیاق نے لے لی۔

”مثلاً“ ہو سکتا ہے وہ ڈرگزیٹا ہو، ہو سکتا ہے
شراب نوشی کرتا ہو یا پھر غیر اخلاقی لبرٹییر۔“ وہ ابھی
یہیں تک کہہ پایا تھا کہ کمرے کی تاب گھمانے کی آواز

پر ان دونوں ہی کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔
”تم لوگ! یہاں اس وقت۔“ تھکے تھکے سے
داؤد نے اندر داخل ہو کر نہایت ہی تعجب سے اندر
موجود نفوس اور صورت حال کا جائزہ لیا۔

”دھ۔ دھ۔“ چہرے پر اڑتی ہوئیاں اور زبان کی
لڑکھڑاہٹ پر بدقت تمام قابو پاتے ہوئے بمشکل ایان
نے تیزی سے کچھ سوچتے ہوئے کہنا چاہا۔

”دھ۔ ہاں چوہا۔ ایک موٹے سے کالے چوہے کو
تلاش کر رہے تھے ہم۔“

”میرے کمرے میں؟“ داؤد نے مشکوک انداز سے
دونوں کو باری باری گھورا۔

”ہاں وہ کچن سے نکل کر اسی طرف آیا تھا۔ لگتا
ہے یہاں سے بھی بھاگ گیا۔“ معصوم چلین۔ داؤد
کو آرام کرنا ہوگا۔ ایان نے جلدی سے کہا اور کمرے
سے باہر۔ معصوم تو اس کی بات مکمل ہونے سے قبل
ہی شاندار پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا کمرہ عبور کر گیا تھا۔

”چوہا؟ اور میرے کمرے میں۔“ بات داؤد کی
سمجھ میں نہیں آسکتی تھی مگر اسے بری ضرور لگی تھی۔
”تو وہ تو شکر سے خدا کا کہ بروقت آپ کے دلغ نے
کام کیا ورنہ تو ہم دونوں ان کے ہاتھوں شہادت پا چکے
ہوتے۔“ معصوم ناچال بے یقین تھا۔

”اور تم؟“ ایان نے اسے غضب ناک نگاہوں
سے گھورا۔ ”ختم ہے تو کہا تھا کہ وہ باہر گیا ہوا ہے۔“

”ہاں تو گئے ہوئے تھے امجد صاحب کے ساتھ،
مجھے کیا معلوم تھا کہ فوراً ہی لوٹ آئیں گے۔ روز تو
دیر سے لوٹتے ہیں۔“ اس نے صفائی دی۔

”نیر جو ہوا سو ہوا۔ اب اگلے قدم کے متعلق
سوچو۔“ ایان نے کہا تھا وہ دونوں پھر سر جوڑ کر بیٹھ
گئے۔



سلطانہ بانو کی زبانی امجد کے خیالات جان کر تابندہ
خیب کی خیب رہ گئیں۔
”اب تم خود کہو۔ باب ہونے کے ناطے اس کے

کے بیسج چہرے کی جانب دیکھا جو اس کی تہید پر حیران دکھائی دیتا تھا۔

”آلہ۔ ہاں۔ آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔“ وہ اس کے انداز پر الجھتی ہوئی بولی۔

”وہ۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں۔۔۔“ اس نے اٹکتے۔۔۔ سنہلتے کہنا شروع کیا۔ جوں جوں اس کے لبوں سے الفاظ نکلتے گئے ایمن کی آنکھیں پہلے حیرت پھر اشتیاق اور آخر میں تبسم ظاہر کرنے لگیں۔ گویا اس نے اقرار کر لیا تھا۔ اور داؤد کو یک دم ہی جیسے کسی نے ہفت اقلیم کی دولت تمھاری تھی۔

اور پھر ایان نے دیکھا کہ ایمن آئے دن داؤد کے ساتھ کہیں نہ کہیں جانے لگی۔ گھر میں بھی دونوں کا اکثر وقت اکٹھا گزرنے لگا اور معصوم نے تو خود اپنی ”گناہ گار“ آنکھوں سے ایمن کو داؤد سے سرخ گلاب وصول کرتے دیکھا تھا۔ ان کی آپس میں ہوتی کھسر پھسر پر حسب عادت اپنے ”گار“ کان لگا کر وہ لینے کی بھی خوشی کی تھی مگر کچھ پلے نہ پڑا سوائے اس کے کہ دونوں یقیناً ”کوئی محبت بھری بات ہی کر رہے تھے اور یہ انہوں نے از خود اپنے پلے پڑا لیا تھا) اور ایان تک پہنچا کر دم لیا تھا۔ معاملہ دشمن ہوتا چلا جا رہا تھا۔



”یہ پھول اور کارڈ بیچے ہیں کسی لڑکی نے داؤد بھائی کے لیے۔“ چھٹی بڑا لے دن تمام افراد خانہ دوپہر کے کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے بات چیت میں مشغول تھے تب ہی معصوم ”سرخ گلابوں کا بگے اور کارڈ اٹھائے چلا آیا سب ہی نے چونک کر دیکھا۔

”میرے لیے بگے اور کارڈ۔۔۔ مگر کس نے بیچے؟“ داؤد متحیر تھا۔

”کہہ تو رہا ہے کسی لڑکی نے بھجوائے ہیں۔“ ایان جو خلاف معمول آج ان کے درمیان موجود تھا لہک کر بولا۔

”مگر یہاں تو مجھے کوئی نہیں جانتا۔۔۔“ اس نے کندھے اچکا کر تجت سے کہا۔

خدا شاکت درست ہی ہیں جو لڑکا خود اپنے ساتھ ہی سنجیدہ نہ ہو وہ کسی لڑکی کو کیا محفوظ مستقبل دے سکتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے گویا تھیں۔ تابندہ ان کے مقابل سر جھکائے متفکری بیٹھی تھیں۔

”بات آپ کی بھی ٹھیک ہے مگر میں کیا کروں۔۔۔ میں تو خود اس کی روش سے تنگ آپکی ہوں ہر طرح سے سمجھا بگھا کر دیکھ چکی ہوں مگر وہ سنتا ہی نہیں۔“ انہوں نے بہت دھیمی اور دل گیری آواز میں کہا۔

”نہیں تابندہ۔ ایسے نہیں چلے گا۔ کیا تم جانتی ہو پروین (داؤد کی والدہ) کا فون آیا تھا میرے پاس۔ لڑکے نے ڈھیر ساری تعریفیں کی ہیں اپنی ماں سے ایمن کی۔ معاملہ سمجھ رہی ہونا؟“ وہ خود پریشان سی تھیں۔

”اچھا؟“ تابندہ نے سر اٹھا کر تحیر سے انہیں دیکھا ”تو یہ بات ہے۔“

”ہاں ایسی بات ہے۔“ سلطانہ بے لچک کندھا دیں مگر او اسی سے بولیں۔

”امجد لاکھ ایان پر جان چھڑکتا ہے مگر یہ مت بھولو ایمن بہر حال اس کی اولاد ہے اور کسی شخص کو بھی اپنی اولاد سے برہ کر پکھنار نہیں ہوتا۔“ جو وہ سمجھانا چاہ رہی تھیں تابندہ اچھی طرح سمجھتی تھیں مگر ان کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟



”ایمن۔۔۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ شام کا وقت تھا۔ ایمن داؤد کی پسندیدہ کشمیری چائے اور چنے کا حلوہ لے کر لان ہی میں چلی آئی تھی۔ تابندہ اور امجد آفس سے نہیں لوٹے تھے۔ سلطانہ اپنے شام کے ذکر و اذکار میں مصروف تھیں اور ایان اور معصوم کہاں تھے اللہ جانے۔

”جی داؤد بھائی۔۔۔ کہیے ایسی بھی کیا بات ہے؟“ ویسے وہ بڑا بے تکلف سا بندہ تھا اسی لیے ایمن کو اس کا جھجکتا انداز دیکھ کر حیرت ہوئی۔

”امید ہے تم میری بات کو سنجیدگی سے لوگی اور میرا ساتھ دوگی؟“ اس نے کسی قدر پرامید نگاہوں سے اس

ماثرات ملاحظہ کیے تھے۔

”جان پہچان ہونے کو کون سی دیر لگتی ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی لڑکی ہوگی۔“ ایان نے سوچتے ہوئے ڈرامائی لہجہ اپنایا۔



”یہ سب تمہاری حرکت تھی نا؟“ آج بہت دن بعد ایمن ایان کے کمرے میں آئی تھی ایان اس وقت اپنے بیڈ پر نیم دراز کٹار کو سینے سے لگائے اس کے تاروں سے چھٹیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

”کون سی لڑکی؟“ ایمن نے پوچھا۔
 ”رسول دہبہ میں کسی لڑکی کی کال آئی تھی داؤد کے لیے کہہ رہی تھی کہ تم نے اس سے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا، مگر تم نہیں آئے۔“ اس نے اپنا لہجہ مقدور بھر ہموار رکھنے کی کوشش کی۔

”کون سی حرکت؟“ ایان نے بنا انداز نشست تبدیل کیے بے حد متعجب ہو کر پوچھا۔
 ”یہی داؤد بھائی کو پھول اور کارڈ کسی لڑکی کی طرف سے بھیجنے والی؟“ وہ کمر پر دونوں ہاتھ نکائے کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”بڑی حیرانی کی بات ہے۔ کون تھی وہ لڑکی۔“ امجد کچھ تاپسندیدگی سے داؤد کی طرف دیکھ کر بولے۔
 ”آئی سوئیو۔ میں نہیں جانتا۔“ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے؟“ اس کے صاف انداز اختیار کیا۔
 ”تب ہی تو میں حیران ہو رہی ہوں کہ آخر تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے انہیں یوں سب کی نظروں سے گرانے کی؟“ اس نے تاسف سے پوچھا۔
 ”وہم واقعی اتنی لاعلم ہو یا ظاہر کر رہی ہو؟“ اب کی بار وہ براہ راست طنز براتر آیا۔

”مگر یہ پھول اور کارڈ۔ پھر ایان جھوٹ تو نہیں بولے گا نا۔“ یہ تابندہ تھیں۔
 ”خیر میری ماں۔“ ایان کا دل اپنی چلی گئی چال کی کامیابی پر بلیوں اچھلنے لگا۔

”کیا مطلب؟“ وہ خاک نہ سمجھی۔
 ”مطلب یہ بیس کرزن کہ تمہارے والد محترم اس کی آمد کے چند ہی روز بعد اسے مجھ پر ترجیح دیتے ہوئے، ہمارے درمیان موجود رشتے پر نظر ثانی کرتے ہوئے، اسے ختم کرنا چاہ رہے ہیں اور ان سب کی وجہ ہے وہ۔ وہ داؤد ابراہیم۔“ وہ ہنرک ہی بول گیا۔

”میں تو صرف حیران ہو رہا ہوں کہ یہاں مجھے پھول اور کارڈ بھیجنے والا کون پیدا ہو گیا؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔
 ”والا نہیں والی۔“ معصوم نے تصحیح ضروری سمجھی۔

”اوہ۔ آئی سی اب میں سمجھی۔“ اس نے یہ بات سن کر پہلے تو اچھی سے میں پڑ گئی پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ”تو تم نے سوچا کہ بجائے میرے ڈیڈ کی شکایات دور کرنے کے انہیں سب کی نظروں سے گرا دو اور یونہی مزے کرتے رہو۔“ اس نے چبا چبا کر کہا۔

”چلو رکھ دو اسے ہمیں اور جا کر سب کے لیے اچھی سی چائے لے کر آؤ۔“ سلطان نے معصوم کو گھر کا۔
 ”میرا خیال ہے کہ کل چاند نظر آجائے گا۔ کیا خیال ہے میاں۔ میرے ساتھ منڈی کی رونق دیکھنے چلو کے؟“ امجد نے داؤد کو مخاطب کیا۔

”وہاں ناٹس۔ میں ضرور چلوں گا۔ یہ یقیناً میرے لیے بڑا اٹو کھا تجربہ ہوگا۔“ داؤد پر جوش سا ہو کر بولا۔
 تو سب ہی بقر عید کے حوالے سے تیاریوں کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔
 ایان کچھ بے مزہ تو ہوا مگر اس کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ سو وہ کسی قدر اطمینان سے اٹھ کر منظر سے اجاڑ ہو گیا، مگر لاعلم تھا کہ ایمن نے بغور اس کے

”وہاں ناٹس۔ میں ضرور چلوں گا۔ یہ یقیناً میرے لیے بڑا اٹو کھا تجربہ ہوگا۔“ داؤد پر جوش سا ہو کر بولا۔
 تو سب ہی بقر عید کے حوالے سے تیاریوں کے ذکر میں مشغول ہو گئے۔

بے حد تاسف سے بولی۔
 ”تم اس کی اتنی طرف ڈاری کیوں کر رہی ہو۔“

کرتی تھی۔ غرض ہر کوئی مصروف تھا خوش تھا سوائے ایان کے۔

”کیسا رہا یہاں منڈی جانے کا تجربہ۔“ رات گئے تھکے ہارے بے حال سے وہ لوگ ایک خوب صورت بھوری گائے اور دو سفید بکروں سمیت واپس لوٹے تھے۔ داؤد کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ ایمن اسے دیکھ دیکھ کر نرس رہی تھی۔

”براہی انوکھا اور منفرد۔“ وہ اس کی شرارت سمجھ کر مسکرایا۔

”قیمتیں آسمان پر جا پہنچی ہیں اور دھوکہ دہی الگ۔“ امجد صاحب وہی رایتی باتیں دہرا رہے تھے۔

”بس اللہ ہی ہے جو ہدایت دے۔۔۔ دیکھے جانور ماشاء اللہ صحت مند اور خوب صورت لائے ہو تم لوگ۔“ سلطانہ بھی شوق سے جانوروں کو دیکھ رہی تھیں کہ جن کو بڑے پیار سے معصوم چارہ کھلا رہا تھا۔ سب مگن تھے۔ سبھی کو بھی اس کی کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایان کے چپکے سے یہ منظر دیکھا اور خاموشی سے پلٹ گیا۔

”کیا میں بوجھ سکتا ہوں کہ آج کل یہ خوب صورت آنکھیں اواس کیوں رہتی ہیں؟“ وہ کافی دیر سے لان میں بیٹھیں۔ بیٹھا ہر داؤد سے باتیں کر رہی تھی مگر اس کے لہجے کا پھیکا پن اور آنکھوں سے پھلکتی اداسی داؤد سے مخفی نہ رہ سکی۔

”ارے نہیں۔“ وہ جلدی سے سنبھلی۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”خیر۔۔۔ بات تو ایسی ہی ہے تم بتانا نہ چاہو تو اور بات ہے۔ یہ میں ہی اسٹوپڈ ہوں جو تم سے سب کچھ شیئر کر بیٹھا اور تم نے اتنے ساتھیوں کی طرح میرا ساتھ بھی دیا، مگر شاید تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے داؤد۔ بس میں آج کل کچھ پریشان ہوں۔“

کہیں تم بھی اپنے ڈیڈ کی طرح راستہ بدلنے کے چکروں میں تو نہیں۔“ وہ چبھتے انداز میں کہتا ہوا ایمن کو از حد چوٹ پہنچا گیا۔

”تم۔۔۔ تم ایان۔“ غصے سے کانپتے ہوئے اس سے کوئی بات نہ کی جا رہی تھی پھر وہ جیسے سنبھلی دو منٹ توقف کیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”ہاں ایان۔ تم نے ٹھیک سمجھا۔ میں نے ڈیڈ کی بات مان لینے کا فیصلہ کر لیا ہے، میں اب مزید تم جیسے فضول اور تنگھے انسان کے ساتھ اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتی۔ تم اشارہ کریں بھی گئے تب بھی ناکام انسان رہو گے۔ کیوں کہ تم نے رشتوں کو اپنانا اور ان کی قدر کرنا سیکھا ہی نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کہہ کر رکی نہیں کمرہ عبور کر گئی۔ کیا کہہ گئی تھی وہ۔ ایان دم بخود بیٹھا تھا۔



چاند نظر آ گیا تھا۔ امجد ہمیشہ ہی چاند رات کو جا کر جانور خریدتے تھے مگر اکیلے یا معصوم کے ساتھ مگر اس بار داؤدان کے ساتھ تھا۔ ہر سال وہ ایان سے منڈی چلنے کے لیے اصرار کرتے مگر وہ نہ جاتا۔ اس بار اصرار تو درکنار انہوں نے اس سے پوچھنا تک ضروری نہ سمجھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کلب تار رہا۔ باہر جانوروں کے استقبال کی گھنٹا بجی تھی جس میں خوشی خوشی معصوم بھی شریک تھا اور گنگنائے ہوئے بڑی دل جمعی سے گھر کا عقبی صحن صاف کر رہا تھا جہاں جانور باندھے جانے تھے۔

سلطانہ اور تابندہ مل کر عید الاضحیٰ کے حوالے سے خریدی جانے والی اشیائے خورد و نوش کی لسٹ بنا رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ دیگر امور بھی ڈسکس کیے جا رہے تھے۔ ایمن ڈیری کے ساتھ مل کر چن کی ضروری صفائی کر رہی تھی پھر بعد میں تو وقت ہی نہ ملتا کہ اسے خود اپنی تیاری بھی کرنی تھی۔ رز مرہ کے معمولات بھی ساتھ ساتھ چلنے تھے اوپر سے وہ جانوروں کی ناز برداری بھی بڑی شوق اور لگن سے کیا

ہے۔ ”معصوم روہانے کچھ میں بولا۔ ایان کے ہاتھ اس کے گریبان کو چھوڑ کر نیچے لٹک گئے۔ شکل پر بارہ بجتے دکھائی دے اور وہ دھپ سے اپنے بیڈ پر یوں بیٹھا گویا کوئی شہتر گڑ کے گرا ہو۔

”میں تو گھتا ہوں ابھی بھی وقت ہے۔ کچھ سوچیں۔ کچھ کیجئے ایان بھائی ورنہ آپ ہمیشہ کے لیے ایمن باجی کو کھو دیں گے۔“ معصوم کتنا ہی ”کمینہ“ سہی مگر ایان اور دیگر گھروالوں کے لیے اس کے خلوص میں شک کی گنجائش نہ تھی۔ اور ایان اسے یوں خالی خالی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس نے زندگی میں ہمیشہ صرف جانیے کا زائقہ چکھا تھا اور اب زندگی اس کو پہلی بار آزمائے چلی تھی۔ وہ اس کا پہلا خواب دل کی اولین خواہش اور محبت سے رہاں محبت چھننے جا رہی تھی اور چھن جانے کا احساس کتنا جاں کسل اور تڑپا دینے والا ہوتا ہے اس سے وہ پہلی بار روشناس ہوا تھا۔ دل پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ نجانے کہاں سے اس کے من کے اندر اتنی اداسی اور سنجیدگی در آئی تھی۔ پوری رات اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا اور صبح صادق صاف وہ ایک نیچے پر پہنچ چکا تھا۔

”نام۔ آپ تیار کیا جان سے ایک بار بات تو کر کے دیکھیں۔ وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“ سب سے پہلے اس نے ماں کے سامنے جا کر فریاد کی۔ ”کیوں نہیں کر سکتے ایان۔ وہ ایمن کے باپ ہیں، اس کی بہتری سوچنے کا پورا حق رکھتے ہیں۔“ وہ اس کے بچتے چہرے سے نظر ہٹا کر خواجواہ ترتیب سے رکھی فائلوں کو دوبارہ ترتیب دینے لگیں۔

”مگر وہ اور میں بچپن سے منسوب ہیں۔ میں جانتا ہوں اسے وہ داؤد کے ساتھ خوش نہیں رہے گی۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔

”اور تمہارے ساتھ؟“ وہ سڑ کر جھپٹے انداز میں بولیں۔ ”تمہارے جیسے غیر ذمے دار اور لالہ لیلی انسان

”اور اس پریشانی کی وجہ کا نام ایان ہے؟“ وہ مسکرایا۔ اس بار وہ چپ رہ گئی۔

”تمہیں یاد ہے پچھ دن پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے خیال سے ایان مجھے پسند نہیں کرتا مگر تم نے میری بات سے انکار کیا تھا، مگر میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا اور کیا اب یہ بھی بتاؤں کہ وہ مجھے ناپسند کیوں کرتا ہے؟ اور کیوں مجھے سب کی نگاہوں سے گرانے کی کوشش کر رہا ہے؟“ وہ آخر میں کچھ سنجیدہ سا ہو گیا۔

”اوہ تو آپ یہ بھی جانتے ہیں۔“ وہ بے ساختہ کہہ گئی۔ داؤد مسکرا دیا پھر پوچھنے لگا۔ ”کیا اب بھی کھل کر کچھ نہیں بتاؤ گی ایمن۔“ ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام آسکوں۔“ اور ایمن نے چند منامیں غور کرنے کے بعد جیسے اسے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”میں تو کہتی ہوں بقر عید کے بعد والا پہلا جمعہ رکھ لو۔“ سلطانہ خوشی سے چسکتی آواز میں بولیں۔

”مگر اتنے کم وقت میں تیاری کیسے ہوگی۔ آخر کو میری اکلوتی بیٹی ہے۔“ اس پر شکر ہو کر بولیں۔

”فی الحال تو صرف نکال ہی کر رہے ہیں تا تو نکال کی تیاری کرنا سبوتا۔“ آسان ہے۔“ تابندہ کی ہنسی بھی

سی آواز۔ سلطانہ کے بند کمرے میں خفیہ میٹنگ جاری تھی (جو بوجہ معصوم کی ٹوہ لینے کے خفیہ نہ رہی تھی)۔ اس میٹنگ میں یقیناً ”داؤد اور ایمن کے مستقبل کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔“

معصوم از حد رنجیدگی سے یہ اندوہناک خبر اپنے پیرو

مرشد کو سنانے چل پڑا۔

”نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“ اور اس دردناک اطلاع کو پا کر ایان نے معصوم کا گریبان یوں چھنچھوڑا

جیسے کسی انڈین فلم میں کوئی جوان لڑکی اپنی بیوی کی خبر سنانے والے ناگریبان پکڑ کر چھنچھوڑتی ہے۔

”میں نے اپنے ”گناہ گار“ کانوں سے خود سنا

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

دکھانا۔ اب جاؤ۔ کل ناشتے کی میز پر ملاقات ہوگی۔“ وہ دوبارہ کتاب کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”ٹھیک ہے تایا جان۔ اب صبح ملاقات ہوگی۔“ وہ پرعزم لہجے میں بولا اور کمرہ عبور کر گیا۔ کتاب پر جمی امجد کی نظروں میں اطمینان تھا۔

اور پھر ہوا کچھ یوں کہ اگلے دن وہ صبح بے دار ہو ہی نہ سکا کہ رات گئے تک صبح جانے کی تیاری میں مصروف رہا۔ بال تو کاٹ نہیں سکتا تھا۔ بس اچھی طرح انہیں شیمپو کر کے میٹ کر لیا۔ صبح جانے کے لیے معصوم سے آنس ڈریس استری کروایا مگر سالہا سال سے بگڑی عادتیں بھلا ایک دن میں کیسے سدھر سکتی ہیں صبح جب جاگا تو گھڑی ساڑھے بارہ بج رہی تھی۔ خود کو لعنت ملا مت کرنا وہ باہر آیا۔ تابندہ اور امجد آنس جا چکے تھے باقی سب چائے نہیں کھاتے تھے مگر ایمن کچن میں مصروف عمل تھی۔

”تجسس ناشتا چاہیے۔“ وہ کچن میں آکر بولا۔

”یہ سچ کا وقت ہے۔“ اس نے مڑے بنا احتیاط۔

”تجسس ہی دید۔ میں ناشتا سمجھ کر کر لوں گا۔“

”تم کبھی نہیں سدھر سکتے ایان۔“ یک دم وہ مڑ کر از حد ناسف ورنجیدگی سے بولی۔

”ڈیڈ صبح ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ تمہاری بات بھروسے کے قابل ہی نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں مگر وہ جو پہلے دن ہی اپنے پیمان پر قائم نہ رہا نے پر از حد شرمندہ سا تھا ایمن کے اجنبی واگھڑے انداز پر دیر تک وہیں رکا رہا۔

”دادی۔!“ اور اب جبکہ کوئی بھی اس پر اعتبار کرنے پر تیار نہ تھا تو وہ دادی کی آغوش میں آکر گر لانے لگا۔ بس آنسو بہانے کی کسر رہ گئی۔

”میں کیا کروں کوئی میری بات کیوں نہیں سن رہا۔“ بے بسی لہجہ۔

”صبر کر میرے بچے۔ سارے معاملات طے پا گئے ہیں اب کچھ نہیں ہو سکتا، داؤد کے ماں باپ عید کے تیسرے روز پہنچیں گے۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر بھیکارے لہجے میں۔

کے ساتھ جیسے وہ بہت آرام وہ زندگی گزارے گی تاہم کتنا سمجھایا تھا تمہیں کہ سدھر جاوے کار وقت ضائع مت کرو۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو مگر تم نے میری کسی بات پر بھی دھیان نہ دیا اب بھگتو۔“ انہوں نے ایک چیخ پر بیٹھ کر کوئی فائل کھول لی۔

”تو آپ کچھ نہیں کر سکتیں؟“ اس نے موہوم سی امید کے تحت پوچھا۔

”نہیں۔!“ حتمی انداز۔ چشمہ آنکھوں پر فٹ کر کے فائل کا مطالعہ شروع۔

”ٹھیک ہے میں تایا جان سے خود بات کرتا ہوں۔“ وہ بے باک لہجے میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”تمہاری مرضی۔“ انہوں نے عقب سے ہانک لگائی، مگر ان کے لبوں کے گوشوں میں مسکان دہی تھی۔

”وہ۔۔۔ وہ تایا جان مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ بہادر بن کر وہ ان کے کمرے تک آیا تو ضرور مگرا نہیں بیڈ پر شیم ڈراز کسی کتاب کا مکمل سنجیدگی سے مطالعہ کرتے دیکھ کر اس کے جوصلے پست ہو گئے۔ وہ اس کے لاڈ ضرور اٹھاتے رہے تھے مگر وہ ہرگز بھی ان سے بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

”کہو میں متوجہ ہوں۔“ کتاب سے نظریں ہٹائے بنا جواب آیا۔

”میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں گانا گانا چھوڑ کر۔۔۔ کل ہی سے آنس جو آنس کر لوں گا۔ میزاجیلہ آپ کو ناگوار گزرتا ہے تو وہ بھی بالکل Change کر لوں گا میں نے پہلے ہی کافی وقت ضائع کر دیا ہے۔“ اس نے جلدی سے یوں کہا گویا کوئی سبق سن رہا ہو۔

”برخوردار!“ انہوں نے اس کی جانب دیکھ کر روکھے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”بات کہنے اور عمل کرنے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اور یاد رکھنا وقت کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ وقت گزرنے کے بعد کیا جانے والا کام بولا جانے والا سچ دی گئی گواہی غرض کسی چیز کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں۔ جو کہہ رہے ہو اس پر عمل کر کے

”بات کہنے اور عمل کرنے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اور یاد رکھنا وقت کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ وقت گزرنے کے بعد کیا جانے والا کام بولا جانے والا سچ دی گئی گواہی غرض کسی چیز کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں۔ جو کہہ رہے ہو اس پر عمل کر کے

”بات کہنے اور عمل کرنے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اور یاد رکھنا وقت کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ وقت گزرنے کے بعد کیا جانے والا کام بولا جانے والا سچ دی گئی گواہی غرض کسی چیز کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں۔ جو کہہ رہے ہو اس پر عمل کر کے

”بات کہنے اور عمل کرنے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اور یاد رکھنا وقت کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ وقت گزرنے کے بعد کیا جانے والا کام بولا جانے والا سچ دی گئی گواہی غرض کسی چیز کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں۔ جو کہہ رہے ہو اس پر عمل کر کے

”بات کہنے اور عمل کرنے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اور یاد رکھنا وقت کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ وقت گزرنے کے بعد کیا جانے والا کام بولا جانے والا سچ دی گئی گواہی غرض کسی چیز کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں۔ جو کہہ رہے ہو اس پر عمل کر کے

”بات کہنے اور عمل کرنے میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے اور یاد رکھنا وقت کی انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔ وقت گزرنے کے بعد کیا جانے والا کام بولا جانے والا سچ دی گئی گواہی غرض کسی چیز کا بھی کوئی خاص فائدہ نہیں۔ جو کہہ رہے ہو اس پر عمل کر کے

”داوی کیا میرا قصور اتنا بڑا ہے کہ مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کر دیا جائے۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

”مگر میرے بچے... تو نے زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو پانے کی کوئی کوشش بھی تو نہیں کی اور بنا کوشش کیے بھی کبھی کوئی بات بنی ہے۔“

”داوی۔ آپ سمجھا میں نا سب کو۔ آپ بڑی ہیں وہ آپ کی بات ضرور مان لیں گے۔“ اس نے لاچارگی سے کہا۔

”نہ بچے۔ اب کچھ نہیں کر سکتی میں۔“ انہوں نے بھی صفا چٹا انکار کر دیا۔

”کیا کروں میرے اللہ۔“ بالآخر اس نے مدد کے لیے اب اسے پکارا جسے سب سے پہلے پکار لینا چاہیے تھا۔



”چلیے بھائی صاحب...“ لابندہ باوجود حرارت کے آفس کے لیے نکلنے لگیں تو امجد نے ٹوک دیا۔

”آپ گھر پر رہیے بھابھی“ آپ کی طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تایا جان۔“ کھینچ کر کے پیٹنٹ کوٹ اور لیو شرت میں ملبوس ہاتھ میں بریف کیس تھا جسے میٹرھیوں سے اترا تانیاں سب ہی کو عجب طرح کی حیرانی سے دوچار کر گیا۔

”ترج سے آپ نہیں۔ میں آفس جایا کروں گا“ آپ نے بہت کام کر لیا اب ذرا مجھے بھی خدمت کا موقع دیں۔“ وہ سب کے درمیان آتے ہوئے بولا۔

”جیتا رہ میرے بچے...“ سلطانہ تو اس کے انداز پر نہال ہی ہو گئیں۔ امجد اور تابندہ نے بھی از حد خوشی کا اظہار کیا۔ ایمن بھی مسکرائی۔ داؤد نے اثبات میں سر ہلا کر حوصلہ افزائی کی تو معصوم نے تو اسے ایسے گلے سے لگایا تھا گویا وہ کشمیر فتح کرنے جا رہا ہو۔ اور سب کا رد عمل دیکھ کر ایان سوچ رہا تھا کہ واقعی لگتا ہے اس بار اس کے قدم صحیح راہ پر پڑی گئے ہیں۔

برائش میں اس نے ڈگری لے ہی رکھی تھی۔ ذہین تھا اور قابل بھی سو وہ تیزی سے کام سیکھنے لگا۔ امجد کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ وہ محنت سے کام کر رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اب شاید سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے مگر زندگی میں ایسا بھلا کب ہوتا ہے۔

وہ چائے کا کپ لیے اپنے گھر کے ٹیرس پہ کھڑا تھا۔ تب ہی اس کی نظر بکرے کی رسی تھا مے گھر کے اندر داخل ہوتے داؤد اور ایمن پر پڑی۔ داؤد جھک کر اس سے کچھ کہہ رہا تھا جبکہ ایمن کے لبوں پر شرمیلی مسکان تھی۔ اشتعال کی ایک تیز لہریاں کے بدن میں دوڑ گئی۔

”آخر داؤد ایسا کیا کہہ رہا ہے خودہ یوں تیار رہی ہے۔ میرے سامنے تو کبھی ایسے نہیں شرمائی۔“ اس کے اندر کا رقیب جاگ گیا اور دھیرے دھیرے موجودہ ایان پر حاوی ہونا چلا گیا۔



اور پھر عید آگئی۔ سب کچھ ہمیشہ کی طرح تھا۔ سوائے نماز کے لیے از خود جاگ جانے والے ایان اور داؤد کی موجودگی کے۔ ایان قربانی کے وقت بھی موجود رہا۔ ایمن یوں تو قربانی کے جانوروں کی بڑی خدمت کیا کرتی تھی مگر انہیں قربان ہوتے دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا سو وہ اندر پگن میں انگوری اور گلابی پرنشڈ سادہ سے کاشن کے سوٹ میں ملبوس روزمرہ کے کام نمٹاتی رہی۔ اسی مصروفیت میں سب کا دن گزر گیا۔ گوشت کی اچھی خاصی تعداد امجد کسی مدرسے یا فلاحی ادارے میں بھجوا دیا کرتے تھے۔ رشتے داروں کا حصہ نکال کر اپنے گھر کے لیے بس اتنا ہی گوشت رکھتے تھے کہ بمشکل ایک ہفتے چل پاتا۔

ایمن عید کی پہلی رات کو مندی لگواتی تھی کیوں کہ پہلے دن تو ظاہر ہے پانی کا اتنا کام ہوتا کہ مندی کا رنگ فوراً پھیکا پڑ جاتا۔ دوسرے دن سب ہی کو قدرے فراغت تھی سو رات میں باربی کیو کا پڑا گرام

سے بولا گویا ان کے درمیان برسوں کا یارانہ ہو۔
 ”ہاں ٹھیک ہے سنا تا ہوں۔ اب تو میں سب کو
 گانا ہی سناؤں گا۔“

”ملنے ہے مجھ سے آئی۔“

جانے پھر کیوں تنہائی۔“

کس موڑ پہ ہے لائی عاشقی۔“

سب لان میں موجود تھے۔ ایان ایک کے بعد ایک
 اپنے دل کی ترجمانی کرتا گانے سنارہا تھا۔ حیرت کی بات
 تو یہ تھی کہ وہ نہ صرف کافی سر میں تھا بلکہ اس کی آواز
 سماعتوں کو بھلی بھی لگ رہی تھی۔ شاید یہ دل پہ لگی
 چوٹ کا اثر تھا۔ سب دبے دبے انداز میں مسکرا رہے
 تھے۔ سوائے معصوم کے جو اپنے مرنے کے غم میں برابر
 کا شریک تھا۔

”ات جیکہ میں سدھ چکا ہوں تہ پھر کیا مسئلہ
 ہے؟“ کل پروین اور ان کے شوہر ایان صاحب کی
 آمد متوقع تھی۔ وقت بے حد کم تھا۔ ایان کے ہاتھ پیر
 پھولے جاتے تھے وہ ہر طرح سے کوشش کر رہا تھا کہ
 کسی طرح رشتہ ٹالا جاسکے۔

”میں تمہیں بتا چکی ہوں ایان اب ایسا نہیں
 ہو سکتا۔“ تابندہ زچ ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے پھر میری جو سمجھ میں آئے گا بس کروں
 گا۔ پھر آپ لوگ مجھ سے شکایت مت کیجئے گا۔“ آخر
 میں وہ ہنسیوں پر اتر آیا۔

”جاؤ جو جی میں آئے کرو مجھے اور بھی بہت سے کام
 ہیں۔ ہاں بھئی فریدہ میں نے تم سے فلاؤ ڈرائیج منٹ کا
 کہا تھا وہ۔“ تابندہ اسے مکمل نظر انداز کر کے فون پر
 مصروف ہو گئیں۔ وہ احتجاجاً ”پیر پٹنٹا ہوا باہر نکل گیا۔“

اور پھر سو بری پروین اور ان کے گریس فل سے
 میاں صاحب کی آمد بھی ہو گئی۔ تمام افراد خانہ جس
 وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے بات چیت میں مشغول
 تھے ایان زری نے سر پر پہنچ کر بولا۔

رکھا گیا۔ ایمن بڑے اہتمام سے تیار ہو کر کمرے سے
 نکل ہی رہی تھی کہ دستک دیتا ایان اندر داخل ہوا۔
 لائٹ اور بج اور پنک ڈریس میں ریوایتی انداز سے سچی
 سنوری ایمن اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ وہ مبہوت رہ
 گیا۔

”ہاں کیا ہوا ایان؟ سب لان میں ہیں میں وہیں
 جا رہی تھی۔“ وہ اس کی نظروں سے گزرتا کر بولی تو وہ
 شنبھل کر ہوش میں آیا۔

”تم مجھے اس بار عید مبارک کہنا بھول گئیں
 ایمن!“ وہ شاک کی لہجے میں بولا۔

”نہیں تو۔ تم جانتے تو ہو میں اچھی طرح تیار
 ہونے کے بعد سب کو عید مبارک کہتی ہوں اہتمام
 سے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”پر میں تمہارے سسرال والے آرہے ہیں کیا تم
 جانتی ہو؟“ دراصل وہ یہ ہی بات کرنے آیا تھا۔

”میرے سسرال والے؟“ اس نے تحیر سے پوچھا۔
 ”اوہ اچھا۔“ پھر جیسے سمجھ کر ہلایا۔

”تم داؤد بھائی۔ آئی مین داؤد کے مام ڈیڈ کی بات
 کر رہے ہو ہاں اتور ہے ہیں پھر؟“ اس نے ایان کو
 دیکھا اس کے انداز پر ایان چڑھی ہو گیا۔

”پھر یہ کہ تم ان کے سامنے ایسی اداکاری کرنا چاہے
 تم پر جن آگیا ہوا کروہ تب بھی بازنہ آئے تب ہم اگلے
 ہی دن جا کر کورٹ میرج کریں گے کیوں کیا آئیڈیا
 ہے؟“

”وہاٹ ریش ایان! تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو میں
 ایسا کچھ نہیں کروں گی۔“ ایمن بوکھلا گئی۔

”ایمن۔ ایمن یار کہاں ہو۔“ بڑے ہی غلط وقت
 پر داؤد نے انٹری ماری تھی۔ ایان نے خونخوار نگاہوں
 سے اسے دیکھا۔ اس کا سدھرنا وہ دھیرنا اپنی جگہ مگر داؤد
 کے لیے اس کی پر خاش ختم نہ ہوئی تھی۔

”اوہ۔ تو تم بھی یہاں ہو۔ آؤ ایان پار تم بھی
 آجاؤ۔ تمہاری سنگنگ کی میں نے بڑی تعریف سنی
 ہے لاؤنا اینا گٹار جب تک ہم لوگ باہر ہی کیوں کر رہے
 ہیں تم وہیں گانے ہی سناؤ۔“ وہ کچھ ایسی کے تکلفی

”دھیان بے میری بات سنو۔“
 ”جی ایان صاحب بولیں۔“ وہ مصروف انداز میں
 چائے کے کپڑے میں سیٹھ کرتی رہی۔
 ”مگر یاد رہے یہ بات بہت راز کی ہے اور تمہیں
 اس راز کی مرثیہ دم تک حفاظت کرنی ہے۔“ اس کا
 انداز پر اسرار تھا۔ زری چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
 ”ایسی بھی کیا بات ہے ایان صاحب۔“

”یہ بے ہوشی کی دوا ہے۔ اس نے ایک شیشی
 آگے بڑھائی، ”یہ تمہیں چائے میں ملا کر مہمانوں کو دینی
 ہے۔“
 ”خدا کا خوف کریں ایان صاحب۔“ زری بدک کر
 بولی۔

”زیادہ نیک پروین نہ بنو جو کہہ رہا ہوں خاموشی
 سے کرو۔“
 ”بہت خوب ایان۔ یہ کیسی ہنسی ہنسی باتیں کر رہے
 ہو تم۔“ عقب سے آئی تابندہ کی گھرتی آواز پر وہ
 اچھل پڑا۔ پھر زری متی مسکرا کر بولا۔

”نام آپ! وہ تو میں زری کو چیک کر رہا تھا کہ یہ کتنی
 ایماندار ہے۔“ اس نے آئیں بائیں شاہیں والے
 لہجے میں کہا۔
 ”بہتر ہے کہ تم اپنی بونگیاں چھوڑ کر سیدھی طرح
 سے آکر ہمارے درمیان بیٹھو اور زری۔ تم نہایت
 چائے سرو کرو۔“ پکڑا گیا تو کیا ہوا۔ مگر اس نے پھر بھی

ہار نہ مانی اور ایک عزم سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا
 جہاں محفل جمی ہوئی تھی۔
 ”اتنی سی تھی جب دیکھا تھا ماشاء اللہ اب تو ایمن
 بیٹی بہت خوب صورت ہو گئی ہے۔“ پروین پیار سے
 اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں۔

”خوب صورتی تو اللہ کی دین ہے۔ اصل خوبی تو
 اخلاق کی ہوتی ہے۔ صورت پر یوں بیسی اخلاق
 چیزیلوں والا ہو تو کیا فائدہ ایسی خوب صورتی کا۔“ جلتے
 جھنے ایان نے لقمہ دیا۔

”ارے پروین بے ساختہ ہنس دیں۔ کہہ تو تم
 ٹھیک رہے ہو۔“
 ”میں ہار گیا، میرے یار میں ہار گیا۔“ کل ایمن کا
 نکاح تھا۔ اور رات اس نے معصوم کے سامنے یہ
 اعتراف کیا۔ وہ سرفہیواڑے ٹیرس کی ٹھنڈی زمین
 پر بیٹھا آنسو بہانے کی تیاری کر رہا تھا اور معصوم کا دل
 اس کی بکھری حالت دیکھ کر کٹا جاتا تھا۔

”صبر کریں ایان بھائی۔ صبر کا اللہ نے بہت اجر رکھا
 ہے۔“ وہ اس کے قریب بیٹھا دلا سے دے رہا تھا۔
 ”قریبانی اللہ کے محبوب بندے ہی دیا کرتے ہیں۔
 جو صلہ رکھیں اور اپنی محبت کو خوش دلی سے کسی اور

اس کی بات پر ایمن نے پہلو بدلا تھا۔ امجد بھی
 سنجیدہ سے ہو گئے۔
 ”اور یگ مین۔ تم کیا کرتے ہو۔“ الیاس نے
 دلچسپی سے پوچھا۔
 ”پہلے اسٹرگٹنگ سگر تھے۔ اب اپنے ڈیڈ کا
 کاروبار سنبھال رہے ہیں۔“ داؤد نے متانت سے
 بتایا۔

”آپ لوگ یہ سمو سے تو لیں نا۔ ایمن نے اپنے
 ہاتھوں سے بنائے ہیں۔“ تابندہ نے ایان کا ہنسا بگڑنا
 منہ دیکھ کر سب کی توجہ اس پر سے ہٹانے کی خاطر کہا۔
 مگر یہ ایان۔

”واہ بھئی ایمن بڑی پھرتلی ہو۔ ویسے تو ایک نمبر کی
 کام چور ہو مگر مہمانوں کے لیے اتنی محنت کرنی۔ آئم
 امپریسٹ۔“ اس نے آنکھیں مصوبیت سے
 پلپٹاتے ہوئے کہا۔

”سو سو سو بیٹا۔ ہمارے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا
 ضرورت تھی۔“ پروین مزید اس پر نثار ہو چلیں۔ ایان
 منہ ہی منہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ ایمن خون آشام نگاہوں
 سے ایان کو گھور رہی تھی جبکہ داؤد ہنسی ضبط کرنے کی
 کوشش میں بے حال دکھائی دیتا تھا۔

اور پھر اس نے جسے ہر حربہ آزما کر دیکھ لیا۔ ہر طرح
 سے کوشش کر کے دیکھ لی۔ مگر کسی نے اس کی بات نہ
 سنی تو ماننے کیسے۔

”میں ہار گیا، میرے یار میں ہار گیا۔“ کل ایمن کا
 نکاح تھا۔ اور رات اس نے معصوم کے سامنے یہ
 اعتراف کیا۔ وہ سرفہیواڑے ٹیرس کی ٹھنڈی زمین
 پر بیٹھا آنسو بہانے کی تیاری کر رہا تھا اور معصوم کا دل
 اس کی بکھری حالت دیکھ کر کٹا جاتا تھا۔
 ”صبر کریں ایان بھائی۔ صبر کا اللہ نے بہت اجر رکھا
 ہے۔“ وہ اس کے قریب بیٹھا دلا سے دے رہا تھا۔

”قریبانی اللہ کے محبوب بندے ہی دیا کرتے ہیں۔
 جو صلہ رکھیں اور اپنی محبت کو خوش دلی سے کسی اور

نہیں کرتے ہیں میری جان کیوں منہ چھپا کر نہیں بیٹھتے
ہری اسپ۔ ”نابندہ کوئی پانچویں بار اس کے کمرے میں
آئی تھیں۔ وہ جو بیڈ پر اوندھا پڑا تھا اٹھ کر شاکی نگاہوں
سے انہیں دیکھنے لگا۔

”معصوم کچھ تم ہی سمجھاؤ اسے ایسے تو اس کی
حالت کا تماشا بن جائے گا۔“ وہ اس کی نگاہوں سے
نگاہیں چرا کر کونے میں کھڑے سفید کرتے شلوار میں
ملبوس معصوم کی جانب متوجہ ہو کر بولیں اور ”مجھے کام
ہے تم لوگ باہر آؤ“ کہہ کر چل دیں۔

”بالکل دلوں والی شیروانی پسند کی ہے لی لی نے
آپ کے لیے قسم سے یمن لیں۔ سب ہی سمجھیں
گے کہ آپ ہی دو لہا ہیں۔“ معصوم نے زار سے پچکارا۔

”اللہ کرے داؤد اغوا ہو جائے۔ یا بھرا چانک اس کی
کوئی بیوی یہاں آکر سلیا ڈال دے یا پھر اس کی
یا دراشت کھو جائے اور وہ سنوٹھ الحواس ہو جائے یا۔“
ایان کے دونوں ہاتھ اٹھا کر بددعا میں دینا شروع
کر دیں۔

”بس بھی کریں ایان بھائی، ابھی تو آپ خود سو والی
لگ رہے ہیں۔ اب سمجھا میں اپنے دل کو اگر آپ
پہلے ہی اپنے اس شوق کی قربانی دے دیتے تو آج یوں
ایمن باجی کو قربان ہونا نہ دیکھ رہے ہوتے۔“
”ہاں تم بھینک ہی کہتے ہو شاید۔“ وہ یک دم
خاموش ہوا اور شیروانی اٹھا کر تھکے تھکے سے انداز میں
کیڑے بدلنے چل دیا۔

”کالی شیروانی جس کے فقط کالر پر نفیس سی گولڈن
کڑھائی کی گئی تھی۔ میچنگ کھسم۔ خوب صورت
ہیئر کٹ۔ ہلکی ہلکی شیو۔ سنجیدہ تاثرات اور بچھی
ہوئی آنکھیں۔

میٹھیوں سے مرے مرے قدموں کے ساتھ
لاؤنج میں اترتا ایان حلیے سے ضرور زولہا دکھائی دے
رہا تھا مگر تاثرات سے نہیں۔ اس نے اترتے سے
ایک نظر اٹھ کر نگاہ لاؤنج پہ ڈالی جہاں سب ہی افراد خانہ

کے حوالے کر کے تاریخ رقم کر دیں۔ پھر یہ بھی تو
دیکھیں ایمن باجی کتنی خوش ہیں۔“ وہ اپنے طور پر تو
اسے تسلیاں ہی دے رہا تھا۔
”تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے۔“ ایان دہاڑا تو وہ
روہا نسا ہو کر بولا۔

”مجھے کیوں ڈانٹ رہے ہیں میں تو صرف یہ بتانا چاہ
رہا ہوں کہ داؤد بھائی نے خود انہیں ساتھ لے جا کر
شاپنگ۔“
”تیری تو۔“ ایان نے روٹا دھونا بھول کر بے ساختہ
ہی اس کی گردن دوپچی تھی۔



کراچ کی تقریب کا انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ سرخ
اور سفید تازہ گلابوں سے مزین لان کی سجاوٹ قابل دید
تھی۔ ٹینسی لائٹس نے ماحول کو جگمگا رکھا تھا کہ سلطانہ
بانو بادامی انہیں سی کڑھائی والے جوڑے میں بزین
سرشار لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی بڑی دلچسپی اور شوق
سے گھر میں ہوتی گہما گہمی کو دیکھتی تھیں اور بار بار اپنی
ضعیف آنکھوں میں در آتے خوشی کے آنسوؤں کو
پونچھتی تھیں۔

گھرے سبز اسٹائنلس سے ٹراؤزر شرٹ میں نابندہ
بھی بڑی مصروف سی دکھائی دیتی تھیں۔ پلک اور
لائٹ پر پل جوڑے میں ملبوس پردین بھی ان کا ساتھ
دے رہی تھیں۔

اندر کمرے میں موجود ایمن کو بیوٹیشن تیار کر کے
جاچکی تھی۔ فان اور گولڈن نفیس کام سے مزین ٹخنوں کو
چھوتے فرائک پاچامے میں اس کے سر پے کی چھب
ہی زالی تھی۔ ڈیپ ریڈ گولڈن پنی لگا دو بٹا سر رکھا تھا۔
چھوٹا سا گولڈن یا قوت جڑا ٹیک۔ اور گولڈن ہی بڑے
بڑے ہالے نما جھکے۔ وہ بڑی سرشاری سے آئینے میں
خود کو دیکھ رہی تھی۔

”حد کرتے ہو تم ایان۔ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔
سمان بس آنے ہی والے ہیں۔ شاہانہ میرا بیٹا، ہمت
سے کام لو اور جلدی سے تیار ہو کر باہر آؤ۔ حالات کو

”ہمیں آپ لوگ میرا نکاح زبردستی اس لڑکی کے ساتھ تو نہیں کروا رہے۔“ وہ ہوش میں آ گیا تھا جیسے۔
 ”لوہ نو ایان داؤد مسکرا دیا۔ یہ اریبہ ہے میری ہونے والی بیوی۔ مائے فرسٹ لو۔“ داؤد نے جذبے لٹاتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
 ”مگر تم تو ایمن سے۔ میرا مطلب ہے کہ آج تو تمہارا نکاح۔“ مارے حیرانی کے اس کے منہ سے بے ربط سے جملے نکلے۔

”نہیں ایان۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں شروع سے جانتا ہوں۔ ہاں معصوم کی یہ بات سچ ہے کہ میری پاکستان آمد کا مقصد صرف بھیر کرنا ہی نہیں تھا۔ میں یہاں اریبہ کے لیے آیا تھا۔ اس کی اور میری دوستی فیس بک پر ہوئی اور بعد میں یہ دوستی دل کے رشتے میں بدل گئی۔ مگر یہاں وہی روایتی صورت حال ہو گئی کہ آوارہ فابریک لڑکے سے اسے بچانے کے لیے اس کے گھر والوں نے اس کی شادی طے کر دی۔ میں بہت فکر مند ہو کر پاکستان آیا۔ مگر بات بنتی دکھائی نہ دی۔ کچھ سوچ کر میں نے ایمن سے سب ڈسکس کیا اور اس پیاری لڑکی کے میرا ٹیبل ساتھ دیا نہ صرف اریبہ کے گھر والوں کو میرے حق میں ہموار کیا بلکہ ہمیں منسوب کرو کر شادی کی تاریخ تک طے کروادی۔ اب اتنی پیاری لڑکی کی بد کرنا میرا اخلاقی فرض بنتا تھا تاہم اسی لیے اس کی بلکہ سارے گھر والوں کی مشترکہ پریشانی یعنی تمہاری غیر سنجیدگی کو سنجیدگی میں بدلنے کے لیے بس چھوٹا سا اسکرپٹ اسٹیج کرنا پڑا اور دیکھ لو ہماری مشترکہ کوششیں آخر کار رنگ لے ہی آئیں۔“ وہ بڑے مزے سے کہتا چلا گیا۔ ایان بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔
 ”مگر میں نے تو خود اپنے گنہگار کانوں سے۔“ معصوم نے کہنا چاہا۔

”وہی سنا جو ہم نے سنوایا میاں! ہم تمہاری کن سونیاں لینے والی عارت سے خوب واقف ہیں۔“ امجد نے مسکرا کر کہا تو معصوم کھٹیا گیا۔

دل میں اک ٹیس سی اٹھی بڑھتے قدم ٹھہر گئے۔ عقب سے معصوم نے کندھا تھیک کر گویا حوصلہ رکھنے کی تلقین کی مگر یک دم ہی کہیں سے بلیو کرتے شلواریں خوش باش سے داؤد نے سامنے سے آکر ایان کو یوں گلے لگایا جیسے کب کا پچھڑا ملا ہو۔
 ”اب تو ناراضی ختم کرو دوست۔ آج تو بے حد خوشی کا موقع ہے۔“ ایان اس کے والہانہ انداز پر دم بخود تھا۔ (اس کی یہ ”ہمت“)

”ہاں بر خوردار مشکل پر بارہ کیوں بجا رکھے ہیں۔ بھئی ہنسو، مسکراؤ۔“ ڈارک گریے نفس سے کرتے شلواریں امجد بھی آگے بڑھے۔ (آہ۔ ظالم سماج)
 ”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے ناچار مسکرا کر کہا۔ جبکہ دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

”ارے آپ لوگ جلدی کیجیے۔ مولوی صاحب آتے ہوں گے مکان کا وقت نکلا جا رہا ہے۔“ تابندہ نے معنی خیز انداز میں سگڑا تے ہوئے کہا۔
 وہ ان کے نرمٹھے میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا لاؤنج کے صوفوں تک بلا آیا۔ ان سب کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ الجھ گیا۔

”آپ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ کنفیوژن سے سوال کیا۔
 ”اے لو۔“ سلطانہ قربان جانے والے لمحے میں مسکرا کر بولیں۔ ”ہائے میرا معصوم بچہ۔ نہیں سمجھا۔“ ان کی بات پر دلہن بیگم کے گلگلوں لبوں پر بھی مسکراہٹ چمکی۔

”میں کیا نہیں سمجھا۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب۔“ وہ ایک دم سے ہونق بن گیا۔
 ”ایک منٹ۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ مگر پہلے اس سے تو ملو۔“ داؤد اپنے عقب میں چھپی گلگالی لباس میں ملبوس خوب صورت اور طرح دار حسینہ کو آگے لاتے ہوئے بولا۔

”کون ہے یہ لڑکی۔“ صدے سے بھرپور

میرے سنیٹنگ پر کوئی اعتراض بھی نہ ہوگا۔ اس نے بڑے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

”ایمان۔“ ایمین نے بوکھلا کر کہا۔

”ابھی ابھی وقت ہے میرے پاس، اگر تم نے دوبارہ یہ بات کی تو میں تم سے نکاح کرنے سے صاف انکار کروں گی۔“ وہ دھمکانے لگی۔

”ہرے۔ ارے“ اس نے ایمین کے کڑے تاثرات دیکھ کر جلدی سے کہا۔ ”میں تو مذاق کر رہا تھا ڈیر بھلا، قربان کر دینے والی چیز کو بھی کبھی کوئی واپس لیا کرتا ہے۔“ اس نے کہا۔ تو ایمین بے ساختہ ہنس پڑی۔ اسے مسکراتے دیکھ کر ایمین نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا۔

اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ ستاروں سے جی بکھشاں ایمین کی منتظر تھی۔

”تم تم داؤد نیک لخت ہی پتھر بنے ایمان میں جان پڑی۔ اور اس نے لپک کر داؤد کو گلے سے لگالیا۔

”مجھے معاف کر دو میرے بھائی میں نے تمہیں کتنا غلط سمجھا تھا۔“ شدت جذبات سے اس کی آواز کانپ کانپ گئی۔

”ارے اب ختم کرو۔ باہر مہمان آچکے ہیں۔“ قاضی صاحب کا تو پتا کرو اور کتنی دیر کرنی ہے۔“ سلطانہ نے اچانک کہا۔ سب الٹ ہو گئے۔ اور ہنستے مسکراتے باہر نکلنے لگے۔ تب ہی جان بوجھ کر سب سے پیچھے رہ جانے والے دو لہانے اریبہ کے ساتھ باہر نکلی اپنی ٹولہن کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

”نیورمانڈ۔ مگر صرف دو منٹ۔“ کندھے اچکا کر نکلتی ہوئی اریبہ باہر نکل گئی۔

”او توہ۔ کیا مسئلہ ہے ہاتھ چھوڑو میرا۔“ گالوں پر شفق پھونکنے لگی تھی۔ ایمین نے شرم کو جھلا ہٹ کے پردے میں چھپایا۔

”اسنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گا جانم۔ آخر کو اپنا درینہ خواب قربان کر کے تمہیں پایا ہے۔“ وہ بڑی پیچھے نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔

”رہنے دو۔“ وہ بڑھٹھے پن سے بولی۔ تب ہی اتنے بارے ہوئے انداز میں میرے اور داؤد بھائی کے نکاح میں شریک ہونے کے لیے تشریف لارہے تھے۔ ”تو کیا کرتا اور تم سب نے اٹل کر مجھے بیوقوف ہی اس طرح بنایا تھا۔ اور پھر مجھ معصوم کے اقبال زریں کا اثر۔ وہ مجھے مسلسل ایثار و قربانی کے فضائل پر اتنے لیکچر لارہا تھا کہ مجھے لگا اگر تمہاری بہتری داؤد کے ساتھ ہے تو مجھے رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔“ وہ اتنے بے ساختہ و بے ریا لہجے میں بولا کہ ایمین کو اس پر بے ساختہ فخر محسوس ہوا۔

”تم بہت اچھے ہو ایمان، اس نے شرمیں مسکراہٹ سے کہا، تمہیں خوا خواہ تمہارا یہ اس شوق نے اسپائل کر رکھا تھا مگر شکر ہے اب سب ٹھیک ہو گیا۔“

”ہاں تم بھی مل گئیں اور میں جانتا ہوں تمہیں

آزارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لیکھی ایمان

رخسار نگار عمران

مکمل ناول کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے



قیمت - 500 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:

32735021

37، ازاد بازار، کراچی

خوشیوں کے رنگ

جو ادنیٰ بات مکمل کی۔ اس تصور سے ہی اس کا چہرہ
تتمتا رہا تھا۔ اور میں جانتی تھی کہ یہ اگلا سال کم از کم
اگلے پندرہ سالوں تک آنے والا نہیں۔

”ہاں تو ہماری گائے کا گوشت بھی تو تم ہی لوگ
بانٹو گے۔۔۔ میں سب کے گھر سے ہی سے بھجواؤں گی۔“
”ہیں باجی! سچ میں۔“ جو ادنیٰ نے بولا تو علیحدہ
کی آنکھیں بھی جھمکا گئیں۔

”میں بھی دینے جاؤں گی۔۔۔“
”ہاں تم بھی جانا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کا گال
تھپتھپایا۔

”باجی! تم سب سے پہلے کے گوشت دو گی۔“
مد قوتی سی صالحہ نے پوچھا تو جو ادنیٰ نے اسے فوراً ”گھر کا۔“
”سب سے پہلے فریج میں گوشت رکھتے ہیں۔۔۔“
”ہیں نا باجی۔۔۔ آپ بھی فریج میں رکھو گی نا۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ میں نے قطعیت سے کہا۔“ سب
سے پہلے میں تم سب بچوں کے گھر گوشت بھیجوں گی
بلکہ خود دینے آؤں گی۔۔۔ اس کے بعد سارا گوشت تم
لوگ سب کے گھروں میں دے کر آؤ گے۔“ یہ سن کر
جو ادنیٰ مسکراتے لگا۔۔۔ دوسرے بچے زور و شور سے
منصوبہ بنانے لگے کہ کون کس کے گھر گوشت دینے
جائے گا۔

ان سب آوازوں میں سب سے بلند آواز گڈی کی
تھی۔



”ساتھ والوں نے اس بار قربانی کے لیے بڑی سی
گائے لی ہے۔۔۔ دیکھنا اس بار وہ ہمیں بھی گوشت کا

گڈی کا اضطراب دیدنی تھا۔ وہ بے چینی سے صحن
میں چکرانی پھر رہی تھی حالانکہ اچھی طرح جانتی تھی
کہ فائق دو گھنٹے سے پہلے آنے والا نہیں مگر پھر بھی۔۔۔
آج وہ آفس سے جلدی گھر آگئی تھی۔ عموماً اس
وقت میرا کمرہ ٹیوشن کے بچوں سے بھرا ہوتا تھا۔ مگر
آج زیادہ تر بچے جا چکے تھے۔۔۔ دو چار ہی رہ گئے تھے اور
ان کا دھیان بھی پڑھائی کے بجائے گڈی کی طرح اس
قربانی کے جانور میں اڑکا تھا جسے فائق خریدنے گیا ہوا
تھا۔

”باجی! باپ کے گھر بکرا آئے گا؟“

”اں۔۔۔ میں خیالات سے چونکی۔۔۔ پانچ سالہ
جو ادنیٰ مجھ سے بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ بکرا بھی آئے گا اور گائے بھی۔“

”گائے بھی! جو ادنیٰ کے ساتھ ساتھ علیحدہ کی بھی
آنکھیں فرط حیرت سے پھیلیں۔

”ہم بھی اگلی دفعہ قربانی کریں گے۔ میری اماں
نے بتایا ہے۔“ وہ شرماتے ہوئے بولا تو میں نے اس کا
مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا۔

میرے پاس جتنے بھی بچے پڑھنے آتے تھے وہ سب
غریب گھروں سے تعلق رکھتے تھے۔ سرکاری اسکولوں
میں پڑھتے تھے اور ان کے ماں باپ کی اتنی حیثیت نہ
تھی کہ وہ ان کے ٹیوشن کی فیس ادا کرتے۔۔۔ ہم الحمد للہ
خوش حال تھے۔ فائق اچھے عہدے پر تھا۔ گڈی کی
تنخواہ بھی پانچ ہندسوں پر مشتمل تھی۔۔۔ میں ان سب
بچوں کو اسکول سے آنے کے بعد فری ٹیوشن دیتی تھی۔
میں ایک اچھے پرائیویٹ اسکول میں ریسپل تھی۔

”پھر میں سب کے گھر گوشت دینے جاؤں گا۔“

”اماں کے آنسوؤں نے سالن کو نمکین کر دیا۔“

حصہ دس گئے۔ پھر ہم اس کے شاہی کباب بنا میں گے۔ گڈی خوش ہو کر بولی۔

”اونہ تم اور تمہارے شاہی کباب۔۔۔ یہ ساتھ والے اتنے کجوس ہیں کہ اپنی گائے کی ایک بوٹی بھی ہمیں نہیں دینے والے۔ پھر بھی اگر یہ کجوس دے دیں تو بنوا لینا تم اپنے شاہی کباب۔۔۔“ اس کا دل توڑنے کے بعد وہ جھوٹی تسلی کا کونا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے جوش سے بولا۔

”ناصر انکل نے کہا ہے پہلے روزان کے گھر آجاؤں پھر وہ مجھے بکرے کے سری پائے دیں گے کتنے مزے دار ہوتے ہیں ناسری پائے۔“ بیو نے مزہ لے کر کہا۔

اور میں۔۔۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا والا۔ اور یوں بھی غریبوں کو کون پوچھتا ہے۔ خوش گلابیوں کی انتہا ہونے لگتی۔ ایسے میں ہماری اماں

ہمیشہ کی طرح خاموشی سے اٹھ جاتیں۔

آج بھی وہ اٹھ کر مٹی سے لیے ہوئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی مگر باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوتے رک گئی۔

اماں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے کچھ مانگا تھا پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر توری کا شاپر سانسے رکھے اب اس میں سے پکانے کے لیے توری نکالنے لگی تھیں جو اب شام کو لے کر آئے تھے کیونکہ شام کو سبزیاں سستی ملتی ہیں اماں نے شاپر اٹھایا اور بڑے سے تھال میں شاپر کو الٹ دیا۔

اوشھی کٹی ہوئی اور چھوٹی چھوٹی توریاں تھال میں یہاں وہاں لڑھک گئیں توریوں کی چھائی کرتی اماں کی آنکھ سے یکایک ایک آنسو نکلا اور رخسار سے بہتا ہوا نجانے کون سی توری میں جذب ہو گیا۔ ہمیشہ مطمئن نظر آتی اماں کی آنکھ سے نکلے آنسو نے میرے دل میں الجھن پیدا کر دی۔۔۔ میں پلٹ تو آئی۔ مگر بہت دیر تک الجھتی رہی کہ جب اماں بیاز کاٹ ہی نہیں رہی تھیں تو ان کی آنکھ سے آنسو نکلا کیوں۔۔۔؟

مگر جب رات کو کھانے میں ابانے کہا کہ توری میں نمک زیادہ کیسے ہو گیا تو میں چونک اٹھی۔

سالن میں نمک زیادہ ہو جانے کی بدولت سب نے بھوک کے باوجود کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اماں نے چپ چاپ اس وقت تو سارے برتن سمیٹ لیے مگر صبح سویرے اٹھ کر اپنے جاوئی ٹونکوں میں سے ایک ٹونکا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے آٹے کا چھوٹا سا پیڑا گرم سالن میں ڈال کر کچھ اس طرح جھجھکایا کہ سالن کا سارا انا تو نمک اس پیڑے کے ساتھ لپٹا چلا گیا۔ جس کی وجہ سے ناشتے میں سب نے شور بے والی توری کے اس سالن کو اس لیے بھی بیٹ بھر کر کھالیا۔۔۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ اب اگلے کھانے میں انہیں توری کے چھلکوں سے بنے ہی کسی کھانے میں شاہی کباب ملنے والے تھے۔

توری کے چھلکوں کے شاہی کباب۔۔۔ جنہیں اماں توری کے چھلکوں سے بالکل اس طرح



بیٹھنیں تو نئے جوڑے کے چاؤ میں باؤلا ہوتا فائق (بیو) اس وقت تک اماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہتا جب تک کہ کرتا سہل نہ جاتا۔ اور جب کرتا سہل جاتا تو وہ کرتے کو اپنے ساتھ لگا کر ہمیں لہک لہک کر دکھاتا۔

اور پھر جب ہمیں نئے جوڑوں کے ساتھ نئی جوتیوں کا خیال ستانے لگتا تو ہم معمور عیار کی زنبیل سے ہماری ساری مشکوں کا حل نکالنے والی اماں کے سر ہو جاتے۔ تب چاند رات سے دو تین دن قبل اماں واقعی اپنی زنبیل سے وہ گلک برآمد کرتیں جس میں انہوں نے سال بھر چیکے چیکے پیسے جمع کیے ہوتے تھے۔ تب ہم سب اشتیاق کے عالم میں ان کے گرد جمع ہو جاتے تو وہ بڑی پیاری سی سکر ایسٹ لبوں پر سجا کر بڑی احتیاط سے چھری کی مدد سے پلاسٹک کے ٹک کا منہ کھولتیں اور سارے پیسے باہر نکال کر پہلے انہیں گنتیں۔ پھر ان میں سے کچھ پیسے اماں، ابا کو ہماری اور خود اماں کی جوتی لانے کو دے دیتیں۔ تب ہم رگڑ رگڑ کر باؤں دھونے کے بعد بہت جوش سے اماں کے ہمراہ جوتی لیتے نکل پڑتے۔ جوتی لینے کے بعد گویا ہماری عید کی تیاری مکمل ہو جاتی۔

مگر ابا کے جوتے کی نئی نو ملی جوڑی دیکھ کر ہمیں ایک دم ابا کے نئے جوڑے کا خیال آنے لگتا۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم اماں سے اس متعلق کوئی سوال کرتے۔ اماں، ابا کا وہ جوڑا جسے ہم نے انہیں پہچلے دو تین سالوں میں بس خاص خاص موقعوں پر پہنتے دیکھا تھا نکال کر پہلے اسے ہلیج میں کچھ دیر چھوٹیں پھر اسے ہلیج سے نکال کر خوشبو والے سرف سے دھو کر دھوپ میں خشک ہونے کو ڈال دیتیں۔ اور جب وہ خشک ہو جاتا تو اماں اس جوڑے میں خوب سارا کلف لگا کر اس پر جما جما کر استری کرنے کے بعد ابا کے سینے کے لیے بھی بالکل نئے جیسا جوڑا تیار کر دیتیں۔ اپنی ساری تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ہم بڑی بے چینی سے عید کا انتظار شروع کر دیتے۔

اور پھر عید آجاتی۔ تو ہم صبح سویرے نہا دھو کر استری کیے نئے جوڑے اور جوتیاں پہننے کے بعد پہلے تو

بناتیں جس طرح قمیے سے بنائے جاتے ہیں۔ بس وہ یہ کرتیں کہ قمیے کی جگہ توری کے اترے پھلکوں کو دھو کر ان میں پنے کی دال ڈال کر ان میں ذرا اسلانی ڈال کر اباتیں۔ جب وہ اہل جاتی تو ان کو پیرس کر بڑی لگن سے انہیں کباب کی شکل دیتیں پھر انہیں فرانی کر کے ہمیں خوش کرنے کو شامی کباب کا نام دے کر چٹنی کے ساتھ کھانے کے لیے پیش کر دیتیں۔

ہماری اماں ایسی ہی تھیں۔ انوکھی اور نرمی۔ وہ ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے ہمیشہ باخبر ہتیں۔

اس لیے جب بھی رات کے کھانے کے بعد روٹی بچ جاتی تو وہ اگلے دن بڑی فرصت سے بیٹھ کر اس باسی روٹی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ کر چھابڑی میں پھیلا کر دھوپ میں سوکنے کے لیے رکھ دیتیں اور پھر آہستہ آہستہ جب دھوپ میں سینکے روٹی کے ان ٹکڑوں کی تعداد بڑھ جاتی تو اماں پہلے تو انہیں کوٹتیں۔ پھر ان کی چھان پھٹک کرنے کے بعد وہ انہیں بڑی ہی پیلی میں ڈال کر گگ میں ذرا دیر کو بھونتیں۔ اس کے بعد انہیں ذرا دیر کے لیے پانی میں بھگو دیتیں۔ جب وہ اچھی طرح پانی میں پھول جاتے تو کئی کئی دن کے بچے کے سارے ساہن ایک جگہ مگس کرنے کے بعد مسالا بنا کر ان ٹکڑوں کو پانی سے نکال کر مسالے میں ڈال کر دیکھی کا ڈھکن بند کر دیتیں۔ ڈھکن بند کرنے سے پہلے وہ ان میں زرد ڈالنا ہرگز نہیں بھولتی تھیں۔ اور پھر تھوڑے سے انتظار کے بعد جب پانی خشک ہو جاتا تو وہ حلیم کی صورت اختیار کیے ہوئے ان ٹکڑوں کو پلٹوں میں نکال کر ان پر کتری ہوئی ہری مرچ اور گرم مسالا چھڑک کر ہمیں کھانے کو دیتیں تو گویا ہماری عید ہو جاتی۔

اور پھر جب عید آنے لگتی تو اماں کترنوں کا وہ تھیلا الٹ کر بیٹھ جاتیں جسے پورے سال میں ابا نے اپنے ورزی دوست سے چھوٹی بڑی رنگ برنگی کترنیں لالا کر بھر دیا تھا۔ اماں ساری کترنوں سے ڈیزائننگ کر کے ہمارے عید کے جوڑے تیار کر دیتیں۔ جبکہ سفید کترنوں سے اماں فائق کے لیے کٹی والا کرتا سینے

کے گھروں میں بندھے قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر آسمان کو چھونے لگتا۔ تب ہم شوق سے گلی سے گزرتے ہر جانور کے پیچھے اس وقت تک بھاگتے دوڑتے جب تک ہمارے پاؤں دکھ نہ جاتے۔

تب ایک دن گڈی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں دائیں بائیں پھیلاتے ہوئے اماں ابا سے سوال کیا تھا۔

”سب کے گھر بکرے آگئے ہیں۔ ہمارے گھر کب آئے گا؟“

اس کے لبوں سے نکلے سوال پر میری اور پودونوں کی ہی سوالیہ نظریں اماں کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ جبکہ ابا اس طرح سر جھکائے کھانے میں رغبت ظاہر کرتے نوالہ توڑ کر شور بے میں ڈبو ڈبو کر کھانے میں مگن نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”تم لوگ دعا کرو پھر ہمارے گھر بھی بھرا آئے گا۔“

اماں دعا کی شرط لگا دیتیں۔ گڈی اس وقت اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو دعا کے لیے اٹھا دیتی۔ اور ہم سب اس کے لبوں کی خاموش دعا پر چپکے سے دل میں آمین کہتے وہاں سے اٹھ جاتے۔

اور پھر عید کے روز اپنے گھر قربانی نہ ہونے کی بنا پر قربانی کے جانور کے ذبح کا منظر دیکھنے کے شوق میں ہم بڑوس کے گھروں میں اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک وہ سارا گوشت سمیٹ کر اندر نہ چلے جاتے۔ جیسے ہی وہ اندر کی طرف بڑھتے۔ ہم گھر آجاتے اور دیر تک ہمسایوں کے گھر سے گوشت آنے کی امید میں دروازے پر منتظر نظر جمائے بیٹھے رہتے مگر ہمارا یہ انتظار انتظار ہی رہتا۔ دوپہر ہونے لگی تو اماں بنا کچھ ظاہر کیے ابا کی لائی مسور کی دال کا ساپرا اٹھا کر باورچی خانے کی طرف بڑھتیں۔

”عید کے روز وال۔“ گڈی اور پودونوں کے منہ لٹک جاتے اور میں اس ساری صورت حال پر افسوس کرتی، خود کو مایوسی کے گہرے کنویں میں گرتا محسوس کرنے لگتی تو گھبرا کر اپنی اکلوتی سہیلی شہو کے گھر پہنچ جاتی۔

”شہو تمہارے گھر گوشت آیا ہے کیا۔؟“ بظاہر

ابا کے ساتھ گلی کی مسجد میں عید کی نماز ادا کرتے۔ اس کے بعد عیدی کے طور پر ابا سے پچاس کا کرارا نوٹ وصول کرتے۔ پھر بہت قیمتی خزانے کی مانند پچاس کے نوٹ کو منھی میں دبا کر خوشی کے عالم میں فلاںچیں بھرتے ہوئے ہتھسوس چاچا کی دکان پر جا پہنچتے۔ پہلے تو سمجھ میں ہی نہ آتا کہ آخر پچاس کے اتنے بڑے نوٹ کو خرچ کریں تو کریں کہاں؟؟؟

مگر پھر دوسرے بچوں کو مختلف چیزوں میں پیسے اڑاتا دیکھ کر پہلے تو ہم دس روپے کی کالی پلاسٹک کے تیشوں والی عینک خرید کر ناک پر چڑھا کر خود کو سلطان راہی سمجھتے ہوئے دس روپے کی پلاسٹک کے چھروں والی پستول بھی خرید کر بڑے اسٹائل سے ہاتھ میں پکڑ لیتے۔ پھر پانچ روپے کا بیٹھاپان خرید کر منہ میں دباتے۔ پھر بڑی شان سے پان چباتے ہوئے محلے کے بچوں کے ہمراہ قریبی پارک میں پہنچ جاتے۔

ناک پہ عینک ہاتھ میں پستول۔ منہ میں دیپان۔ اور چپس۔ کچھ دیر تو ہم بڑے اترائے اترائے سے پارک میں یہاں وہاں گھومتے پھر پارک میں لگی ریڑھی سے دس روپے کی چٹ پیٹے دھٹی بھلوں کی پلپٹ پیٹ میں اتارنے کے بعد پانچ روپے کی کون والی آس کریم اس طرح چاٹ چاٹ کر مزے لے کر کھاتے کہ جیسے اس سے بڑھ کر ہمارے نزدیک کوئی چیز مزے کی ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر ذرا جھوٹے لینے کے لیے چل جاتا اور پھر ہم اس وقت تک جھوٹے لیتے رہتے جب تک ہماری دس روپے ختم نہ ہو جاتے اور پھر جب دس روپے ختم ہو جاتے تب ہم منہ لٹکائے گھر لوٹ آتے۔

اور پھر ہماری عید ختم ہو جاتی۔ رات کو پھر وہی روز کے کپڑے پہن لیے اور اماں ہمارے وہ نئے جوڑے اور جوتے لے کر بڑی عید پر پہننے کی خاطر سنبھال کر رکھ دیتیں۔ عید کے بعد بڑی عید۔ ہم پھر سے عید کا سن کر ایک بار پھر انتظار شروع کر دیتے۔ پھر جوں جوں دن قریب پانے لگتے ہمارا جوش نئے جوڑے اور جوتے سے ہٹ کر آس بڑوس

سرسری لہجے میں جو جانے کی تمنا تھی شبو اس سے بخوبی واقف تھی۔ اس لیے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ہمراہ اپنے گھر کے چھوٹے سے باورچی خانے میں لے آئی۔

”یہ دیکھ ہمارے گھر کتنا سارا گوشت جمع ہو گیا ہے آگے بڑھ کر اس نے بڑی چھوٹی کئی تھالیوں سے کپڑا ہٹا کر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ہاڑو کھائے تو میری آنکھیں واقعی حیرت سے پھٹ سی گئیں۔“

”مگر میرے گھر تو گوشت کی ایک چھوٹی سی بوٹی تک نہیں آئی۔“ افسوس سے زیادہ میرے انداز میں حیرت نمایاں تھی۔

”کیونکہ تم غریب ہو۔۔۔ اور غریبوں کے گھر کوئی گوشت نہیں دیتا۔“ میری حیرت سے مزہ لیتے ہوئے اس نے کہا تو مجھے اس کا انداز حد درجے پر الگا۔

”اگر ہم غریب تھے تو وہ کہاں کی امیر تھی۔۔۔ ہماری ہی طرح کا دو کمروں کا گھر تھا اس کا اور اس کے ابا بھی تو وہیں مزدوری کرتے تھے جہاں میرے ابا مزدوری کرتے تھے۔“

”پھر وہ ہم سے الگ اور انوکھی کہاں سے ہو گئی۔۔۔؟“ اس نے شاید میرے تاثرات سے میرے اندر ابھرتے سوالوں کو پڑھ لیا تھا۔ اس لیے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے یہ سارا گوشت محلے داروں نے ہمارا اور واڑہ بجا بجا کر ہمیں دیا ہے۔۔۔؟“ بڑا طنز سا انداز تھا اس کا۔۔۔ میں کچھ بھی نہ بول سکی۔

”میں نے کہا ہے نا، غریب کے گھر کوئی گوشت نہیں دیتا۔“ اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا پھر بولی۔

”غلط نہیں کہہ رہی ہوں میں۔۔۔ میری اماں کہتی ہے یہ سارے امیر جتنے بڑے بڑے گھروں میں رہتے ہیں۔ اتنا ہی چھوٹا دل ہوتا ہے ان کا۔۔۔ یہ دیتے بھی اپنے ہی جیسے ان لوگوں کو ہیں جن سے واپسی میں کچھ بڑھ کر ملنے کی امید ہوتی ہے۔ اب تم خود تاؤ۔ ایسے میں ہم جیسے غریب لوگوں کو دے کر ان کو واپسی میں کیا مل جاتا ہے؟ پھر بے رحمی تشکر آمیز مسکراہٹ سے اور دل سے نکلی دعا جس کی یہاں کسی کو ضرورت نہیں ہے۔“ تفصیل سے بولتی شبو کے تاثرات آخر میں

بڑے عجیب سے محسوس ہوئے تھے۔

”پھر یہ گوشت کا ڈھیر۔“ میں نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔ گوشت کا یہ ڈھیر ابا نے خود لوگوں سے مانگ کر جمع کیا ہے۔۔۔ خود ان کے پاس جا کر ان سے شاپر لے کر آئے ہیں ابا۔ تب کہیں جا کر یہ اتنا گوشت جمع ہوا ہے ورنہ اس بڑوس کے سارے گھروں میں قربانی ہونے کے باوجود ہم گوشت کے انتظار میں دن ڈھلے تک بھوکے بیٹھے تھے۔“ وہ ہنس ہنس کر مزہ لیتی ہوئی اپنے ابا کے کارنامے کا ذکر کر رہی تھی۔

مجھے ایک دم۔۔۔ اس سے اس کی باتوں سے وحشت محسوس ہونے لگی۔ اس لیے اپنا ہاتھ چھڑا کر میں بھاگتے قدموں سے اس کے گھر سے نکلی تھی۔

”تمہارے ابا خود وار ہیں۔۔۔“ میرے کانوں میں شبو کی آواز گونجی تو بھاگتے قدموں کی رفتار میں ذرا سی کمی ہونے لگی۔

”تمہارے ابا بھوکے مرجائیں گے مگر کسی بگے سامنے ہاتھ پھیلا کر سوال نہیں کریں گے۔“ شبو کی یہی اگلی بات نے میری سماعت پر اس زور سے دستک دی کہ میرا سر فخر سے اٹھ گیا۔

”میں فقیر نہیں ہیں۔۔۔ ہم وال کھالیں گے مگر کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے۔“ غریب کے پاس ایک اکلوتی خوداری ہی تو ہوتی ہے۔ اگر غریب اپنی اس خوداری کو بھی کھو دے۔۔۔ تو پھر کیا فرق رہ جائے گا غریب اور فقیر میں؟

”گائے آگئی۔“ میرے خیالات کے تسلسل کو جواو کی جوش بھری آواز نے توڑ دیا۔

سارے بچے ہڑبونگ مچاتے ہوئے صحن کی طرف بھاگے جہاں فاتح گائے کو لے کر داخل ہوا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابا کی دوا کا ٹائم ہو گیا تھا۔ میں کمرے سے نکلی تو صحن میں رونق لگی ہوئی تھی۔ بچے تھمتاتے چروں کے ساتھ گائے پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔۔۔ گڈی صحن میں پچھی چارپائی کے پاؤں کے ساتھ دونوں بکروں کو باندھ رہی تھی۔۔۔ اماں اور

فاتح کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔

میں بھی مسکراتی ہوئی ابا کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

حالی سرکاری

”کیا مطلب کہ اسے تیار کروں؟“
میں نے غصے سے تقریباً ”بل کھاتے ہوئے علی
سے سوال کیا۔ علی نے اب کی بار گلا کھنکھار کر
وہی لہجے میں کہا۔

”آپا! ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ بس آج اگر
آج یہ اپنے گھر پر نہ ہوئی تو ہمارے پورے سال بھر کی
محنت ضائع ہو جائے گی۔ پلیز آپ اس کو تیار کر دیں
کہ وہ واپس جاسکے۔ پلیز آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔“
”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے۔ اس جسم
میں دوبارہ بنانے دوں۔ بتانا بھی ہے کہ وہ اب اس
قابل ہی نہیں۔۔۔ تمہیں اس کی تکلیف کا احساس
نہیں ہے۔ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ایسے میں
اس کو لیٹنے بیٹھنے تک میں تکلیف ہے اور تم چاہتے ہو
وہیں بھیج دوں جہاں اس قدر وحشیانہ ظلم ہوتا رہا ہے
اس پر۔۔۔؟“
میں ابھی اور بھی کچھ کہتی تھی کہ علی کا فون بجنے لگا۔
علی اس وقت ایسی عجلت میں تھا کہ اُوہی بات میں کسی
نہ کسی سے فون پر رابطہ کر لیتا۔ یا کسی کا فون آجاتا۔
میں بھی اپنی جگہ جمی کھڑی تھی۔ جو علی چاہتا تھا
میرے نزدیک ناممکن تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ
اب کچھ بھی ہو، میں علی کی کوئی بھی بات نہیں مانوں
گی۔

جب علی اسے میرے پاس معائنہ کے لیے لایا تھا تو
وہ بڑی تکلیف سے چلتی معائنہ کے بستر پر جا بیٹھی تھی۔
میں اس وقت کسی اور مریض کو دیکھنے میں مصروف
تھی مگر میں نے کن اکھیوں سے سب دیکھا کہ کس
طرح علی اس کو ہر ایک قدم پر سہارا دے رہا تھا۔ اور
اس وہیں میرے اندر غصے کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس لڑکی

میں ابھی اور بھی کچھ کہتی تھی کہ علی کا فون بجنے لگا۔
علی اس وقت ایسی عجلت میں تھا کہ اُوہی بات میں کسی
نہ کسی سے فون پر رابطہ کر لیتا۔ یا کسی کا فون آجاتا۔
میں بھی اپنی جگہ جمی کھڑی تھی۔ جو علی چاہتا تھا
میرے نزدیک ناممکن تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ
اب کچھ بھی ہو، میں علی کی کوئی بھی بات نہیں مانوں
گی۔

علی نے کلینک میں موجود باقی مریضوں کو چلتا کر دیا تھا۔
”یہ تمہیں کہاں سے... کس طرح؟“

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ علی سے کیا پوچھوں کہ میرے حساب سے تو علی اور سحرش کی دوستی کوئی پانچ سال ہوئے یونیورسٹی کے آخری سال کے ختم ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی... مگر آج جس طرح علی اسے سہارا دے کر میرے پاس لایا تھا اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ علی اور سحرش ایک دوسرے سے کافی بے تکلفی سے ملتے رہے ہیں۔

سحرش کا جاو تو پوری یونیورسٹی کے لڑکوں پر سہڑھ کر بولتا تھا... بھلا علی کی کیا مجال کہ بچ نکلتا... علی مجھ

نے علی کو تباہ کر دیا... ممکن طور پر ناکارہ کر دیا... مگر ابھی تک علی کا پیچھا نہیں چھوڑا... میرا بھائی اس لڑکی کے چکر میں کیا سے کیا ہو گیا... اور یہ ابھی تک تماشے بازی سے باز نہیں آئی۔

مریض کو فارغ کر دینے کے بعد میں سحرش کی طرف متوجہ ہوئی اور علی کو اشارے سے کمرے سے باہر بھیج دیا... سحرش اس وقت خلاف عادت سنجیدہ تھی... اس نے صرف اتنا ہی بتایا کہ وہ سیڑھیوں سے پھسل گئی اور اس کے بعد سے اپنا بایاں ہاتھ ہلانے بلانے سے قاصر ہے... میں نے چند لمحے اس کی شرٹ کو اوپر نیچے کیا تاکہ معائنہ کر سکوں... ہر بار جب بھی میں اس کی شرٹ کو گھلے سے پکڑ کر اوپر نیچے کرتی اس کے ہاتھ اور ہنسی کی ہڈی پر زور پڑتا اور وہ تکلیف... بلبلاتا جاتی۔

آخر کار میں نے اسے ڈانٹ دیا... ”کیا بچوں کی طرح اپنے چلی جا رہی ہو... چپ رہو... اداکاری کی بھی حد ہوتی ہے... ایک آواز تمہیں نکلے اب... سمجھیں؟“

اس نے تڑپ کر جواب دیا... ”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا؟ میں واقعی بہت تکلیف میں ہوں...“
میں نے بھی ہنسنے سے اسے بستر پر پیٹنے کے بل لٹا کر اس کے منہ کے نیچے تک رکھ دیا کہ چھٹا ہے تو تکیے میں جینے یوں آواز باہر تو نہیں جاسے گی... باہر کافی مہارے مریض موجود تھے اور کیونکہ ابھی تک میں نے سحرش کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا تو اس کی ہر حرکت پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی... مگر پھر اس کے کندھے اور گردن کے درمیان سفر کرتے میرے ہاتھ نے کالر بون میں جو خلا پایا تو میں کانپ کر رہ گئی۔

مجھے سحرش پر ایک دم بہت رحم آنے لگا... میں نے اسے چند ایک ہدایات دیں... جو ہڈی جوڑ والے ڈاکٹر مریضوں کی ہڈی بٹھاتے ہوئے بتاتے ہیں۔

وہ تکلیف سے ادھ مونی سی ہو گئی تھی... میرے نزدیک وہ اٹھنے تک کے قابل نہیں تھی اور یہی پہانے میں علی کو باہر آئی تھی اور تب میں نے دیکھا کہ



سے عمر میں چھ سال چھوٹا تھا۔ ہمارے درمیان میں دو بھائی بہن اور تھے مگر گھر میں میری اور علی کی دوستی خوب جمی ہوئی تھی۔ علی جب تک یونیورسٹی میں پہنچا۔ میں میڈیکل کی تعلیم سے فارغ ہو کر ہاؤس جا کر رہنے لگی تھی۔ یونیورسٹی میں دو ایک لیکچرار میرے دوست تھے جن سے ملنے اکثر علی کے ساتھ یونیورسٹی چلی جاتی تھی۔ وہیں مجھے سحرش نامی لڑکی کا پتا چلا کہ کس طرح اپنی بچھے دار باتوں اور شعلہ بیانی سے اس نے سب کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ سحرش ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ خوب صورت تو تھی ہی رہتی بھی ہمیشہ ٹپ ٹاپ سے تھی۔ کچھ اس طرح برانڈڈ کپڑے جوتے پہنتی کہ اپنی حیثیت کو صاف چھپا جاتی تھی۔ علی نے جب باقاعدہ یونیورسٹی کی کینٹین میں سحرش کو مجھ سے ملوایا تو مجھے اس میں بہت بناوٹ محسوس ہوئی۔ مگر علی کی اس قدر تعریف کے آگے میں خاموش ہو گئی اور سوچا کہ ابھی علی جوتوں میں ہے اس کو کچھ بھی کہنا سمجھانا فضول ہے جوانی کا جوش اور پہلی محبت کا نشہ اکثر اندھا کر دیتا ہے۔

علی کو میں روز بروز سحرش کے لیے دیوانہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ سحرش نے نہ صرف علی کو قابو کیا تھا بلکہ وہ باقاعدہ ہمارے گھر بھی آنے لگی تھی۔ اور اپنی ہنس مکھ طبیعت اور شرارت سے گھر والوں کے درمیان رونق محفل بنی رہتی تھی۔ اور کوئی دو ڈھائی سال میں جو اپنی ہاؤس جا کر اب میں حدت زیادہ مصروف ہوئی تو میری نظریں یہ دیکھنے سے قاصر رہیں کہ کب علی اور سحرش میں ناچانی ہوئی اور پھر سحرش نے ہمارے گھر آنا بھی بند کر دیا۔

انتایا وہ ہے کہ تعلق ختم ہونے سے چند مہینوں پہلے سے سحرش جب بھی گھر آئی، علی کہیں باہر چلا جاتا۔ سحرش بھی جیسے کسی سوچ میں گم رہتی اور گھر والے اسے یاد دلاتے رہتے کہ وہ قہقہہ لگانا۔ ہنسنا تقریباً بھول ہی چکی ہے۔

ہاں ایک بات اور بھی ہے جو مجھے اچھی طرح یاد

ہے۔ پتا نہیں وہ کون سا دن تھا۔ اس دن سحرش آئی تو سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی۔ مجھ سے وہ کم ہی بے تکلف ہوتی تھی۔ کچھ میں بھی اس کو حد میں رکھتی تھی مگر اس دن جیسے وہ تمام حدود توڑنے آئی تھی۔

”کبھی کبھی ہم اپنے ہی اندر ایک خالی مکان بن جاتے ہیں۔ ایسا مکان جس کو صدیوں سے کسی نے رہنے کے قابل نہ سمجھا ہو۔ دن بھر خاموشی۔ ایسی۔۔۔ تنہائی سی چھائی رہے اور رات میں کچھ یوں بھوت پریت جنات کا ریٹا اٹھے کہ میلے کا سماں بندھ جائے۔ ابھی کوئی رو رہا ہے۔ اب کوئی قہقہے لگا رہا ہے۔ کہیں سے کسی کے گلنٹانے کی آواز آرہی ہے تو کبھی کوئی چہم چہم گھنگھر و باندھے نایاب رہا ہے۔ ایسے میں کوئی انجان راہ گیر سامنے سے گزرتے کان دھرے تو اس پر پتھر سائے جاتے ہیں اور کسی پر پھول۔“

اس نے بڑے نئے تلیے انداز میں کہا تو میں چڑ گئی۔ ”اور علی؟“ علی کو کون سا راہ گیر سمجھوں۔ جس پر پتھر سائے گئے ہیں۔ نیوں؟“

سحرش نے شرمندگی سر جھکا لیا۔ اور تھکے سے انداز میں بولی۔

”علی راہ گیر نہیں آیا۔ وہ تو اس خالی مکان کا گمشدہ مکین ہے۔“

اور پھر وہ چلی گئی۔ علی کی مایوسی اور دکھ کا ہم سب کو اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک دن امی کے کہنے پر میں نے علی کو کریدا۔ جس پر مجھے اس قدر ہی معلومات مل سکیں کہ سحرش نے کسی بہت ہی امیر بزنس مین سے ملنے کر لی ہے اور اب وہ یونیورسٹی میں بس اپنا آخری سال مکمل کرنے کے انتظار میں ہے۔ جبکہ علی بھی اس کے لیے کافی سنجیدہ تھا۔ دونوں میں کافی بحث ہوئی۔ مگر سحرش کے مطابق اس کے والد بھند ہیں کہ سحرش بزنس مین سے ہی شادی کرے کیونکہ شادی میں سحرش کو اس کے والدین کے لیے مکان کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ مل رہا تھا۔

علی خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔ سحرش کی شادی

ماضی میں گھٹنے میں گس کا ہاتھ ہے۔ سحرش یا علی خود ہی اپنا دستمن بن بیٹھا ہے۔۔۔؟ میں ایسے ہی خیالات میں ڈوبی سحرش کے بال بنا رہی تھی۔۔۔ اس کے ہاتھ کے گرد پٹی باندھ کر گلے سے لٹکا دیا تھا۔۔۔ جبکہ علی قریب ہی رکھے اسٹول کو گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔۔۔ بہت گھمبیر لہجے میں اس نے سحرش کو ہدایت دینی شروع کی۔۔۔

”دیکھو سحرش۔۔۔ اس فائل تک تم ہی پہنچ سکتی ہو۔۔۔ جس سیف کا تم نے بتایا ہے، میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں جس فائل کی مجھے ضرورت ہے۔ وہ اسی سیف میں ہے۔۔۔ میں نے تم کو ویڈیو دکھائی تھی نا جس میں ہمارا بندہ تمہارے شوہر سے بات کر رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی بس وہی یاد رکھو۔۔۔ وہ فائل بہت اہم ہے۔۔۔ اسی میں سارے نام ہیں مگر تم احتیاط کے طور پر باقی جی اے سی کا فائلز نظر آئیں اٹھالیسا۔۔۔ اور پھر بس جو موبائل فون دیا ہے اس پر ایک مس بیل۔۔۔ میں اپنی ٹیم کے ساتھ وہیں۔۔۔ تمہارے گھر کے قریب ہی ہوں گا۔۔۔ سمجھ گئی ہو۔۔۔ پلیز کوئی کوئی نہیں۔۔۔ بہت ہوشیاری اور سمجھ داری سے چلنا۔۔۔“

”میں سحرش کو ہرگز جانے نہیں دوں گی۔۔۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے۔۔۔ یہ چوٹ گرنے سے نہیں آئی ہے۔۔۔ اس کو باقاعدہ زود کو ب کیا گیا ہے۔۔۔ میں نے اس کی پیٹھ پر دو سرے نشانات بھی دیکھے ہیں۔۔۔ بس اب یہ کہیں نہیں جائے گی۔۔۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

یہ سن کر علی کا چہرہ تاریک ہو گیا۔۔۔ اس نے سحرش کی طرف دیکھ کر سختی سے پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟ تم نے تو کہا تھا کہ اس نے آج تک تمہیں ہاتھ نہیں لگایا۔۔۔ بولو؟“

سحرش زیر لب مسکرانے لگی اور آہستگی سے کھڑی ہو گئی۔۔۔ غیر ارادی طور پر علی اور میں نے اسے سہارا دے دیا۔۔۔ سحرش کو اس کی گاڑی میں سوار کرانے کے بعد علی واپس آ گیا۔۔۔ میں اب تک پریشان سو گوارسی

تعمیری سال ختم ہوتے ہی ہو گئی جبکہ علی اپنی ہینوں تنگ بے کار پھرتا رہا۔ ہم سب کو دکھ تھا سب ہی جانتے تھے کہ علی کا دکھ بہت زیادہ ہے اور کسی میں ہمت نہیں تھی کہ اسے دلا سے کے لیے کچھ کہتا۔

صدمہ جیسا بھی ہو۔۔۔ اگر سانس باقی ہے تو زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ یوں علی نے دو ڈھائی سال میں ہی اپنے لیے ہاؤسنگ منسٹری میں جگہ بنائی۔۔۔ اور ایک ڈیڑھ سال میں ہی ترقی کر کے ایچ جے عمدے بر آ گیا۔ آئے دن ہم اخباروں میں پڑھتے اور میڈیا چینل میں علی کے ڈپارٹمنٹ کی جعلی الاٹ شدہ پلانوں پر چھاپے اور حکومتی چارہ جوئی کی خبریں سنتے رہتے۔

علی نے چند ہی دنوں میں لینڈ مافیا پر کچھ یوں ہاتھ ڈالا کہ اکثر ہمارے گھر میں قسم قسم کے لوگوں کا آنا جانا ہونے لگا۔۔۔ کچھ اس میں علی کے ہی مخبر تھے اور کچھ اس کے حریفوں کے حیلے۔۔۔ علی نے یہ سب کچھ کرنا الگ فلیٹ لے لیا تھا اور انہوں ہمارے ساتھ صرف چھٹی کاروز گزار تا باقی دنوں میں مصروف رہتا۔

میں سمجھتی تھی کہ علی سحرش کو میکرو بھول چکا ہے۔۔۔ اور اپنے کام میں کچھ اس قدر منہمک ہے کہ اسے ماضی کا وہ تکلیف دہ دور یاد نہیں رہا ہے۔۔۔ مگر شادی کی بات پر وہ تلخی سے ہنس دیتا اور اس کی ہنسی ہی ہم سب کو مایوس کر دیتی۔۔۔ خاص طور سے مجھے علی کا کبھی کبھی کھانا کھاتے سوچ میں گم ہو جانا۔۔۔ یا کسی ہنسی مذاق کے دوران اچانک خاموش ہو جانا۔ بہت کھلتا تھا۔۔۔ مگر ہم سب مجبور تھے۔۔۔ محبت آپ پر اپنے ہی انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔۔۔ سب کے لیے الگ واردات کے ساتھ ظہور میں آتی ہے۔۔۔ اور ہم سب اپنی اپنی جگہ کٹھ پتلی بنے اس کے بچھائے گئے جال میں جکڑے جاتے ہیں اور تکلیف کے اظہار سے بھی ڈرتے ہیں۔

چلو یوں بھی سب ٹھیک ہی تھا۔۔۔ ہم سب اپنے اپنے زخم دل میں چھپائے ہنستے مسکراتے ہیں۔۔۔ زندگی گزار لیتے ہیں اور مجھے علی جیسے مضبوط ارادوں والے لڑکے سے بھی یہی امید تھی۔۔۔ مگر آج سحرش کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے کافی مایوسی ہو رہی تھی۔۔۔ علی کو

کھڑی تھی۔ علی مجھ سے نظریں چڑا رہا تھا اور میں منتظر تھی کہ اب مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کرتا لگا۔

”صدیق اینڈ کو۔ ایک مشور کنسنرکشن کمپنی ہے۔ اس پر ہمارے ڈپارٹمنٹ نے ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اس کے مالک سیٹھ تو صیف نے شہر کے کئی پارک اور کھیل کے میدان یہاں تک کے قبرستان کے لیے مختص پلاٹ ہاؤسنگ ڈپارٹمنٹ کے کئی افسروں کو رشوت دے کر باقاعدہ اپنے نام کر لیے ہیں۔ اور اب کئی پلاٹوں پر بڑی بڑی بلڈنگز کھڑی کر دی گئی ہیں۔ ہمیں نہ صرف سیٹھ تو صیف کو پکڑنا تھا بلکہ اس کے ساتھ ملے ہوئے حکومتی افسروں کو بھی۔ مجھے بھی ان لوگوں نے بکاؤ سمجھ کر اپنی کمپنی کی طرف سے دی گئی بہت بڑی پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ جہاں میں سیٹھ تو صیف کی بیوی سحرش سے ملا۔ میں تو ابھی ہی دھن میں کمپنی اور مالک کی ٹوہ لینے گیا تھا مگر چند ایک دن میں سحرش مجھ سے ملنے آگئی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر ایک نہایت سفاک انسان ہے اور وہ میری ہر ممکن مدد کرنا چاہتی ہے۔ اسی طرح شاید وہ اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے۔“

”اور تم نے پورا اس کی بات مان لی۔؟ یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر ہمارے ڈپارٹمنٹ سے ہی بات نکل گئی اور اس کے شوہر تک پہنچ گئی تو وہ سفاک انسان سحرش کا کیا حشر کرے گا۔؟“ میں نے پہلی بار گرج کر پوچھا۔

علی سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ”خدا کی قسم آیا! سحرش نے یہی بتایا تھا کہ اس کا شوہر نفسیاتی طور پر اس پر بے انتہا قسم کی سختی کرتا ہے۔ اس نے جسمانی تشدد کے بارے میں مجھے کبھی نہیں بتایا۔“

میں نے نخوت سے سر ہلانا شروع کر دیا۔ علی بے چینی سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے جیسے خود سے گویا ہوا۔ ”بس آج رات بھر کی بات ہے۔ سحرش نے کل

ہی سیف کو ڈ۔۔۔ حاصل کر لیا تھا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھے یہ خبر دیتے کھر سے نکلی ہے۔

نوگ آفس کے بجائے ہمیشہ کسی پارک یا گنام جگہ پر ہی ملتے ہیں۔ آج اس نے کہا کہ واپسی پر اسے ایک ڈاکٹر کو دکھانا ہے تو میں اسے آپ کے پاس لے آیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس پر کیا جتی ہے۔ خیر آج ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس آپ فکر نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔

کہنے کو تو علی مجھے مطمئن کر رہا تھا مگر میرا دل بے چین ہو چکا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس خطرناک کھیل سے سحرش اور علی کو بچاؤں۔ میں یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ اگر ان سب میں سحرش کو کچھ ہو گیا تو علی ساری عمر کے لیے گم ہو جائے گا۔ مگر بتا نہیں کس مجبوری میں علی نے اس کام کے لیے سحرش کو استعمال کرنا منظور کر لیا تھا۔ بہر حال میں نے بڑی مشکل سے کلینک کا وقت پورا کیا اور پھر جب میں کلینک سے نکلنے ہی والی تھی تو کلینک میں کام کرنے والی ملازمہ نے مجھے ایک موبائل لاکر دیا۔ جو کہ نجانہ کے بستر کے نیچے بڑا تھا۔ یقیناً ”سحرش علی کا دیا گیا موبائل یہیں بھول گئی تھی؟ میری برواشت کی حد ہو گئی تھی۔ میں کلینک سے سیدھی سحرش کے بنگلے کی طرف نکل کھینچی ہوئی۔ کچھ دور گاڑی پارک کر کے میں ابھی بنگلے تک پہنچنے ہی والی تھی کہ علی کہیں سے نمودار ہو گیا۔

”آہا! آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ آپ کیا سوچ کر یہاں آگئی ہیں۔“ وہ گھگھہا کر میزرا راستہ روکتے ہوئے بولا۔

”میرے سامنے سے ہٹ جاؤ علی۔ میں سحرش کو لینے جا رہی ہوں۔“ میں نے سختی سے کہا۔

”اوہو۔۔۔ سمجھیں پلیز۔۔۔ یہاں میری پوری ٹیم صبح سے کھڑی ہے۔ میرا پلان۔۔۔“ علی ابھی کچھ اور کہتا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”بھاڑ میں جائے تمہارا پلان۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔“

یہ ہی سب باتیں کرتے ہم بنگلے کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے علی کی التجاؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے کال بیل بجادی۔ تھوڑی ہی دیر میں

سیٹھ تو صیغہ پھنکا رہا تھا ہوا۔ سحرش کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ادھر سے علی آگے بڑھ کر اس کے راستے میں آگیا تھا۔ میں نے بھی پھرتی سے سحرش سے فائلیں لے کر اسے اپنے پیچھے کر لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سیٹھ تو صیغہ کوئی سوال کرتا، علی نے حکمانہ انداز میں اسے چپ کرادیا۔

”کچھ بھی کہنے سے پہلے بہتر ہے آپ اپنے وکیل سے مشورہ کر لیں۔“

سیٹھ تو صیغہ سمجھ چکا تھا، مگر بے بس تھا، جبکہ ہم سحرش کو لیے بھاگ بھاگ بنگلے سے باہر نکل آئے۔

وہاں سے بھی سیٹھ تو صیغہ سحرش کے ہاتھ میں فائلیں دیکھ چکا تھا اور اب سحرش کو وہاں چھوڑنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ باہر آکر دیکھا کہ ہمارے لیے ایک لمبی کالی گاڑی کھڑی ہے۔ ہم بیٹھیں۔ اس میں سوار ہو گئے۔ جبکہ میری گاڑی علی کی ٹیم کا کوئی بندہ پہلے ہی لے جا چکا تھا۔

سحرش تکلیف کے باوجود بہت جوش میں تھی۔ علی نے جلدی سے فائلوں کو چیک کر کے خوش خبری سنا دی تھی۔ اس کے مطلب کی فائلیں مل گئی ہیں۔ سحرش نے اطمینان سے سر ہینڈ پہ لگا دیا، پھر چونک کر علی سے پوچھنے لگی۔

”حیرت ہے۔ میں تو تمہارا دیا ہوا موبائل فون کا کیلنڈر میں ہی بھول آئی تھی اور نہ ہی کسی اور موبائل سے میں نے مس کال دی تھی، پھر تم اس طرح عین وقت پر کیسے فائلیں لینے پہنچ گئے؟“

علی میری طرف دیکھ کر مسکراتے لگا۔ پھر بڑے لذتیز انداز میں بولا۔

”آپا ہی بتائیں گی کہ یہ کمانڈو بن کر وہاں کیا لینے پہنچی تھیں؟“

میں بھی اپنی اس بے وقوفانہ بہادری پر مسکرانے لگی۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”بھئی مجھے ان فائلوں کا کیا پتا۔ میں تو بس اپنے عزیز مسکین چھوٹے بھائی کا غیر قانونی طور پر قبضہ لگایا گیا خالی مکان لینے گئی تھی۔“

بلازم نے اگر ہم سے نام اور آنے کی وجہ پوچھی۔

”اپنے مالک کو جا کر بتاؤ کہ علی شمیم کی بہن ملنے آئی ہیں۔“

میں نے بڑے دھڑلے سے ملازم سے علی کی بہن کہہ کر تعارف اندر بھیجا۔ میں جانتی تھی یہ نام سن کر مجھے فوراً ہی اندر بلا لیا جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ علی بے بسی سے مجھے دیکھ رہا تھا، پھر میرے ساتھ ساتھ ہی وہ بھی اندر داخل ہو گیا۔ ہمیں بڑے سے ڈرائنگ روم میں بٹھار دیا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک ادھیڑ عمر کا سمارٹ سا آدمی آگیا۔ وہ علی کو دیکھ کر چونک گیا۔

”ارے علی صاحب۔ آپ۔ ارے سرکار! آپ پہلے بتاتے تو میں آپ کو دروازے پر لینے آتا۔ یہ کیا لگتا آپ نے جناب۔؟“ وہ بڑے تپاک سے علی سے لپٹ گیا۔

اس کی باتوں کے بعد چائے پانی کا آرڈر دے کر سیٹھ تو صیغہ بڑے انہماک سے ہمیں دیکھنے لگا۔ ہمارے ہی حکم کا منتظر ہو۔ میں نے گلا کھنکھار کر کہا۔

”آپ تو ایک کنسٹرکشن کمپنی کے مالک ہیں۔ آپ کا کام ہی لینے سے خالی مکان خریدنا۔ انہیں نئے سرے سے بنا کر بیچ دینا ہے۔ ہمارا بھی ایک معصوم سا خالی مکان تھا جو آپ نے۔“

میں اب کچھ گھبرا گئی تھی۔ نہیں تو رہا تھا کہ بھلا میں کس طرح اس سے کہوں کہ اپنی بیوی کو میرے حوالے کر دے۔

اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اتنے میں دیکھا کہ سحرش تھکی تھکی سی کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کے ہاتھ میں چند فائلیں تھیں۔ وہ راستے میں ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ اسے شاید ہمارے یا کسی کے بھی ڈرائنگ روم میں ہونے کا پتا نہیں تھا۔ اس سے پہلے کے ہم کچھ کہتے سیٹھ تو صیغہ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں سحرش کے ہاتھ میں موجود فائلوں پر ہی پڑی ہوئی تھیں۔

”ڈرائنگ یہ ہاتھ پٹی سے دیکھوں انکار کھا ہے۔ کیا ہوا؟ تم ٹھٹک تو ہو۔“



سوک

تب ہی میں نے آفاق سے پوچھا۔
”پترا! تیرے ابا کو پتا ہے کہ تو میرے پاس کس
مقصد کے لیے آیا ہے۔؟“
”اونہ۔۔۔!“ آفاق نے سر کو استہزائیہ انداز میں
جھٹکا دیا اور بولا۔ ”چاچا جی! عجیب بات کہتے ہیں آپ
بھی۔۔۔ اگر انہیں پتا ہوتا کہ میں آپ کے پاس کس
مقصد کے لیے آیا ہوں تو میری ٹانگیں بوڑھ کر حویلی کے
پھوٹے دروازے سے ڈلوادیتے۔“
بات معقول تھی۔۔۔ مجھے اپنا سوال ہی بڑا بے تکا
لگا۔

ایک گمبیرسی خاموشی نے پورے ماحول کا احاطہ
کر رکھا تھا۔ جن باتوں کی بازگشت میں کئی دن سے
حویلی کے باہر سن رہا تھا، آج اپنی حویلی کی بیٹھک میں
اس بازگشت کے موجب کو مجسم دیکھ رہا تھا۔ مجھے
شدید حیرت تھی کہ آفاق میرے سامنے بیٹھا۔۔۔
مریم کا رشتہ طلب کر رہا تھا۔ اس نے موجو میراثی کا بھی
محاطہ نہ کیا جو اس کے آنے سے پہلے ہی میری بیٹھک
میں موجود تھا۔
آفاق کا دل جاننے کے بعد میں نے موجو کو اور اس
نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا تھا۔

مکمل ناول

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



www.paksociety.com



**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

WWW.PAKSOCIETY.COM



”تو تیرے ابا کو اعتراض کیا ہے آخر؟“

”حسب نسب رہا!“ آفاق نے جواب دیا۔ ”وہ کہتے ہیں کہ مریم کے حسب نسب کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ بے شک وہ تیرے چاچے کے گھر میں رہ رہی ہے اور تیرا چاچا اسے اپنا رشتہ دار بھی بتلاتا ہے پر انہیں پھر بھی یقین نہیں کہ وہ درحقیقت کس خاندان سے ہے۔“

”ہوں۔!“ میں نے ہنکارا بھرا۔ ”تو میرا پتر تو مریم کا خیال دل سے نکال دے اور جہاں خیرا پو کہتا ہے وہاں کر لے۔ آخر کو تو کو اک پتر ہے اس کا۔“

”نہیں ہوں میں پتران کا۔“ آفاق یک دم میری بات کاٹ کر تلخ لہجے میں بولا۔ ”بچپن سے لے کر حوالی تک میں نے ان کے اس احسان کا خراج چکایا ہے جو انہوں نے مجھ لاوارث کو وارث بنا کر مجھ پر کیا ہے۔“

جو کہتے رہے میں نے وہی کیا۔ جو پڑھانا چاہا پڑھتا رہا۔ ہی پڑھا اور پھر پڑھنا لکھنا اور اپنی آگاہوں بلوایا تو بھی میں نے آف نہیں کی۔ مگر اب یہ میری باقی تمام زندگی کا معاملہ ہے چاچا جی! ادھی میری زندگی اباجی نے گزار دی، ادھی میں خود گزاروں گا۔ بس!“ آفاق نے دو ٹوک انداز میں بات ختم کی تھی۔

مجھے دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرنے والے آفاق پر آن بڑی حیرت تھی۔ بس میں کوئی شک نہیں تھا کہ آفاق بہت تابع دار اور رکھ رکھاؤ والا بچہ تھا۔ باپ کی آنکھ کا ایک اشارہ اس کا ارادہ بدل دیتا تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ لعل دین اس کا حقیقی باپ نہیں۔ وہ پانچ سال کا تھا جب لعل دین اور اس کی بیوی نے اسے گود لیا تھا اور پھر سب نے دیکھا کہ دنیا کی کون سی ایسی نعمت تھی جو آفاق کے قدموں میں لا کر رکھی نہ گئی ہو، مگر آفاق کی زندگی کا ہر فیصلہ لعل دین کی مرضی کا محتاج تھا۔ اس نے آفاق کو انجینئرنگ کی تعلیم دلوائی تھی، مگر اسے زمینوں جاگیروں کے معاملات سنبھالنے پر مجبور بھی کیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ آفاق کتنا عرصہ بچھا بچھا سا پھرتا تھا، مگر پھر آہستہ آہستہ حسب معمول اس نے خود کو لعل دین

کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ غرض ایسے چھوٹے بڑے کتنے ہی واقعات میرے ذہن میں گردش کرتے تھے جب آفاق نے لعل دین کی خاطر دل مارا تھا۔ بس۔! محبت مارنے میں ناکام رہا تھا۔ بس! میں جانتا تھا کہ آفاق مریم سے محبت کرنا ہے اور یہ جذبہ اول روز سے میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ مریم کا میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، مگر آفاق کا جب بھی مریم سے اتفاقاً ”سامنا ہوا“ میں نے اس کی آنکھوں کو پہلے سے کہیں زیادہ روشن پایا، مگر میں اسے بڑھا دیکھے دیتا۔

لعل دین کی سرشت سے میں واقف تھا۔ وہ ذات بات اور اونچ سچ کا قائل تھا اور کافی حد تک متعصب تھی اور میں جانتا تھا کہ مریم کو سو کے طور پر بیٹا نے میں وہ کبھی رضامند نہیں ہوگا۔ اسی لیے بڑھتا تھا کہ میں بھی آفاق کی حوصلہ شکنی کروں۔

”پتر! پتر ہے کہ تو بھی اس خیال کو دل سے نکال دے۔ کیوں باپ سے اڈھ (مقابلہ) لگاتا ہے۔ اس کے بغیر تیری حیثیت صفر ہے بیٹا۔ اس لیے جیسا کہ کتاب ہے تو ڈساکرے“ میں نے آفاق کے جھکے ہوئے سر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں چاچا جی۔ بالکل نہیں! نہ میری حیثیت صفر ہے اور نہ میرا ارادہ کمزور“ میں انفرادی طور پر بھی اپنی حیثیت منوان سکتا ہوں، مگر اس دن میں ان کی بات نہیں مانوں گا۔ آپ بس مجھے یہ بتائیں کیا آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے۔؟“ اپنی بات کہہ کر آفاق نے نرا امید نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔

”ہاں۔!“ میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ”کیوں چاچا جی۔؟“ آفاق کو شاید مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی اسی لیے اسے دھچکا لگا تھا۔ ”دیکھ پتر۔ تیرا باپ صرف ضدی اور کھڑوس ہی نہیں، میرا یار بھی ہے اور میں اسے جانتا ہوں کہ وہ میری یاری چھوڑ دے گا پر اپنی ضد نہیں۔“

”میں انہیں چھوڑ دوں گا۔“ آفاق کا انداز دو ٹوک

”سرکار! میں کیا بات کرتی ہوں، چھوٹا منہ اور بڑی بات پر جے، تساں اجابت دیو تو ایک مشورہ دیوت ہوں۔ عمل کرت نہ کرت یہ آپ کی مرضی ہووت ہے۔“

موجو سے اکثر میں کسی نہ کسی معاملے میں رائے لے لیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ تھی کہ ایک تو وہ میرا اور لعل دین کا ہم عمر تھا اور بلا مبالغہ بڑی کھری اور پر خلوص رائے دیتا تھا اور دوسرے کبھی بھی آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔

”بول موجو۔۔۔ بول، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تو کیا کہے گا۔۔۔“

”تو سرکار! اس ماں برالی گیا، دیوت سے۔۔۔؟ مریم بیٹا کو ساندرا گھرانہ مل جاوت ہی ہے تو آپ ہی کی جات کی، اور آفاق باؤ لعلی باپ سے منہ کو نہ اوت ہے۔“

”پر موجو! میں کیسے اس کے باپ کو راضی کروں۔۔۔ لعل دین کو جانتا نہیں کیا؟“ میں چڑ کر بولا تھا۔

”تو اس کا علاج ماں بتاوت ہوں نا سرکار! نلک جی کو تساں بتاؤ کہ تساں آفاق باؤ کی حقیقت جانت ہو۔۔۔“ موجود بے رہے لعلی میں بولا تو میرا دماغ یک دم گھوم گیا۔

”تیری مت ماری گئی ہے کیا۔۔۔؟ یا بھنگ چاڑھ (پڑھا) کر آیا ہے، کچھ پتا نہیں کہ لالی اور میں اک دو بچے کے لیے کیا ہیں۔؟ میں اس سے ایسی بات کر سکتا ہوں بھلا!“ میرا تنفس تیز ہو گیا تھا۔ موجو نے بات ہی ایسی کی تھی۔

”سرکار! سنے مانی دیو سرکار! سنے پہلے ہی کہا تھا چھوٹا منہ اور بڑی بات، مگر سرکار۔۔۔ جراعور کریو تو اے رستہ تھاری بیٹا کے لیے نعمت ہوونے ہے۔ ملکانی بن کے راج کرت اور تساں بھی جمے داری سے فارگ ہووت، تساں آج ہی بڑے ملک جی سے بات کر لیو، اتاں کی کجوری اتاں کے ہاتھ پکڑا دیو پھر دیکھیو کہ کیسے

دو دن ماں مریم بیٹا کا ڈولا اٹھت ہے۔“

اور لچکے کستاخ تھا۔ میں نے پھنڈای سانس کھری پ ”اس نے مجھے پالا ہے۔ تیری کسی خواہش سے منہ نہیں موڑا اور تو اسے چھوڑ دے گا تو وہ تو شاید سہار جائے پر تیری ماں تو مر جائے گی نا۔!“

آفاق نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”اور رہ گئی اس رشتے کی بات تو مریم کا رشتہ میں ان حالات میں تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔ ماں اگر لعل دین راضی ہو جائے اور خود مجھ سے بات کرے تو سو بسم اللہ!“

میں نے بات ختم کر دی تھی، اب مزید میں اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ تب ہی موجو میرا پی کی طرف متوجہ ہوا جو اس تمام عرصے میں میری ٹانگیں دبا تا رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ بھی کھراٹھا کر دخل انداز ہونے کی کوشش نہیں کی تھی، حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ حرف بہ حرف اس صورت حال کو ذہن نشین کر رہا ہے اور آفاق کے جانے کے بعد مجھے اس مشورے کی ضرورت بھی تھی۔

”ٹھیک ہے چاچا جی! میں پھر چلتا ہوں۔۔۔ پر آپ یہ بات سن لیں اور اپنے بار کو بھی بتاؤ تاکہ نہ میں انہیں چھوڑ کر جاؤں گا اور نہ ان سے کوئی تقاضا کروں گا، مگر تمام عمر شادی نہیں کروں گا اور یہ بات میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ چلتا ہوں۔ اللہ حافظ!“

آفاق اپنی بات مکمل کر کے تیزی سے لے لے ڈگ بھرتا میری بیٹھک سے نکل گیا تھا۔ پیچھے صرف میں اور موجو رہ گئے تھے اور ہماری سوچیں۔ موجو نے یوں میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنا شروع کیا کہ میں اکتا گیا اور پوچھا۔

”موجو! تو نے چند مل بھی مزید میری طرف اس طرح دیکھا تو تیری آنکھوں کی جگہ سننے فٹ کر ادوں گا۔ سمجھا؟“ میں نے گھورتے ہوئے موجو کو تنبیہ کی۔

”سرکار! موجو نے کچھ گھمانے ہوئے کہا۔“



کوئی بن گیا رونق پکھماں دی
کوئی چھڈ کے شیش محل چلیا

کوئی پلایا نازتے نخریاں وچ
کوئی رست گرم تے ٹھل چلیا

کوئی بھل گیا مقصد آون دا
کوئی کر کے مقصد حل چلیا

اتھے ہر کوئی ”فرید“ مسافر آئے
کوئی آج چلیا کوئی کل چلیا

میں کھیتوں میں بنی پگڈنڈی کے گزرتا خیالوں میں
مگر لعل دین سے بات کرنے کے لیے لفظ لفظ
بروتا چلا جا رہا تھا۔ جب لعل دین کی حویلی کے
چھوڑے بے باڑے کے قریب پہنچے ہی موجو کی
آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں جھوم جھوم گیا۔

کبھی ”بہی“ وارت شاہ، کبھی بابا فرید تو کبھی لمھے شاہ کا
کلام۔! موجو ہر لفظ میں خون جگر سپینچ لاتا تھا۔

ارادہ تو میرا لعل دین کی حویلی کی بیٹھک میں جانے کا
تھا، مگر میں وہیں باڑے کی اور چل دیا۔ مجھے دیکھتے ہی
موجو نے جھٹ کچے میں چارپائی ڈالی اور مسکراتی
نظروں سے تکتا قریب چلا آیا۔

”لے بھی موجو! اٹو گیا ہوں پر رب سونا جانتا ہے
کہ کتنا اوکھا لگ رہا ہے مجھے لالی سے ایسی بات کرنا۔“

میں نے موجو سے کہا اور چارپائی پہ ٹک گیا۔ اسی دوران
موجو نے میرے مقابل ایک اور چارپائی بچھائی، پھر بولا۔
”فکر ناں کرت سرکار! رب بھلی کرت تمہاری

نیت صاف ہوت ہے فیر کا بے ڈرت ہے۔“

”اچھا۔ اچھا! جا جلدی سے بلا لالا اپنے ملک جی کو
اور ہم دونوں کے قریب بھی نہ بھٹکیو، جب تک
میں نہ آؤں۔“

موجو بات ختم کر کے دوبارہ سے میری ٹانگیں دبائے
لگا تھا، مگر مجھے اس کے انداز میں رُاسرارست سی
محسوس ہوئی تھی۔ اس کا پُر تفکر چہرہ مجھے فکر میں مبتلا
کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”موجو! تو مجھے اصل بات بتا۔ تو اتنا زور کیوں
دے رہا ہے اس رشتے پر اور کچھ کچھ پریشان بھی دکھتا
ہے۔ بتا مجھے جلدی سے۔“

موجو کچھ دیر خاموش رہا جیسے لفظوں کو تول رہا ہو۔
یہ اس کی عادت تھی۔ پھر بولا۔

”سرکار! گاؤں والے بڑی باتاں بناوت ہیں بدنامی
ہوت ہے بڑی۔ آفاق باؤ۔ مریم بیٹا کو ایک آدھ واری
رستے میں لہجی روکت ہیں جب مریم بیٹا ملانی جی کے گھر

جلوت ہیں۔ منے اوٹ ماں ہو کر سنا تھا، آفاق باؤ اک
واری مریم بیٹا کو دھمکات تھے کہ اگر انوں کاویاہ مریم
بیٹا کے ساتھ ناں ہووت تو وہ کھوڈ کسی کرےوت ہیں اور

ساتھ ماں اک پر چا لکھ دیوت ہیں کہ تماری وجہ سے
ماں یہ قدم اٹھاوت ہوں۔ سرکار! اگر ایسا کچھ
ہوت ہے ناں بڑی بدنامی ہوڈے گی۔ اسی لئی بہتر

ہوت کہ تھان بڑے ملک جی کو راضی کرت، اناں کو
بتا دیوت کہ تھان آفاق باؤ کی اصلیت جانت ہوں۔“

موجو نے مجھے بھی ہراسناں کر دیا تھا اگر آفاق ایسا
کوئی قدم اٹھاتا تو مریم کے مستقبل پر اس کا کیا اثر
پڑتا۔ میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کیوں کہ اس کی

ذمہ داری سے میں جلد از جلد فارغ ہونا چاہتا تھا اور
مریم کے ساتھ اگر کوئی بدنامی لگ جاتی تو۔! نہیں۔

نہیں! مجھے آفاق کو ایسی کسی بھی حماقت کو سرزد کرنے
سے روکنا ہوگا۔ اوسے اور کیا حرج تھا اگر مریم کو آفاق
سے بیاہ دیا جائے تو۔! اس کا مستقبل محفوظ ہو جاتا اور

میں سبکدوش ہو جاتا۔

پر اصل مسئلہ لعل دین کو منانے کا تھا تو کیا موجو کے
مشورے پر عمل کر لوں۔؟ کیا برائی تھی بھلا؟ میرا
جگری یار تھا، تھوڑا بہت بک بک جھک جھک کرے گا

پھر مان جائے گا۔ آفاق اور مریم کو ایک کرنے کے لیے

اتھرا بھی اور اتھری جوانی، اڑیل کھوتے کی طرح ہوتی ہے جتنا مرضی زور لگا لو گرتی وہی ہے جو من میں ٹھکانے اور پھر آفاق تو فطرتاً بالکل تیرے پر بڑا ہے۔ اڑیل ٹٹونہ ہو تو! دنیا والوں کو یہی پتا ہے کہ آفاق تیرا خون نہیں اور یہ بات وہ خود بھی جانتا ہے۔ اب اگر تو اس کی بات نہیں مانے گا تو وہ کہیں بھی منہ کر لے گا۔ تیرے ہاتھ نہیں آنے والا! اور جائیداد تو ساری اس کے نام لگا بیٹھا ہے۔“

لعل دین نے پھر پہلو بدلا تھا اور بے چارہ کب سے یہی کیے جا رہا تھا۔

”مان لے میری بات۔ بچوں کے آگے ہار مانی بڑتی ہے اور سچی بات ہے لالہ! مجھے تیرا راز خیر ہے آگے اگلنا پڑا ہے۔ مجبوری تھی۔ اب طرف تیرا آفاق ہے اور دوسری طرف مریم ہے جسے میں نے پوری ذمہ داری سے اپنے گھر رکھا ہے اس کے سناڑی بیاہ سے لے کر دیگر تمام پھولنی بڑی ذمہ داریوں کو میں نے قبول ہے۔ آخر مرنے کے بعد اس کے مرے ماں پو کو میں نے اپنا نیکوں کے نور سے چمکتا چہرہ دکھانا ہے۔ ہا ہا ہا۔“

میں اپنی بات کے اختتام پر خود ہی ہنس دیا جب کہ

”سرکار! موجود تمہاری آنکھ کا اشارہ سمجھتے اے!“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور لعل دین کو بلانے چلا گیا۔ جب کہ میں ایک دفعہ پھر سوچوں میں ڈوب گیا۔



”ہاں تو بھئی لعل دین جی۔! کچھ منہ سے بھی پھوٹ لو کہ تمہیں سب (سنانپ) ڈنگ گیا ہے۔؟“ میں جو بڑی دیر سے لعل دین کے چوکھٹے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا، آخر آگیا اور اسے خیالات کے نائے بانے سے نکالنے کی کوشش کی۔

”کیا یوں۔۔۔؟“ لعل دین کی مری مری سی آواز

”ارے۔۔۔ بولنا کیا ہے لالہ۔۔۔؟ کچھ بھی بول، بس ذرا سوچ کر اور تول کر بولنا۔ کیوں کہ میں نے بھی پوری داستان بڑی ناپ تول کر تجھے بیان کر دی ہے۔ اب بس مجھے تیرا جواب ہاں میں چاہیے۔“ میں نے مسلسل اسے گھورتے ہوئے کہا جواب پہلو پہ پہلو بدلے جا رہا تھا۔ میں نے پھر پوچھا۔

”چل پھر تباہ کیا کرتا ہے تو نے؟“

”کل جواب دیاں گا۔“ لعل دین کے چہرے کا رنگ بدلا تھا تب ہی میں نے پھر جوش کی۔

”نام تو تیرا لعل دین ہے پر اس وقت تو تو ”موجو میراٹی“ کا ہم شکل دکھ رہا ہے۔ ویسا ہی کالا اور پیلا۔ ہا ہا ہا۔“

میں نے اپنی بات پر خود ہی زور دار تہقہ لگایا تھا اور چند گز کے فاصلے پہ بھینسوں کا چارہ کاٹتا موجو اپنا نام سن کر الرٹ ہو گیا۔

”حاضر سرکار۔“ وہ ہاتھ کھڑے کر کے بولا۔

”او ٹھہر جا ابھی تو۔۔۔ کام ختم کر، پھر بلا تے ہیں تجھے۔“ میں نے موجو کو وہیں کھڑا رہنے کا کہا کہ اتھی مجھے لعل دین سے چند باتیں مزید کرنی تھیں۔

”دیکھ لعل دین۔۔۔ آفاق ابھی جوان بھی ہے اور



”شرم کر لالہ... آج تک تجھ سے کچھ چھپایا ہے جو اب چھپاؤں گا۔ مجھے زیادہ تاؤ نہ دلا ورنہ تیرے دماغ کا سارا سورا ناک کے رستے باہر نکال دوں گا۔ اب جو اب دے وہ جو مجھے دو دن تک... پھر بعد کے معاملات طے کر لیں گے۔“ بہت کے انتقام پر میں نے اپنے لہجے کو دانستہ نرم کیا اور موجود میراثی کو آواز لگائی۔
”او موجود...!“

”آیا سر کاسہ!“ موجود ہاتھ کندھے پہ دھرے پرنے سے صاف کرتا لپک کر نزدیک آیا اور میرے قریب ہی فرش پر پھیل کر بیٹھ گیا۔
”چل کاکا...! ذرا ہو جائے حضرت پیر وارث شاہ کا کلام... اور ذرا سُر پکے رکھیو... میں تو دلوں کا گدڑی پر ایک...“

میں نے کن اکھیوں سے لعل دین کے سنجیدہ اور سوج چمے کو تکا اور چارپائی پر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا۔ حضرت پیر وارث شاہ کا معتقد ہوں اور ان کے کلام سے مجھے اور لعل دین کو بے پناہ رغبت ہے۔ فرصت میں ہم دونوں موجود میراثی سے ”میر“ بنا کرتے تھے اور پی بات تھی موجود سماں باندھ دیتا تھا۔ اس کی گونج دار آوازوں پہ غم میں لگاتی تھی۔ اس وقت چاروناچار لعل دین بھی سر دھننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”اول حمد خدا یاد رو کیجئے۔“

عشق کہتا سوچک دامنوں میاں
پسلاں آپ ہی رب نے عشق کہتا
معتوق بنے نبی رسول میاں
عشق پیر فقیر دا مرتبہ اے
مرد عشق دا بھلا رنجول میاں
کھلے تنہا دے باغ قلوب اندر
جناں کہتا اے عشق قبول میاں
دوئی نعت رسول مقبول والی
جہندے حق نزول لولاک کہتا
خاک آکھ کے مرتبہ وڈا داتا

سب خلق دے عیب تھیں پاک کہتا
سرور ہوں کہ اذلیاء انبیاء دا

لعل دین نے بے اختیاری مسکراہٹ کو دیا تھا اور میں یہی چاہتا تھا کہ بچھلے گھٹنے سے جو تاؤ میرے اور اس کے بیچ تن کر کھڑا تھا اسے زمین بوس کیا جائے کہ آخر کو لعل دین میرا لنگوٹا تھا۔ ہم دونوں کی ایک دوسرے سے جذباتی اور قلبی وابستگی سے سارا گاؤں واقف تھا۔ بس لعل دین میں میں (اکثر) بڑی تھی جب کبھی اڑ گیا تو مجھو بیڑہ غرق... اور اس کی اس میں کو واحد میں ہی دبا سکتا تھا۔

مجھے افسوس تھا کہ مجھے آج لعل دین کا جذباتی استحصال کرنا پڑا تھا۔ اسے اس کی کمزوری کہہ لیں یا رانہ جو بھی تھا، بہر حال میں سالوں پہلے اس ”خفیہ کھاتے“ سے واقف تھا، مگر آج تک میں نے اس کو اپنے سینے میں یوں ہی دبائے رکھا جیسے کہ وہ میرا بیزار از ہوا کہ آج سے پہلے مجھے کبھی سوچ بھی نہ آئی تھی کہ اس بات کو زندگی میں کبھی نہ کبھی مجھے لعل دین کے سامنے دلا ہار پڑے گا، گو کہ یہ کمزوری اس کی کمزوری تھی میری نہیں۔

پر میں نے کہا نا... کہ لعل دین اور میں یک جان دو قالب ہیں، ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بہت سے سچی اور خفیہ پسواؤں سے واقف ہیں اور کئی ”ہانتوں“ کے امین بھی...!
”اویارا...! اتنا پریشان کیوں ہوتا ہے۔ دل بڑا کر کے سوچ... وڈی پگ پہنتا ہے تو ظرف بھی وڈا کر۔ وگرنہ رشتے تیرے آفاق کو بھی بڑے اور میری مزیم کو بھی یہ اور بات کہ تیرا آفاق قسم کھائے بیٹھا ہے کہ کنوارہ مرجائے گا پرویاہ نہیں کرے گا۔ اب تو ظلم نہ کما۔ اس کا جنازہ جائز کر... ہا... ہا...“
میرے ہنسنے پہ اس نے مجھے زخمی نظروں سے گھورا تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”لالے...! تجھے میرا منہ بھی نہیں مارتا، یارا، میری بیٹی جیسی ہے مزیم... میرے ہی رشتے داروں کی اولاد ہے۔“

”مجھے یقین نہیں... تو جھوٹ کہتا ہے!“ لعل دین
میری بات کاٹ کر بولا۔

اگے حق دے آپ نون خاک کیتا

رب نے وارث کر کے مارنا ہے
میں نے لعل دین کے دھواں دھواں سے چہرے کو
ڈھلتی شام کے سپرد کیا اور گھر کی راہ لی۔



جاتی سردیوں کی خشک شام تھی۔ تھکے ہارے مزدور،
کسان گھروں کو لوٹ رہے تھے اور کچھ نے یقیناً
ڈیرے پر اکٹھے ہونا تھا جہاں محفل رات گئے تک
جمتی تھی۔ حقے لڑ گڑائے جاتے، ماضی کے قصوں کی
پٹاری کھل جاتی۔ اس دوران جانے والے گھروں کو
چل دیتے اور کچھ کھانے اور نماز سے فراغت کے بعد
واپس آ بیٹھتے اور پھر رات گئے تک باتوں کا سلسلہ چلتا
جس کا اختتام موجود میراثی کے سنائے گئے کبھی لوگ
گیت یا صوفیانہ کلام پر ہوتا اور گاؤں میں رات گئے
سے مراد نو دس بجے تک کا وقت ہوتا ہے۔ اکثر میں
بھی ڈیرے پر جا بیٹھتا تھا، گریہ تب تک تھا جب تک
میراثی میرے گھر نہیں آتی تھی۔ وہ میری ذمہ داری اور
فلک کی وجہ تھی ورنہ ذکیہ (بیوی) کے اکل پے کی پروا میں
نے کبھی نہیں کی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ خدا نخواستہ میں بے اولاد ہوں۔
مشاء اللہ چار بچے ہیں میرے۔ دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔
بیٹیاں شادی شدہ اور خوش باس اپنے اپنے گھروں میں
آباد ہیں۔ انہی کی بات تھی کہ میری دونوں بچیاں
سمندر پار جا بسی گئیں۔ کافی وقت بیت جاتا تھا ان
سے ملے ہوئے۔

باقی رہ گئے لڑکے۔ تو دونوں پڑھ لکھ کر نوکریوں
سے لگ چکے تھے۔ شہر میں ہی ہوتے تھے۔ ہم نے
بھی اعتراض نہ کیا کہ آخر اتنا پڑھ لکھ کر افسر بنے تھے تو
زمینیں سنبھالنے سے انکاری ہو گئے۔

میں نے بھی کھلے دل سے انہیں شہر میں بسنے کی
اجازت دے دی۔ ذکیہ نے بہتیرا رولا ڈالا تھا، میں نے
بتایا تاکہ میں اس کے شور شرابے کی پروا ذرا کم ہی کیا
کر رہا ہوں۔

وہ میرے بیٹے بے حد تابع دار اور فرماں بردار

”واہ! واللہ۔ قربان جاؤں میں لکھنے والے پر۔“
میں نے نار ہوتے ہوئے، جیب سے پانچ سو کا نوٹ
نکالا اور موجو کو تمھارا۔ پھر اپنی آنکھیں پونچھ لیں جو کہ
ہر بار اس کلام کو سن کر بھر آتی تھیں۔ نامعلوم کیسی
ترپ تھی جو دل میں جاگ اٹھتی تھی کہ جی کرتا
کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جاؤں اور کبھی ادھر کا
ریخ نہ کروں۔ پر ہائے ری دنیا۔! تو نہ اپنا رکھتی ہے
نہ کسی کا ہونے دیتی ہے اور ہم جیسے دنیا داروں کے تو کیا
کہنے۔! موجو اٹھ کر جا چکا تھا۔ سب ہی آہستہ آہستہ
اپنے ٹھکانوں پر لوٹ رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا
تھا۔ بندے دن بھر کی اڑان بھگتا کر اپنے پر سمیٹتے
ہوئے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔

مجھے بھی اب گھر جانا تھا۔ جانا تو لعل دین کو بھی
تھا۔ پر وہ اڑیل اپنی مرضی کا مالک، جب دل چاہتا تھا
ہی اٹھتا۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اٹھوا اور قدم بڑھانے سے
پہلے لعل دین کے کاندھے پر ہاتھ دھر اور بولا۔

”لاکھ! انا بڑی بری چیز ہے ایک ”بیس“
بندے کی نسلیں اجاڑ دیتی ہے۔ جس وارث بندہ
اڑتا پھرتا ہے نا۔ اس کی انا اسی وارث کو مٹی میں مٹی
کر دیتی ہے۔ پھر بھلے وہ یہ سوچتا رہے کہ۔ لوجی! میں
نے اپنی نسل مکاری پر انا کو بچھکنے نہیں دیا۔ اپنا وقار
سلامت رکھا، پر ہوتا یہ ہے کہ رب مت بھی (الہی)
کر دیتا ہے؟ اس کے خود کے ہاتھوں اس کی تباہی لکھ
دی جاتی ہے۔ اپنی جھوٹی خودداری اور انا کے
جھنڈے کو وہ اپنے وارثوں کے سینے میں گھونپ دیتا ہے
اور یا تو انہیں مار دیتا ہے یا تباہ کر دیتا ہے۔ آخر میں اس
کے پاس اس کی انا اور ”وراثت“ تو رہ جاتی ہے۔ پر
”وراثت“ نہیں رہتا۔ تجھے حضرت پیر وراث شاہ کا
ایک شعر سنا تا ہوں۔ اس پر غور ضرور کریں۔!“

”وراثت! مان نہ کریں کدی وارثاں وا

رہب بے وارث کر باردا ای۔!“

(وراثت! مان نہ کرنا کبھی وارثوں کا

تھے۔ ہمارا بے حد خیال رکھتے تھے۔ بلا ناغہ فون پہ حال احوال پوچھنا ان کی ڈیوٹی تھی۔ میں تو ایک آدھ ضروری اور چیدہ چیدہ باتوں کے بعد نکل لیتا تھا، مگر ذکیہ کو تو فون کے ریسپور سے عشق تھا۔ ایسی چمکتی تھی کہ تب تک نہ چھوڑتی جب تک میں ہی جنکے سے پیچھے سے تار نہ نکال دیتا۔ وہ نمائی "ایلو ایلو" کیے جاتی اور میں کچھ دیر میں واپس تار لگا کر اسے چڑاتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولتا۔ "اے لو!"

وہ مجھے ایسی نظروں سے گھورتی جیسے میں نے اس کا اس کے پیچھے جانا بند کیا ہو۔ ہا ہا ہا۔۔۔ ان ہی دنوں اچانک مجھے شہر جا کر مریم کو اپنے ساتھ لانا پڑا۔ ہمیشہ کے لیے۔ کسی خاص وجہ کے باعث میں ہمیشہ سے مریم سے رابطے میں تھا اور پھر جیسے ہی مجھے اس کے تمنا رہ جانے کا علم ہوا، میں اسے اپنے ساتھ شہر سے گاؤں لے آیا۔

ذکیہ نے کافی اعتراض کیا پھر میں نے جھاڑ کر چپ کر لیا اور سختی سے مریم کا خیال رکھنے کی ہدایت بھی کر دی۔ بس پھر چند دن ہی لگے تھے مریم کو ساری حویلی کا انتظام سنبھالنے میں۔ ذکیہ کو بھی چند ہی دن لگے وہیلے بیٹھنے کی لت لگنے میں۔ سب کچھ مریم کے حوالے کر کے پلنگ توڑتی تھی یا فون کر کے بیٹیوں کے کان کھاتی تھی۔

مریم کا بھی اب کافی حد تک دل لگ گیا تھا۔ پانچ ماہ ہونے کو آئے تھے اسے میرے گھر میں رہتے ہوئے۔ ہم سب ایک دوسرے سے بے حد مانوس ہو چکے تھے۔ بیٹیوں سے بڑھ کر مریم ہمیں عزیز ہو چلی تھی۔ اتنی خدمت کرتی تھی وہ بچی ہماری۔

میرے قدموں میں تیزی آگئی تھی۔ راستے میں میں نے جیدے حلوائی سے گرم گرم جلیبیاں لی تھیں۔

کن ہی — سوچوں میں گم میں نے

دروازے پہ دستک دی تھی۔ حویلی کا بھاری بھر کم پھاٹک نما دروازہ ماہی رسولان آئے کھولا تھا۔ ماہی

رسولان میری سبے جی کے وقت سے ہماری حویلی میں قیام پذیر تھی۔ میں بھی اسی کے ہاتھوں پر دان چڑھا تھا۔ اب تو بڑھی۔ ہو چکی تھی کہ سر بالوں سے خالی اور منہ دانتوں سے فارغ تھا، مگر ابھی بھی چستی اور پھرتی لاجواب اور بصارت و سماعت بے مثال تھی۔

میں نے اندر قدم بڑھائے تو جھٹ سے کسی کو نے سے مریم میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور میرا دل شاد کر گئی۔ کالے اور سبز امتزاج کے سادہ سے شلوار قمیص میں ملبوس، خوب صورت اور جاذب نظر نقوش والے سادہ سے چہرے کے گرد بڑی سی گرم شال لپیٹے وہ حسب معمول مجھ سے چار لینے کے بعد میرے ہاتھ سے جلیبیوں والا لٹاؤ تھا، مگر اب اس مڑنے لگی تو میں نے پکار لیا۔

"اوسے مریم پترا! دو گھڑی کبھی بیٹھ ہی جایا کر۔ رات سونے تک ایک پیر برکھڑی رہتی ہے۔ مائی کدھر ہے؟" کہنے کے ساتھ ہی میں نے اپنی بیوی ذکیہ کے بارے میں پوچھا۔

"چا چاچی! وہ تو مغرب پڑھ کر ہی کوٹھڑی میں چلا گئی تھیں۔ تسبیح لے کر اور کہہ گئی تھیں کہ

عشا سے پہلے کوئی انہیں، آواز نہ دے۔ وہ خود ہی باہر آجائیں گی اور پھر مجھ سے بھی لٹا کہ اپنے چاچے کو کھانا کھلا کر گرم گرم دودھ جلیبی دینا۔ بغیر کھانے کے نہیں نورس۔ اور یہ بھی لٹا تھا کہ تمہارے چاچے کو شام ہوتے ہی سردی زیادہ لگنے لگ جاتی ہے اس لیے پہلے سے ہی انگلیٹھی سلگا کر پاس رکھ دینا۔"

آخری جملہ مریم نے قدرے شہزیرے انداز میں کہا تھا۔ میں بھی مسکرا دیا اور اس سے پوچھا۔

"اپنی چاچی کی کوٹھڑی میں بھی انگلیٹھی رکھ دی ہے کہ نہیں؟ یہ نہ ہو کہ وظیفے پورے کرتے کرتے ہی ٹھہر جائے۔"

اگر ذکیہ کو میری پروا تھی تو ظاہر ہے مجھے بھی اس کی فکر تو رہتی تھی نا۔ یہ اور بات کہ میں اظہار کے

مقابلے میں قدرے سنجوس ہوں۔

”جی چاچا جی! بالکل رکھ دی ہے اور اب آپ بھی نماز پڑھ کر اندر اپنے کمرے میں چلیے۔ وہاں میں نے کچھ ہی دیر پہلے آنکھیں رکھی تھی۔ اب تک تو کافی گرم ہو چکا ہوگا۔ ویسے بھی مغرب کا وقت گزر رہا ہے۔“

مریم کہہ کر جلدی سے باورچی خانے کی جانب چلی گئی جہاں سے تازہ کڑھے ہوئے دودھ کی مہک، مہک، مہک کر میرے نتھنوں میں پہنچ رہی تھی۔

میں نے تیزی سے کمرے کا رخ کیا اور نلکا گیسٹر کر تازہ پانی سے وضو کرنے کے بعد وہیں برآمدے میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد اندر کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں واقعی سکون اور حدت موجود تھی جس نے میرے ٹھنڈے ہوئے اعصاب پہ یک دم اچھا اثر ڈالا۔

رات کے کھانے میں ابھی کچھ وقت تھا تب ہی میں جو نا اہل کر بیٹنگ پر خلاف میں گھس گیا۔ دل نجانے کیوں بڑا بو جھل تھا۔ لعل دین کے منہ سے انکار سن کر میرا دل بے طرح اداس تھا۔ اب یہ اداسی انکار کی تھی یا اس کے سامنے اس راز کے آشکار ہونے کی جو آج تک میرے سینے میں بند تھا۔ جو بھی تھا، رہ رہ کر میری نگاہوں میں لعل دین کا پشمرہ چہرہ گھوم رہا تھا اور پھر میں لیٹے لیٹے کب لعل دین کے ساتھ بتایا پچھلا وقت دہرانے لگا، مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا۔



”اک دونی۔۔۔ دونی

دو دونی۔۔۔ چار

تین دونی۔۔۔ چھ۔۔۔“

پپیل کے گھنیرے درخت کے نیچے بیٹھی سولہ بچوں کی جماعت ہل ہل کر زور و شور سے پہاڑ دہرائی۔ سولی پہ ٹنگی محسوس ہوتی تھی۔ ہلتے سروں والے بچوں کے اوپے سرکان پھاڑے دیتے تھے۔ ان ہی بچوں میں آخری سے چوٹی رویں بیٹھے میں اور لعل

دین، جنائیاں روکنے کی ناکام کوشش کیا کرتے جب کہ نظریں مسلسل ماسٹر عینی کی کرسی کی بانہ سے نکلے ہوئے تازے مولا بخش کا طواف کیا کرتیں اور پھر نظریں، نظروں سے ملا کرتیں۔ جیسے ہی ماسٹر عینی بچوں کو دو کے پہاڑ کے ہاڑتے دبا کر خود بیٹھی نیند کے جھونکوں میں جھولنے لگتے، میں اور لعل دین (جو اپنے بچپن میں لالی کے نام سے معروف تھا) ہولے ہولے ہو کے کھسکتے ہوئے پہلے جماعت کی سب سے آخری رد میں کھسکتے اور پھر موقع دیکھنے ہی بڑی مہارت سے کھسک لیتے۔ ماسٹر محمد عینی جھولتے رہ جاتے اور باقی بچے دیکھتے رہ جاتے۔

کسی بچے کی جرات نہیں تھی کہ وہ ہم دونوں کے فرار کے بارے میں منہ سے کچھ پھولے گیوں کہ لعل دین خاصا ہتھ چھٹ اور کپتا (ٹراکا) واقع ہوا تھا۔ مرنے مارنے میں شروع سے ہی خاصا ہوشیار تھا اور پھر سب سے بڑی بات ملک نواز علی کا اکلوتا بیترہ۔ اپنے دادا دادی ماں باپ سب کا چیتا۔

میں یعنی محمد صادق صدیقی بھی ملکوں کی اولاد ہوں، مگر لعل دین کے اباجی کے پاس میرے اباجی سے چار مہینے زیادہ تھے۔ اس لیے وہ بڑے ملک جی کہلاتے تھے۔ یہی خناس لعل دین کے داغ میں جا سما تھا اور اسے محسوس ہونا کہ وہ بڑی توپ چیز ہے۔

مجھ سے اس کی بڑی یاری تھی اور ہم دونوں کے گھرانوں کی دور کی رشتے داری تھی۔ آپس کے مراسم نے ہمیں اور ہماری دوستی کو آغاز سے ہی پینے کا موقع دیا تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میں اور لعل دین ایک ہی دن کی پیدائش تھے۔ میں فجر کی اذانوں کے آس پاس اس دنیا میں وارد ہوا تھا جب کہ لعل دین عرف لالی اسی روز عصر سے کچھ پہلے اس دنیا میں پست (ٹرائی) ڈالنے آ گیا تھا۔

ہماری ماؤں کا بھی آپس میں بڑا بہنپنا تھا اور باپ بھی کسی چھوٹی بڑی چپقلش کے بغیر اپنا اپنا منصب سنبھالنے بیٹھے تھے۔ میں بڑھائی میں لالی کی نسبت بہتر تھا۔ وہ اسکول جاتا تھا تو صرف میری وجہ سے۔

جاتا، میرے ابا جی کے کھیتوں کے مرکز میں بنے نیوب ویل تک آیا تھا۔

وہیں میں نے چھوٹے یوسف کو گھوم بھگایا تھا کہ جو بھی ریکا ہے، اوہر ہی لیتا آئے اور وہ بے جی سے پولی میں ساگ اور مکئی کی روٹی بندھوا لیا تھا۔ لالی نے چند نوالے لینے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا اور ہاتھ لہرا کر بڑھکیں مار رہا تھا جب کہ میں ابھی سیر نہیں ہوا تھا۔

اسی شوخی میں لالی نے بغیر دیکھے میری ران پہ دھب دے ماری تھی اور مکھنومکھنی ہوا ساگ الٹ کر لالی کے کھیری سے سجے پیر پہ جا سجا اور اسی چیز نے میری ہنسی چھڑا دی۔ جب کہ لالی کی حالت ایسی تھی کہ جیسے سکتے میں چلا گیا ہو۔ پاؤں کھیری سمیت زمین پہ جم گیا تھا۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا اور لالی کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تو اس نے بڑے اداکارانہ انداز میں چہرے کا رخ میری جانب کیا۔ میں سمجھا کہ صدے میں ہے ایسے اگلے ہی پل عریں پھاڑ ہنسی فوارے کی مانند اس کے منہ سے پھولی تھی اور پھر ہم دونوں ہنسنے لگے لوٹ پوٹ ہوتے دہرے ہوتے چلے گئے۔

ایسے ہی خوب صورت دن تھے وہ جب مستی اور شرارت تمام جسم میں رقصاں رہتی تھی اور یوں ہی دن پہ دن بیتے چلے جاتے تھے۔



میرے شہر بانے میں تقریباً "ایک ہفتہ" ابھی باقی تھا جب لالی کی حویلی میں اس کی پھوپھی کی بچوں سمیت آمد ہوئی۔ لالی کی پھوپھی دو برسے گاؤں کی رہنے والی تھی، پر اب مجھے بے جی کی زبانی پتا چلا تھا کہ پھوپھی کے شوہر اپنی تمام اراضی فروخت کر کے شہر میں کسی کاروبار میں سرمایہ لگا رہے تھے جس کے لیے انہیں شہر میں کچھ عرصہ اکیلے رہائش اختیار کرنی تھی چونکہ پھوپھی کی سرال میں ان کی اپنی ایک نند کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور وہ بھی شہر میں بسٹی تھی۔ لہذا ان کے خاوند کو اپنے بال بچوں کی فکر لانی تھی کہ انہیں گاؤں میں غیر متعین

اور میں اسکول آتا تھا تو صرف ماسٹر محمد غنی کی وجہ سے جنہیں میرے ابا جی نے مجھ پر مولا بخش آزمانے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ اس کے باوجود لالی مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ "خرابی کارروائیوں" میں ملوث کر لیتا تھا۔ اور بچپن میں بچے دنیا داری کے اور کسی رشتے کو نہیں بھانٹے ماسوائے دوستی کے۔! یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔

سو میرا اور لالی کا بچپن ان ہی مستیوں میں گزرا تھا۔ فصلوں میں دوڑتے بھاگتے، ویسی کھیل کھیلتے، ماسٹر محمد غنی کا مولا بخش سستے بھانٹ بھانٹ کی شرارتیں کرتے، آخر کار میں نے "منستے ہوئے" اور لالی نے قدرے "موتے ہوئے" میٹرک کر ہی لیا۔

یہ ان ہی دنوں کا ذکر ہے جب میٹرک کارڈ لٹ نکلنے کے بعد میرا ایک دم شہر جا کر کالج میں داخلہ لینے کا جی کھل گیا۔ حالانکہ پہلے میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا، یوں کہ لالی کا نہیں تھا اور ہم دونوں کے ارادے شروع سے ایک سے ہی ثابت ہوئے تھے۔ یہ اور بات کہ ارادے یا تمکیمیل تک لالی کے ہی ہمیشہ پہنچتے تھے جب کہ میں ٹانگ ٹوٹیاں مارتا رہ جاتا تھا۔ اب یہ شہر جا کر پڑھنے کا ارادہ واحد ایسا تھا جو لالی کا نہیں تھا، میرا تھا۔ لالی تو بادشاہ آدمی تھا، میٹرک کی سند ہاتھ میں آتے ہی لہرا کر ہوا کے سپرد کی تھی اور اکر ڈیتے ہوئے بولا تھا: "لو جی! اسے وی سیبا پارکا" ہنسی مربعے سا بھال گئے تے مربے کھاواں گے۔

(لو جی! یہ بھی سیبا ختم۔۔۔ اب مربعے سنبھالیں گے اور مربے کھائیں گے)

ساتھ ہی تہقہہ مارتے ہوئے زور دار دھب میری ران پر دے ماری تھی۔۔۔ اور میں جو بڑا گن سا ہاتھ میں مکئی کی روٹی تھا، ران پہ دھری ساگ اور مکھن کے گول گول سفید سفید پیڑے سے جی کٹوری رکھے لالی کی لن ترانیاں سن رہا تھا۔ اگلے ہی پل زور دار اور کان بھاڑ تہقہہ مارنے پر مجبور ہو گیا۔ لالی رزلٹ والے دن کے لیے خاص الخاص الجناص، نئی ٹکوری لٹکارے، مارتی کھیری پس کر آیا تھا اور اسکول کے واپسی پر بھی بڑا بچ بچا کر پیر

بدلت کے لیے جس کے آئینے پر چھوڑا جائے تو لالی کے ابا جی نے جھٹ بہنوئی کو تسلی کا پیغام بھیج دیا اور بن اور ان کے بچوں کو حویلی بھیجنے کو کہا، مگر لالی کے پیچھا جی مترود تھے کیوں کہ ان کی سب سے بڑی بیٹی لالی کی منکوحہ تھی۔ بچپن میں ان کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ اس نازک رشتہ کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کو یہاں نہیں بھیجنا چاہتے تھے سوہ زیبو کے اٹھارہ سال سے پہلے رخصتی کے حق میں نہیں تھے۔

یہ مسئلہ بھی بہت سے تسلی دلاسوں کے ساتھ نبٹ گیا تھا۔ یوں لالی کی پھوپھی بھی سب اہل و عیال جس میں سرفہرست اس کی منکوحہ زین النساء عرف زیبو تھی، اپنے بھائی کے گھر آ موجود ہوئیں اور لالی کی موبصیں لگ کر گئیں۔ وہ لالی جو زیبو و مل کی کھڑی پہ بیٹھ کر سارا دن گریہوں میں تریوز اور آم کھاتا تھا اور سرویوں میں گا جیسی مولیاں اور شاہجہ ڈکار تارتا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے سورج غروب کر دیا کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ پرے لگا کا اکثر حصہ وہیں بیٹا پڑتا تھا۔ اب وہی لالی تھا جو حویلی سے باہر جھانک کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ سارا سارا دن پھپھو کے گوبے سے لگ کر بیٹھتا تھا اور بعد ازاں اپنی بے بے سے اس بچرم کی یاداش میں گٹوں پر سوئے کھاتا تھا، مگر پھر بھی بہت نہیں ہاری اور پھوپھی کے ذریعے درحقیقت زیبو کو متاثر کرنا معمول بن گیا۔

میں شہر جانے کی تیاریوں میں لگا رہا اور لالی یہاں جن جڑھانے کی تیاری میں لگا تھا۔ مجھے کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ لالی نے کب اور کیسے زیبو کو اپنے ”عشق“ کی سرے والی سے ”اعتبار“ کی سلاخیاں نکال نکال کر آنکھوں میں پھیریں کہ وہ احمق نہ صرف اندھی ہوئی بلکہ شرم و حیا کے پردے بھی چاک کر بیٹھی۔ حویلی کی بیٹھک میں یا کبھی کسی ناویدہ کو نے کو ٹھڑی میں ہونے والی ملاقاتیں کب کماؤ کے کھیتوں اور بھیسنوں کے باڑے کے پچھواڑے بنے توڑی بھوسے والے کمرے میں منتقل ہوئیں۔

میں آج بھی سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں جو لالی کے دن رات کو اس سے زیادہ جانتا تھا، کیسے اس کی

بیشتر اوقات نہیں ہونے والی حرکات سے بے خبر رہ گیا۔ وال میں کچھ کالا ہے، یہ تو مجھے کئی دنوں سے ہی شک تھا، مگر اس کالک کے نتیجے سے لالی بے پردا ہو گا، میں اسے کم از کم اتنا لاپرواہ نہیں جانتا تھا۔

جس صبح میں نے لاری چڑھنا تھا، اس سے ایک شام پہلے میری لالی سے ملاقات ہوئی تھی اور مجھے وہ کافی چپ چپ اور بوکھلایا سا محسوس ہوا، مگر میں نے کرید نہیں کی تھی۔ اس کام کے لیے میں موجد کو چھوڑے جا رہا تھا۔

موجود میرا اور لالی کا ہم عمر تھا، مگر کا سے (ملازم) کا پتر تھا۔ ملتان کے انتہائی پسماندہ قصبے سے تعلق رکھنے والا۔ اس کا خاندان بہت عرصہ ہوا ہجرت کر کے اندرون پنجاب آسا تھا۔ یہ لوگ میرا بھی نہیں تھے، مگر موجود کا باب بیٹھے بیٹھے ایسے۔۔۔ چھٹے چھوٹا تھا کہ دنوں میں ”بخشو میراٹی“ کے نام سے جانا جانے لگا۔ قدرت نے گلے میں سُجھوایا تھا، کیاں اور لوگ گیت پڑے سزا میں گاتا تھا۔ غریب تھا اور شریف بھی۔ فاقہ کشی نے عزت نفس کا چولا اتار بیٹھکنے پر مجبور کر دیا تھا، جب ہی لوگوں نے میراٹی کہا تو وہ میراٹی بن گیا۔ گندم چاول کے لیے ملکوں کو خوش بے رکھتا تھا۔ یہی صفات آگے سے موجود میں بھی تھیں۔ موجود ہوں، اپنے باپ کی کاربن کالی تھا۔ بول چال، عادات و فطرت اور گلے کا سُر سب بتا کچھ اس نے بخشو میراٹی سے لیا تھا۔

میرے اور لالی کے علاوہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہی کھیل کر جوان ہوا تھا، پر کسی اپنی حیثیت نہیں بھولا اور اب وہی موجود ”موجود میراٹی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ باپ مر گیا تھا اور اس کا منصب موجود نے سنبھال لیا تھا۔

خیر۔! بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ موجود میری بہت عزت کرتا تھا، اسی لیے لالی کی نسبت وہ مجھ سے کچھ حد تک بے تکلف تھا، لیکن وہ کبھی بھی میرے اور اپنے مرتبے کو نہیں بھولتا تھا۔ جب کہ لالی اس پر اپنے ملک ہونے کا خوب رعب جھاڑتا تھا اور اب اسی موجود کو میں یہ ڈیوٹی سونپ آیا تھا کہ لالی پر خوب نظر

ساتھ میں حیرت بھی کہ لالی کی ماں انہیں بتائے بغیر کیسے روانہ ہو گئی۔ آخر ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی.....!

اور پھر موجودہ مجھے بتایا کہ بڑے ملک جی کی حویلی میں کوئی بڑی ہی کچھڑی پک رہی ہے۔ دو ہفتے پہلے چھوٹے ملک جی (لالی) اپنی پھوپھی اور ملک جی کے ساتھ منہ اندھیرے ادھر سے روانہ ہوئے تھے۔ ساتھ میں ایک لڑکی بھی تھی جس نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں کہ وہ سب اتنی اچانک ادھر سے کیوں گئے تھے.....؟ پیچھے حویلی میں صرف بڑے ملک جی اور ان کی بہن کے دوسرے بال بچے موجود ہیں۔

موجودہ کی دی ہوئی تفصیل میں کسی انہونی کے بہت سے مبہم اشارے تھے۔ وہ کہا تھا منہ نہیں کھول سکتا تھا اور میں لالی کا یار تھا اس لیے خاموش تھا، ہم دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے اور وہ یقیناً "سچ تھی۔ لالی نے وال کالی کر دی تھی۔"

مگر مجھے حیرت تھی کہ اس سنگین صورت حال میں لالی اور بچوں کی رخصتی کیوں نہیں کی گئی۔ میں لالی سے ملنا چاہتا تھا مگر اس کی واپسی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سوچ چاہے، موجودہ کو ہوشیار رہنے کی تلقین کرتا واپس ہولیا۔

مجھے شہر آئے ابھن چند دن ہی ہوئے ہوں گے جب ایک دن کالج سے واپسی پر ثریا پھوپھی کے گھر کے باہر میں نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ ناگہانی کے احساس نے میرے حواس منجمد کر دیے۔ مجھے پہلا خیال چور ڈاکوؤں کا آیا تھا۔ نامعلوم بد بخت کیا کیا کچھ لوٹ کر چلتے بنے.....؟

میں حوصلہ جوڑتا، لوگوں کے درمیان سے گزرتا صحن تک آیا تو سامنے کے منظر نے مجھے اتنا شہد رکھا کہ میں کھڑے قدم سے ایک جھٹکے کے ساتھ فرش پر گھٹنوں کے بل گرا۔ سامنے چار پائی پر پھوپھی ثریا کے شوہر کی لاش ادھڑی پڑی تھی۔ اعضاء کٹ پھٹ چکے تھے، صرف چہرہ سلامت تھا۔ بے تحاشا خون دیکھ کر میرا جی متلا لیا تھا، نگہ میں نے خود پر قابو پایا اور پچھاڑیں

رکھے۔ اس کی حویلی کے اندر اور باہر ہونے والی مختلف کارروائیوں پر ممکنہ حد تک نظر رکھے اور مجھے میری چھٹیوں کے دوران واپسی پر مفصل رپورٹ دے کیوں کہ میری چھٹی حس کسی بڑی گڑبڑ کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور پھر موجودہ نے اس فرض کو خوب نبھایا، میرے نزدیک وہ ایسا ہی قابل اعتماد تھا۔

تقریباً ڈھائی ماہ تک میری گاؤں واپسی ممکن نہیں ہو سکی تھی کیوں کہ ایک تو کالج میں نیا نیا ایڈمیشن اور پھر چھوٹے موٹے دیگر ضروری امور سے فراغت پانے میں مجھے کچھ وقت لگ گیا تھا۔

شہر میں میری رہائش اباجی کے چاچے کی بیٹی کے گھر تھی۔ اباجی سے عمر میں کافی چھوٹی تھیں اور وہ اور ان کے شوہر ہماری بڑی قدر کرتے تھے کیوں کہ شہر میں سکونت اختیار کرنے اور چھوٹا موٹا کاروبار سیٹ کرنے کے لیے میرے اباجی نے ہی اپنی چچیری بہن کو قرض فراہم کیا تھا۔

ان دنوں میاں بیوی کی ایک ہی بیٹی تھی جو اس وقت پانچ سال کی تھی بہت خوب صورت تھی اور میں اس کے بڑے لاڈ اٹھا تھا۔ اباجی کی کزن کو میں پھوپھی ثریا ہی کہتا تھا، دونوں میاں بیوی نے میرا خوب خیال رکھا تھا۔ کالج کی پڑھائی شروع ہو چکی تھی اور میری رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تو میں نے گاؤں کا چلنا دیکھا تھا۔

موجودہ انکشافات کی پٹاری لیے میرا منتظر تھا۔ میں جمعرات کی شام کو حویلی پہنچا تھا اور اگلے دن شام کو میری واپسی تھی لہذا پہلی شام تو ملنے ملانے میں اور بے جی سے لاڈ اٹھوانے میں صرف ہوئی۔ اگلے دن تڑپ ہی موجودہ مجھے لیے کھیتوں کی طرف چل دیا۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا جس میں سرفہرست لالی کی گمشدگی تھی۔ بے جی سے معلوم ہوا تھا کہ لالی تقریباً دو ہفتے سے اپنی ماں اور پھوپھی کے علاوہ زیو کو لے کر کسی دوسرے پنڈ گیا ہے۔ جس پنڈ کا ماں نے نام لیا تھا وہ ہمارے گاؤں سے بہت دور تھا اور کافی پسماندہ بھی۔ میں نے وہ پوچھی تھی بے جی نے لاعلمی ظاہر کی اور

سات ماہ تو ہو چکے تھے ایک دوسرے سے دور ہوئے۔۔۔!

ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ شہر کی گاؤں کی۔۔۔ ادھر ادھر کی۔! یہاں تک کہ لالی نے بتایا کہ اس سال فصل کی کٹائی کے بعد اس کے ابا زبیر کو باقاعدہ بیاہ کر گھر لارے ہیں مگر میں پوچھ نہ سکا کہ پچھلے اتنے مہینوں سے وہ کیا کرتا پھر رہا ہے اور نہ ہی اس نے خود سے کوئی ذکر کیا۔ مجھے دکھ بھی بہت ہوا مگر خاموش رہا کہ ہو سکتا ہے لالی شرمندہ ہو اور یہی شرمندگی اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھے ہوئے ہو۔ اور مجھے لالی کی عزت نفس بہت عزیز تھی۔

زبیر اور لالی کی شادی کی خوشی اپنی جگہ! مگر اندر والا رولا پتا کیے بغیر چین مجھے بھی نہیں تھا۔ شہر واپسی پر ایک دفعہ پھر موجو الرت تھا۔ اب کی بار میں نے اسے حتمی اور کھری معلومات حاصل کرنے کو کہہ دیا تھا چاہے اس کام کے لیے اسے اس بند جانا پڑتا جہاں زبیر اور اس کی ماں کے موجود ہونے کا امکان تھا۔ کیونکہ موجو کو یقین تھا کہ وہ دونوں اسی بند میں ہیں اور اس کی وجہ وہ میری واپسی پر مع تفصیل مجھے بتانے والا تھا۔

شہر کی اپنی ہی ایک دنیا ہوتی ہے وہاں کا اپنا ہی ایک نشہ ہے جو میرے جڑھ کر بولتا ہے۔ مجھے بھی شہر کی ہوا راس آگئی تھی۔ وہاں میرا خوب دل لگتا۔ شام کو کالج کے دوستوں کے ساتھ مل ملا کر ”بنٹیاں“ دیکھنے نکل پڑتا اور اکثر دیر سے واپسی ہوتی۔ اس کے علاوہ ٹریا پھوپھی اور فوزیہ کی بھی ساری ذمہ داری میں نے اٹھا رکھی تھی۔ اندر باہر کے سب ہی کام میں خود ہی نبھاتا تھا۔ اسی لیے پھر پھوپھی کو بھی میری تفریح پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

سیکنڈ ایئر کی کلاسز شروع ہوئے ابھی چند ہفتے ہوئے تھے کہ اکہتری کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لالی کی شادی کی بھی اطلاع دی تھی۔ مجھے بڑھ کر بے حد خوشی ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ وہ تمام باتیں بھی یاد آگئیں جن کی کھوج میں میں موجو کو لگا کر آیا تھا۔ ویسے تو گاؤں میں لڑکیاں چھوڑ لڑکوں کی بھی جلدی

کھاتی پھوپھی کو جا کر سہارا دیا۔ ان کے بین کان پھاڑے دے رہے تھے ان کی ننھی سی پانچ سالہ بیٹی فوزیہ کسی ہمسائی۔۔۔ کی بعل میں تھسی سسکیاں بھر رہی تھی۔

گھنٹے بھر میں گاؤں سے اجاتی اور بے جی بھی پہنچ گئے۔ اس کے بعد میت کو جیسے تیسے غسل دیا گیا تھا۔! جو لوگ لاش لے کر گھر آئے تھے ان ہی سے معلوم ہوا کہ پھوپھی کے شوہر اپنی ہی فیکٹری میں رکھی آرے والی مشین میں حادثاتی طور پر آکر کٹ مرے۔ سانحہ بہت بڑا تھا۔۔۔ اجاتی اور بے جی چند دن بعد واپس ہو لیے تو مجھے سختی سے کہہ گئے کہ پھوپھی کی عدت مکمل ہونے سے پہلے گاؤں کا رخ نہ کروں، مبادا باہر کے کسی کام کے لیے ضرورت پڑے اور گھر میں کوئی مرد موجود نہ ہو۔ لہذا اگلے چار ماہ تک میں کلی طور پر گاؤں سے کٹ گیا۔ خدا خدا کر کے ادھر پھوپھی کی عدت ختم ہوئی اور مجھے کالج سے چھٹیاں ہوئیں تو میں گاؤں بھاگا۔

پھوپھی کے پاس ہر وقت ہمسائیں کا تانا باندھا رہتا تھا اور ایک بڑھیا سی عورت پھوپھی نے مشغل رکھ لی تھی، سو میں کچھ دن کے لیے بے فکری سے گاؤں جاسکتا تھا۔

گاؤں میں داخل ہوتے ہی مجھے موجو نظر آ گیا تو میں نے اسے آواز دے کر متوجہ کیا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا اور میرے ساتھ چلتا اسی راہ ہولیا جو میری حویلی کی سمت جاتی تھی۔ ادھر ادھر کی ہانک کر اس نے مجھے بتایا تھا کہ لالی اور اس کی ماں واپس حویلی آچکے تھے مگر لالی کی پھوپھی اور زبیر، نوز حویلی میں موجود نہیں تھیں۔

میں حیران ہونے کے ساتھ ساتھ مجھس بھی تھا۔ یہ سارا چکر میری سمجھ سے باہر تھا۔

میں گھر پہنچا سب سے ملنے ملانے کے بعد ابھی نہانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ چھوٹے یوسف نے مجھے لالی کے آنے کی اطلاع دی۔ میں سب کچھ جھوڑ چھاڑ، بیٹھک کی طرف بھاگا اور پھر ہم دونوں بڑے پر جوش انداز میں ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے تھے کہ کم دیش

موجو کو جلدی سے چالو ہونے کا کہا کہ مجھے ازانوں سے پہلے اباجی کے پاس پہنچنا تھا اور پھر موجو "چالو" ہو گیا! ایک ایسی حیرت انگیز داستان میری منتظر تھی، جو میرے حواسِ شل کے دے رہی تھی۔

موجو نے مجھے بتایا کہ میرے شہر جانے کے بعد وہ تسلی سے لالی کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا اور پھر ایک دن موجو نے زیبا اور اس کی ماں کا بھی پتا چلا لیا، جب منہ اندھیرے اس نے لالی کو کچھ ضروری سامان کے ساتھ گاؤں سے باہر جانے والے رستے پر مڑتے دیکھا۔

موجو نے بڑی ہوشیاری سے لالی کا پیچھا کیا تھا اور پھر تھوڑی مشکل سے وہ لالی کے پیچھے اس گھر تک پہنچ گیا جہاں زیبا اور اس کی ماں موجود تھیں۔ یہ ایک نہایت خستہ حال سا دو کمروں کا گچھا مکان تھا۔ جس کا مالک اس گاؤں کا واحد کھسار عبداللہ تھا اور دو سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ اب وہاں اس کی بیوہ اور چار بچے بڑے حالوں میں رہتے تھے۔

موجو ٹھکانہ دیکھ کر لوٹ آیا تھا اور پھر اگلے چند دن اس نے وہاں کے تسلسل چکر کاٹ کر یہ پتا چلا لیا تھا کہ زیبا اور اس کی ماں اسی گھر میں موجود ہیں اور وہ بھی پچھلے کئی ماہ سے۔ زیبا امید سے تھی اور کچھ ہی عرصے میں اس کے ہاں ولادت متوقع تھی اور جب تک ولادت ہو نہیں جاتی زیبا کو وہیں رہنا تھا اپنی ماں کے ساتھ۔ اس بات کی ارد گرد کسی کو خبر نہیں تھی۔ ان دونوں سے ملنے کے لیے بھی صرف لالی ہی آتا تھا جو اپنے ساتھ پورے ٹبر کے لیے ڈھیروں سونامیں لے کر آتا تھا۔ اس بیوہ ماں اور اس کے بچوں کے دن پھر گئے تھے ساری عمر اتنا نہیں کھایا تھا جتنا ان چند ماہ میں۔

بدلے میں زیبا کی بھرپور نگہداشت کی ذمہ داری اور پھر وائی کے فرائض اسی عورت کو پورے کرنے تھے موجو کا ایک یا ر اسی پنڈ کارہا لشی تھا۔ وہ اتفاق سے اسی بیوہ عورت کی سب سے بڑی بیٹی کا منگیتر تھا۔ اسی کے ذریعے موجو نے بڑی احتیاط سے اندر کی باتیں باہر نکالوائی تھیں اور نکالنے والی تھی، موجود کے یار کی

شادی ہونا کوئی ان ہونی نہیں تھی۔ لالی اور میں بھی اٹھارہ برس کے ہو چکے تھے، میں تو مزید بڑھنے شہر آ گیا تھا مگر لالی کی شادی میں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مزید رہائی کرنا ہوا۔ کہیں یہاں تھی اور پھر اڑتا۔ سو اس کا بیاہ کسی کے لیے باعث حیرت نہیں تھا۔ میرے اندر بس کھلبلی سی مچی تھی تو یہ جاننے کی کہ میری غیر موجودگی میں موجو کے پاس کیسی کیسی حیرت انگیز خبریں جمع ہو چکی تھیں۔

گاؤں میں شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ بڑے ملک جی کے اکلوتے پتر کی شادی تھی، جتنا بھی کرتے کم تھا۔ دو ہفتے پہلے سے ہی لنگر شروع ہو گیا تھا۔ گاؤں میں کسی کے گھر بھی چولہا گرم کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں نے بھی جو پٹی پہنچتے ہی اپنی خدمات پیش کر دی تھیں اور پھر دن رات کا فرق مٹانے شادی کے انتظامات میں جت گیا۔ موجو تو تھا ہی کالا۔ اس نے اسے مسلسل اندر باہر کے کاموں میں چکراتے دیکھا حالانکہ میں جلد از جلد اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

گو کہ لالی بے حد خوش تھا مگر کچھ تھا جو اوپر اور اس پر محسوس ہوتا تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے یک دم کئی سوچ میں گم ہو جاتا تھا اور اس کی وجہ مجھے صرف موجو ہی بتا سکتا تھا۔ آج کل اباجی کی طبیعت بھی کچھ گری گری سی رہتی تھی۔ سینے میں جکڑن سی محسوس کرتے اور جسم سن ہو جانے کی شکایت تھی۔ اباجی اسے موسم کی تبدیلی کا اثر قرار دیتے تھے اور حلیم جی سے دوائی لے کر چیکے بیٹھ رہتے، شام ہوتے ہی میں بھی گھر لوٹ آتا تھا کہ اباجی اور دیگر گھر والوں کے ساتھ وقت گزار سکوں۔

ایسے ہی ایک شام میں لالی کی حویلی سے لنگر کی تقسیم کے بعد گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں ہی ایک درخت کی اوٹ سے موجو نے مجھے پکارا۔ پہلے تو میں چونکا پھر تسلی کرنے کے بعد اس کے ساتھ وہیں درخت کے موٹے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور گرد کی جھانڑیوں کی وجہ سے ہم اوٹ میں تھے۔ میں نے

سر دست ممکن ہی نہیں تھی۔ کیونکہ زیبو کے حمل کو پانچ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور اگر شادی کر دی جاتی تو صرف چار ماہ بعد ولادت پورے گاؤں کو مشکوک کر دیتی۔۔۔!

یہ انتہائی راز کی باتیں حویلی کی بے حد پرانی نمک خوار ملازمہ ماسی برکت نے انتہائی رازداری کی تاکید کے ساتھ موجودگی ماں کے کان میں انڈیلی تھیں۔۔۔! ماسی برکتے موجودگی ماں کی سگی ماسی بھی جسے عرصہ بہت چکا تھا حویلی کا نمک کھاتے۔۔۔! مگر آخر عورت تھی۔۔۔ حویلی کا یہ انتہائی قیمتی راز موجودگی ماں کے سامنے اگل کر پیٹ ہلکا کر چلتی بنی اور موجودگی چارے والی کھڑی میں گھسا مزے سے بیڑی پہ بیڑی سلگائے جا رہا تھا، سب کچھ جان گیا۔ ادھر ادھر بچل خوار ہونے کی نوبت ہی نہ آئی اور گھر بیٹھے ہی بڑی حویلی کے خفیہ کھاتے کھل کر سامنے آگئے۔

ماسی برکتے نے ہی موجودگی ماں کو بتایا تھا کہ چونکہ فوری شادی نہیں ہو سکتی لہذا ولادت تک کا انتظار ناگزیر تھا اور یہیں آکر لالی کا پھوپھا پھر اینٹھ گیا کہ وہ کسی بھی صورت وہ بچہ اپنے خاندان میں نہیں دیکھنا چاہتا۔۔۔! چاہے لالی اسے خود فنا آئے یا کسی بے اولاد کو دے دے مگر اسے اپنا نواسہ یا نواسی تسلیم نہیں کریں گے۔ آخر لوگوں سے کیا کہہ کر اس بچے کو خاندان میں شامل کیا جائے گا۔۔۔؟ اور صرف ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے بڑے ملک جی نے بھی ان کی تائید کر دی تھی، ورنہ ان کی بہن کا گھر اچڑنے کی نوبت آگئی تھی۔

اس کے بعد موجودگی کے بقول لالی کے ہاں لڑکا ہوا تھا جسے زیبو اور اس کی ماں اسی بیوہ عورت کے حوالے کر کے واپس حویلی آئی تھیں۔ زیبو کسی صورت آمادہ نہیں تھی مگر باپ کے خوف سے اسے دل پر پتھر رکھنا پڑا۔ لالی خود بہت پریشان تھا چاہے جیسے بھی حالات میں وہ دنیا میں آیا۔۔۔ تھا تو دونوں کی اولاد۔

لالی نے اس بیوہ عورت کو سختی سے تاکید کی کہ بچے کی خوراک اپنی ہی طرف سے کسی قسم کی لاپرواہی نہ

مگلیترے! جس کو چند میٹھی باتوں اور درجن بھر رنگین چوڑیوں سے اس کے مگلیترے نے رام کیا اور ساری گتھا سننے کے بعد موجودگی کو بتائی۔ اس دوران موجودگی صبری سے میرا انتظار کرتا رہا تھا مگر میں شہر میں مصروف تھا۔ اور اب قریباً ”ڈیڑھ ماہ پہلے زیبو کے ہاں لڑکا ہوا تھا جس کی ولادت اسی گھر میں ہوئی۔

واہ۔۔۔! قدرت کے رنگ ہیں سب ملکوں کے وارث کو لادارثوں کی طرح اسی بیوہ عورت کے حوالے کر آئے۔

لالی اور زیبو کے اس کسب (عمل) نے بڑے ملک جی کو بے حد چراغ پکایا۔۔۔ مگر پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ پانچ ماہ گزر چکے تھے بہنڑی کو پھنک بھی پڑ جاتی تو بیٹی کو تو بعد قتل کرتے پہلے لالی کا گلا ادا دیتے۔ بہن کا گھر اجڑ جاتا۔ لالی ان کا انکو تا وارث تھا۔ پھر اس اگلو تے وارث کی بھیا تک غلطی کو مٹانے کی بہت کوشش کی گئی مگر والی کے بقول وقت اور ہو چکا تھا۔۔۔ اب لڑکی مرے گی اگر کچھ ایسا کیا کیا تو!

پھوپھی کا دن رات کا رونا سب کے دل دہلائے دے رہا تھا اور خود پھوپھی کا دل دہل رہا تھا اسے شوہر کا سوچ سوچ کر کہہ اگر انہیں اس سارے سلسلے کی بھنک بھی پڑ گئی تو زیبو کا نووہ بعد میں کچھ کریں گے پہلے خود ان کا حشر کر دیں گے۔ مگر یہ خبر زیبو کے باپ سے چھپی نہیں رہ سکی در پھر بڑی حویلی میں وہ کھرام چپا کہ رشتے ناتے ٹوٹنے کی نوبت آگئی۔۔۔

زیبو کے باپ نے بیوی کو لالی کے ابا جی کے سامنے پیٹ ڈالا۔۔۔ معاملہ سلجھتا نہ دیکھ کر بڑے ملک جی نے پگڑی بہنوی کے پیروں میں رکھ دی اور کہا کہ ”میرے بیٹے نے غلطی ضرور کی ہے۔ گناہ نہیں کیا۔ تمہاری بیٹی آج بھی میرے گھر کی عزت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔“

اس بات پر لالی کے پھوپھا کا رباغ تھوڑا ٹھنڈا ہوا اور پھر بل بیٹھ کر آگے کے حالات پر غور شروع ہوا۔۔۔ لالی آگے پھوپھا کی ترجیح فوری رخصتی تھی جو کہ

کرتے۔ بدلتے میں اسے ہلانہ رقم اور اناج ملتا رہے گا۔ اور یہ لالچ اس عورت کے لیے بہت بڑا تھا۔ کہ گھر کے حالات تو دو وقت کی روٹی کو بھی ترساتے تھے، کہاں ڈھیروں اناج اور نقد رقم کی صورت ڈھیروں ضرورتوں کا پورا ہونا۔! ایسے میں تو وہ ایک چھوڑ دس بچے بھی پال دیتی۔

یہ ساری کتھا موجو کی زبانی سن کر میرا دل بے طرح اداں ہو گیا تھا۔ آخر اس بچے کا قصور...؟ اور پھر لالی کی پریشانی بھی جائز تھی۔ مگر اب وہ اپنے کیے کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔

میں نے موجو سے پوری تسلی کی کہ اس کی ماں اور ماہی برکتے یہ باتیں کسی تیسرے کو تو نہیں بتادیں گی تو اس نے مجھ سے کہا کہ وہ دونوں کو ٹھیک ٹھاک تزیان (دھمکیاں) لگا کے ڈرا چکا ہے اور وہ اب کبھی بھی منہ نہیں کھولیں گی۔ مجھے اس کی تزیان سن کر بے حد ہنس آئی تھی۔ اور پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں گھر آیا تھا۔ جہاں ایک نئی پریشانی میری منتظر تھی۔ ابا جی کی طبیعت یک دم بگڑ گئی تھی۔

ابا جی برفان کا زبردست حملہ ہوا تھا، پھر انہیں چار روز چار شہرے لے جایا گیا اور اسپتال داخل کر دیا گیا۔ دو ہفتے ابا جی انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رہے اور پھر ڈھیروں دواؤں اور بدایتوں کے ساتھ ابا جی کو حویلی لایا گیا۔ ان کا جسم تقریباً "مفلوج ہو چکا تھا۔

بے جی الگ پریشان تھیں، ان پر وہی ذمہ داری آن پڑی تھی۔ ابا جی کی شدید بیماری اور حویلی کا انتظام۔!

گھر میں ملازموں کی کمی نہ تھی مگر بے جی کو شدت سے ایک بیٹی کی کمی محسوس ہو رہی تھی جو اگر ہوتی تو یقیناً "اس مشکل گھڑی میں بے جی کے شانہ بشانہ ہوتی۔ مجھ سے چھوٹے دو بھائی تھے، بس کوئی نہ تھی، حالانکہ بے جی کے ہاں بیٹی ہوتی تھی پر وہ چند سانسیں لے کر پار لگ گئی تھی۔

اب ابا جی بے حد چڑخڑے سے رہتے تھے، بے جی ان کے پاس سے ذرا سا بھی ہنسیں تو شور کرتے اور

لا یعنی آوازیں نکال کر غصے کا اظہار کرتے۔ ابا جی کی بیماری کی خبر سن کر ثریا پھوپھی اور فوزیہ بھی چند دن کے لیے گاؤں چلے آئے تھے، ان کے آنے سے بے جی کو بڑا آسرا ہوا تھا مگر کب تک۔!

ادھر میں لالی کے ساتھ مل کر اس کے بیاہ سے پہلے اور بعد کے سلسلے نمٹانے میں لگا تھا اور ادھر پھوپھی ثریا نے اماں کو نئی راہ دکھادی۔ میری شادی کا شوٹا۔! میں نے سنا تو ہکا بکا منہ دیکھا رہ گیا۔ ہتھ سے اکھڑا مگر پھوپھی اور بے جی نے جذباتی ہتھکنڈے استعمال کر کے میرا زور توڑا۔ بقول ان کے بڑھ لکھ کر مجھے کون سا نوکری ڈھونڈنی ہے، جو میری شادی میں دیر کی جائے۔۔۔ رب کا دیا بہت کچھ ہے! میں اگر پردھنا چاہوں تو پردھتار ہوں، کم از کم جویلی میں بے جی کے پاس تو کوئی ہو گا ناں! لالی کو بتا چلا تو وہ میرے سر ہو گیا کہ میں بھی ہر حال میں شادی کروں تاکہ دونوں یار رکھنے ہی باپ بن جائیں اور پھر آپس میں ہی رشتے دار بن کر کے دوستی مضبوط کریں۔! اس کی منطوق سن کر مجھے بے تحاشا ہنسی آئی تھی کہ "سوت نہ کیا ہے، جو لالہ ہے سے لٹھم لٹھا" والی بات تھی۔

اور آخر کار مجھے بھی نکیل ڈال ہی دی گئی، ذکیہ کی صورت! ذکیہ ہماری رشتے دار نہیں تھی، بلکہ خاندان سے باہر کی تھی۔ ہاں ابا جی کی ذکیہ کے ابا سے خاصی دوستی تھی اور ذکیہ کا تعلق ہمارے ہی گاؤں سے تھا۔ اچھی سا کھجی طبیعت کی تھی، گھرداری میں طاق اور صورت شکل میں بھی کم نہ تھی۔ بے جی نے چھری تلے دم بھی نہ لینے دیا تھا، اور جھٹ نکاح پر دھوا دیا۔ سب کچھ اتنا آنا "فانا" ہوا تھا کہ کچھ خاص تیاری بھی نہ کی جاسکی، کچھ ابا جی کی طبیعت کا اتار چڑھاؤ۔!

یہاں بھی لالی اور زبیر کام آئے تھے پھوٹے موٹے تمام انتظامات لالی نے ہی کیے تھے اور زبیر تو اپنے جہیز اور بری کے کتنے ہی سگے اور ان سگے جوڑے لیے چلے آئی کہ جو جو بھی پسند ہو وہ ہم ذکیہ کے لیے رکھ لیں۔

کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا اس طرح میری چہل قدمی بھی ہو جاتی تھی اور راہ چلتے بہت سوں کے حالات کی بھی خبر ہو جاتی تھی۔

میں اپنے ہی دھیان میں مگن صبح کی پرفیکٹ فضا میں ادھر ادھر نظر دوڑاتا چلا جا رہا تھا جب لالی کی حویلی سے نکلتے موجو سے بڑھ بھڑ ہو گئی۔ وہ بے حد جلدی میں تھا۔ اسے لالی نے کسی ضروری کام سے شہر بھیجا تھا مگر دہاتے جاتے بھی مجھے ایک اہم خبر دے گیا۔!

لالی اس سچے کو حویلی میں لے آیا تھا بڑی خاموشی سے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی مگر موجو تو موجود تھا۔ اسے نا صرف یہ خبر تھی بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایسا انتہائی قدم کیونکر اٹھایا گیا۔

لالی کے یہاں کے بعد دیگرے تین بیٹوں کی پیدائش نے اسے بے حد فکر مند اور چڑچڑا کر دیا تھا۔ اپنی جاگیر جائیداد اور وارث کے نام پر تین بیٹیاں اور وہ بھی پر ایسا رہن۔ اور سب سے افسوس ناک بات یہ تھی کہ لالی کی بیوی کو یہ مرثہ سنایا گیا کہ آخری بیٹی کی دفعہ چند اندرونی پیچیدگیوں کے باعث وہ مزید بچوں کی ماں نہیں بن سکتی۔

قدرت کی نہ جانے کیا مصلحت تھی مگر لالی کو وارث کی فکر کھانے چارہ ہی تھی اور تب ہی لالی کی بیٹی جی کو جو ابھی جنات تھیں اپنے اس پوتے کی یاد ستانی جسے اس پورے گھر اپنے نے کب سے مصلحتاً بھلا رکھا تھا۔ بے جی کو ہڑک انھی تو ماں تو ماں تھی۔ لالی کی بیوی نے بھی دن رات سچے کو واپس لانے کا راگ اپنا شروع کر دیا۔ اور خود لالی بھی ہی ایسا چاہتا تھا جب ہی چند دن میں وہ بچہ حویلی میں موجود تھا۔ اور جس کی خبر انھی انھی مجھے موجو سے ملی تھی۔ میں وہیں سے واپس ہو لیا اور گھر آکر لالی کی حویلی کی طرف ذکیہ اور بے جی کو روانہ کیا اور ساری بات معلوم کرنے کو کہا۔

واپسی یہ جو کہانی انہوں نے مجھے سنائی وہ یہ تھی کہ لالی اور اس کی بیوی نے دہر پرے کے کسی رشتے دار کا بچہ گود لے لیا ہے۔ تمام تر قانونی کارروائی کے بعد!

بے جی تو نماں ہی ہو گئیں۔ غرض تو ہولائے سے تھی سو وہ سوکھے داموں پھلی آئی۔ یوں میری اور لالی کی گھریلو زندگی کا آغاز بھی تقریباً ساتھ ساتھ ہی ہوا۔ اس تمام عرصے میں لالی کا بچہ میرے دماغ سے یکسر نکل گیا تھا۔ کچھ دن گاؤں میں ذکیہ کی ناز برداریاں کرنے کے بعد میں پھوپھی ثریا اور فوزیہ کو لیے شہر واپس آ گیا۔ کیونکہ مجھے تعلیم ادھوری نہیں چھوٹنی تھی۔ یہ اور بات کہ میں جان چکا تھا کہ انٹری کر لیا تو بڑا معرکہ ہو گا۔ کجا کہ لی اے!

انٹریاں کرنے کے بعد ابھی میں نے تھرڈ ایئر کے لیے مضامین منتخب کیے ہی تھے کہ گاؤں سے میرے بیٹے کی پیدائش کی خبر آئی بات ایسی تھی کہ فطری طور پر میں بے تحاشا خوش تھا۔ ادھر لالی کے ہاں بھی لڑکی ہوئی تھی۔

میں بھاگ بھاگ گاؤں پہنچا تو ہم دونوں کی حویلی میں بھرپور خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ میری تو واقعتاً اور لالی کی ظاہراً پہلی اولاد تھی۔ سو جتنی خوشیاں منائی جاتیں اتنی کم تھیں۔ بس۔ بس۔! پھر میں واپس شہر نہیں پلٹ سکا۔ کیونکہ اتنی کشش مجھے کبھی ذکیہ کے وجود میں محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی عبداللہ میں۔ اپنے خون کی مہکت میرے حواسوں پر ایسی سوار ہوئی کہ شہر کی رنگینیاں یکسر بھلا بیٹھا۔ پھوپھی ثریا اور فوزیہ کی فکر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ایک تو ان کے محلے دار بہت ہی اچھے تھے پھر پھوپھی ثریا کے پاس کل وقتی ملازمہ بھی موجود تھی۔ جو کہ خاصی مرد مار قسم کی عورت تھی۔

پھر وقت کو تو گویا پر لگ گئے اور جاتے جاتے جہاں ڈھیروں سکھ جھولی میں ڈال گیا وہیں پر کچھ دائمی دکھ دے گیا۔ میرے اور لالی کے آئین میں تین تین بچے کھیلنے لگے۔ عبداللہ کے بعد میرے ہاں ایک بیٹی اور پھر ایک بیٹا ہو چکا تھا جبکہ لالی تین لڑکیوں کا باپ بن گیا اور قدرے چڑچڑا بھی ہو چکا تھا۔ بڑے ملک جی اور میرے ابا جی دونوں چند ماہ کے فرق سے گزر گئے۔

پھر ایک روز عجیب ہی بات ہوئی۔ امین نجر بڑھ کر

اب وہ لالی کے گھر اس کے بیٹے کی حیثیت سے ہی پلے گا اور وہی لالی کا ”وارث“ ہوگا۔ وہ رشتے دار کون تھا۔۔۔ جن کا یہ بچہ تھا کسی کو نہیں بتایا گیا۔

بس لالی چند ہی دن تک اپنی معقول جائیداد اس بچے کے نام لگانے والا تھا۔ میں جانتا تھا کہ شام کو لالی سے جب میری ملاقات ہوگی تو وہ بے دھڑک مجھے بھی یہی کہانی سنائے گا اور میں بھی یقینی کیفیت میں سنتے ہوئے سردھنوں گا۔ کیونکہ مجھے ہر حال میں لالی کے راز کو راز ہی رکھنا تھا۔۔۔ گاؤں والوں کو ”ملک جی“ کی اس کہانی میں کھوٹ نہیں دکھ سکتا تھا۔۔۔ اور اگر میں لالی کے کردار کے اس کھوٹ کو جانتا تھا۔ تو یہ دوستی کا فرض تھا کہ اس عیب پر پردہ بڑا رہے۔ موجوں کی تو بات ہی کیا تھی؟ منہ میں ساری عمر پتھر ڈالے رکھے گا۔۔۔ میں جانتا تھا!

اور ابوں یہ حقیقت ہمارے سینوں میں دفن ہو گئی۔ میں آفاق سے ملا۔۔۔ سنا ہوا قدرے اجڑ سا بچہ تھا مگر ہو سونالی کی کالی۔ جس ماحول میں وہ پلا بڑھا تھا یہ بھی غنیمت تھا کہ اسکول جاتا تھا۔ لالی نے دو مہینے حویلی میں رکھ کر اسے خود سے اور گھر والوں سے خوب مانوس کیا۔۔۔ لاڈ، نخرے، اٹھالے۔۔۔ جان شان بنائی اور پھر تیسرے مہینے وہ آفاق کو شہر کے بہترین اسکول کے ہاسٹل میں داخل کر آیا۔ لالی کی بے سجن اور ذہنیوں نے خوب شور ڈالا مگر لالی ہر صورت کچھ عرصے کے لیے آفاق کو سب کی نظروں سے دور کرنا چاہتا تھا۔۔۔ میں لالی کی کیفیت سمجھتا تھا مگر اسے سمجھا نہیں سکتا تھا۔۔۔ وہ باپ تھا اور اپنی اولاد کی بہتری اس سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا تھا اور پھر وقت نے ثابت کیا کہ یہ فیصلہ آفاق کے حق میں بہترین رہا۔۔۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی بول چال اور رنگ ڈھنگ یکسر تبدیل ہو گئے۔۔۔ موجود اکثر گاؤں سے سوغاتیں لے کر شہر اس کے پاس جاتا رہتا تھا اور واپسی پر مجھے بھی اس کی رو دا سنا تا تھا۔

سے کا گھوڑا سموں سے ڈھیروں خاک اڑاتا۔۔۔ ہمارے سروں میں دھول جھونک گیا۔۔۔ منظر صاف ہوا۔

تو میں اور لالی عمر کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔۔۔ بچے کنارے لگ گئے تھے۔۔۔ لالی نے لڑکیاں بیاہ دی تھیں اور میری دونوں بیٹیاں بھی بیاہ کر پردیس جا بسیں۔۔۔ میرے دونوں لڑکے شہر میں ہی اچھی نوکریوں سے لگ گئے۔۔۔ آتے جاتے رہتے تھے اور ہم میاں بیوی سے شہر چلنے کی ضد بھی کرتے تھے۔۔۔ ذکیرہ تو خیر تاؤلی ہوئی پھرتی تھی مگر میں اسے نیکل ڈالے رکھتا تھا۔۔۔ کیونکہ میں ہرگز بھی گاؤں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔۔۔ ایک وقت تھا کہ شہر سے پرتنے (لوٹنے) کو جی نہیں کرتا تھا۔ وہاں کی فضا میں ایک الگ ہی مستی سی چھائی محسوس ہوتی تھی مگر جب گاؤں آکر بالی بچے کے جھنجھٹ میں پڑا تو شہر کا شوق ختم ہو کر رہ گیا۔۔۔ اب کبھی لڑکوں سے ملنے ملانے یا ان کی ماں کے ہاتھ کی بنی سوغاتیں دینے چلا جاتا تھا۔۔۔

میرے بیٹوں نے شہر میں رہ کر ہی پڑھا تھا۔۔۔ آفاق کی طرح جب بڑھ گیا کہ اگر فارغ ہوئے تو وہیں نوکری کرنے کی اجازت مانگی۔۔۔ میں نے بغیر جیل و ججٹ کے اجازت دے دی مگر ذکیرہ نے بہتیرا رولا ڈالا۔۔۔ اور پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ بیوی کو درکالیا میں نے۔۔۔ ایسا کرنے میں بھی بڑا سواد آتا تھا مجھے۔۔۔ مگر لالی کے پتر آفاق کا معاملہ الٹ نکلا۔۔۔ بڑا لائق فائق منڈا تھا۔۔۔ انجینئرنگ کی شان دار ڈگری تھی اس کے پاس۔۔۔ اور قدرتی بات تھی کہ وہ بھی شہر ہی میں نوکری کرنے کو ترجیح دیتا جبکہ اگلے ہاتھوں ہاتھ اسے لینے پر تیار تھے مگر حسب فطرت لالی اڑ گیا۔۔۔ اور ایسا اڑا کہ کسی کے سمجھانے پر بھی نہ ملا۔ ایک ہی ضد باندھ لی کہ آفاق زمینیں سنبھالے گا اور بس!

اس بچے پہ شاباشی جس نے دکھے دل سے باپ کا مان رکھ لیا اور رہ بیا بند میں ہی۔۔۔ کبھی میرے دونوں لڑکے چھٹی والے دن حویلی آتے اور آفاق ان سے ملنے آتا تو اس کی آنکھوں میں حسرت تیرتی دکھائی دیتی۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ اسے بھی قرار آ ہی گیا۔۔۔ آج کل بلالی اور اس کے گھر والے آفاق کا گھر بنانے کے چکر میں تھے۔۔۔ ان کی دیکھا دیکھی مائی کو بھی شوق ہوا لڑکے

بیانے کا یہ روزیوں لڑکیاں دیکھنے نکلتیں جیسے وہی عید کے دنوں میں مرد لوگ جانور دیکھنے نکلتے ہیں۔ اور انہی دنوں مجھے ایک فون موصول ہوا۔ میں قوری طور پر شہر روانہ ہوا تھا۔ وہاں مجھے کئی دن لگ گئے تھے۔ اور جب اٹھارہ دن بعد میری واپسی ہوئی تھی تو ایک خبر گاؤں میں میری منتظر تھی اور ایک خبر مسلم میرے ساتھ گاؤں پہنچی تھی۔!

میری بیوی ذکیہ نے عبد اللہ کے لیے لڑکی ڈھونڈ لی تھی۔ دو گاؤں چھوڑ کر ذکیہ کے رشتے دار رہتے تھے۔ ان ہی میں سے کسی کی بچی تھی۔ سنا تھا شہر میں بائبل میں رہ کر پڑھائی کی تھی۔ سلیقے طریقے والی بچی تھی۔ عبد اللہ سے بھی بات کر لی تھی اور وہ بھی راضی تھا۔ اب بس میرا ہی انتظار تھا کہ میں آؤں تو بچی کی تلی (تھیلی) پر کچھ رکھ آئیں۔ یوں بات کی ہو جائے۔

ہاں۔ آفاق کا رشتہ ابھی تک کہیں طے نہیں ہوا تھا۔ بقول ذکیہ کے کہ اس کی ماں بہنوں کے خمرے ہی بہتیرے ہیں۔ (ان زمانوں کے سیاپے ہی وکھرے ہیں)۔

اور میرے باپ جو خبر تھی وہ مریم تھی میرے ہمراہ حیولی پہنچی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے آئی تھی۔ نہیں رہنے کے لیے۔!

مریم پھوپھی شریا کی دو بہتری (نواسی) تھی۔ فوزیہ کی بیٹی! وہی فوزیہ جو اپنے باپ کی موت کے وقت محض پانچ چھ سال کی تھی اور اب تو اسے مرے سالوں بیت چکے تھے۔ مریم کو پھوپھی شریا نے ہی پالا تھا۔ کچھ دن پہلے مجھے فون پر اچانک پھوپھی شریا کے ہی انتقال کی خبر ملی تھی جو ان کی بے حد پرانی ملازمہ نے کیا تھا۔ وہ عورت پھوپھی کے پاس ان کے خاوند کے مرنے کے بعد سے آج تک تھی۔ مریم فوزیہ کی اکلوتی اولاد تھی اور پھوپھی شریا کے مرنے کے بعد ظاہر ہے اس کا والی وارث کوئی نہیں بچا تھا سوائے میرے۔ اس لیے مجھے ہر حال میں اسے ساتھ لایا جانا تھا۔ مریم بے حد سلجھی ہوئی اور خاموش طبع بچی تھی۔ عمر

اٹھارہ انیس کے لگ بھگ تھی۔ ویسے تو مجھے یقین تھا کہ ذکیہ کو اعتراض ہرگز نہیں ہوگا مگر وہ کیا ہے نا۔ عورت کو نکتہ چینی کی کوئی وجہ نہ ملے تو یہ ہی وجہ بن جاتی ہے!

اس لیے جس وقت میں نے مریم کو اس کے آگے کیا۔ اس سے اظہار ہمدردی کرنے کے بعد اس کا منہ ماتھا چوما اور اس سے نظر بچا کر میرے کان میں بدبانا نہیں بھولی تھی۔

”سارے سیاپے آپ نے ہی گلے ڈالنے ہوتے ہیں۔ اپنے نبڑتے نہیں۔ دو بجے تھے گھر میں جمع کر چھوٹے بس!“

اس وقت تو میں نے اسے گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔ بعد میں کافی کس بل نکالے تھے۔

تب سے اب تک مریم حیولی میں ہی تھی اور بے حد خوش بھی تھی۔ ذکیہ کا بھی دل لگ گیا تھا اس کے ساتھ۔ سارا ہی بیٹیاں تو کب کی پرانے گھر کی ہو چکی تھیں۔ اس لیے بھی مریم کی جگہ بننے میں وقت نہیں لگا۔ اور اب اسے تین ماہ سے اوپر کا عرصہ ہو رہا تھا ہمارے بیچ رہتے۔ اس دوران میرے دونوں بیٹے کئی بار گاؤں آئے عبد اللہ اور اسفند دونوں کو بھی مریم کی موجودگی پر ہرگز کوئی اعتراض نہیں ہوا بلکہ وہ دونوں اس بات پر خوش تھے کہ مریم ہم دونوں کا جس جانفشانی سے خیال رکھتی ہے وہ کوئی سگی بیٹی ہی رکھ سکتی ہے۔

عبد اللہ اور اسفند دونوں نے ہی مریم کو بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح جانا تھا اور اسی بات کو دیکھتے ہوئے میرے دل میں اطمینان بھر گیا تھا۔ مریم نے ایف اے کر رکھا تھا اور اب پرائیویٹ تھی۔ اے کی تیاری کر رہی تھی۔ مگر میرا ارادہ تھا کہ اس دوران اگر کوئی اچھا کھانا پیتا رشتہ آیا تو میں اسے رخصت کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ کچھ بھی تھا آج کل ہم دونوں میاں بیوی کے مزے تھے، وہ بھی اتنا سکھ دیتی تھی کہ گھر میں رہنے کو دل نہ کرتا تھا۔ کچھ جیسے سیٹ سا ہو گیا تھا اور معمولات میں۔ بے فکری ہی بے فکری تھی اور پھر

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

فکر کا پہلا ٹکڑا آفاق نے پھینک مارا تھا۔ شرم صدم تو وہ مجھے بھی محسوس ہوتا تھا اور میری جوہلی کے چکر بھی بڑھ گئے تھے مگر میں نے اس بات کو ہرگز بھی مزیم سے نہیں جوڑا تھا۔ مجھے تو ابھی تک یہ ہی محسوس ہوتا تھا کہ نوکری کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے اداس رہتا ہے اور عبد اللہ اسفند کی خیر خبر کے لیے آئے دن مجھ سے ملنے چلا آتا ہے۔ حالانکہ موبائل سب ہی کے پاس تھا۔ خیر میں نے کسی دوسری تیسری وجہ پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اور میں اسی وہم میں رہتا جو ایک دن اچانک آفاق میری بیٹھک میں بیٹھ کر مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار نہ کر دیتا۔! بھوسے میں چنگاری نہیں لگی تھی بلکہ آگ دہک اٹھی تھی۔



لوئے لوئے پھر لے کرئیے، بے لوث بھانڈا بھرنا شام بی بی بن شام محمد، اتنے گھر جاندی سے ڈرنا مگر شکاری کر یوں تیار ہی، اتنے پار چرے ہٹھا ہرنال جو چڑھیا اس ڈھینا اڑک، اتے جو جمہاں اس مرنا ”او موجود! اب بس کریا رس۔ جازرا حقہ سلگا کر لے آ اور پھر دوشھیاں بھر دے۔ آج سارا پنڈا تھکا تھکا سا ہے۔

لالی سے بات کیے ہفتہ بیت گیا تھا مگر ابھی تک جواب نہیں آیا تھا۔ حالانکہ میری ایک دو دفعہ ملاقات ہو چکی تھی مگر وہ سز سز کی نوعیت کی تھی، اس میں ایسی کوئی بات پوچھنی، کرنی مجھے بھی مناسب نہیں لگی تھی، لیکن بتائیں دل کیوں بوجھل سا تھا۔ ایک عجیب سا شرمندگی کا احساس تھا جو اسوں پر چھایا تھا۔

مجھے اپنے مقام سے نیچے آکر لالی کو اس کے ماضی کے سیاہ باب کے ورق الٹ کر دکھانے پڑے تھے مگر یہ میری انتہائی مجبوری تھی۔ میں ساری عمر منہ میں پتھر ڈالنے رہتا جو بات میری عزت پر نہ آجاتی۔ دوستی سے پیاری مجھے اپنی عزت تھی اور مزیم بھی میری ہی لگ کا ایک دل (ہل) تھی اور موجود نے مجھے جو آفاق کی حوائش بتائی تھیں اس کی وجہ سے یہ قدم ناگزیر تھا۔

میں اب ہی سوچوں میں گم تھا جب اپنے کندھوں پر مجھے موجود کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے نرم ہاتھوں سے مجھے دباننا شروع کیا۔ میرے پورے جسم میں سکون کی لہر دوڑ گئی۔

”کیا سوچتے ہیں سرکار۔! اپنے ذہن ماں اٹھٹے پٹھے کھیالات کا ہے کولاوت ہیں۔ دیکھنا کچھ ہی دن ماں اوڈے ملک جی کا جواب ملت ہے اور وہ بھی ہاں ماں۔“

ہمیشہ کی طرح موجود میرے اندر تک اتر کر میری فکر اور پریشانی جان کر مجھے تسلی دے رہا تھا۔

”ہم م م۔!“ میں نے ہنکارا بھرا۔ اور حقے کا ایک گھرا کش لیا۔ ”ہے تو بڑا پکا ڈھینٹ لالی۔ مگر میں نے ایسا کلہوچہ (شکنہ) ڈالا ہے کہ پھر پھر بھی نہیں سکے گا۔ مزیم کو آفاق کے لیے اسے یاہنا ہی پڑے گا۔ بس یارا! یہ جو دل پہ بوجھ سا ہے ناں۔ اسی نے کھنسن سی کر رکھی ہے پورے پنڈے میں۔“

”تو سرکار کا ہے کہ بوجھ ڈھووت ہو۔ کون سا گناہ کرت ہو۔ بلکہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ آج تک تسان نے گناہ پر پرہہ رکھت، پورے پنڈاں کوئی بھی اس بات سے واقف نہ ہووت۔ آج بھی یہ راز راز ہی رہت جو ڈڈے ملک جی آسانی سے رشتہ کرن واسطے راضی ہووت۔“

موجود نے اب میری پنڈلیاں دبانے شروع کی تھیں۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کو ٹکا اور بھاری آواز میں گویا ہوا۔

”دیکھ موجود۔! یہ راز آئندہ بھی راز ہی رہے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے من میں یہ بات سما جائے کہ لالی کے آگے بات کھل گئی ہے تو سارے میں کھول دوں۔ یار ہے وہ میرا۔ جگر ی یار!“

میرے لہجے میں جو تنبیہ تھی اسے فوراً سے پیشتر موجود نے بھانپ لیا تھا۔ اس کا چہرہ یکدم لال ہوا اور سینہ پھول گیا۔

”موجود چند گوریاں اتر جاوت ہے سرکار۔ بے کر تسان کو بے اعتباری ہووت۔ موجود آج بھی وہی

موجود ہے سرکار۔ گردن تو کشادہ توت پھر وفاداری کا مول نہ ڈالت۔

موجود آبدیدہ ہو گیا تو میں نے پیار سے اس کا کندھا تھپکا۔ اس کی وفاداری پر مجھے کبھی بھی شک نہیں رہا تھا۔ مگر تنبیہ ضروری تھی کیونکہ لالی کا یہ راز زبان زد عام ہو جاتا تو اس کی ساری عمر کی کمائی عزت چلی جاتی اور ایسا میں کبھی نہیں ہونے دے سکتا تھا۔



میں حویلی کے بڑے سے صحن میں چارپائی بچھائے دھوپ سینک رہا تھا۔ جاتی سردیاں تھیں پھر بھی دھوپ بدن کو مزہ دیتی تھی۔ مریم میرے پاس تیاہی پر کبھی پھیل کر۔ ان کی پھانک پھانک علیحدہ کر کے۔ کالا منگ چھڑک کر رکھ گئی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ میں جیسے کاچور ہوں۔ اس لیے ہمیشہ میرے لیے وہ ایسا ہی اہتمام کرتی تھی۔

میں پھانک پھانک منہ میں دھرتا لالی اور آفاق کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اگر لالی آفاق کا رشتہ لے کر نہیں آتا تو میرا اگلا لمحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ مریم مجھے بے حد عزت دیتی تھی اور گری بڑی ہرگز نہیں تھی کہ بار بار منہ سے کہہ کر میں اس کی قدر گھٹاتا۔ لالی کا دماغ ”کھوتا“ تھا۔ ایک دفعہ اڑ جاتا تو اڑ جاتا تھا، وہ پھوپھی ثریا سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ میرے بتانے کے باوجود کہ مریم ان کی نواسی ہے۔ اس کے بھیجے سے یہ حسب نسب کا کیرا نہیں نکلا تھا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اباجی اور بے بے کے گزر جانے کے بعد پھوپھی ثریا کبھی بیٹھ نہیں آئی تھی۔ اس لیے لالی، مریم کے وجود سے یکسر بے خبر تھا۔ وہ تو مجھ سے فوزیہ کے نکاح کی بھی تفصیل پوچھتا رہتا تھا۔ اب وہ میں نمانا بھلا کہ ہر سے فراہم کرتا! میں ان ہی سوچوں میں غرق تھا اور کنوؤں کی ساری پھانکس میرے حلق میں غرق ہو چکی تھیں، جیب ذکیہ کی چغیں مارتی آواز میرے کانوں سے نکل آئی تھی۔

”خدا ہو گئی کر لے۔“ وہ مریم سے مخاطب تھی۔

”سارا دودھ ابلان دتا۔ سویرے سویرے بے برکتی پا دتی۔ شالا تیرا دھیان کس مکان میں جاوڑتا ہے۔۔۔ آج شامی تیرے دونوں بھرا اپڑینے (پہننے) والے ہیں۔۔۔ ان کے لیے فرنی چڑھانی تھی۔۔۔ اب دودھ کون دے گا۔ تیرا چاچا۔۔۔؟“

”استغفر اللہ۔۔۔!“ میں نے سٹیٹا کے باورچی خانے کی سمت گھورا اور گلا کھنکار کر لکڑا لگائی۔

”اومائی۔۔۔! کج ہوش سمجھ سے بولا کہ۔۔۔ بند عقل کی شوہری عورت نہ ہو دے تے۔۔۔ لا دیتا ہوں تجھے میں منرے کی ہٹی سے تازہ دودھ۔۔۔ خبردار جو میری دھی کو کج بولا تو۔۔۔ تیرے پیو کے گھر سے نہیں آتا راشن پالی۔۔۔ جو اتنا سینہ پیٹ رہی ہے۔۔۔ ذکیہ آئی لائے (طعن) دینے والی۔۔۔!“

میں نے جھینپ مٹانے کے لیے ذکیہ کی تگڑی خبر لے لے چھوڑی تھی۔ لے سو! جب کرے گی یاغلوں والی ہی بات کرے گی۔۔۔ ویسے بھی مریم پتر کو کوئی کچھ کہے مجھے ہرگز اچھا نہیں لگتا تھا۔

ذکیہ آستینیں چڑھاتی باورچی خانے کا جالی والا دروازہ کھولتی باہر صحن میں نکل آئی۔۔۔ میں ابھی ”یا اللہ خیر!“ کہہ کر سیدھا ہو کر بیٹھا ہی تھا جب حویلی کے بڑے سے دروازے سے لالی اور زینہ اندر داخل ہوئے۔ پیچھے نوکرے اٹھائے نوکروں کی فوج بھی تھی۔

”لے بھئی۔۔۔ سن گیا بندے کا پتر۔۔۔!“ میں نے جی ہی جی میں لالی کے لیے یہ جملہ بولا تھا اور بظاہر حیران ہوتا چارپائی سے نیچے اتر آیا۔ اور جوش سے قریب جا کر جھپھی شہی ڈالی۔ زینو کے سلام کا جواب دیا جو ہر دوسرے دن کی ملاقاتی، میری بیوی سے ایسے گلے مل رہی تھی جیسے یہ تب ملتی ہیں جب ان کے پیکوں (سیکوں) میں کوئی مرگ ہو جاتی ہے۔

”خیر ہے لالے۔۔۔! آج دن دے ساڑے ای چن چڑھ آیا ہے۔۔۔ اور ساتھ میں یہ اتنے ڈھیر سارے تارے کس کھاتے میں اٹھا لیا ہے۔۔۔“ میرا اشارہ مٹھائی کے نوکروں کی طرف تھا جنہیں ملازموں نے برتنوں میں ڈھیر کیا تھا۔

”چل چل... زیادہ ٹیس ٹیس میں نہ کر۔ بیٹھک میں چل۔ میں محول کرنے نہیں آیا۔“ لالی چڑ کر بولا تھا۔
یعنی چلی رسی کے بل تھے یہ۔ میں نے بھی جھٹ تیریاں چڑھائیں اور بھاری آواز میں مخاطب ہوا۔

کی فطرت میں کلبلا تا تھا۔ اور فطرت کے ساتھ سمجھو تا کیا جاتا ہے۔ ڈھالا نہیں جاتا۔! میں نے دو دن رسا ”سوپنے کے لیے تھے۔ جس پر لالی نے طنزیہ مجھے گھورا تھا اور میں جواباً ”اس کی ران پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔“

”اوسے اولالے۔! سیاپے کا آیا ہے تو اوسرے ہی واپس مڑ جا۔ اور اپنے یہ تارے بھی اٹھا کر لے جا۔ پھر جو چن میں چڑھاؤں گا ناں۔ تو اس کی روشنائی میں تیری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ سمجھا۔ وڈا آیا مجھے اکڑ دکھانے والا۔ اونہہ!“

”اویار لالے۔! میرے دونوں پتر شام تک شہر سے پہنچ جائیں گے، مریم کو اپنی بہن مانتے ہیں۔ ان سے بھی رسمی مشورہ تو کرنا ہوتا ہے ناں۔ ویسے فکر نہ کر مریم تیری ہی نون ہے۔ میں بھلا تجھے نا کر سکتا ہوں۔ میں نے کھوپڑی کھلوانی ہے اپنی کیا۔؟“

میں طیش میں منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تھا۔ لالی کو مجھ سے اس رویے کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے زبوں کے شو کا دینے پر جھٹ سے میرا رخ اپنی طرف کیا اور میرے گلے لگ گیا۔

میں زوردار تہقہہ مارتا۔ بوندی کے لڈو سے اس کا منہ میٹھا کروانے لگا اور وہ بس بے بسی سے مجھے دیکھ کر رہ گیا کہ آخر یہ سب کروانے والا بھی میں ہی تھا وہ بھی سنگی تاؤں دے کر۔ (گلے پر ناخن دھر کر۔)!

”تو میرے ساتھ جتنا مرضی محول کر لے۔ میں نے کیا نہیں اور تیرا بوتھا ج کے کیا بنا نہیں۔ ماڑا موٹا مذاق چھی سمجھ جایا کر کبھی۔“ لالی میرے تیر دیکھ کر یقیناً ”کو کھلایا تھا۔ زبوں نے بھی اسے گھوری ڈالی تھی۔ میں نے بات کو طول دینا مناسب نہیں جانا۔ لالی کے طبق روشن کرنے کے لیے میرے اتنے ہی ”ٹشٹن“ بہت تھے۔

آفاق اور مریم کی بات کیا پکی ہوئی۔ پورا گاؤں ہی مبارک باد دینے لگا آیا تھا۔ سارا دن میرا بیٹھک میں اور ذکیہ کا صحن میں عورتوں کے درمیان گزر جاتا تھا۔ لالی نے لنگر لگوا دیا تھا۔ حالانکہ شادی کی جو تاریخ طے ہوئی تھی۔ اسن خراب سے ابھی ڈیڑھ ماہ بڑا تھا مگر وہ لالی تھا اور لالی سدا سنی شوخ تھا! آفاق کی خوشی اس کے چہرے سے بھونکی رہی تھی۔ میرے پاس اکیلے میں معافی مانگنے بھی آیا تھا۔ میں محض کندھا تھک کر رہ گیا تھا۔ اب اسے کیا بتانا کہ اس سارے کے پیچھے اصل قصہ کیا ہے۔؟

کچھ ہی دیر میں ہم سب بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ ذکیہ بھی دونوں سیال بیوی کے آنے کی وجہ بھانپ گئی تھی اسی لیے رکوئی میں بلا زماؤں کی روز لگوا دی تھی۔ مریم کو بھی ذرا منہ چکا کر تیار ہو کر بیٹھے رہنے کو کہہ آئی۔ اس کے بعد چائے پانی آنے تک لالی اور زبوں آفاق کے لیے مریم کا رشتہ ڈال چکے تھے۔ زبوں تو بے حد خوش لگ رہی تھی۔ بظاہر لالی بھی خوشگوار موڈ میں تھا مگر میں اس کا یار تھا۔ بچپن کا بلی! مجھے اس سے زیادہ علم تھا کہ اس کی کون سی رک کب اور کس بات پر پھڑکتی ہے۔ وہ اندر سے جھا ہوا تھا۔ مگر مجھے پرواہ نہیں تھی۔ مریم بیاہ کر چلی جاتی تو اس بچی میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ اپنی خدمت اور اطاعت گزار ہی سے وہ سب کے دلوں میں گہر کر سکتی تھی۔ لالی کو بدلا نہیں جاسکتا تھا کیونکہ حسب نسب کا کیرا اس

عبداللہ اور اسفند بھی بے حد مطمئن تھے۔ آفاق سے دوستی کی بنا پر وہ اسے لازمی ترجیح دیتے مگر مریم کو بھی وہ چھوٹی بہن مانتے تھے۔ اس لیے وہ ہر طرح سے تسلی میں تھے۔ آج کل دھڑا دھڑ مریم کے لیے شاپنگ کر کر کے سامان شہر سے بھجوا رہے تھے جس میں زیادہ تر کراکری اور الیکٹرانکس کا سامان تھا کیونکہ ”چیٹوٹے“ والی ذکیہ کو بلینڈڈ گرائنڈر کا کچھ نہیں پتا تھا۔

باقی کپڑے لیتے رہے۔ ایسے میری دونوں بیٹیاں عنقریب پہنچنے والی تھیں۔ اس کے بعد کپڑے زیور کی بھی فکر ختم ہو جاتی۔۔۔ دونوں مریم کے وجود سے باخبر تھیں اور کسی طرح کا کوئی اعتراض مجھے ان کی طرف سے بھی سننے کو نہیں ملا تھا۔ بلکہ اب تو موبائل پر مریم کے ساتھ اچھی گپ شپ تھی ان کی۔

جو بیڑہ میں نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا تھا۔ وہ کنارے لگنے والا تھا۔۔۔ یہ کوئی تین مہینے کی بات تھوڑی تھی۔۔۔ مریم صرف تین مہینے پہلے ہی تو میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔۔۔ مریم تو اپنی پیدائش سے پہلے سے میرے ساتھ تھی۔۔۔ کب کیسے؟ بتاؤں کیا؟

”اے جی ملک صاحب۔۔۔! ذرا باہر آؤ جی۔۔۔ نال والے چودھری صاحب کی گڈی آئی ہے۔۔۔ پھانک پر کھڑے ہیں۔۔۔ آپ جا کے دیکھو ذرا۔۔۔“

”کیہ کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا تھا۔۔۔ یہ ذکیہ بھی نال سے جوں جوں بڑھی جاتی جا رہی ہے جان زیادہ کھانے لگی ہے۔۔۔ ہے ویسے سادی۔۔۔ کتنا بڑا ہاتھ کیا ہے اس کے ہاتھ۔۔۔ کبھی عقل کا گھوڑا دوڑا کر میری گرد پانے کی کوشش نہیں کی اس نے۔۔۔! چنگی رہتی ہیں ایسی بیویاں۔۔۔!“

پھر ملتا ہوں، آپ سے ذرا۔۔۔ چودھری صاحب کو بھگتا لوں۔ ذرا میرا قصہ طویل ہے۔۔۔ فرصت سے سنا تا ہوں۔



جس دن سے بات پکی ہوئی تھی۔۔۔ آفاق آنے بہانے۔۔۔ حویلی کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔۔۔ ویسے تو مریم پروے میں جا بیٹھی تھی مگر ایک آدھ دن چھوڑ کر وہ آجی کے گھر جاتی تھی۔۔۔ آجی امام مسجد کی بیگم تھیں اور پھوپھی ثریا کی میری بہن بھی تھیں۔۔۔ رشتہ واری کا علم ہونے پر فطری طور پر مریم کے دل میں ان کے لیے انیسیت اور لچک پیدا ہونا کوئی ایسی اجنبی بات نہیں تھی۔۔۔ اس لیے ان سے گائے بگائے ملتی

تھی۔۔۔ آفاق ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھا۔۔۔ اس دن سہ پہر کے بعد مزیم بڑی سی چادر۔۔۔ اوڑھے حویلی کے پیچھے پھانک سے نکلی تھی۔۔۔ اس جانب سے آجاتی کا گھریا نکل تاک کی سیدھ میں تھا۔۔۔ راستے میں ٹیوب ویل کے قریب سے گزرتے ہوئے یکدم کسی نے برگد کے پرانے درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کی کلائی تھامی تھی۔۔۔ مریم کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ بائیں ہاتھ میں تھاما اچار کا ڈول کھینچ مار گئی۔۔۔ آفاق کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ہم گئی۔۔۔

”کیسی ہو۔۔۔!“ ”زم لہجے میں پوچھا۔

”اچھی ہوں۔۔۔!“ ”ادھر بھی لہجے ملائی تھا۔

”جاننا ہوں۔۔۔“ ”بھی تو اتنا کشت کیا ہے۔۔۔“

”کس نے کہا تھا اتنے کشت اٹھانے کو۔۔۔“

”دل آوارہ ہو گیا تھا بس۔۔۔“

”دل تو آوارہ ہی ہوتا ہے۔۔۔“ ”کیل ڈالنی پڑتی ہے۔“

”اب تم ڈال دیتا ناں۔۔۔“

”مجھے اور کوئی کام نہیں بھلا۔۔۔ آفاق بھائی!“ ”جملے کے آخر میں شرارت ہی شرارت تھی۔۔۔ آفاق کی تیوریاں چڑھ ہی گئیں۔

”اب مجھے بھائی کس خوشی میں کہتی ہو۔۔۔ گھر میں دویلے پلائے بھائی مل گئے ہیں۔۔۔ کالی نہیں ہیں کیا؟“

”بس جی کرتا ہے کہ میرے ڈھیر سارے بھائی ہوں۔“

”نچلا ہونٹ دانٹوں میں دبا کر شہر لہجے میں کہا۔

”مگر میرا جی ہرگز نہیں کرتا کہ میری ڈھیر ساری بہنیں ہوں کیونکہ مجھے پہلے ہی کمی نہیں ہے۔۔۔!“

”چلیں۔۔۔ چلیں سامنے سے ہٹیں اب۔۔۔ مجھے واپس حویلی جلدی آتا ہے، شام کو آپ کی والدہ تشریف لارہی ہیں۔۔۔“

”میری والدہ تمہاری کیا لگیں۔۔۔؟“

”وہی جو میری والدہ آپ کی لگیں۔۔۔!“

”اور وہ بھلا میری کیا لگیں۔۔۔؟“

”وہی جو آپ کی والدہ میری لگیں ہیں۔“
 ”تم تو خاصی چالاک ہو۔ میں مفت میں بھولی بھالی سمجھتا تھا۔!“

”مفت کا جسے بھی جائیں گے وہ توقع کے برعکس ہی نکلے گا۔ اب ذرا پیچھے نظر کیجئے۔ آپ کے والد گرامی تشریف لا رہے ہیں۔“ آفاق ایک جھٹکے سے پلٹا تھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ واپس مریم کی طرف چہرہ کیا تو وہ آیا جی کے گھر کی طرف چل دی تھی۔ اس کی لقمی ہنسی کی آواز آفاق کو اندر پاہر سے شاد کر گئی۔ چند قدم مزید چل کر وہ ایک لمحے کو رکی۔ پلٹی۔ اور بولی۔

”میری راہ دیکھنے کے بجائے فی الحال گھر کی راہ لیجئے، میری راہ میں پلکیں بچھانے کے لیے تو ساری عمر چھینے کی کیا سمجھے؟ آفاق بھائی۔!“

وہ ایک دفعہ پھر شرارت سے آفاق کی دکھتی رگ دباتی پلٹ گئی تھی۔ اور آفاق حیرت سے دیکھتا اور سوچتا رہ گیا تھا۔ اس نے کبھی بھی مریم کو ایسا بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ کجا کہ شرارت کرتے۔ ایسے جاتے جاتے بھی اسے چھیڑ گئی تھی۔

”بالکل اپنے سر پر پڑی ہے۔!“ وہ پتھر کو ٹھوک مارتا، بائیں ہاتھ سے خوب صورت گھنی مونچھ کو بل دیتا، مسکراتی نظروں سے آگے تب تک دیکھتا رہتا تھا جب تک وہ اس کی نگاہوں سے او جھل نہیں ہو گئی۔



وقت بڑے بڑے رنگ دکھاتا ہے۔ چت کو پٹ اور پٹ کو چت ہوتے دیر نہیں لگتی۔ انہونی کو ہونی کرنے میں وقت کو کمال مہارت حاصل ہے۔ کبھی کبھی زندگی ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں آگے کھائی ہوتی ہے اور اس سے چند قدم مزید آگے کنواں۔! پیچھے کچھ بھی نہیں! پھر بھی ہم پیچھے جانے کے بجائے کھائی میں کود پڑتے ہیں۔ اس سے نکل آئیں تو کنوئیں میں جا پڑتے ہیں اور ساری عمر اس میں سے باہر آنے کی تک و دو میں گزار دیتے ہیں اور پھر

تھک ہار کر ناسی میں پڑے رہتے ہیں۔! ہمیں اس آفت سے انسیت ہو جاتی ہے۔ مشکل من کو راحت دیتی ہے۔ تو تن آسان ہو جاتا ہے۔!

آج سے اٹھارہ سال پہلے مجھے بھی زندگی نے ایسے ہی مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ جب جائے توجہتے میں نے بھی بھڑکتے الاؤ میں چھلانگ لگائی تھی یہ دل چیز ہی بڑی خبیث ہے۔!

ان دنوں سردیاں عروج پر تھیں۔ سارا سارا دن زمینوں پر گزر جاتا تھا۔ ایک پرسکون اور خوشحال زندگی تھی جو سبک خرازی سے بل بل بے جا رہی تھی۔ اور سے بھر پور جوانی کے دن۔ اٹھارہ سال کی عمر میں بیاہ کرنے کا نتیجہ تھا کہ محض اٹھارہ سال کی عمر میں ’میں نو سال کے بیٹے کا باپ تھا اور صرت سے پھوٹا بھی چار سال کا تھا۔ یہی حال لالی کا بھی تھا۔ ہم دونوں کی رگوں میں ابھی جوانی کی خساری خون بہن کر ڈوٹی تھی۔ خیر تو میں بتا رہا تھا کہ انہی مہکتے دنوں کا رگسین قصہ ہے میں زمینوں سے ابھی ابھی ڈیرے پر پہنچا تھا

جب موجود نے مجھے پھوپھی شریا کے فون کا بتایا۔ پھوپھی شریا کا فون اور وہ بھی ڈیرے کے نمبر پر۔ مجھے اچنبھا ہوا کیونکہ البتہ نہیں تھا کہ وہ فون نہیں کرتی تھیں مگر ہمیشہ حریفی کے نمبر پر ہی کیا۔ اکثر ذکیہ اور بے سے بات ہو جاتی تھی ان کی۔ آج اگر ڈیرے پر فون کیا تھا تو یقیناً ”مجھ ہی سے خاص کام ہو گا۔

یہ سوچ کر میں نے سکون سے پہلے کھانا کھایا جو دوپہر کو میں اکثر ڈیرے پر ہی کھا لیتا تھا۔ اس کے بعد میں نے پھوپھی کو کال ملانی۔ وہ تو جیسے انتظار میں تھی تھیں۔ میری سلام دعا بھی نہ سنی اور جو قصہ مجھے سنایا اس نے مجھے بھی بے حد پریشان کر دیا۔ ساری بات سن کر میں نے دو بول تسلی کے بولے اور جلد از جلد پہنچنے کا کہا۔ فون رکھ کر میں نے موجود کو کچھ بھی بتائے بغیر بس گھر اطلاع دینے کو کہا کہ میں کچھ دن کے لیے شہر جا رہا ہوں ضروری کام سے۔ آتے ہوئے موجود کو دیکھوڑے بھی لایے گا۔ وہ پر سوچ نظروں سے مجھے

سلب ہو گئی۔ فوزیہ کو دیکھ کر میں چاروں شانے چت ہوا تھا۔۔۔

ذکیہ ایسا ابا کی پسند تھی۔۔۔ خوب صورت تھی۔۔۔ وفا شعار تھی، میرے بچوں کی ماں تھی۔۔۔! اگر فوزیہ کو دیکھ کر جیسے چند بل کو میرے حواس چھین سے گئے۔۔۔ وہ کل کی بچی ایک مکمل اور خوب صورت دوشیزہ کے روپ میں میزے سامنے بھی جس کا حسن ملال کا رنگ لیے مزید تابناک دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ میرے گمان نے بھی فوزیہ کے ایسے رنگ و روپ کا گمان نہیں کیا تھا۔۔۔ اس کے حسن میں بانگین تھا۔۔۔ اک ادا تھی اور میرا دل گھائل تھا۔۔۔ صرف ایک صدا تھی کہ اس چہرے پر زندگی ندا تھی۔۔۔!

کہاں کا سمجھانا۔۔۔ کیا سمجھانا۔۔۔ میری اپنی سمجھ بوجھ فوزیہ کے قدموں میں لوثنیاں لگا رہی تھی اور پھر دل تو سب ہی کا ”تھوڑا بوتا“ کہینہ ضرور ہوتا ہے۔۔۔ میزا بھی تھا سو میرے دل نے کیلینہ پن دکھائے ہوئے پھوپھی شریا کو اوکے کا سگنل دے دیا اور شام کو مغرب کی اذان کے بعد فوزیہ کا نکاح میرے ساتھ پڑھوایا گیا۔

نکاح سے پہلے کافی دیر فوزیہ کے کمرے سے پھوپھی شریا اور فوزیہ کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں جن میں پھوپھی کی آواز جاڑی تھی۔۔۔ ایک آدھ کراری سی ”چھوڑیں“ تو بھی سنائی دیں جو بلاشبہ پھوپھی نے فوزیہ کو دھری تھیں، میرے دل کو کچھ ہوا مگر پھر دل کی خاطر ہی دل کو ڈپٹ لیا۔۔۔

یوں اس شام میری زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی تھی جس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی اور میں پورے دو ہفتے پھوپھی شریا کے گھر گزار کے واپس گاؤں چلا آیا۔۔۔ واپسی پر میرے انگ انگ میں سرشاری اور مستی ہلکورے لیتی تھی۔۔۔ لب بات بے بات مسکراتے تھے۔۔۔ اسی شوخی میں ذکیہ کو بھی دو چٹکیاں بازو پر بھر دیں تو وہ دیدے پھاڑ کر ”توبہ استغفار“ کرنی سامنے سے ہٹ گئی۔

یہ سب اس محبت کا اعجاز تھا جو مجھے ایک دم اور

انتہائی شدت کے ساتھ فوزیہ سے ہوئی تھی۔۔۔ گو کہ اس کا رویہ ہرگز بھی حوصلہ بخش نہیں تھا مگر مجھے پروا نہیں تھی۔۔۔ ان دو ہفتوں میں اس نے میری کسی بھی بات کا پاں یا نا سے زیادہ جواب نہیں دیا تھا مگر مجھے پروا نہیں تھی۔۔۔! میرے لیے یہ ہی بہت تھا کہ جس عورت کو دیکھ کر مجھے پہلی نگاہ میں محبت ہوئی۔۔۔ قدرت نے اسے میری بیوی بنا دیا تھا۔۔۔

میں حویلی لوٹ تو آیا تھا مگر میرا دھیان مستقل فوزیہ میں اڑکا تھا۔۔۔ موجود نے بھی میری بدلتی حالت کو محسوس ضرور کیا مگر ایک بار کے بعد پھر دوبارہ نہیں پوچھا۔۔۔ مزاج تھا کہ خوش ہوا جاتا تھا۔۔۔! چند دن بعد ہی میں نے دوبارہ شہر کا رخ کیا۔۔۔ گو کہ پھوپھی شریا سے ٹیلی فون کے ذریعے مسلسل رابطہ تھا مگر دل تھا کہ ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔۔۔ فوزیہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دل ہمکتا تھا سو میں کچھ دن بعد ہی وریا پر پڑا تھا۔

فوزیہ، فوزیہ کی ہی سپاٹ سی تھی۔۔۔ میرے لائے ہوئے بے حد تھی۔۔۔ کفنوں کو جو میں بے حد محبت سے لایا تھا۔۔۔ ان پر ایک سے دو سری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔۔۔ مگر میں پھر بھی خوش تھا کیوں کہ وہ میرے سامنے تھی۔۔۔ دیدار یاز سے بڑی لذت نہ کوئی دیکھی نہ چکھی۔۔۔

میں ایک ہفتہ گزار کر واپس روانہ ہوا تھا اور یہ ایک ہفتہ بے حد مصروف گزارا۔۔۔ فوزیہ کے چاچے اور چاچے کے پتر سے بھی نبٹ لیا۔۔۔ شہر کے ایک دو واقف کاروں سے کہہ کر ”تریاں“ لگوا میں اور دو چار ہاتھ لگوائے تو سکون سے بیٹھ گئے۔۔۔ اس کے علاوہ فوزیہ کو بھی کئی جگہوں پر لے لے کر گھوما۔۔۔

اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔۔۔ ہر دو سرے ہفتے میری گاڑی شہر کا رخ کرتی تھی۔۔۔ موجود ٹھنک گیا کیوں کہ وہ موجود تھا مگر میں نے اس دفعہ اس کے ہاتھ گرو کا ذرہ بھی نہ آنے دیا۔۔۔!

اور پھر جس دن مجھے پھوپھی شریا نے فون کر کے بتایا کہ فوزیہ کی طبیعت خراب ہے۔۔۔ ڈاکٹر آئی تھی اور خوش خبری سنائی ہے۔۔۔ میری حالت ایسی تھی جیسے

ایسا کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا زاوہ تھا کہ بچے کی پیدائش کے بعد سب سے پہلے بے بے کو بتاؤں گا اور پھر ان ہی کو ذکیر کو بتانے کے لیے کہوں گا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آسکی!

فوزیہ کا وقت قریب تھا اور میں ابھی چند دن پہلے ہی اس سے مل کر آیا تھا۔ تب سے لے کر اب تک اس کا چہرہ میری نگاہوں سے ہٹتا نہیں تھا۔ بے حد لاغر اور بیمار۔ مدقوق چہرہ!

پھوپھی ثریا بے بس بیٹھی تھی اور میں شاید اس سے بھی زیادہ بے بس تھا۔ ڈاکٹر کے بقول ماں کی حالت ہرگز تسلی بخش نہیں تھی۔ بچہ بھی بے حد کمزور تھا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے اختیار میں ہوتا تو اپنے جسم کی تمام توانائی فوزیہ کو دانا کر دیتا مگر وہ واقعی میں برف کا جھمبہ تھی جسے ہرگز ہرگز بھی کوئی فرق کرے سے پڑتا ہی نہیں تھا۔ بھلے سے میں اپنی کھال کی جوتیاں بنا کر اس کے قدموں تلے رکھ دیتا۔ میں بے حد دل گرفتہ سا واپس آیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس سے منت کی تھی کہ اپنا خیال رکھے اس مرحلے سے بحیرت نکل آئے تو میں اس کے مستقبل کا فیصلہ اس کی مرضی کے مطابق کروں گا۔!

تب سے اب تک میری طبیعت بو جھل اور مزاج میں تناؤ تھا۔ نشانہ موجود تھا اور موجود تھا کہ میرے آگے پیچھے لوٹنیاں لگا رہتا تھا۔ جو بن پڑتا مجھے خوش کرنے کے لیے کرتا۔ ہانپاں سنائے چلا جاتا، کلام گائے چلا جاتا مگر میرے بے چین دل کو قرار نہ آیا۔!

اور پھر ایک رات بڑی شدید بارش تھی۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی دل میں طرح طرح کے وسوسے جڑ پکڑ کر بیٹھے تھے۔ اس رات میں ڈیرے پر ہی ٹھہر گیا تھا۔

آدھی رات کے بعد پھوپھی ثریا کا فون آیا تو میرے دل کو سنبھلے لگ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ پھوپھی مجھے فوراً شہر پہنچنے کو کہہ رہی تھی۔ فوزیہ کی حالت خراب تھی اور بارش کا وہاں بھی بے حد زور تھا۔ میں نے پھوپھی کو کسی بھی طرح فوزیہ کو

میں پہلی دفعہ باپ بنے جا رہا ہوں۔ خوشی چھپانے نہ چھپتی تھی اور اگلی شام میں دنیا جہان کی نعمتیں لے کر فوزیہ کے پاس تھا۔

اس کے ناز نخرے اٹھا اٹھا کر میرا جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ وہ جتنا بیٹھتی تھی میرا دل اتنا ہی اس کی طرف ہمکتا تھا۔ اب اس حالت میں تو وہ مزید نازک مزاج ہو گئی تھی۔ پہلے جو ہوں ہاں میں جواب آتا تھا اب وہ بھی نڈاریا اور پہلی دفعہ مجھے تشویش نے گھیرا تھا۔ ڈاکٹر کہتی تھی مریضہ بہت کمزور ہے، خون کی کمی ہے۔ بلڈ پریشر بھی نارمل نہیں۔ خوش رکھیں!

اور میں ہزار جتن کر کے بھی فوزیہ کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں لایا رہا تھا۔ اس طرح میرے بچے کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ نہ کچھ کھانا نہ کچھ پینا۔ بس بے زار سی پڑی رہتی تھی۔ پھوپھی ثریا سے میرے سامنے ہی خوب لتاڑتی تھی مگر وہ یونہی ٹھنسی ہی رہتی۔

کم سن میں ہوئی شادی نے کہیں دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دی تھی اور اس سے پہلے دو سال جو میرے شہر میں برصالی کی غزل سے گزرنے ان دو سالوں میں ابھی اتنی تنگ ہی نہیں تھی کہ ادھر ادھر تاک جھانک کی جاتی تو دل اب توجہ کا طلب گار تھا مگر فوزیہ بے جان چینی کی مورت سے بڑھ کر کچھ نہیں تھی۔ اسی لیے اس دفعہ واپسی پر میں تہہ کر کے آیا تھا کہ اب مجھے فوزیہ سے طلب کا رشتہ نہیں رکھنا۔ میرے پاس اس کے لیے دل میں پیار کا دیا بہتا تھا سو کیا تھا جو اسے سیراب کیے جاتا۔!



ایسا کرنے کے باوجود بھی مجھے فائدہ نہیں ہوا تھا اور میری ڈھیروں محبت کے باوجود فوزیہ دیمک لگی لکڑی کی طرح کھوکھلی ہوتی چلی گئی۔ میری مجبوری یہ تھی کہ اس شخص مرحلے پر میں ہر وقت فوزیہ کے پاس نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے واپس گاؤں جانا ہی پڑتا تھا کیونکہ میری ذرا ہی کوتاہی سب کو چوکنہ کر سکتی تھی اور میں ہی الوقت

لے کر ہسپتال پہنچنے کا کتنا گروہ خود خاصی ہر اسٹاپ ہتھیں
ایک تو اس وقت پاس کوئی مرد نہیں تھا اور دوسرے
سواری کے لیے بھی محلے والوں میں سے کسی کو کنا پڑنا
تھا۔!

میں جیسے تیسے گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا۔۔۔ موجود کو
اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس وقت
میں جس قدر حواس باختہ تھا۔۔۔ کچھ بعید نہ تھا کہ اس
کے آگے اپنا ہی راز اگل رہتا۔!

شدید بارش کے وجہ سے جو سفر میرا ڈیڑھ گھنٹے میں
طے ہونا تھا وہ ساڑھے تین گھنٹے میں ہوا۔۔۔ پرستی بارش
میں میں سب سے پہلے پھوپھی ثریا ہی کے گھر پہنچا تھا
جہاں ثروت نامی عورت جو پھوپھی ثریا کے ہاں اس کی
بیوی کے وقت سے مستقل ساتھ تھی۔۔۔ وہ میرے
لیے ہی گھر پر ٹھہری ہوئی تھی اس نے مجھے ہسپتال کا پتا
دیا اور خود بھی تالا ڈال کر میرے ساتھ ہونے لگی۔۔۔ مجھے
کچھ خبر نہیں کہ میں کس طرح سے ہسپتال پہنچ پایا تھا۔
زندگی میں پہلی دفعہ میں نے خود کو کسی رعشہ زدہ
مریض کی طرح کا پتے محسوس کیا۔۔۔ مجھے یقین ہو گیا
جیسے اس مرض کا میں مستقل مریض ہو جاؤں گا۔

زچہ بچہ کے گروڈ اور میں پھوپھی ثریا آنسو بہاتی
دیوار سے ٹیک لگائے گھڑی آئی۔۔۔ میں بھاری قدموں
سے اس تک پہنچا تھا۔۔۔ وہ مجھے دیکھ کر پھینک پھینک کر رو
دی۔۔۔ میرا دل ٹکڑ کر پھیلا تھا۔۔۔ اس قدر رونا کسی
انسوئی کا پتا دیتا تھا۔۔۔ میرے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے
ایک نرس تیز قدموں سے چلتی آئی اور تنہی سی گلابی
رنگ کی نوٹلی پھوپھی کے ہاتھ میں تھما کر مزید عجلت
دکھاتی اندر گم ہو گئی۔۔۔ یعنی کہ میری اور فوزیہ کی اولاد
دنیا میں آچکی تھی۔۔۔ یقیناً ”پھوپھی ثریا کو خبر ہوگی اور
اب نرس بچے کو صاف ستھرا کر کے ہمیں تھما گئی تھی
۔۔۔ میں نے اسے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی
کیونکہ اس وقت مجھے فوزیہ کی فکر تھی۔۔۔ صرف اس
کی لگن تھی۔

اس سے پہلے کہ میں ایک بار پھر پھوپھی ثریا سے
کچھ پوچھتا۔۔۔ کسیر روم کا دروازہ کھلا اور ایک درمیانی عمر

کی عورت پر مشرہ سی باہر آئی۔۔۔ اس کے ہمارے قریب
آ کر رکنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔۔۔ اس کے
چہرے کے تاثرات ہرگز حوصلہ افزا نہیں تھے۔ میرا
دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔۔۔ میں نے آنکھیں میچ کر
بے ساختہ فوزیہ کی سلامتی کی دنیا کی تھی۔۔۔ مگر

”مریضہ کی حالت بہت خراب تھی۔۔۔ میں نے
آپ سے کہا تھا کہ اس میں خون کی پہلے ہی بے حد کمی
ہے۔۔۔ عین وقت پر حالت بگڑ سکتی ہے وہی ہوا۔۔۔ ہم
بڑی مشکل سے بچے کو بچایا ہے۔۔۔ آخری سانسیں
ہیں۔۔۔ آپ چاہیں تو ایک نظر دیکھ لیں۔۔۔“

کوئی قیامت سی تھی جو اس ڈاکٹر نے ہم پر ڈھالی۔۔۔
پھوپھی ثریا کے حلق سے رو رو کر چیخ نکلی۔۔۔ ثروت
نے لیک کر وہ پوٹلی تھامی جو مستقل دستہ سائے جا
رہی تھی اور میرا مفلون ذہن ابھی تک اس حقیقت کو
قبول کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو وہ ڈاکٹر اگل کر چلی گئی
تھی۔۔۔ بے گے جان قدموں سے میں نے کسیر روم کا
دربخ کیا جہاں فوزیہ سر سفید بستر پر نیم ڈال آنکھوں سے
اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔۔۔ اسے آکسیجن
ماسک لگایا گیا تھا۔

برف کا مجسمہ قطرہ قطرہ پھیل کر ساکن ہوتا جا رہا تھا۔
اس کی ساری رعنائی جیسے بھاپ کی صورت تحلیل
ہو چکی تھی اور چند بل جاتے تھے کہ اس کا وجود بھی اسی
دھو میں کا حصہ بن جاتا۔

میں نے دکھ کی انتہا پر پہنچتے ہوئے اس کا ٹھنڈا اور
نیم مرده ہاتھ تھاما تو چند ثانیے بعد آنسوؤں کی ایک لمبی
اور باریک سی لکیر اس کی بائیں آنکھ سے نکل کر کنپٹی
سے ہوئی اس کے سنہرے بالوں میں جذب ہو گئی۔
اس نے مجھے محسوس کیا تھا۔۔۔ وہ میرا نس پہچان گئی
تھی۔۔۔ اس سوچ نے میری آنکھوں کے بھرے پیمانے
چھلکا دیے اور میں گھٹ گھٹ کر رو دیا۔۔۔ میرے گرم
آنسو اس کے رخ ہاتھ پر گرے تو ایک ذرا سی حرکت
سے اس کی نازک کملانی انگلیوں نے میرے مضبوط
ہاتھ کو دبا لیا تھا۔

میں نے بے بسی سے بے ساختہ دیوانہ وار اس کے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی میسرائل

SOHNI HAIR OIL

- ✽ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✽ نئے بال آگاتا ہے۔
- ✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ✽ سردیوں اور گرمیوں کے لے
- ✽ یکساں بناتا ہے۔
- ✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 150 روپے

ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنی گیلی آنکھوں سے لگایا۔ صرف چند پل اور پھر اس کے ہاتھ کی رہی سہی حرارت بھی میری انگلیوں کی پوروں میں جذب ہو گئی۔ ایک نجیف سی ہنکی میری سماعت میں اتری اور مجھے لگا کہ میری روح ہمیشہ کے لیے بہری ہو گئی۔!



دھولگی کی زوردار تھاپ پر میرے خیالوں کا سلسلہ منتشر ہوا تھا۔ یاد ماضی بھی اون سے بنے سوئیٹر کی طرح ہے۔ بس ایک سر ہاتھ میں لو اور ادھیڑتے چلے جاؤ۔ ہاتھ رکتا نہیں!

آج مریم کی بالوں ہے۔ مریم میری اور فوزیہ کی بیٹی۔! میری اولین محبت کی نشانی۔! وہی محبت جو آج بھی پیرے دل میں ویسے ہی ڈیرہ جمائے ہوئے تھی جیسی اول روز۔!

اس رات فوزیہ بیٹی کو جنم دے کر ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ آج بھی میری انگلیوں کی پوروں پر اس کے ہاتھ کی ٹھنڈک ٹھہری ہوئی ہے آج بھی اس کی ہنستی نگاہوں کے لیے کی آخری ٹٹماہٹ میرے تصور میں تازہ ہے۔

اور مریم مجھ کی اوہ بد نصیب بیٹی جسے میں آج تک اپنا نہیں سکا۔ حالانکہ وہ میری رازدواں ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں اس کا باپ ہوں مگر اس کا ظرف اتنا بڑا ہے کہ اس عمر میں مجھے کسی قسم کی خواری سے بچانے کے لیے اس نے مجھ سے اپنے رشتے کی اصل چھپالی تھی۔ میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے حویلی آنے سے پہلے اس نے بڑے رساں سے مجھے ایک بات کہی تھی۔

”ابو۔! میں نے چھوٹی سی عمر سے زندگی کو الگ ڈھب میں برتا ہے۔ وقت نے مجھے رشتوں کی نزاکتوں کا شعور بہت چھوٹی عمر سے دلا دیا۔ اسی لیے کہ نانی نے میری تربیت ہی ایسے ڈھنگ سے کی۔ ہر چند کہ میرے پاس باپ جیسی نعمت ہے مگر ماں کے نہ ہونے نے مجھے بھی بہت عرصہ قلق میں مبتلا رکھا۔ آپ کی محبت میں کئی ہرگز نہیں مگر آپ کی کمی میں نے

سوہنی میسرائل 127 بی بیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تعویذی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں کر سکتے ہیں، اگر آپ کسی دوسری شہر سے خریدنا چاہتے ہیں، ایک پتہ کی قیمت صرف 150 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لیے آرڈرنگ کر جہاز کی رقم سے نکالیں اور جہاز سے نکلنے والے کسی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 350 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 500 روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 1000 روپے

نوٹ: اس میں ایک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھجیے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیوٹی بکس ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

پھوپھی کے حوالے کیا۔ اس اللہ کی بندی نے پلٹ کر مجھ سے سوال تک نہ کیا۔ گو کہ میں مریم سے بے خبر کبھی نہیں رہا مگر ماہانہ خرچ بھیجنا اور مہینے دو مہینے بعد چکر لگانا خبر گیری بھی تو نہیں!

جب آفاق کا جھکاؤ مزیم کی جانب ہوا تو میں نے ضرورت سے زیادہ غیرت مندی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ آفاق بھی وہ بچہ تھا جس کا باپ اسے سگی اولاد ہونے کے باوجود اعلانیہ کہہ نہیں سکتا تھا اور مریم بھی وہ بچی تھی جو میری سگی بیٹی ہونے کے باوجود کھلوائے جانے سے قاصر تھی۔ اس لیے میں نے ایک داؤ کھیلا۔ لالی کے ساتھ!

اور میرا داؤ چل گیا۔ لالی لپیٹے رہیں آگیا۔ اس کی دکھتی رگ ساری عمر میں نے پکڑے رکھی تھی۔ اب آکر مجھے دبانی پڑ گئی۔ کیا کرتا؟ مریم کے لیے آفاق بہترین رشتہ تھا۔ میری بیٹی میری نظروں کے سامنے رہتی اور اچھی جگہ بیاہی جاتی۔ میرے لیے یہ نعمت تھی۔ اور لالی کا کلک کلک کو دماغ نہ الٹ جائے اور میری بیٹی کو طعنے مارنے پر آجاتا۔ اس کے بعد باب کے لیے میں نے پیشگی اسے آئینہ دکھا دیا تھا۔

کیا کریں گی۔ کبھی کبھار کسی کینے کے کینے پن کو تھوڑی سی کیننگی دکھا کر کین گاہ میں گھسیٹنا پڑتا ہے۔ یہ ہی دستور نیا ہے!

اللہ کے حکم سے میری مریم کا پلا بھاری رہے گا۔ یہ اور بات کہ وہ بے حد صلح جواد و خد مت گزار چکی ہے۔ اس کی فطرت میں عاجزی اور انکساری ہے!

آج کل میرے حواسوں پر فوزیہ بڑی شدت سے سوار ہے۔ باہر ہماری بیٹی کی مایوں بھی۔ لڑکیاں بالیاں خوب شور مچائے ہوئے تھیں۔ میں باڑے کے قریب مناسب طول و عرض پر مشتمل بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ یہاں پر عام طور پر موجو کے علاوہ کوئی نہیں آتا تھا۔

جب فوزیہ کی یاو کچھ زیادہ ہی بے کل کرتی تو میں یہاں آ بیٹھتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی دیوار گیر الساری ہے جس میں فوزیہ سے منسوب چند چیزیں میں

بہت سے موقعوں پر بہت زیادہ محسوس کی۔ لیکن نانی نے مجھے ہمیشہ سنبھالا دیا اور آپ کی مجبوریوں کو دل کی خلش بنانے کے بجائے۔ حقیقت پسندی سے قبول کرنے کا حوصلہ سدا کیا مجھ میں۔ اس لیے آج جب ہم باپ بیٹی ہمیشہ کے لیے قریب ہونے لگے ہیں تو میں سمجھتی ہوں قدرت ایک بار پھر میرے ظرف کا امتحان چاہتی ہے۔ آپ کی پریشانی مجھ سے او جھل نہیں مگر آپ کے پاس مجھے حوصلی لے جانے کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنے رشتے کی حقیقت کسی کو نہیں بتائیں گے۔ میں آپ کو چاچا جی کہہ کر بلاؤں گی۔ اس سے میرا اور آپ کا رشتہ بدل تو نہیں جائے گا۔ مگر باقی رشتوں میں دراز آنے سے بچ جائے گی۔ ویسے بھی مجھے اس دنیا میں لانے والی ہستی میرا منہ۔ دیکھے بغیر مر گئی۔ نانی اب گزر گئیں۔ تو جب آپ کے اس راز کی آئین دو ہستیاں پر ہوش ہو گئیں تو پھر میں اور آپ بھی اس قصے کو پردے میں ہی رہنے دیں۔ فی الحال اسی میں بہتری ہے۔!

اور میں اپنی اہم عمر بیٹی کا منہ دیکھتا رہ گیا جس کا طرف حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرح ہر گز نہیں تھی۔ بلکہ وہ شاید مجھ پر بھی نہیں بڑھی تھی۔ وہ کوئی لطیف سی روح محسوس ہوتی تھی!

اور یوں تب سے اب تک مزیم میرے گھر میں پھوپھی ثریا کی نواسی کی حیثیت سے رہ رہی ہے۔ جس وقت وہ مجھے چاچا جی کہتی ہے ایک برجھی سی میرے دل کے آریار ہوتی تھی مگر میں واقعی خود کو مجبور پاتا ہوں کہ میں یہ راز افشا کروں۔

میں ثریا پھوپھی کا مرتے دم تک احسان مند رہوں گا جس نے میری بیٹی کی اس قدر عمدہ تربیت کی اور کبھی بھی میرے اور مریم کے رشتے کو لے کر آڑے نہیں آئی اور خاموشی سے قبر میں اتر گئی۔

چاہتی تو زور دے کر مجھے مجبور کر سکتی تھی کہ میں مریم کو۔ اپنی اولاد کی حیثیت سے متعارف کرواؤں مگر میں نے مریم کی پیدائش کے ساتھ ہی جو اس بچی کو

نے سنبھال رکھی ہیں۔ دل بے طرح اواس ہو تو میں انہیں نکال نکال کر دیکھتا ہوں اور پھر کسی قیمتی خزانے کے طور دوبارہ تالے میں ڈال دیتا ہوں! میں نے ایک نظر کھڑکی میں سے نظر آتے آخری دنوں کے زرو چاند پر ڈالی اور نواڑی پلنگ پر دھرے گاؤ تکیے کے نیچے سے سرخ جھلملاتا تالے کے کام سے یو جھل دوپٹہ نکالا تھا۔ اس کی جھلملاہٹ یکدم میری آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ یہ فوزیہ کا دوپٹہ تھا جو اس نے نکاح کے وقت اوڑھ رکھا تھا۔

ماہیا مینوں یاد آؤندا
میرے دل و جوں اٹھدی اے ہوک
ماہیا مینوں یاد آؤندا
میری عید والا جن کدوں چڑھے گا؟
اللہ جانے ماہی کدوں ویٹرے وڑے گا؟
دکھ ڈاھلے نہیں تے جندڑی ملوک۔۔۔
ماہیا مینوں یاد آؤندا۔۔۔
سن چرکھے دی مٹھی مٹھی کوک۔۔۔

میری نگاہوں کے آگے چھم سے وہ منظر اتر آیا تھا جس کے حصار میں میں آج بھی پھر پھڑکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر مجھے لگتا تھا کہ وہ جو آخری سانسوں کے درمیان فوزیہ نے اپنے نحیف ہاتھ میں جکڑا میرا ہاتھ دھیرے سے ویایا تھا۔ وہ محض ویانا نہیں تھا، وہ اظہار تھا۔ ان کہا سا۔۔۔ ان سنا سا اور ہمیشہ رہ جائے والا۔۔۔ محبت کا اظہار۔۔۔!

اور اس اظہار نے ہی تو مجھے بے مول خرید کر انمول کر دیا۔۔۔ زندگی ڈوبتی ابھرتی موجوں کا نام ہے مگر کچھ لہرس کنارے سے ٹکرا کر واپس نہیں پلٹتیں۔۔۔ وہیں پہ ذم تو ڈوبتی ہیں۔۔۔ فوزیہ بھی ایسا ہی ایک کنارہ تھی جس سے ٹکرا کر میں کبھی واپس نہیں پلٹ سکا۔ مدغم ہو گیا۔۔۔

”حق باہ! میں نے ایک ہندسی اور بوسیدہ سی آہ بھری تھی اور وہیں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔۔۔ دوپٹہ میرے سینے پہ اب بھی یوں دھرا تھا جیسے محبوب کا سر!

میری بیٹیوں اور پنڈ کی دیگر بچیوں کی بے سری تائیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔۔۔ میں مسکرا دیا۔۔۔ دھیان بے ساختہ موجوں کی سمت گیا اور باڑے میں چارے کو پھولتا موجوں ایک دفعہ پھر میرے دل کی پا گیا۔۔۔ فضا میں یکدم موجوں کی تیز اور سریلی آواز ابھری اور چاند کے عشق کے وبال میں پھنسا چکور ویوانہ وار اس کی سمت پرواز کر گیا۔۔۔!

سن چرکھے دی مٹھی مٹھی کوک

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

قیمت	کتاب کا نام	مصنف
500/-	بسا بادل	آسمانیاں
750/-	زور موسم	راحت حسین
500/-	زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار رحمان
200/-	خوشبو کا کوئی کمر نہیں	رخسانہ نگار رحمان
500/-	شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری
250/-	حیرت نام کی شہرت	شازیہ چودھری
450/-	دل ایک شہزادوں کا	آسیہ مرزا
500/-	آئینوں کا شہر	قائزہ انصار
600/-	بھول بھلیاں خیزی نہیں	قائزہ انصار
250/-	بھلاں دے رنگت کالے	قائزہ انصار
300/-	یہ بھیاں یہ چھوڑا سے	قائزہ انصار
200/-	عین سے عورت	فرازہ عزیز
350/-	دل آسے دھوٹ لایا	آسیہ رزاقی
200/-	نکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی
250/-	رخم کو ضد تھی مسیحا کی سے	فوزیہ یاسین
200/-	امادس کا چاند	جزئیہ سعید

ناول منجانب سے کے لئے یہی کتاب ڈاک خرچ -30 روپے
نکھانے کا پتہ
کتابخانہ عمران ڈائجسٹ -37 اردو بازار، کراچی۔
02215361

عشقِ رومی

دل کی تختی صاف کر، الف کی تسبیح پڑھ کے سب
پچھ نفس کی نذر کر دے۔ اثبات حقیقی کے بحر میں
غوطہ زن ہو کر شہادت عطا کی سیپیاں چن لے۔
باروی! کن کہنے والے کو راضی کر لے اور امر و روح

اکھر پڑھ الف جو پیا ورق سبھ دسار
اندر توں اجار، پنا پڑھندیں کیترا
”صرف لفظ الف کا پڑھ لے باقی سارے اور اراق

بھول جا۔

باطن کو صاف کر لے اور کتنے فضول کاغذ پڑھے
گا۔

باروی! ”روح“ دل کو یکتا کی یاد سے روشن کر لے،
صرف الف سے لوگا لے، اور سارے کورے کاغذوں
کو بھاڑ دے، قلب کے کاغذ سے غیر کا نام مٹا دے۔

کو اس کے تابع کر لے

او ماروی!

او ماروی!

ذرا سن لے

ندائے ملیں

مُکِجَلِ تَاوِلِ

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**



ندائے الست

الست برکم (کون ہے تمہارا رب) جب سماعت نے یہ ندا سنی۔ تو ماروی (روح) اسی وقت قلب سے قالو ملی (تو ہی ہے میرا رب) کا اقرار کر بیٹھی۔

وہ وعدہ وہ عمد اب اس عالم ناسوت میں وفا کرنا ہے۔ وہ وعدہ وہ عمد پورا کرنا ہے۔

اے ماروی! یہ دنیا خوب صورت و پر فریب سی عمر (نفس) خواہشات کا خریدار سی۔

پھوگ (شیطان حرص و ہوس) کی ترغیب پر فریب سی۔

مگر

ندائے ملیر (عالم ارواح) سے نہ مگر

قالو ملی کے اقرار کو نہ بھول

و جدانیت کی دوا دی کو یاد کر

قلب کی گرہیں کھول دے

ظاہر و باطن اول و آخر کے ذکر سے زبان کو تر رکھ

او عالم ناسوت میں پھنسی پور پور جکڑی ماروی

ابھی سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوا

ابھی توبہ کے دروازے بند نہیں ہوئے

لوٹ آراستہ نکلا ہے

آلاستوں سے وامن اجھاڑ

کورے کاغذ سارے پھاڑ

ملیر کی اور کر مہار (سرخ)

نفس کو نیند سلا

نیند (عشق کا کاجل لگا)

توفیق الہی کے جھولے میں جھول جا

توفیق الہی کی رضا سے وامن آراستہ کر

لوٹ آ ماروی

اپنی اصل کی اور



روشنی پر چمکنے والی ریت نے۔
سورج کے گیروالباس پہن کر، آرام کرنے پر خود
بھی ٹیالا لباس زیب تن کر لیا ہے۔ پاؤں کے نیچے ہجر
ایسی پتی ریت نے وصال کی ٹھنڈک جیسا لباس پہن
لیا۔

ان بھٹوں ٹیلوں کی اوٹ میں اکا دکا تھری درخت
بادلوں کو سمیٹے سر نیہو ڈائے کھڑے ہیں۔ بکریاں اپنے
بچوں کو سونگھ رہی ہیں۔ ٹیالا گھاگھا اپنے گاؤں کے
گونے پر اہستہ ٹیلا جس کی تکیوں پر کھڑا کھیت میلوں
دور اس سڑک کو گھور رہا ہے جو ریت میں سانپ کی
طرح ریگتی لگتی ہے۔

اس دور دراز مٹی سڑک کے تین کلو میٹر پار وہ گاؤں
جہاں ماروی کی آمد متوقع ہے اور جس کے انتظار میں
کھڑا کھیت استقبال کے خوش کن خیال سے خیرہ ہو
رہا ہے۔

کشتا تکی بخش تصور ہے۔ چاندنی رات میں
محبوب کو اونٹ پر بٹھائے اونٹ کی مہار پکڑ کر محبت

میں چھو کر منزل کی اور بڑھتا۔

اس تصور کے طیور تلور کی طرح تیز ہیں۔ مور کے
رنگوں کی طرح سین۔ وہ اس تصور کی قوس قزح میں
کھویا ہوا ہے۔ محبت کا مینہ برس رہا ہے اور وہ اس میں
پور پور بھیلنا بجا رہا ہے۔

دور آسمان پر چاند اس چکور ایسے کھیت کی دیوانگی پر
مسکرا رہا ہے۔

کھیت سراٹھا کر چاند کو دیکھ کر منس پرتا ہے چاند تیری
ذات اپنے محبوب کی مثل برابر نہیں سمجھتا تو تو صرف
رات میں چمکتا ہے، میرا محبوب تو ہر وقت روشن رہتا
ہے۔

وہ چاند کو آنکھ مار کر بشارتاً "طعنہ دیتا ہے۔ اس
سے سرد سندھی کی آواز میں شیخ ایاز کا کلام اس کی
سماعتوں میں زندہ ہو جاتا ہے۔

اور بے چاند اور بے چاند۔

میرا محبوب تم نے تو نہیں دیکھا۔

ماروی منتوں و عاؤں سے پانے والی من چاہی مراد۔
محبت کا میلہ سجانے آرہی ہے۔ سورج کی سفید روخالی

کر نکلتا ہے وہ نہیں کراتا ہے پھوڑتا ہے۔
 محبوب کے جدا ہونے کے خوف سے اسے تشبیہ
 دی تھی اس کی جان بخشی لازمی تھی یہ عشق کا معاملہ
 ہے کوئی مسخری نہیں۔ وہ ناچتا ہے۔ اس کے ساتھ ٹیلا
 ناچتا ہے اس کے قدموں تلے جیسے سارا تھری رقصیم
 کی مدہم تان پر تھرکتا ہو۔ وہ مدہوش ہوا جا رہا ہے۔ اس
 سے اب دور سے آنے والی جب کا انتظار ٹیلے پر نہیں
 ہوتا وہ بے تابی سے ٹیلے کی چلی سطر پر دوڑتا ہے۔
 اس کا ایک پاؤں ریت میں دب جاتا ہے وہ کھینچ کر
 نکالتا ہے، تو صرف پاؤں چیل سے باہر آتا ہے۔ وہ
 جلدی میں دوسری چیل کی اتار دیتا ہے اور ریت اس
 کے پاؤں کو چومتی ہے لپٹ جاتی ہے اسے دیکھ کر
 اونٹ اٹھ جاتا ہے اور اس کی ہمار پکڑ کر روڈ پر
 ہوٹل کی طرف راج کرتا ہے۔
 اس کے من میں محبت کی مدہم مدہم منک ہر
 دھنتی ہے اور ابراہیم نشی کی ایسی پر سوز محبوب کو ریت
 نگر سے کھینچنے والی آواز میں وہ منت ہو کر گنگلتا
 ہے۔ بی جا رات ٹھہری آہے اٹھرے میں۔ اجن
 تنہا جو بھاگن بی بھری آہے۔

اس کارنگ اس کاروٹ ایسا ہی ہے جیسا تو
 چاندنی رات کا فسوں فضائے بسید پر طاری ہو کر
 اس کے دل کو فیض یاب کر رہا ہے۔ محبت کی مدہ میں
 مدہوش ہو کر اس کے دونوں بازو تلور کے پروں کی
 طرح پھیل جاتے ہیں۔ وہ چکور کی طرح پھرتا ہے ٹیلے
 کی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ٹھار ریت اس کے پاؤں کی نیچے سے
 سرکتی جاتی ہے۔
 اس کی نظریں چاند سے ملتی ہیں چاند کی مسکراہٹ
 اسے بھلی لگتی ہے اس کے دل پر اسے پار آتا ہے۔
 اورے چاند اورے چاند میرا محبوب تم نے تو نہیں دیکھا
 اس کارنگ اس کاروٹ ایسے ہی ہے جیسے تو۔
 اس کی بلند آواز فضاؤں میں پھیلے فسوں پر سوار ہو
 کر پورے گاؤں پر گونجتی ہے۔
 ٹیلے سے لہرائی آواز پر 'صحن میں سوئی بھاگی
 آگ میں کھول کر کوٹ لیتی ہے۔
 پگلا صبح تو کتا ہے میری ماروی بھی تو چاند ایسی
 ہے۔

اورے رات اورے رات میرا محبوب تم نے تو
 نہیں دیکھا اس کے بال اور گھنگھریالی جگر ایسی ہی ہے
 جیسے تو ساروی کے گھنگھریالی نے بال جو ستارنی پشت پر
 سایہ کیے رکھتے وہ بال زنجیر بن کر اس کے دل کی ہتھ
 کڑیاں بن جاتے دل بے قابو ہوتا اس کی پشت پر
 سانپوں کی طرح لہراتے بالوں کو چھونے کو سوہ اپنے
 ہاتھوں پر ان ریتی بالوں کا لمس محسوس کرنا چاہتا تھا۔
 مگر روایات اور برہوں کا اعتماد ضبط کے ان دیکھے پہاڑ
 کھڑے کر دیتا۔

اور میرا پھول میرا محبوب تم نے تو نہیں دیکھا اس کا ساتھ
 اس کی سنگت ایسی ہی ہے جیسا تو خوشبوئے محبت کی
 لطافت چاروں اور پھیلتی جا رہی ہے۔ تیزی سے نیچے
 کی طرف ناچتی گرتی ہے۔

اورے سانپ اورے سانپ میرا محبوب تم نے تو
 نہیں دیکھا اس کا خوف ڈنگ ایسا ہی ہے جیسا تو
 کوئی سانپ اس کے پیروں تلے بدکتا ہے بھدک

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

کی جانب سے بہنوں کے لیے خوشخبری
 خواتین ڈائجسٹ کے ناول گھر بیٹھے حاصل کریں

30 فی صد رعایت پر

طریقہ کار ناول کی قیمت کے 30 فی صد کاٹ کر
 ڈاک خرچ۔ 100/- روپے فی کتاب منی آرڈر کریں۔

منگوانے اور بتی خریدنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار گراچی۔ فون: 32216361

وہ اپنی بھانگوں بھری گھڑی کو پائے جا رہا تھا۔



ماروی نے جیب کے شیشے سے اس پار اپنے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے چاند کو دیکھا۔ چاند جو محبوب جیسا دکھتا اور پریت کا پیغام چھوڑ دیتا۔

اور چاند ایک آنکھ سے محبت میں تاپتے کھیت کو دیکھ رہا ہے۔ دوسری آنکھ سے ماروی کو خاموشی کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ شانت سکون سے سے سوچ کا سورج طلوع ہوتا ہے۔ تصویر محبوب دل کے نہاں خانوں سے ابھرتی ہے کھیت اس کی دید کا مشتاق بھٹوں پر اس کی آمد کے انتظار میں مور کی طرح ناچتا رہا ہے۔

وہ ساتھ چلتے چاند کو دیکھ کر مسکرائی ہے۔ اس وقت وہ گاڑی میں سوئی سمجھ اور عبداللہ کے خزانوں بھری نیند سے غافل ہو جاتی ہے۔ اس نے آہستہ سے شیشے نیچے کیا، چھوٹی سی درز سے ہوا میں اپنے ہوش و خواں کر کے اس سے آپٹیں اس نے لمبی سانس کھینچ کر محبت کی آکسیجن اپنے اندر اتاری۔

سنے اس کی آنکھوں کی منڈیوں پر آکر چپکے چپکے مسکتے رہے اس نے تلی کے پروں کی مانند چپکے سے اک سننے کو چٹلی میں تھا۔

چھوٹے ڈیم سے بننے والی واٹر کی خوب صورت قطار کھیتوں کے گرد پھیلتی جا رہی تھی۔ تھر کی ریت پر لہلہاتے کھیتوں کے ایک طرف ترتیب سے بنے ہوئے پکے مکانات، ان کے بیچ بنا شاندار اسکول اور اس میں پڑھاتا ہوا کھیت اس نے خوشحالی کے خواب کو آہستہ سے سنبھال کر اپنی جگہ رکھا۔

اس نے آنکھ کی منڈی سے دوسرے سننے کا جگنو پکڑا۔

اک خوب صورت ہٹ نما چھوٹے سے خوب صورت گھر میں وہ کھیت کے ساتھ، قحط کے دنوں کی پلاننگ کر رہی ہے، کیسے تھریوں، تھر کے باسیوں کو اناج دینا اور روزگار سے لگانا ہے۔ اس کے ذہن میں کئی منصوبے آ رہے ہیں، جن کی تعبیر کرنے کی

اسے سندھ یونیورسٹی میں سوشیالوجی میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کو بھیج لائی تھی اور پھر ان منصوبوں کی سطح پر کھیت کا وجود ابھر کر نمایاں ہو جاتا ہے۔

اور کھیت جو گا رہا ہے۔ اسے مسیح بھیج رہا ہے، اس کے مسیح جزی پر بے مایوں پر ماروی پر یہ بھیج کھلتا ہے کہ کھیت کا وصال وہ بیٹھا بھت (شیشے چاول کا زرہ) ہے جو تھر باسیوں کو کئی روز کے فاقوں کے بعد میسر آ رہا ہو، اس نے پہلی بار سوچا محبوب کا بجز بھی قحط جیسا ہی ہے وہ بیک جھپک جھپک کر آنے والے ہر خیال کو من کی اور بھیجتی ہے۔

چاند اب بھی اس کی ہم سفری پر مسکرا رہا ہے۔ اس نے بہت احتیاط سے آنکھیں میچ کر سارے سننے اپنے اندر سمولے۔ بند آنکھوں گاڑی رکنے کے جھٹکے سے کھلیں۔ آنا "فانا" جیب کے دروازے کھلے، کھیت کر عبداللہ اور ڈرائیور کو روڈ پر پھینکا گیا۔ اس کے ساتھ بیٹھی شمع کو دوسری طرف سے بازو سے کھینچ کر اتار گیا۔ اسے ایک لمحے کو بھی لگا کہ یہ ڈاکو شاید گاڑی لے جانا چاہتے ہیں۔ اس نے دیکھا ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نقاب پوش براجمان ہو چکا تھا۔

باہر اترنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ دوسرے دروازے سے شمع کے پیچھے اترنے کا، اس نے مستعدی سے شمع کے پیچھے اترنے کی کوشش کی، شمع کو اتارنے والا اب گاڑی میں چڑھ آیا تھا۔ اسے دھکا دے کر اپنی سیٹ پر گرا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تیسرا آدمی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر چکا تھا۔ اس نے ایک چیخ ماری اس کے منہ سے عبداللہ کے بجائے کھیت نکلا، اگلے ہی لمحے بھگا روہاں اس کے منہ پر تھا۔ ماروی نے بمشکل سر سے کھسکنے والی چنری کو اپنے ہاتھوں میں تھاما، بے ہوش ہوتے وقت اس کے ذہن کی اسکرین پر کھیت ساکت تھا، بھٹ شاہ میں بھٹائی کی وائی کر لائی بھالوا میں ماروی کی روح بے چین ہوئی۔

تھر کی دنیا بھی عجیب تھی۔ جہاں وہ مل کر جوان ہوئی۔ وہ ماروی ٹیلی کی عزت کا بن باس نے گرا ہاتھ میں

تختی پکڑے بہول کے درخت تلے جا بیٹھی۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والا کھیت تھا۔ جس نے اسے اپنے قریب بٹھایا۔

”تو بھی تھری طرح جیسا ہے۔“
 ”ارے جن! ایسا تو ہر کوئی ہے۔ محبت کا مال کا۔ جو سکون دے اس خوشی کا۔“

”ابا! روئی کو بھی پڑھا۔“ اس نے تختی ابا کے گھٹنوں پر رکھی۔ کامبھ باندھ کر دونوں گھٹنے کھڑے کر کے ان کے گرد اجرک کمر کے پیچھے اڑس کر گھٹنوں کے گرد باندھ کر سیدھی صوفیانہ طریقے پر بیٹھے ہوئے جن سندھی نے تختی اٹھا کر روئی کو مسکرا کر دیکھا۔
 ”ماروی! پڑھے گی؟“

”بھلا تھرو والوں کا سکون تو صرف پانی ہے۔ ساری خوشیاں مند ملہار سے جڑی ہوئی ہیں۔“
 ”چنگو (اچھا) بھاؤ! اب میں چلتا ہوں۔ میری ماروی کو پڑھانا۔ پہلے لوئی لچ (چاور عزت) کا سبق جو ماروی کی شان ہے۔ جس سبق سے ماروی ماروی بنتی ہے۔“ پاندھی نے اجرک لپیٹ کر کندھے پر رکھی۔
 ”ارے فکر نہ کر پاندھی۔ یہ سبق تو تھری ہر بیٹی کو ازبر ہے۔ سب سے پہلا سبق جو ماں کی گود سے سن کر بڑی ہوتی ہے۔ یہی لوئی لچ کا ہی تو ہے۔“

”جی ابا! پڑھے گی؟“ ماروی سے پہلے کھیت کا جواب بے تالی سے آیا۔ ماروی نے شرما کر اثبات میں سر ہلا کر کھیت کی تائیدی۔

اجرک کی گانٹھ کھولتے ہوئے جن روزانو ہو کر تھر کی ریت پر عاجزی سے بیٹھ گیا۔ ماروی کو گھٹنے پر بٹھا کر تختی تھالی۔

وہ ماروی بھی بھلا کیا ماروی تھی۔ اک عربک تھریا کی بیٹی۔ جو تھری جنگلی جڑی بوٹیاں جمع کرتی پھرتی جو موٹی اور لوگ بھی کھاتے، کھریاں چرانے چرواہے۔ وہ اسی ہی تھری سفید چاندی جیسی ریت سے رزق لیتے۔ رزق کی فراوانی تھریوں کے لیے مفقود ہے۔ تھری تو اپنے رازن کا ان جنگلی پھل اور بوٹیوں پر شکر ادا کرتے کہ یہی چیزیں تھریوں کے پیٹ کا اندھن تھیں۔ مگر جب مند ملہار آئی، ہر بار ان پر ستا پھر تو تھریوں کے وارے نیارے ہو جانے رزق کی فراوانی ان کا لُحظ ختم کر دیتی۔ مال موٹی عمارت سب خوش اٹھ سائیل رزق کے دروازے کھول دیتا۔ اور تھری زمین سوتا اگلتی، خربوزے، تریوز، ٹنڈے، گوار کی پھلیاں، باجرہ، چاول تھریوں کے پیٹھ سے لگے پیٹ پھولنے لگتے۔ وہ خوشی سے ہمہ جو گاتے، ملہار گنگناتے۔ ان کے سانولے بدن تھر تھرا اٹھتے کیوں کہ چاندی ایسی جلتی ریت سبز پوشاک پہن لیتی، اسے سادوں نے سجادیا۔ قدرت مہربان ہو گئی۔ قادر نے گرم کیا، کن من برستی بوندوں نے من میں ملن کے میلوں کی آس جاگ جانی۔ اب تھریا سیوں کے منٹھار لوٹ آئیں گے ان کے دھنار (چرواہے) جو مویشیوں کے ریوڑ لے کر نہری علاقوں

”الف انب (آم) ب بلا۔ بلا دیکھی ہے جو ریت میں ریگلتی ہے۔“
 ماروی نے فوراً ”اس بات پر سر ہلایا۔“
 ”نکل ابا نے ماروی تھی اتنی بڑی۔“
 ”اچھا، بھئی، ابا! تمہارے ابا نے تو کمال کر دیا۔ ورنہ وہ ہمیشہ پورا گاؤں اکٹھا کرتا ہے۔ اگر کہیں بلا دیکھ لے تو۔“ وہ جی بھر کے ہنسا۔
 ”ارے جن! کیا بیٹی بڑھا رہا ہے میری ماروی کو؟“
 ”ارے پاندھی! تو بھی پہنچ گیا۔ تیرا چندھ (زاستہ) کبھی گم نہیں ہوتا۔ ہمیشہ بات پکڑنے کو عین موقع پر پہنچ جاتا ہے۔“

”تو میری غیبت کرتا ہے، مجھے بتا چل جاتا ہے۔“ پاندھی نے بہول کے درخت کے نیچے رکھے مٹکے کے اوپر رکھے مٹی کے پاس لے میں پانی اٹھ دلتے ہوئے کہا۔
 ”تو تھریا ہو کر ٹانگ بلاؤں سے ڈرنا ہے۔ ہنسی تو آتی ہے نا بھلا، تیری اس بزدلی پر۔“

”بس بس جن! تو تو ٹھٹھول کا موقع جانے نہیں دیتا۔ سارا دن مشمکوری۔“ وہ غٹا غٹ دو سر ابا لے پالی کاپی گیا۔

پیاسی تھی اپنے سر کے بسائیں کی۔ اس کا من بھی تو
دیران تھا اور گھر کے تسلے میں دوروٹی کا آٹا۔ کتنے روز
سے وہ اک ہی روٹی پکا رہی تھی۔ ماروی کے سامنے رکھ
کر کسی کام کے بہانے اٹھ جاتی اور سیانی ماروی آدھی
روٹی کھا کر آدھا پیٹ بھر کے سختی لے کر چاچا سا جن
سندھی کے بول کے درخت کے نیچے آکر بیٹھ جاتی۔

چاچا سا جن سندھی نے دوسرے دن اسے گود میں
بٹھا لیا۔ اس کی چہرے پر بھوک رقم تھی آدھا پیٹ
آدھی روٹی، آدھی بھوک اور پورا درد جو کہ مشترکہ تھا۔
تھر کے باسی واقف حال تھے۔ آگ دوڑے کے۔

اس دن چاچا سا جن اس کو پکڑ کر اپنے گھر لے آیا۔
کھیت کے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا اس نے دو دنوں
لینے کے بعد انکار کر دیا۔

”کیوں دھئی لمانی کیوں نہیں کھاری؟“
”چاچا لمانی انہاں کے ساتھ جا کر کھاؤں گی۔“ آدھی
روٹی کا درد مشترک سا جن سندھی کی آنکھوں میں پانی
بھر آیا۔

”کتنی حساس بچی ہے۔ بھوک میں بھی ماں کو نہیں
بھولتی۔“
”ماروی جو ہوئی۔“ چاچا کے اس جملے نے اس کا
سرفخر سے بلند کر دیا۔

کھیت نے روٹی لپیٹ کر چنگیر اٹھا کر اور سالن کی
پیٹ رکھ دی۔

”چل تیرے ویڑھے میں اکٹھے کھاتے ہیں۔“
”بھاجانی، کب سے آتا نہیں۔“ اس نے تسلے کا
ڈھکن اٹھا کر خالی تسلے کو دیکھ کر استفسار کیا۔

”بھاؤ بس ادا جن آیا ہی نہیں ایک ماہ ہو گیا۔ اس
کے گج تیار ہیں۔“ جو ابا ”مختصر عذر پیش کیا۔“
”بھلا ادھار کی ماں تو نہیں مری۔“ سا جن کی آواز
میں تاسف جھلکتا تھا۔

”پاندھی نے بھی کوئی قاصد نہیں بھیجا۔ ورنہ وہ
چارپے بھیج دیتا ہے۔“
اب کیا بتانی تھر پارسی سارے ہی ایک جیسے تھے
دونوں وقت آدھی روٹی کھانے والے اور ہندو بیٹھہ کی

کی اور ہجرت کر گئے وہ پاندھی کے لیدل چلنے والے قحط
کا بن پاس کاٹ کر اپنی ملکوں کے من موہنے واپس
لوٹیں گے۔ ان کے مویشی دوڑیں گے۔

من موہنی ملکائیں۔ من کے سندھے پا کر خوش ہو
کر سات سنگھار کے سنگھار پر بیٹھیں گی۔ سپنوں کی
تعبیر ملنے کا وقت آیا چاہتا ہے۔ وصال کی دامن
(سندھی شاعری کی اک جنس) فضا پر فسوں طاری کر
دیتی۔ اور ایسے ہی فسوں میں گھری ماروی کی ماں بھاگی
اپنے پاندھی کے انتظار میں تھی جو بدین مویشیوں کا
ریوڑ لے کر گیا تھا۔

ماروی روز اپنے ابا کو یاد کرتی۔ تاروں بھرے
آٹاں کے نیچے اپنے آنگن میں چارپائی پر لیٹ کر بازو
ناں کے گٹھے میں ڈالتی۔

”اماں ابا کب آئے گا“
”جب قحط ختم ہو گا۔“ بھاگی کی قحط زدہ آواز ریت
میں سرسراہی بلاؤں کی طرح پھول پھول کر کے
پھنکارتی۔

”اور قحط کب ختم ہو گا؟“ ماروی زنج ہو کر کہتی۔
”جب سکار ہو گا۔“ سکار (خوش حالی) کا لفظ آدھن
گر ظاہر ہوتا۔

”اماں! آخر سکار کیوں نہیں ہوتا؟“ ماروی روز باری
ہو جاتی۔

”تو دعا کر رب رحم کرے۔ والی مہینہ برسائے پیاسی
دھرتی سیراب ہو اور سب کے وارث واپس آئیں۔“
بھاگی کی آواز بھرا گئی۔ تارے دھندلا گئے۔

”اماں! تو رو رہی ہے؟“
”نہیں دھی۔“ اس نے غم سے کا پوند لگے پلو سے
آنکھیں پونچھیں۔

”اللہ سائیں تھرو سے (برے) ریگستان و سے۔“
اس نے اپنے باپ کی زبانی سنی دعا فوراً ”دہرائی۔“
”اماں اب مہینہ برسے گا نا؟ اور تو روئے گی بھی
نہیں۔“

”ہاں میری بچی!“ اس نے اس سے کہا۔ آنکھ سے
بے/شہم کے قطرے تکیے میں جذب ہو گئے۔ وہ بھی تو

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجن

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

اکھوتی وکان سے اوهار آنا لینا گوارا نہیں کہ اس کی ناگوار نگاہیں غیرت پر حملہ تھیں۔



اور کچھ ہی عرصے بعد وہ گج ثقافتی میلے کی زینت بن کر چکا چوندروشنیوں میں اپنی چھب دکھارہا ہوگا۔ اس کے شیشوں کا عکس ان روشنیوں پر تھرکتا ہوگا اور کوئی سیاح ہزاروں میں خرید کر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں دیوار پر سجا کر ہر آنے والے مہمان کو تیار رہا ہوگا یہ ہاتھ کا کام ہے۔ جو صحرائے تھر کی عورتیں کرتی ہیں۔

میشینی دور کے مشینی انسان کے لیے بہت بڑی بات ہو گی۔ ہاتھ سے بنا ہوا گج۔

یا کسی امیر کبیر خاتون نے کسی ثقافتی شو میں پننے کے لیے خرید لیا ہوگا اور اس پننے والی خاتون کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ اسے کاڑھنے والی میالے رنگ کی عورت نے کتنی امیدوں سے اسے کاڑھا ہوگا۔ اک اک ٹائٹلے میں اپنی اک اک حسرت ٹانگ کر اس کے بڑے بڑے شیشوں میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرا کر اپنے ہی ہنر کو داد دی اس کے مشقت بھرے سیاہی مائل ہاتھ کی رگیں وہ دھاگے کھینچنے پر ابھر آئیں اور وہ شیشے اپنی جگہ پر ٹھیک ٹھیک لگاتے سوئی دانتوں میں دبائی ہو گی۔

یہ گج دنوں اس کی توجہ اپنے جانب بھیج کر اس کے حواس برچھایا ہوگا وہ ہر کام کرنے کے بعد فوراً اسے اٹھانے کو سوچتی ہوگی۔ جب میلوں پیدل چل کر وہ کنویں سے پانی بھرنے جاتی ہوگی۔ تو وہ ہرے مکے سر پر دھر کر اک گھڑ بازو پر اٹھا کر وہ تیز تیز چلتی ہوگی۔ اسے گج کا رہا سا کام یاد آتا ہوگا۔ جلدی جلدی لکڑیاں چستے روئی پکاتے کسی بلوتے اور اگر بکری دودھ کے لیے پانی ہوگی تو اسے چراتے یہی خیال ذہن میں آتا ہوگا کہ ابھی گج کا اتنا کام باقی ہے۔ کرلوں تو چار پیسوں کا آسرا بندھے اور ان چار پیسوں کے انتظار میں دنوں کراچی سے آنے والے دلائل کا انتظار کرتی ہوگی۔

اور جب وہ دلائل اس سے بھاؤ تاؤ کر کے وہ گج آئے۔

کے گلو کے عوض خریدتا تو اس کے ارمانوں پر اس پر جاتی پڑے کے پونڈیونہی اس کی غیرت کے چولے پر لگے ہوتے نہ نیا جوڑا ملتا نہ نیا جوڑا بس آدھی روٹی آدھی بھوک پورا درد۔

ساری حسرتیں تھر کی ریت میں بچھو کی طرح چھپ جاتیں اور وہ بچھو ڈنک مارتا۔ تیرے چولے کی ادھڑی ہوئی سلانی تیرے بڑے کے پونڈ تیری چنری کے چھید وہ زہر پی جاتی مگر ماروی کے پرانے کپڑے اور آدھی روٹی۔ پوری بھوک سارا درد زہر بن کر اس کو نیلوں نیل کر دیتا۔ اور بھلا ان باتوں کا اس گج کو گھر میں سجانے والے مرمیس جسم پر پہننے والوں کو کیا پتا کہ ان کی رقم نے دلالوں کے پیٹ بھرے اور کارہے والی کی بھوک بڑھی۔



ابن دن وہ بھرے ہوئے پیٹ سے اسکول دوڑتی جاتی۔ بلند ٹیلے خاک اڑاتے رہتے اور ٹیلے کی آڑ میں بنے بول اسکول کے نیچے بیٹھے آٹھ دس طالب علموں کو دیکھتے رہتے۔ ان ٹیلوں نے صدیوں پہلے اس ماروی کو بھی دیکھا تھا جسے عربیانی پلانے کا کہہ کر کنویں سے اٹھا کر لے گیا تھا۔

اور اب اس ماروی کو بھی دیکھ رہے تھے۔ جس کے پاؤں اسی نقش قدم پر اٹھتے تھے۔ جو چاچا سا جن سندھی سے ہر روز نصائی سبق لینے کے بعد صدیوں پہلے ماروی کے قصے کی کوئی نہ کوئی بات اپنے پلو میں باندھتی تھی۔ اور اس کے قریب بیٹھا کھیت اسے محویت سے تکتا رہتا۔ چاچا سا جن اس کی نظروں کو جانچتا تو لٹا اور دل میں عمد کرتا ہے ماروی میری ہی بہو بنے گی۔ اور اب کی بار سکار ہو تو میں اس کی کھیت سے پدھری (بات کی) کر دوں گا۔

اور یوں اللہ نے گرم کیا۔ اس سال مہینہ ٹوٹ کے برسسا سارا تھر جل تھل ہو گیا۔ رزق کی فراوانی ہوئی اور ان ہی دنوں سا جن نے اپنے دوست پاندھی سے ماروی کا دستہ رشتہ کھیت کے لیے ہانگ لیا۔

www.paksociety.com

”ناں! وہاں شر ہے، ہر چیز ملتی ہے یہ زاد سفر ہم
تھریوں کے لیے ہے۔ جو تھمر کے بیابانوں میں رہتے
ہیں۔“ وہ کھلکھلائی۔

”بس دھئی بس۔ وقت بے وقت بھوک لگ سکتی
ہے۔ اپنے پاس چیز بڑی ہوگی تو نکال کر کھالے گی۔
ورنہ تو باہر نکل کر لٹنی پڑیں گی نانا اور دماغ خشک ہو
جائے بڑھائی میں تو فوراً ”بھوگاڑے کی اک ٹکیہ کھا لینا
اصلی گھی اور مغزات کی طاقت ملے گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے جو میری ماں کا حکم۔“
”حکم ہی ماننا ہے تو دھئی سب سے پہلے میرا یہ حکم پلو
سے باندھ لے کہ لوئی لچ کبھی بھی نہ لجانا۔“

”اماں! میں ماروی ہوں ماروی۔“ اس کے پر عزم
نہجے نے بھاگی کے دل سے سارے وہم زور کر دیے۔

باپ کے خراٹوں پر اس نے آنکھیں کھول کر
دیکھا۔ سانسے والی سیٹ پر بیٹھے کھیت کی رنگاں خود پر
مركز دیکھ کر وہ مست دل سے اسکرانی تھی۔

ان دونوں کے بیچ دوری کی کک کھٹک آئی تھی۔
جن کے من میں محبت کی مستیاں مست مگن تھیں۔
کنڈیکٹر کے بیچ میں سے گزرنے پر وہ اک لمحے کو اک
دوڑے کی آنکھوں سے او جھل ہونے اور یہ بھی انہیں
ناگوار گزرا تھا۔

”بیٹھ جا بھائی کیوں بار بار آجاتا ہے ہمارے بیچ۔“
اس کی آخری سرگوشی صرف وہ ہی سن سکی۔ اس کے
ہونٹوں پر ہنسی کے پھول کھل گئے کھیت نے اک لمحے
کو آنکھیں موند کر اس منظر کو اپنی پتلیوں میں قید کیا
تھا۔

انہیں بدین سے جام شور و سنپتے تین گھنٹے لگ
گئے۔

”ماروی!“ ہاسٹل کے گیٹ پر پاندھی نے اس کے
سر کو چومتے ہوئے کہا۔

”دھی اپنی لوئی لچ (چار عزت) کی حفاظت کرنا۔“
”ابا! یاد نہیں میں آپ کی ماروی ہوں لوئی لچ کا
سبق بچپن سے ازر ہے۔“

”نہاں! مجھے یاد ہے فیروز بچہ! پاندھی نے اسے سینے

بات پکی ہو گئی اور گیارہ سالہ ماروی پندرہ سالہ کھیت
سے منسوب ہو گئی انہوں نے ننگر پار کر شہر سے لائے
ہوئے زرد لٹو بانٹے اور سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی
کہ کتنی شان دار پدھری ہے کہ ساجن نے تو نانا
ختائیاں ہمیں شہر کی بنی پکی مٹھائی بانٹی اور لوگوں کو گڑ
کے بنے چاول بھی کھائے۔



ماروی کے من میں محبت کی میخ ٹھونک دی گئی۔
کھیت کی چاہت نے اس کی کامیابیوں میں اہم کردار ادا
کیا۔ سندھ یونیورسٹی جاتے ہوئے راستے میں وہ بدین
اتر گیا۔

”ارے ارے کہاں جا رہا ہے کھیت۔“

”بس چاچا! ابھی آیا۔“

”دیکھ اس کے کام بس ابھی چل پڑے گی۔“

ارے چاچا! فکر نہ کر تیرا بیٹا آجائے تو پھر چلائے
جیں لاری کو کنڈیکٹر نے اسے دلا دیا۔ وہ بار بار کھڑکی
سے باہر جھانک کر دیکھتا رہا اور سے کھیت کو آتے دیکھ
کر ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر اسے اشارے سے
بلا یا۔

”اور ابا! جلدی۔“

اس کی آواز سن کر اس کے قدموں میں تیزی آئی۔
وہ جب بس پر سوار ہوا تو اس کی سانس پھول رہی
تھی۔ ذرا میور نے بس اشارت کر دی۔

”ابا! تیرے بھی یہ انصاف ہیں اتنی دیر کراوی۔“

پاندھی شکوہ کنان ہوا۔

کھیت کھیانا ہو کر ہنس دیا۔ ماروی نے اسے دیکھ کر
مسکراہٹ کا تبادلہ کیا اور سر سیٹ کی پشت سے ٹیک کر
آنکھیں موند لیں۔ اس کی ذہن کی اسکرین پر آنے
سے پہلے والے مناظر تیرتے رہے۔

اس کی ماں نے اس کے لیے بھوگاڑو (ڈرائی فروٹ
کی مٹھائی) بنایا بسری پکائی مٹ کے لٹو بنائے اور کھیت
کے ہاتھوں منگوائے ہوئے سوٹ کیس میں ساری

چیزیں رکھ دیں۔

سے لگایا۔

کھیت نے اس کا سوٹ کیس اس کے پاس رکھ کر بدین سے لینے والا کالا شاپر کھولا۔ اس سے رنگین چنری نکالی، کھول کر ماروی کو اوڑھائی۔ ”یاد رکھنا تو میری ماروی ہے۔“ اس کا لہجہ بھیگا تھا۔

اس نے چنری کے پلو مضبوطی سے تھامے۔ ”یہ ماروی کی ریت نہیں کہ محبوب کو سونے کے بدلے میں دے دے۔ اسے بھول جائے۔ جھونپڑیوں کی محبت، محلوں کے برابر نہیں سمجھوں گی۔“ اس کے برعزم لہجے پر متزلزل ہوتے یقین نے پھر سے کھیت کے دل کا گونا پکڑا تھا۔ اس سے وہ دونوں دل سے شکر ائے تھے۔

”ابا، اب چلیں واپس۔“

”اماں واہی رانی اللہ کے حوالے۔“ پاندھی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”اللہ واہی۔“ ماروی نے دونوں کو دیکھتے کہا۔ واپس پلٹتے کھیت کی آنکھوں میں جدائی نمی بن کر نمودار ہوئی۔

”بس بلی بال (بچہ) بند بن۔“ پاندھی نے کھیت کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر کہتے کہا اور ماروی کے پلو سے چپکے سے اپنی بھی آنکھیں پونچھ لیں، چوڑی پکڑے جلنے پر کھیت نے بھی زور سے اسے پانڈوں میں بھر کر بس میں سوار کیا تھا۔



وہ چنری ماروی کی پہچان بن چکی تھی۔ وہ تھرکی ماروی کہیں بھی آتے جاتے وہی چنری چادر کے طور پر اوڑھتی۔

اس کی روم میٹ مٹلاس فیلوز اس رہنستیں۔ ”ماروی کوئی اور بھی چادر ہے کہ نہیں؟“ وہ ہنس کر آئی۔ ”بھئی تم کیا جانو، جن کے تن کو رے کاغذ ہوں۔ جن پر کوئی محبت کی تحریر عشق کی سچی سیاہی سے لکھی ہی نہیں گئی۔“

”اوہو ہو۔“ اس کا پورا گرد پ بھئی تان الاپتا وہ

کھٹا کھٹا اٹھتی۔

”اور نہیں تو کیا۔ تم لوگوں کو کیا پتا کہ میرے من کو کیسا قرار ملتا ہے اس چنری کو اوڑھ کر۔“

”ارے لڑکیوں پالیوں! اس کی چنری کو ذرا اٹھا کر تو دیکھو۔ کہیں کھیت تو نہیں چھپا ہوا۔ ہم بھی دیکھ لیں اس سرسبز کھیت کو۔“ شمع کی جولانیاں اپنے عروج پر پہنچ جاتیں۔

”تو جلتی رہ شمع، کھیت چھپا ہوا نہیں، میرے دل کے پلو سے بندھا ہوا ہے۔“ مشترکہ فہمے پورے کمرے میں گونج اٹھتے۔

”ارے پگیو! اس کی محبت کی میخیں میرے من میں لگی ہوئی ہیں۔ تمہیں کیا پتا، میری ہڈیاں یہاں ہیں، روح تو اس کے پاس ہے۔“

”لو جی، اب نئی تکنیک آگئی، پہلے سنتے تھے کہ محبوب کے پاس دل ہوتا ہے اب روح بھی رہنے لگی۔“

”ایسا گل محبت روح کا ہی تو رشتہ ہے، ورنہ دل بیچارے کی کیا مجال کہ اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو اپنے اندر سمو سکے، یہ روح کی طاقت، روح کی توانائی ہی ہے جو اسے یہ جذبہ پانے کی توفیق دیتی ہے۔“

”ہم مان گئے تمہارے تجربے کو بابا! بحث فہستہ۔“ وہ ایک زبان ہو جاتیں۔

”تم ہادیت کے بیوپاری دل کا دھندا کیا جاؤ۔“ وہ شرارتا رہنستی۔

”اوہو تو یہ دل کا دھندا صرف وہاں ہی جانتے ہیں کیا۔“ شمع کی زبان تیز ہوئی۔ ”بھلا کیا بیچتے ہو اس دھندے میں۔“

”اپنا وقت جو تم لوگ کسی کو نہیں دے سکتے۔ اپنا خلوص، اپنی چاہت، محبت، پریت، پیار، خواب، درد، حسرتیں، پوری جان ہی تو رہن رکھ دیتے ہیں۔ انمول سوداگر، یاد کی لو سے سلگتے ہیں اسے شمع فردزاں، کچھ اور پوچھنا ہے تو پوچھ لے۔“ ماروی کے لہجے سے اک شان بے ننازی اٹھتی رہتی تھی۔

بات شمع کے دل کو لگتی۔ وہ لوگ وقت کے گرد

بھانگے اور وقت ان کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ ان کو اپنے پیچھے دوڑائے رکھا وقت سیلاب تھا جو اپنائیت، خلوص، پیار، وضع داری، اقتدار اور سب سے قیمتی متاع محبت کو ہمائے لیے جاتا تھا اور دیہاتوں کے پاس وقت ٹھہر جاتا۔ اپنے دامن سے سارے انمول موتی محبت و وفا، خلوص و پیار کے بچن لینے کی مہلت مہیا کر دیتا، وقت سبک رو قبیل کی مانند ہوتا جہاں اپنائیت کے سارے پیچھی آ کر بسیرا کرتے اور اپنے اپنے حصے کا خلوص، پریت، پیار، انسانیت، محبت کا رزق چگتے۔

ماہ پرستوں اور محبت پرستوں میں آگ یہی فرق تھا۔ وہ وقت کے غلام تھے اور یہ وقت کی قید سے آزاد پھرتے تھے۔



عمر سومرو نے اسے پہلی بار لاہوری سے ملتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے سر پر سلتے سے اوڑھی ہوئی چنری لٹے اس کی توجہ کھینچی۔ اس کی اٹھان میں آگ شان بے نیازی تھی۔ اس کی توجہ کہیں نہیں تھی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابوں اور اٹھتے ہوئے قدموں کے سوا، حسن اس کی ذات سے چھلک چھلک پڑتا تھا۔

”کافی مغرور لگتی ہے۔“ اس کی خود کلامی پر عبداللہ نے کتاب سے اٹھا کر اسے دیکھا، پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دور ہوئی ناروی کو۔

”نہیں خود دار اور غیرت مند۔“

”نیا مال ہے یونی میں۔“ وہ اسے مسلسل دیکھتے ہوئے ہنسا۔

”یار! تمیز سے بات کر۔ ہر کسی پر جملے کتے ہوئے اتنا تو سوچ لیا کر کہ وہ بھی کسی کی بہن بیٹی ہے۔“

عبداللہ کو اس کا لہجہ انداز دیکھنا، کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔

”بڑی حمایت کر رہا ہے۔ جان پہچان کہاں تک پہنچ گئی کہ دوست کو بھول گیا۔“ عمر سومرو کو اس کی باتیں سخت بری لگیں۔

”یقین کر اس لڑکی سے میری رنج تک کوئی بات

چیت نہیں ہوئی۔“ عبداللہ زنج ہوا۔

”پھر دل میں بس گئی ہے کیا۔“ عمر نے طنز کیا۔

”ہے بھی بسنے والی۔“

”نہیں، میری کوئی جذباتی وابستگی اس لڑکی کے ساتھ نہیں مگر کچھ لڑکیوں کو دیکھ کر ان کی عزت کرنے کو جی چاہتا ہے، ان کے بلند کردار کی وجہ سے یہ لڑکی بھی ان میں ہی سے ہے۔“ عبداللہ نے اپنا موقف بیان کیا۔

”ارے دیکھتے ہیں، سالی کتنی دیر تک پار سار ہتی ہے۔“ عمر سومرو استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

”تم نہیں سدھرو گے۔ ہر ایک کو ایک ہی لاشی سے ہانکنا اچھی بات نہیں۔ عمر سومرو! خیال ہے جانا۔ شکار کرتے کرتے کبھی ہرزہ خود بھی شکار ہو جاتا ہے۔“

عبداللہ نے تنبیہ کی۔

”تمہارے دوستانہ مشورے کا شکریہ۔ عمر سومرو صرف شکار کرنا چاہتا ہے۔ ہونا نہیں۔“

”بہت زیادہ خود اعتمادی بھی بندے کو لے ڈوبتی ہے۔“

”فکر نہ کرو عبداللہ! تمہارا یار کھلاڑی ہے، اناڑی نہیں۔“

وہ بات تو عبداللہ سے کر رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں اس چنری والی لڑکی کا انداز بے نیازی گردش کرتا رہا۔ وہ بالکل غائب راغی سے بولتا جاتا تھا اور پھر اچانک ہی جی اچاٹ ہونے پر باتیں ادھوری چھوڑ کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

”پھوگ۔“ اس نے اپنے کمدار کو پکارا۔

”جی سرکار۔“

ایک لڑکی آئی ہے یونیورسٹی میں، کل اس کا اتا پتا معلوم کرنے کی مہم پر نکل جانا۔“

”حاضر سرکار۔“ پھوگ ہنسا۔



”انسان میرا راز ہے، میں اس کا راز ہوں۔“

”میں بندہ تو منجھو، تمیز ہی وجدانیت میں کوئی شک و

”سرکار ایوہ لڑکی تو ماروی ہے، اپنے علاقے کے پاندھی چرواہے کی بیٹی۔“

”اچھا...“ وہ خوشی سے ہنس دیا۔ اپنے علاقے کے لوگوں کو تو وہ مال غنیمت سمجھتا تھا۔

”کتنا مول ہو سکتا ہے اس کا؟“ اس نے پھوگ کو آنکھ مارتے ہوئے تمسخر اڑایا۔

”سرکار، بس یہی چند ککے یا زیادہ سے زیادہ کچھ زمین۔“ پھوگ نے تقہہ مارا۔

عمر سومر دل کھول کر ہنسا۔

”دیکھنے میں تو بڑی ان مول لگتی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کتنے مول میں بکتی ہے۔“ اس نے اس سے جان پہچان تو کر لیں۔ ”وہ پریڈ لے کر نکلی تھی۔“

”ارے ارے، ادوی ماروی!“ اس نے پھوگ کی آواز پر رک کر دیکھا۔

”بڑی خوشی ہوئی ہے تمہیں سندھ یونیورسٹی میں دیکھ کر۔“

”اچھا، شکریہ۔“ ماروی نے رکھالی سے کہا۔

”یہ میں نہیں۔“

تمہاری یاد، پیار، ذکر اے میرے محبوب تجھ سے محبت کرنے والوں کے لیے باعث افتخار ہے۔

تجھ کو پانے ڈھونڈنے والی ہر دلیل بات برحق ہے، سچ ہے۔

ماروی، انسان سری میں گم ہو چکی ہے، وہ خود کو کھونے کی جستجو میں محو ”میں“ کو فنا کرنے کی لگن کو معدوم نہ ہونے دیتی، وہ اس راز کو جان چکی ہے۔ عبد جب فنا ہو تو ہی بقا کو پہنچتا ہے۔

عشق کے چڑھتے سورج کے ساتھ ہی ان نینوں کو (مہرین) محبوب واحد و یکتا کو دیکھنے کی عادت ڈال، اگر ماروی تمہارے نین ادھر ادھر کو جھانکیں، غیر پر فدا ہوں، ایسے نادان نینوں کو نوالے بنا دو، کوؤں کے زاغوں کے ماروی کو است کی صدا یاد آتی ہے اور قالو بلی۔ کا قرار اس عمر کوٹ و دنیا میں نہیں بھولتی۔

بس بس ایک محبوب مائل ہو جائے۔ اس پر نظر گرم ہو جائے۔

قلب کو قرار ملے احد کے اسرار میں جو محو ہو گئے۔ وہ کسی اور کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتے، اسی راز میں پوشیدہ رہتے ہیں۔

ماروی اس درجے کے لیے پریشان اس عالم ناسوت میں ماری ماری پھرتی، توفیق الہی پانے کے لیے کبھی بھٹالی کی روحانی رمز میں رہتی، اور کبھی سیکل کی سرسستی میں سما جاتی۔

ماروی! خدائے ازل وابد تیرا راستہ آسان بنائے۔



اس کے ہاتھ میں سوشیالوجی کی کتابیں تھیں۔

”تم پہلے اس ڈیپارٹمنٹ میں جاؤ۔“ اس نے آدھا گھنٹہ پہلے پھوگ کو کہا تھا، خود گاڑی میں بیٹھا رہا۔

بھلا عمر سومر کی یہ شان ہے کہ کسی لڑکی کو ڈھونڈنے خود نکل کھڑا ہو، اس نے نخوت سے سوچا، وہ گاڑی میں بیٹھا، موسیقی سے لطف اندوز ہوتا رہا، چیونٹم چباتا رہا۔

ایک گھنٹے بعد پھوگ دوڑتا آیا۔

”آپ یقیناً ماروی ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”مگر عمر سومرو صاحب! مجھے آپ سے مل کر بالکل بھی خوشی نہیں ہوئی۔“

عمر سومرو کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ یہ اس کی توہین تھی، جس کا وہ کبھی بھی عادی نہیں رہا تھا۔ اک غریب چرواہے کی بیٹی کی یہ ہمت وہ تپ گیا، چڑ گیا۔ اس کے کان غصے میں لال ہو گئے۔

ماروی رکھائی سے کہہ کر رکی نہیں تھی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کا مکا بنا کر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر زور سے مارا، خالص ڈیرا نہ انداز میں۔

”کونسا فکر نہ کریں، کہاں جائے گی؟ پھر پھر آکر آخر پھنسنے لگی۔“ پھوگ نے دلا سا دیا۔



حام شور کی ٹھنڈی ہوا میں، دریائے سندھ کے پانی کا لمس لے کر اس کے جسم سے ٹکرا رہی ہیں، اک فرحت بخش احساس اس کے دل میں انگڑائیاں لے کر بیدار ہوا ہے۔ اس نے اپنی کتابیں سرہانے پر رکھ دی ہیں اور خود گھر کی سے تاروں کی طرح شہر کی ٹھنڈائی روشنیوں کو ہر سڑی سادہ لکھ رہی ہے۔

اسے اوپر تھر تھاروں بھرا آسمان یاد آتا ہے اور نیچے ماں کی آنکھ سے بہنے والی شبنم اور پیٹھ سے لگے پیٹھ کی آدھی بھوک اس کی آنکھوں میں کمی تیرنے لگتی ہے۔

”اللہ سائیں تھر کی پیاس مٹا دے، ماروں کی بھوک مٹا دے۔“ تمہ دل سے دعا کی۔

بکریاں چراتا، اس کا باپ، لکڑیاں چنتی اس کی ماں اور گاؤں کے اسکول میں اب چاچا سا جن کی جگہ پڑھا تا ہوا کھیت سب ہی تو اس کے منتظر تھے کہ کب وہ پڑھ کر آئے اور صرف اپنے گھر کی ہی نہیں پورے گاؤں کی قسمت بدل دے۔

کھیت کے نام کا پینا ہوا چاندی کا وہ پتلا اس کے دل میں پیٹھی پیٹھی محبت دگاتا ہے وہ آپوں آپ مسکرائے

لگتی ہے۔ اس کے دل میں محبت کی گھٹائیں اٹھنے لگتی ہیں اور کھیت کی یاد برسنے لگتی ہے۔

اس کی دوستیں اس پر ہنستی ہیں۔

”ماروی کھیت یاد آ رہا ہے۔“

”وہ بھی بھلا کوئی بھولنے والا ہے، اس کی یاد موجود رہتی ہے ہر دلیے، بس کبھی کبھی دل کے کواڑ اور آنکھوں کی پاڑھ پھلانگ بیٹھتی ہے، نادان جو ہوئی۔“

وہ سر کو نفی میں جنبش دے کر یاد کو سرزنش کرتی ہے۔

وہ ماروی سے جس کے من میں اپنے ماروں (لوگوں) کی محبت لچکتی ہے۔ ان محبت کے جلووں میں کھیت کی محبت کا جلوہ سب سے نمایاں بنا ہوا ہے اور بھاری بن کر نمودار ہوتا ہے، وہ اس جلوے میں جلتی ہے اور جلا پاجاتی ہے۔

کھیت کی یاد کی لہریں چند سو میل دور ہوا کے رستے کھیت کی روح تک پہنچ کر اسے جگاتی ہیں اور ہرتی آگے گنگنا اٹھتا ہے۔

”سارا دن جلتی ہے مگر ظاہر بھاپ تک نہیں ہوتی۔“ اس کی آنکھیں کھینٹ کے بھٹائی کے بیت کے پیغام پر بھیجتی ہیں اور انگلیاں سیل کے کی پیڈ پر تھرکتی ہیں۔

بھٹائی کی زبانی وہ بھی پیغام بھیجتی ہے۔

”عین نیند نہیں کرتے، آنکھوں کی سستی اور نیند ختم ہو چکی ہے۔“

وہ گل ہو کر پھر جل اٹھتی ہیں، تمہیں یاد کرنے اے محبوب۔“

رات اپنے پلو سمیٹ رہی ہے اور محبت گزیدہ جاگتے ہیں۔ جب سارے لوگ نیند کی آغوش میں آرام کرتے ہیں۔



اس نے شمع سے رابطہ کیا، شمع جس کو وہ گھاس بھی نہیں ڈالتا تھا۔

”وہ تمہاری دوست ہے۔ تم پر اعتماد کرتی ہے“

میری سہیننگ گراؤ اس کے ساتھ۔ ” عمر سومرو کسی لگی پٹی کے بغیر بولا۔

”تم اس کے ساتھ کیوں سہیننگ کرنا چاہتے ہو۔ وہ تمہارے علاقے کی اک غریب لڑکی ہے۔“ شمع کو عمر سومرو کی خواہش بڑی عجیب لگی، وہ عمر سومرو جس کے لیے کئی لڑکیاں جان دینے کو تیار بیٹھی تھیں۔

”وہ اپنی چہری سمیت تجھے اچھی لگی ہے۔“ عمر سومرو نے مدعا بیان کیا۔

”کیوں؟ اس لیے کہ وہ تمہارے پیچھے دوڑنے والیوں میں سے نہیں اور یہ بات تمہاری غیرت کے لیے کسک بن کر رہ گئی ہے۔“ شمع کی آنکھیں بات کی تہ تک پہنچنے پر چمک اٹھیں۔

عمر سومرو ہکا بکارہ گیا تھا۔ لب بھینچ کر اک ساعت کو سوچا۔

”مجم مجھ بھی سمجھ لو، بس مجھے اس سے وہ ہستی کرنی ہے۔“ اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

”معاف کیجئے گا۔ میں نے فی الحال ایسی کوئی ایجنسی نہیں کھول رکھی۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھی۔ عمر سومرو نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑا۔ ماروی تک پہنچنے کا ایک ہی وسیلہ تو تھا۔

”میں تمہیں لین دین کو تیار ہوں۔“

”آپ کو غلط نہیں ہوتی ہے، سومرو صاحب، میں ضرورت مند نہیں۔“ اس نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا۔

”مجھے پتا ہے، تمہارے والد انٹرنیشنل این جی او میں بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ تم لوگ روپوں میں نہیں ڈالو میں کھیلتے ہو۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ شمع جربز ہوئی۔

”ضرورت صرف پیسوں کی نہیں انسان کی بنیادی ضرورت میں محبت کا رول بہت اہم ہے۔ آپ میرا کام کر دیں، میں آپ کا کردوں گا۔“ شمع خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

سومرو نے اس کی خاموشی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور کامیابی سے جال پھینکا۔

شمع نے جانے کے لیے قدم بردھائے۔

”ضرور سوچنا اس بات پر۔“ وہ اس کے پیچھے آیا۔

”میں منتظر رہوں گا۔“ وہ گاڑی تک آیا۔

شمع نے لمبی سانس لی اور گاڑی اشارت کر دی۔ وہ اسے جاتا دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی خاموشی ہمت افزا تھی اور امید دلاتی تھی کہ وہ اس کے پھینکے گئے جال میں ضرور پھنسے گی۔

عبداللہ کتالی کیرا تھا اور شروع دن سے شمع کی اس کی جانب دلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

عبداللہ اس کا یار تھا، وہ اس سے بھی کوئی نہ کوئی دلیل کر رہی لیتا، اس کی چار بہنیں تھیں۔ ان کی شادیاں کر دیتا اور عبداللہ سے شمع کی شادی اس کا پلان اس کامیاب سیاست دان کی طرح ناکام نہیں ہو سکتا تھا۔

جو حسب کو ساتھ لے کر چلنے کی بات کرتا تھا۔ وہ بھی ایک کامیاب سیاست دان وڈیزے کا بیٹا ہی تو تھا۔



”سلام چاچا!“ کھیت جھونپڑے میں داخل ہوا۔

”بابا، علیکم سلام۔“ دینتالی تلفظ میں پاندھی نے جواب دیا۔

”چاچا! آپ سے پوچھنے آیا ہوں۔ کوئی کام ہو، کچھ لینا ہو تو تادیں۔ میں شکر پار کر شر جا رہا ہوں۔“

”اڑے بابا! سارے کام پیسوں سے ہوتے ہیں۔ ہم مسکین مارو، غریبی پر صابر رو کی سوکھی پر گزر کرنے والے ہمارا کیا کام شہر سے، اس کے سودے سے۔“

بس اللہ سائیں کا شکر ہے، مالک نے ہمارا رزق اسی تھر کی ریت میں سے پیدا کیا ہے۔“ پاندھی نے لمبی تمہید باندھی۔

”توں ماٹھ تہ لڑ بات کرتا ہے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔“ بھاگی ہنستے ہوئے چند دھاگے ہاتھ میں پکڑ کر آئی۔

”بھلے بات کر، کس نے روکنا ہے تجھے۔“ پاندھی

خوش دلی سے نہیں دیا۔

”ابا! کھیت یہ نمونے کے دھاگے اور شیشے پکڑ ایسے لے آوریہ ان کے پیسے۔“ اس نے کھیت کو پکڑاتے کہا۔

”بس ابا! جب تک ماروی کی چھٹیاں ہوں تب تک کچھ سچ مکمل کروں، شہر میں جا کر بیچے گی تو اچھے پیسے ملیں گے، میری بچھڑی بتا نہیں کیسے گزارا کرتی ہوگی۔ پیسے اس کے پاس ہوں گے بھی کہ نہیں۔“ بھانگی کے گہجے میں تاسف در آیا۔

”ان شاء اللہ مالک سائین اس کے دن بدلے گا۔“ پاندھی نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

”آمین۔“ ان دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ وہ باہر نکلا صحن میں سہلستے ہوئے مور نے اس کو دیکھ کر آواز نکالی۔

”ماروی کی یاد لگی ہے۔“ اس نے مور کو پکارا۔ مور اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ کھیت نے سیل فون نکالا۔ ”ہیلو ماروی۔“

”ہاں بولو کھیت جلدی میں ہوں، پریڈ نکل جائے گا۔“ اس نے پھولی سائین سے کہا۔

”بس دو لفظ اپنے مور سے بول دو۔“ کھیت نے اسپیکر کھولا۔

”اوہ میرے مور کیسے ہو تم اور میں نہیں ہونا میں جلد آؤں گی۔“ مور نے اس کی آواز سن کر خوشی سے آواز نکالی۔ ماروی کی کھلکھلائی ہنسی ابھری۔

”یہ کس مور سے بات کر رہی ہو، دو ہاتھوں والا یاد پروں والا۔“ شمع کی کھلتی آواز اسپیکر سے ابھری۔

”جیب کربد تمیز۔“ ماروی کی بھنچی سی آواز پر کھیت دل کھول کر ہنسا تھا۔ ماروی نے کال کاٹ دی۔

”ابا! ماروی تھی؟“

”ہاں چاچی! جلدی میں تھی۔ رات کو آکر آپ سے بات کرو آؤں گا۔“

اس کی سکھی سہیلیاں اب میری نسبت سے اسے چھیڑتی ہیں۔ اس احساس نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے بھول کھلا دیے۔

کھیت اسے لینے آیا تھا۔

”کھیت میں اب وہ ماروی نہیں، میزے اندران چھ مہینوں میں کالی خود اعتمادی اور بہادری آگئی ہے۔“ وہ ہنسی۔

”مجھے پتا ہے ماروی! تو صدیوں سے بہادر ہے۔ یہ کوئی آج کی بات تھوڑی ہے۔“ کھیت کا لہجہ گہبھر ہوا۔

”پتا ہے کھیت، جب تم مجھے اس ماروی سے ملاتے ہونا، تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس ماروی کے اوپر بہت بڑا امتحان آگیا تھا۔ اللہ ہر بیٹی کو ایسی آزمائش سے محفوظ رکھے آمین۔“

”ماروی تو ماروی بنتی ہی ہے۔ اگر اس کی کوئی بچ کا امتحان نہ لیا جاتا وہ اس آزمائش پر پوری نہ اترتی تو وہ تھرکی لاکھوں عورتوں کی طرح بے نام ہی رہتی۔ اسے نامہ والا بنایا ہی اس واقعے نے تھا۔“ وہ ہنسی دیا۔

”دسم نہیں سمجھ سکتے کھیت، کسی لڑکی کے لیے اس کا اغوا ہونا موت ہے۔ چاہے وہ باعصمت واپس لوٹے مگر

دنیا اسے بے عزت کر کے رکھ دیتی ہے۔ یہ آج کی حقیقت ہے۔ مگر جو مگر رہے ہو، وہ بھی درست ہے

مگر ماروی کا حال ماروی کو بے حال کر دیتا ہے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں رہتا جب تک وہ ماضی نہ بن جائے

پھر اس کا قصہ داستان گودہراتے ہیں اور خراج تحسین کے ڈونگرے برساتے ہیں۔ مگر درحقیقت ماروی اپنی

زندگی میں اس ناموس، عزت و پارسائی کا کوئی فیض نہیں پاتی۔“ وہ مسکرائی۔

کھیت ہنسی دیا۔

”یہ بھی ہے کہ ہر ناموری کوئی نہ کوئی قربانی ضرور مانگتی ہے۔“ وہ بس سے باہر خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔

”اور ہر محبت بھی۔“ اس کی آواز دھیمی ہوئی، سرگوشی نما۔

”جیسے تھڑوں نے تھرکی محبت، بھوک جیسی قربانی

یاندھی کے اعتماد کو نہیں پہنچانے کا سبب بھی نہیں سکتا تھا۔

”تمہاری خاموشی تمہری تپتی رست پر کڑکتی دھوپ کی چادر بن جاتی ہے۔“

”بس کرو کھیت۔“ وہ جھینپتے ہوئے بولی۔
کھیت اس کے شرمانے پر دھیمے سے ہنسا۔ ”ایسا لگتا ہے جیسے تریاں (ٹیلوں کے نیچے بنے چھوٹے حوض) پانی سے لہالب بھر گئی ہوں۔ تمہاری آواز کی بارش سے۔“ ماروی کے ہونٹوں پر مسکان چھڑ گئی۔ بس میں اور مسافروں سے بے خبر وہ اپنی باتیں کرتے گئے بس اسٹاپ پر رک گئی تھی۔ ان کے گاؤں میں ابھی لنک روڈ کا نام و نشان نہ تھا۔ چھپر ہوٹل کے قریب وہ اونٹ باندھ آیا تھا۔ ہوٹل کا مالک اس کا دوست تھا۔ وہ دوڑ کر آیا، چائے پانی کا پوچھا وہاں بیٹھ گئے۔ تھکن اتارنے اور چائے پینے لگے۔

”بھھاؤ! راستے میں پریشانی تو نہیں ہوئی۔“
”نہ بھھاؤ! راستہ آسانی سے کٹا، بلکہ کچھ زیادہ ہی جلدی کٹ گیا۔“ کھیت کا سرگوشی نما آخری جملہ صرف ماروی ہی سن سکی اور ہونٹوں پر اندھے والی مسکراہٹ کو بخشل روک پائی، اس نے نظریں خلاؤں میں گاڑ دیں، جتنا رست اڑاتے ہوئے میا لے رنگ کی راجدھالی تھی۔

”ہا بھھاؤ! روڈ تو آج نہیں بن گئی ہے، بس اب تمہیں لنک روڈ بھی بن جائیں تو باقی سفر آسان بن جائے، گوٹھوں دیہاتوں تک بھی۔“ ہوٹل والا سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔

”فکر نہ کر بھھاؤ! یہ اپنی ماروی گئی ہے نا۔ شہر بڑھنے، بڑھ کر آئے گی تو کسی این جی او میں اسے اچھی سی نوکری مل جائے گی پھر کھینا۔ میرے گاؤں کی تو قسمت ہی بدل جائے گی۔“ کھیت فخر سے بولا۔

”ہاں بھھاؤ! تمہاری تو واقعی قسمت اچھی ہے، جو بھاگوں بھری ماروی ملی ہے۔“ ہوٹل والے نے ہنس کر چھیڑا۔

ماروی ذرا ہی مجزب ہوئی اور اس نے فوراً ”سرخ ہوڑ

ماٹتی ہے اور تمہری وہ قربانی دیتے، بھوکے رہتے ہیں، مگر تمہیں چھوڑتے۔ تمہری محبت، وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔ وہ اس ایمان پر ایمان رکھتے ہیں۔“ اس نے بہت گہری آہ نما سانس سندھ کے نہری علاقے کی فضاؤں کے سپرد کی اور چپ ہو گئی۔

”چپ کیوں ہو گئی ہو، بولو ماروی، بولو۔ جب تم بولتی ہو تو مجھے لگتا ہے۔ میں بھٹائی کی والی سن رہا ہوں۔ جیسے مائی بھائی کھڑی نیم کے نیچے گا رہی ہو، یا صادق فقیر کی آواز شیخ ایاز کے کلام سے کانوں میں رس گھول رہی ہو۔ جب تم معاشرتی علوم پر بات کرتی ہو، تو مجھے لگتا ہے میں امر جلیل کو بن رہا ہوں۔ تمہاری باتیں میرے دل پر ایسے برستی ہیں جیسے تمہری دھرتی پر بارش کی کن من برستی بوندیں۔ میرا دل سیراب ہو جاتا ہے، تمہری رست کی طرح جو رست بارش کی میٹھی بوندوں کو چوس لیتی ہے اور میں تمہارا کھیت، جس کا دل تمہاری مائھی مٹھڑی آواز سے — ہمارا ہو جاتا ہے۔ جیسے ساون کی بارشیں ہوں۔ تمہاری باتیں۔ تمہاری باتیں۔“ کھیت نے آنکھیں بند کر کے اسے جواب دیا۔

یہ کھیت اس کا سنگیت، سنگی ساتھی اس سے وہ شرماتا گئی۔ بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی سندھ کی شہری علاقوں کی سبز بریاں اپنے اختتام کو پہنچ کر تمہری رست میں بدل رہی تھی۔ شہر کے علاقے کا آغاز ہی دروڈ تک ہوا تھا۔ وہاں مرے ہوئے مور اور مویشیوں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔

”بولو ماروی، کھیت کی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔“ تمہاری چپ مجھے اچھی نہیں لگتی، تم چپ کرنی ہو، تو مجھے لگتا ہے جیسے تمہرے فط کا سناٹا چھا گیا ہو۔“

ماروی نے اس قحط سے نظریں ہٹا کر کھیت کو دیکھا۔ جو اس کی محبت سے آیا تھا۔ ان نظروں کے ٹاگرے سے محبت کا دریا بہتا تھا کھیت کا دل جاہا وہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور بنے ہونٹوں سے لگالے۔ مگر اس کی روایات اس کی خواہش پر بند باندھ دیتی تھیں۔ وہ چاچا

سے ہنسی میں پکڑی ہے۔ آنکھیں میچ کر اڑتی رست سے خود کو بچاتی ہے۔ آنکھ کھولتی ہے تو منظر بدل جاتا ہے۔

”اس میں بھلا کوئی شک ہے۔“ کھیت کی آواز میں خوشی رچ بس گئی۔

کارو نخر سے آنے والے تلوروں کی اک قطار اور نیچے رانگل لیے عمر سومرو ان کے شکار میں منہمک۔

”اب ہم چلتے ہیں۔ رات بڑ جائے گی۔“ اس نے ماروی کا ہیک اٹھا کر اونٹ کو بٹھا کر اسے بٹھایا۔

”اللہ واہی۔“

”رک جا کھیت۔“ وہ چیختی ہے۔ کھیت کے قدم فوراً ٹھمتے ہیں اس کی آواز کی ہیر یوں پر۔ وہ اونٹ کے ہٹھنے کا انتظار نہیں کرتی، چھلانگ لگا کر رست پر کودتی ہے۔ گرتی ہے اٹھتی ہے اور دوڑ پڑتی ہے۔

”اللہ واہی۔“ ہوٹل والا زور زور سے ہاتھ ہلا کر بولا۔ اس کے ہوٹل پر کارو نخر سے گھومنے والے سیاحوں کی اک بس آ کر رکی تھی۔ وہ ان کی چائے بنانے میں لگ گیا۔



”ارباب عمر امت کر یہ ظلم۔“ اس کی دھاڑ پر عمر سومرو کا نشانہ چوک جاتا ہے، تلوروں کی اڑان گولی کی آواز پر تیز ہو کر قطار تتر بتر ہو جاتی ہے۔

”ارباب عمر سومرو! آخر کب بنو گے اس دھرتی کے دوست کیوں تم کو مرنے چاہتے ہو تمہارے چند تلوروں کے عوض۔ شکاری دوستوں کے ہمراہ اپنے چند لچکوں کی تسکین کی خاطر۔“ ارباب عمر سومرو اسے دیکھ کر ہنسا۔

محبت کی مہار پکڑنے والا کھیت اپنے شانے پر مہار رکھ کر اونٹ کو دوڑائے جا رہا ہے اور اونٹ پر بیٹھی ماروی اس کے قدموں سے اڑتی ہوئی رنول میں دھندلے مناظر دیکھ رہی ہے۔ ہٹھوں (ٹیلوں) کی پسندیاں اونٹ کی اونٹ میں بنے ان لوگوں کے چھو پڑے اور اس کے۔ چھو پڑے پر بیٹھا اس کا مور خچن میں بندھی پھیڑ بکریاں اور ٹیلوں کے بیچ بنی نرایاں۔ لبالب ہر جاتیں اور لوگ اور مویشی اس کے پانی سے سیراب ہوتے پھری چوڑے والی بانہوں والی عورتیں خوش پیاں کرتیں۔ اپنے مویشیوں کو پانی پلاتیں اور اپنے گھر کے لیے پانی بھرتیں۔ وہ جھیلیں جن میں مٹی اڑتی رہتی وہ آباد ہو جاتیں۔

”تو وہی ماروی ہے نا جو یونی میں مجھ سے بات کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔“ وہ طنز سے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”تو میری مند بہار ہے۔“ محبت کا مہار پکڑنے والا پلٹ کر زور سے بولتا ہے۔ اس کی آواز پر نیلے سر اٹھا کر آتی ماروی کو دیکھتے ہیں۔ اور سورج پلٹ کر اپنی آنکھوں میں اس منظر کو قید کرتا ہے اور غروب ہونے کے لیے اپنی لال ٹمٹاتی بتی روشن کر لیتا ہے۔

”تو آتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے تھر کا ٹھ ختم ہو گیا ہو۔ یہ کھیت بھی تھر بن گیا تھا، تیری دید کا کیا سا۔“

”ہاں میں وہی ماروی ہوں جو تم جیسے ڈیروں کو منہ نہیں لگاتی کیوں کہ تم ظالم ہو، شکاری ہو، غدار وطن ہو،“ وہ غصے سے بولی۔

”اوہو اڑان تو تلور جیسی ہی تیز ہے، ٹکر آگے بھی ارباب عمر سومرو سے، جس کا نشانہ کبھی بھی نہیں چوکتا، ماروی!“ وہ دل کھول کر ہنسا۔

”نفرت سے مجھے تم جیسے شکاریوں سے۔“ عمر سومرو کے لیے اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ وہ اس کے لیے ٹوہن گئی تھی۔

”اڑے بس کر چھو کری اتنا آگے نہ بڑھ۔“ پھوگ اپنے سرداران کی مدد کو آیا۔

”تو چپ کر بکا، مال۔“ وہ اس پر دھاڑ کر پھر عمر سومرو

وہ اٹتے قدموں سے آگے بڑھتا پتے ماروی کو اپنے بے تالی کی کتھا بنا رہا ہے۔

ماروی نے ہوا کے دامن پھیلانے پر اپنی چنری زور

کی جانب بڑھی۔
 ”تم میرے گاؤں میں تلور کا شکار نہیں کر سکتے۔“
 ”یہ میرا علاقہ ہے۔“ عمر سومرو کو تاؤ آیا۔

”یہ میرا گاؤں ہے۔ یہ میری دھرتی ہے، یہ میری زمین ہے، تو جا کر اپنے علاقے میں شکار کر۔ میرے گاؤں میں نہیں، آئی بات سمجھ میں۔“ وہ شعلہ بن کر اس کو جلا رہی تھی۔ اس کی توانا آواز میں طاقت تھی۔ عمر سومرو زندگی میں پہلی بار کمزور ہوا۔ اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔
 ”سامیں بھوتار، چھوری کے منہ لگنا ٹھیک نہیں۔ چلیں اسپد۔“ پھوگ کے بازو سے پکڑ کر جیب میں بٹھانے پر وہ فوری بیٹھ گیا تھا۔

کھیت یہ سارا منظر حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ کتنی طاقت اور ہو گئی تھی ماروی۔ عجیب سی خوشی تھی جو سارے سراپے میں دوڑ گئی تھی۔
 ”ماروی۔“ اس نے پکار کر اطمینان کو دیکھا۔ جس کا آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

”یہ عمر سومرو، جب ادھر ادھر سے دل بھر جاتا ہے، تبدیل کی لیے یونیورسٹی میں دھکے کھانے آجاتا ہے، کسی نہ کسی لڑکی کے پیچھے وہاں میں اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی۔“ اس نے کھیت کی حیرت کو کم کیا۔
 ”علم بہت بڑی طاقت ہے، آج یقین آ گیا۔ ماروی!

جن لوگوں کے آگے ہم ہاتھ جوڑتے رہے ہیں صدیوں سے، آج ان کو لٹکا رہے ہیں۔ یہ پہچان ہمیں تعلیم نے دی ہے۔“ کھیت نے جالی جیب سے اڑنے والی دھول کو دیکھتے ہوئے کہا اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔

صدیوں سے غلام لوگ انگشت بدنداں ہو کر، انگریز کے پٹھوں کو وفاداری کے صلے میں ملی جاگیروں سے مرعوب غلامانہ ذہنیت رکھنے والے، خوف زدہ ہو گئے۔

”پاندھی تمہاری بیٹی نے قہر کر دیا۔ وڈیرے کے بیٹے کو لٹکا رہا ہے۔ اب دیکھنا رات تک سارا گاؤں لگا۔“
 ”وہ کھو عبد اللہ آ گیا؟“

اس کے اندر ہی اندر ایک طوفان اٹھتا تھا ایک غریب چرواہے کی بیٹی کی یہ مجال کہ اس کے علاقے میں اس کو شکار سے منع کرے۔ اسے رہ رہ کر غصہ آتا اور پھر وہ غصہ سارے میں تبدیل ہو جاتا۔

”کم بخت ہے، جی تو خوب صورت، آنکھیں ہیں کہ جھپٹیں، جس میں تیرے کو دل بے تاب ہو جا رہا ہے۔ ہرنی کی طرح چھال مارتی ہوئی اور شیر کی طرح دھاڑتی ہوئی۔ پھوگ اس وقت دل کر رہا تھا، ابھی اٹھا کر گاڑی میں ڈال لوں چھوری کو۔ بڑی اچھی لگتی ہے۔“ اس وقت اسے اپنے ہی منہ سے چھوری کا لفظ اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ بات اس کے اندر تبدیلی کی غماز تھی۔

”بھوتار سامیں! عام دن ہوتا تو خیر تھا۔ ابھی تو بڑے بھوتار سامیں کی ایکشن سر رہے۔ ایسا کرنے سے لوگ باغی ہو جاتے، ووٹ بینک برا اثر پڑتا۔“
 ”اسی لیے تورک گیا، اسی لیے تورک گیا۔“ ہتھیل پر مکا مارتے بولا۔ بے بس ہونا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ وہ اس مقام پر آکر کیوں بے بس ہو گیا ہے۔
 ”سامیں! گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔ ٹھنڈا کر کے کھاؤ۔“ پھوگ اس کی بے چینی بھانپ گیا۔
 ”دھبر نہیں ہوتا۔ اب صبر نہیں ہوتا۔“ وہ شہلنے لگا۔

میری باتوں پر یقین آجائے گا۔ وہ ماروی کی اکلوتی بااعتماد دوست ہے، ہو سکتا ہے، شمع اسے میری طرف راغب کرنے پر آمادہ ہو جائے۔“ عبد اللہ سوچ میں پڑ گیا۔



”قید الماء“

سے تو ماروی (روح) بھی مٹی کے پتلے میں مقید مگر اس پتلے کی توشان ہی عجیب کہ یہ مسجود ملائکہ کا گارے جیسی تھکنکھاتی مٹی سے بننے والے پتلے کے اندر خیر ہی خیر تھا۔ جب تک شیطان نے حسد سے شر پھیلا یا اس کے اندر پھر دو قوتیں کام کرنے لگیں خیر و شر کی۔

اور پھر ماروی بے چاری اور چونگ (شیطان) کے واسطے دوسرے نامیدی اور بھٹکانے کے جتن اور ان آلائشوں کے درمیان مجبور محض ماروی بار بار خودی اور انا کو کھو دینے کی فکریں ماری ماری پھرتی ہے۔

”جر“ کو چھوڑ کر ”کل“ میں فنا ہونے کو بے تاب

مگر وہ تو چھپ گیا۔ عمد لے کر پھر اس گندگی بھری دنیا میں بیچ کر، اب مجھے ڈھونڈ۔ ندائے لیلر ”عالم ارواح“ کا عمد یا در پڑنا۔

”کہاں ڈھونڈوں؟ کہاں ڈھونڈوں؟ ماروی سرگرداں حیران و پریشان آلائشوں کے درمیان لرزتی جاتی۔

”اپنے اندر ڈھونڈ۔“ لطیف الاپتا۔
”اپنی پہچان رکھ۔ خود کو پہچان جا۔“ تپیل سرمست پر عشق حقیقی کی مستی چڑھتی۔
”جان لے، اپنی روحانی طاقتوں کو۔ پھر دیکھ۔“ اس ایک ”کی معرفت مل جائے گی۔

صوفی ستار بختا۔ عشق کا ساز بلند ہو جاتا۔ ماروی جسم کی چہرے اور ڈھ کر ناچتی، بیابانوں میں ریگستانوں۔ کبھی عمر (نفس) کی پرستش سے بچا کر اپنی عصمت کی لہنی کی حفاظت کرتی اور کبھی پھوگ (شیطان) کے شر سے نزار ہوتی۔

پھوگ فوراً باہر نکلا اور اگلے ہیروں کو اپس پلٹا۔
”سامیں عبد اللہ صاحب ڈرا بنگلہ روم میں آپ کے منتظر ہیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا مشروب کا گلاس وہیں رکھا اور تیزی سے ڈرا بنگلہ روم میں آیا۔
”عبد اللہ! تم میرے دوست ہو اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”وزیر کے بیٹے کو میری مدد کی کیا ضرورت آن پڑی ہے یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔“ عبد اللہ کی حیرت دیدنی تھی۔

”تم شمع سے شادی کر لو۔“
عبد اللہ اس کی بے سکی بات پر بے ساختہ ہنسا۔ ”مگر کیوں؟“

”سو فونے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔
”ہمیں ادھار کا قائل نہیں فوراً قرض چکاتا ہوں۔
تمہیں پتا ہے تم بڑھ کر نکلو گے پھر بھی تمہیں لڑکائی نہیں ملے گی۔ میں تمہیں سترہ گرنڈ کی پوسٹ دوں گا۔
تمہاری بہنوں کی شادی کے اخراجات برداشت کروں گا۔ میری ایک بات ماننے میں تمہارے ایک نہیں رہیں فائدے ہیں۔“ وہ اپنے سارے پتے بڑی ہو سیاری سے پھینک رہا تھا۔

”ہمیں مانتا ہوں میں تمہارا دوست ہوں، مگر یہ اتنا کچھ تم۔۔۔ میری روہتی میں نہیں کر رہے پھر آخر کس لیے؟“ عبد اللہ الجھ گیا۔ عمر سو مزید لحظہ چپ ہوا، تھوک نکل کر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔
”تمہیں پتا تو ہے۔“ وہ لڑکی۔

”ماروی!“
”ہاں وہ میرے گلے کا کاٹنا بن گئی ہے۔“
”صرف گلے کا کاٹنا یا دل کا درو بھی۔“ عبد اللہ ہنسا۔

”پتا نہیں۔“ وہ شیشے کے دروازے سے باہر دیکھ کر جھنجھلا کر بولا۔

”میں نے شمع سے بات کی تھی، اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ شمع کی تم سے محبت ڈھکی چھپی بات نہیں۔ تم اگر اس سے شادی کی ہاں بھرا لو گے تو اسے

تو بل لیتے ہیں۔
 ”کراچی کی درسگاہوں کو چھوڑ کر سندھ یونیورسٹی
 میں پڑھنا گیا وجہ ہے؟“
 ”میرا ڈومیسائل کراچی کا نہیں اس لیے۔“
 ”اوپہ تو یعنی آپ بھی نسائی پابندی کا شکار ہوئیں۔“
 ”جی بالکل۔“

شع اصل میں بات یہ ہے کہ میں اپنی ای کو آپ
 کے گھر رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں، آپ کو کوئی
 اعتراض تو نہیں۔“
 شع کو لگا اس کا دل ابھی سینے سے باہر کود جائے گا۔ وہ
 اس اچانک ملنے والی خوشی سے بے حال ہوئی جاتی
 تھی۔

”نہیں نہ نہیں بالکل بھی نہیں۔“
 ”اور آپ کے گھر والوں کو؟“
 ”عبداللہ! آپ کو بتا ہے، ہم آزاد خیال لوگ ہیں۔
 ہمارے والدین کو ہمارے فیصلوں پر کوئی اعتراض نہیں
 ہوتا۔“
 ”پھر کب بھیجوں گا وہ اس کام میں کوئی تاخیر نہیں
 چاہتا تھا۔“

”جب آپ کی مرضی۔“
 ”ٹھیک ہے میں کل ہی اہلی کو بھیجتا ہوں۔“ اس
 نے کہتے ہوئے فون بند کیا اور اپنا نٹمنٹ لیٹر کو نئے
 سرے سے پڑھنے لگا۔ عمر سومرو ہنس رہا۔
 ”اس سیٹ پر بٹھایا ہے تمہیں جہاں مال ہی مال
 ہے۔ فنانس ڈپارٹمنٹ میں آؤٹ آف آفس۔ مال بٹورنے
 والوں سے اپنا حصہ لو اور پرکھوں کی اخوت سے جان
 چھڑاؤ۔“ وہ تھا مستقبل کا سیاست دان سارے
 سیاسی گرجانتا تھا۔

”میرا کام ضرور یاد رکھنا۔“
 ”میں تمہاری محبت تمہیں دلانے میں ہر ممکن
 کوشش کروں گا۔“ عبداللہ نے اس سے ہاتھ ملا کر
 عہد کیا اور اس کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔
 ”ماروی! تم مجھ سے بچ نہیں سکو گی۔ تمہاری دوری
 میری مجبوری کبھی نہیں بن سکے گی۔ میں تمہیں ہر

ماروی کہاں، اگر پھنس جاتی۔“
 قید الما (نقدیر داس نے پانی کی قید میں) جو ہوتا تھا اس
 ہونی کو لکھ کر قلم سوکھ گیا۔ اور اب بیچاری ماروی اس
 ہونی کے ہونے کا خوف دل میں پالتی اور پھوگ اس
 خوف کی نیل کو پانی دیتا۔

ماروی اندھا دھند اس قلم کی سیاہی کے راستے پر
 بھاگتی جاتی، عمر کوٹ کی بھول بھلیوں میں اس ”یکتا“ کو
 بھول بھول جاتی جو راستہ پکڑنا تھا وہ نہ ملتا۔
 راستے کا ہی تو روگ تھا سائیں، ورنہ کون نہ مر جاتا
 اس زندگی میں راضی بہ رضا۔

راہ کا پتا بھلا بیٹھی اوہرا دھر گم ہوتی رہی۔ ذات کو فنا
 کرنی خودی کو مارتی اپنا کو دفناتی رہی۔ پتا ہی نہ چلا ماروی
 کو۔ یہ واہمہ ہے یقین نہ تھا۔ رستہ ہے منزل نہ تھی۔
 سرائے زندگی میں کیا کیا نہ صدقات تھے۔
 بس لٹا جان کی سوگی۔
 مگر نہیں گئی، نہیں گئی۔

ماروی کے قلب میں گونج ہوئی بس جان ہی تو جانی
 ہے۔ اک بار ہی تو جانی ہے تو کیوں نہ قربان کر، اس
 ایک اللہ ایک اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر۔
 راستہ تو یہی بچھائی رہا اس کے حبیب صلی اللہ
 علیہ وسلم کا دائرہ بنیکڑ کر چلنے کا اس کو پانے کا تو بس
 ایک رستہ تھا ندا آئی۔

”میں ان کی شہہ رگ سے قریب ہوں۔“

شع کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔
 ”ہیلو، میں عبداللہ بات کر رہا ہوں۔“
 ”اوپہ عبداللہ تم۔“ اس کے دل کی دھڑکن ایک دم
 تیز ہوئی۔

”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 مگر ابھی تو میں کراچی ہوں۔ آپ کو بتا ہے، میرا گھر
 وہیں ہے۔ جیسے ہی چٹنیاں ختم ہوتی ہیں میں آتی ہوں۔

اس دن گاؤں میں پولیس بھیجنے کا شوشہ چھوڑ کر اس نے گاؤں والوں کو ہراساں کیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ الیکشن سربر ہے وہ ایسا بھول کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہاں اک کتنی اس نے چھوڑ رکھی تھی۔ جو ماروی اور اس کے رشتے داروں کو پھوگ کی حکمت عملی کے تحت پریشان اور دباؤ میں لے۔ گاؤں والوں کی معرفت۔ پھوگ اس دنیا میں شیطان کا روپ تھا اور ہر طرح کے شیطانی، تھکنڈوں اور ہتھیاروں سے لیس۔



ہاسٹل کے کمرے میں آتے ہی شمع اس سے لپٹ گئی۔
 ”اوہو! اتنا پیار کا ہے کو۔“ ماروی مزاحیہ انداز میں بولی۔

”یہ دیکھو۔“ شمع نے اپنی انگلی اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔
 ماروی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھا۔ ”کوئی خاص بات ہے اس میں؟“
 شمع نے ماروی کے استفسار پر لب بھیج کر اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ منگنی کی انگوٹھی ہے۔“
 ”اچھا کس سے لب ہوئی۔“

”عبداللہ ہے۔ دو دن پہلے۔“ شمع کے چہرے پر محبت ملنے کی خوشی نمایاں تھی۔
 ”بد تمیز! مجھے اب بتا رہی ہو۔“ ماروی گئی۔
 ”سوچا، فون برانک جمنٹ رنگ دکھانے سے تو رہی۔ اس لیے دکھا کر سامنے بٹھا کر بتاؤں گی۔“ شمع ہنسی۔

”اچھا مبارک ہو۔ شکر تمہیں اپنی محبت ملی، مگر کیسے فتح کیا اسے آنا“ فانا۔“ ماروی اسے گلے لگا کر بولی۔ اس کی آخری بات پر شمع نے ناؤنستگمی سے لب کاٹا۔
 ”محبت میں بڑی طاقت ہے، ماروی! فتح کر کے فتح پاتی ہے۔“ وہ ہنسی۔

”دیکھنا، ایک دن عمر سومرو کی محبت بھی تمہیں فتح کرے۔“

قیمت پر حاصل کروں گا۔ پاندھی چڑھا ہے ہاکی بیٹی! تم کیسے بھاگ سکتی ہو مجھ سے۔ ارباب عمر سومرو کو اتنا مجبور سمجھ لیا ہے کیا۔“ وہ اضطراب سے ٹھلنے لگا۔
 ”سائیں! وہ شیرنی آخر کو ہرنی بن کر ہمارے سائیں کے دام میں پھنسے گی۔“

پھوگ نے ہمیشہ کی طرح اس کی ہمت بندھائی۔ اس کے دل کو ڈھارس ملی۔ اس نے شمع کا نمبر ملایا۔
 ”جی عمر صاحب!۔“

”میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اب آپ اپنا وعدہ وفا کریں۔“

”میری کوشش آپ کے ساتھ اور آپ کے حق میں ہو گی، مجھے جو خوشی آپ کے توسط سے ملی ہے میں چاہوں گی وہ آپ کو بھی ملے۔“ وہ خوشی سے شاد لہجے میں بولی۔

”مجھے آپ پر یقین ہے۔“
 ”میں بھی یقین ہے۔ آپ کو دھوکا نہیں دوں گی۔ عمر سومرو صاحب، یہ ہی آپ کے اعتماد کو بھیس پہنچاؤں گی۔“ اس نے فون بند کر دیا۔



پھوگ اس کا کمدار اس کا ہاتھ بیلے، اس کا نوکر، محرم راز اور ہر جرم میں شریک ساتھی تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس کے ساتھ رہتا آیا تھا۔ پھوگ کا باپ اس کے باپ حاکم سومرو کا کمدار تھا اور پھوگ اپنے باپ کا جانشین، وہ دونوں اپنے باپوں کے جانشین، اکٹھے پلے بڑھے، مالک و نوکر کے حیثیت میں۔

مگر آگے چل کر پھوگ اس کی ذات کا لازمی جز بن گیا اس پر جان چھاور اور ہر جائز ناجائز خواہش پر سر دھڑکی بازی لگانا، پھوگ کی زندگی کا مقصد ٹھہرا۔

پھوگ یہ کیسے قبول کرنا کہ ماروی اس کے سائیں عمر سومرو کو انکار کر دے۔ ٹھکرا دے، نظر انداز کر دے، سو وہ جال پر جال بننے لگا، زاو پر زاو کھیلنے لگا۔ ہر طرز کے جال اس نے ماروی کے گرد پھیلادے۔

والا ڈمپل بہت خوب صورت لگتا جو کہ مسکراہٹ پر کم اور ہنسنے پر اور زیادہ نمایاں ہو جاتا تھا۔

اور عمر سومرو اس ڈمپل پہ اپنا دل ہار گیا تھا۔ اس دل ہارنے سے پہلے وہ صرف اس سے دوستی کا خواہش مند تھا۔ اور پیسوں کے عوض خریدنے کا متمنی مگر اس کی بلند کردار نے یہ باتیں ناممکن بنا دیں۔

وہ ماروی کو رکھیل بنانے کے ارادے سے بھی باز آ گیا۔ یہ تھا تو اس کے شان کے خلاف کہ اک شاہی وڈیر ایک جروا ہے پانڈھی کی بیٹی سے شادی کر لے مگر اس نے یہ گنجائش بھی نکالی اور اسے دوسرے درجے کی بیوی بنانے کی حیثیت پر خود کو راضی کیا۔ کیوں کہ نہ تو اس کی وڈیرانہ اناکی تسکین ہو رہی تھی اور نہ ہی آتش محبت ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ وہ دو آتشہ احساس میں گھر گیا۔ پھوگ اپنے تیس ماروی کا رشتہ لینے گیا تھا۔ نرنی۔ بابا زمین کا لالچ اور پیسے، آسائش کی تسلی سب کچھ ہی تو ٹھکرا دیا پانڈھی نے۔

”ابا! ہماری بیانی بچپن سے منسوب ہے۔ ہم اپنی زبان کو جھوٹا کر کے اس نسبت کو دولت پر قربان نہیں کریں گے۔ تم عمر سومرو سائیں سے معذرت کر لو اور عمر سومرو سائیں ہمارے علاقے کا چنگا مرٹن (بردا آدمی) ہے وہ ضرور ان روایتوں سے آگاہ ہوگا۔ برا نہیں مانے گا اور اپنے دل کو بھی سمجھائے گا پانڈھی کے اس جواب پر پھوگ نے شکر ادا کیا کہ عمر سومرو رشتہ مانگنے خود نہیں آیا۔

”جا چاہا! چنگا مرٹن سمجھتے تو انکار نہ کرتے۔ تمہارے گھر تو لکشی چل کر آئی ہے، خود ہی اپنے بھاگ کولات مار رہے ہو۔“ پھوگ اپنے غصے کو بابتے بولا۔

”ابا! ہمارا کیا بھاگ کیا بھاگ؟ ہم مسکین لوگ روز جنگلی سبزیاں، میوے چن کر لاتے ہیں اور ہانڈی چڑھاتے ہیں۔ ہم نے تو کب کی طمع کو طلاق دے دی۔ دنیا دو دم آج سے کل نہیں، دنیاوی دولت پر اپنا ایمان نہیں بچھیں گے۔ بابا ہمیں معافی دو، خدا کا رن پانڈھی نے اپنے دونوں ہاتھ پھوگ کے آگے باندھتے کہا پھوگ جبر ہونے لگا۔

لے گی۔“ اس کے ملے ہوئے ٹارک کا آغاز کیا۔

”بکو اس بند کر۔“ ماروی ناراض ہوئی۔

”پاربت کرنے میں کیا حرج ہے۔“

”مجھے مذاق میں بھی یہ بات گوارا نہیں۔“ اس کی ناراضی ہنوز برقرار تھی۔

”ایک بار سوچ کر تو دیکھو۔ آخر اتنا بڑا وڈیرہ وزیر کا بیٹا، مستقبل کا وزیر، تمہاری محبت کا اسیر ہوا ہے۔“ شمع نے پریکٹس کی ہوئی ساری باتیں دہرا دیں۔

”ان وڈیروں اور وزیروں کی محبت بھی الیکشن میں وڈر سے کیے ہوئے وعدوں کی طرح ہی ہوتی ہے، جو کامیابی کے بعد ڈسٹ بن کی نذر ہو جاتے ہیں۔ سمجھیں تم۔“ ماروی کا اندازنا صحانہ تھا۔

ماروی! ایسی بات نہیں ہے یار۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سارے وڈیرے ایک جیسے تھوڑی ہوں گے۔“

”جس بات کا تمہیں جو یقین نہیں، اس کا یقین مجھے دلانے کی کوشش کیوں کر رہی ہو۔“

”اف تو بہ باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔“ شمع ہنسی۔

”اور تمہیں شرم آئی چاہیے۔ تم میری دوست ہو، عمر سومرو کی نہیں۔ تمہیں میری محبت کا احساس ہونا چاہیے۔ عمر سومرو کی انار پرست نام نہاد، خالی خولی محبت کا نہیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، بچپن سے کھیت سے منسوب ہوں اور ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کے ان مول دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں۔“

ماروی نے اپنی کلائی میں بندھے دھاگے کو انگلی سے کلائی کے چوگرد پھرایا۔

شمع کے بات کرنے کے سارے راستے بند ہوئے۔ اس نے باقی کوشش بعد میں کرنے کا سوچا۔

”نام نہاد انار پرست، خالی خولی محبت، واہ ماروی کیا اصطلاحات ایجاد کی ہیں یار، تمہارا بھی جواب نہیں۔“

وہ اپنی خفت مٹانے کو ہنسنے لگی۔

اس کی ہنسی کا ساتھ ماروی کی جان دار خوب صورت مسکراہٹ نے دیا۔ اس کے گال میں پڑنے

”چاچا! اب بھی وقت گیا نہیں تم تسلی سے پھر اس رشتے پر سوچنا۔“

”ابا! میرا جو جواب آج ہے۔ وہ ہی کل بھی ہوگا۔ ہم مسکین مارو ہیں۔ وڈیروں کی جوتی میں پیر نہیں ڈال سکتے ہماری جان بخش کرو کہو تو میں پکا پگڑی اتار کر تمہارے پیروں میں ڈالوں۔“ پاندھی اس کی تکرار سے عاجز آ گیا۔

”نہیں نہیں چاچا! تو بڑا ہے تیری پگڑی کی۔ عزت کرتا ہوں۔“ پھوگ نے آنے والے طیش کو حکمت عملی سے روکتے کہا۔

وہ اب بھی بات بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

”وہ کی پیری یہ ہر کوئی ڈیلے مارتا ہے۔ جس گھر لڑکی ہو وہاں رہتے تو آتے رہتے ہیں۔ تمہاری اپنی چیز ہے یہاں تو ہاں نہیں تو نہیں تمہاری اپنی مرضی ہے۔“ وہ اکتھتے ہوئے اس کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر بولا۔

”اس کی ہمت تو دیکھو سائیں! اس نے آپ کی رشتے داری سے انکار کیا۔ بد بخت کہیں کا۔“ پھوگ کو براہ رہ کر پاندھی پر غصہ آ رہا تھا۔

”اس کی ہمت بر میں خود حیران و پریشان ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ عمر سومرو اچھ گیا۔“ سائیں! اس نے سب جیسے بادشاہ زاوے پر ہنس بول کے درخت کے نیچے چار بچوں کو پڑھانے والے کھیت کو ترجیح دی ہے کہاں دو ٹکے کا کھیت کہاں آپ! پھوگ اپنے انہی کام میں مشغول تھا۔

”پاندھی نے میرے لیے انکار کیا ہے میرے لیے۔“ عمر سومرو اپنے سینے الٹی مارتے بولا ”ہم اسے عزت دے رہے تھے۔ اپنا رشتے دار بنانا چاہ رہے تھے“ مگر اس نے گھمنڈ کیا ہے اب اس کو یہ گھمنڈ بہت مزہ گاڑے گا۔“ اس نے میز برلات ماری۔

”ہاں سائیں بھگتے گا وہ بھگتے گا۔“ پھوگ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔

”ارے ہم کسی کو رکھیل بنا کے رکھیں تو بھئی بڑی

بات ہے۔ اس کے گھر والے ہماری جوتیاں چاہتے ہیں۔ ہم ان کا مقدر بدل دیتے ہیں۔“

”ہاں سائیں یہی بات ہے یہی حقیقت ہے۔“ پھوگ کو یاد آیا اس کی پھپھی بھی حاکم سومرو کی رکھیل بن کر مر چکی ہے اور ان کے پاس یہ دولت اور یہ کم داری اس کے مرہون منت ہے۔

”سائیں شکر ہے کہ بڑے بھوتار سائیں کو خبر نہیں۔ وہ پاندھی کو تو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے مگر ہمیں بھی نہیں چھوڑتے مجھے تو الٹا لڑکا دیتے۔“ پھوگ یہ سوچتے ہی کانپ اٹھا۔

”فکر نہ کر۔ بڑے سائیں کو پتا نہیں چلے گا۔“ اس نے ڈھارس بندھائی۔

”میں اب دکھتا ہوں شیخ اور عبداللہ لقتا ساتھ دیتے ہیں۔“ شیخ کا یاد آتے ہی اس نے لبیر لایا۔

”اور تاناؤ شیخ بھابھی! میرا سن کہاں تک پہنچا۔“

”عمر بھائی! اس کاٹھ کی الوٹیل پتھر کا دل ہے پھلتا ہی نہیں مگر میں بھی وقتاً فوقتاً“ آپ کے ذکر سے اسے

چھیڑتی رہتی ہوں کہ شاید آپ کا نام اور محبت سنتے سنتے اس کی دل میں بھی نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔ وہ تو آپ نے سنا ہو گا کہ پتھر بھی اگر قطرہ ٹپکتا رہے تو بالا آخر

سورخ بن جاتا ہے۔“

”اس سورخ بننے تک ہمارا دل ہی نہ برباد ہو جائے۔“ عمر سومرو جھٹاتے ہوئے ہنسا۔

”اللہ نہ کرے۔ آپ کی نخت سچی ہوگی تو بالا آخر جیت ہی جائے گی۔“ شیخ نے آسرا دیا۔ اس نے شیخ سے دوسرے دن کی منصوبہ بندی پر بات کر کے فون بند

کر دیا۔

”اس کو اگر غور سے تو وہ خاک میں ملاتا ہے۔ گھمنڈ توڑتا ہے۔ اسے روندنا کون سا مشکل کام تھا مگر اس کی وڈیرانہ اناکی تسکین اس میں تھی کہ وہ خود بخوبی اس کی طرف مائل ہو۔ وہ اسے محب بن کر نہیں محبوب بن کر تسخیر کرنا چاہتا تھا اور یہی اس کی بھول تھی کہ اس کے آگے بھی ناروئی تھی۔ وہ ناروئی جسے لوئی رنج بچانا آتی

لہجے میں بولی۔

تھی جسے اگر تسخیر کر سکتی تھی تو وہ سچی محبت تھی دنیا کی
لاچ اور فریب نہیں ناہی شاہانہ ٹھانٹھا باٹ۔



”ہاں سارے شرفا اور ان کے کل پرزے خلاؤں
میں ہی رہتے ہیں۔ سنہ زمین پر دیکھتے ہیں نہ ہی زمین کے
مسکین مارواں کی نظر میں اپنے جیسے انسان ہیں۔ وہ تو
کیڑے مکوڑے ہیں۔ ساری نعمتیں ساری
آسائشات ان کے لیے ہیں۔ یہ گداگر شرفا جن کا
کاسہ بیرون ملک امداد سے پُر ہو کر ان کے پیٹوں میں چلا
جاتا ہے پورے کا پورا ملک ہڑپ کرنے والے کیا
جانیں کہ بھوک کیا ہوتی ہے، غم و غمست کیا ہوتی
ہے۔“

وہ دونوں کلاس روم سے باہر نکلیں۔
”یار! بھوک لگی ہے۔ ذرا کینٹین تک چلو میرے
ساتھ۔“ ماروی شمع کی بات پر ہنسی اسے تھریوں کا کم
کھانا آیا۔

”تم کھاتے مٹے لوگوں کی بھوک کبھی ختم نہیں
ہوتی۔ جب دیکھو تمہیں بھوک ستاتی رہتی ہے۔“
”تم تو ماروی لوہے کی بنی ہو یا کانٹھ کی میرے خیال
میں پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ تب ہی تو سنگ دل ہو ذرا رحم
نہیں آتا عمر سو مرو پر۔“

”ایسی بات نہیں ماروی! ہم لوگ غریبوں کا بھی
بہت خیال رکھتے ہیں، ہر ممکن مدد کرتے ہیں بیرون
ملک ایڈ کی بات شمع کے دل پر لگتی تھی۔“

”بھرے پیٹ والے کیا جانیں بھوک کاٹنے والوں کا
درد؟“ ماروی کی آواز کینٹین کے شور میں گم ہوئی۔
سینڈ ویل سائنس نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ تھریوں زچہ و بچہ
کے لیے حکومت اور این جی اوز کے پاس کوئی پروگرام
نہیں۔ نہ ڈراپس نہ انجکشن، نہ گولیاں نہ ہی
سپلینٹ، جو زچہ و بچہ کی قوت مدافعت کو برصا سکے۔
اور شرح اموات پر قابو پایا جائے مگر کیوں کریں گے
وہ ایسا ان کے ہاں تو صرف فوڈ پروگرام ہے۔ تاکہ گندم
میں ریت بھر کے وہ اپنے پیٹ کے اینڈوٹھن کا انتظام کر
سکیں، اربوں روپیہ فوڈ پروگرام کی نذر ہو جاتا ہے مگر
تھریوں کی بھوک و غمست ویسی ہی رہتی ہے۔ “شمع اس
کی ہر بات پر سر ہلا کر تائید کر رہی تھی۔

”ہر بات میں عمر سو مرو کی مثال لانا کہاں کی دانش
مندی ہے، یہی تو خرابی ہے تم مادیت پرستوں کی ذرا
عہدہ دیکھا ”دولت“ دیکھی وہاں پر سنس شروں؟“
ماروی کے لہجے میں تائید در آیا۔

”یار! ہم لوگ ایسے بھی گئے گزرے نہیں، ہم
زندگی کی دوڑ میں کامیاب لوگ ہیں۔ محبت بھی کر ہی
لیتے ہیں۔“ شمع نے جان بوجھ کر عمر سو مرو کے ذکر سے
گریز کیا۔ تاہم ماروی اس پر شک نہ کر سکی۔
ماروی اس کے انداز پر ہن پڑی۔

”ہاں، محبت بھی کر ہی لیتے ہیں۔ ذرا محبوب کی بات
بری لگی گالیاں شروع، ذرا اسی بے توجہی پر محبت سے
دست بردار۔ در در پر دل پھینکنے والے۔“ اس نے اپنی
دوسری روم میٹ کی مثال دی۔

”دیکھو ماروی! ایک بات تو تمہیں ماننے پڑے
گی۔“ وہ کینٹین کی طرف چلتے ہوئے پھولی ہوئی سانس
سے بولی۔

”ہم ہیں ترقی یافتہ لوگ، بے کار چیزوں کو بیرون کی
زنجیر نہیں بناتے اور آگے بڑھتے ہوئے خلاؤں کے سفر
پر روانہ ہو جاتے ہیں، دیہاتیوں کی طرح ست
نہیں۔“ شمع نے اپنی بات میں وزن پیدا کیا۔ ماروی
نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا اور اپنے مخصوص بے باک

”تم ٹھیک کہتی ہو ماروی! یہاں اگر کرپشن نہ ہو تو
یقیناً ان اربوں روپے سے بہترین فوڈ پروگرام چل
سکتا ہے۔ ویسے تمہاری یہ ماں اور بچہ کے سپلینٹ
وغیرہ والی تجویز قابل غور ہے۔ میں ضرور پاپا سے
ڈسکس کروں گی۔“ وہ برگر کھاتے ہوئے بولی۔

”اس لیے شمع کہ یہاں گندم اگر مل بھی جائے تو وہ
پورے گھرانے کی کفالت کرتی ہے۔ ماں اور بچے کو تو
مکمل خوراک چاہیے۔ ان کے لیے یہ فوڈ پروگرام
بیکار اور نامکمل ہے۔ ان کے لیے الگ سے پروگرام ہو

”جب رانی بنا کر رکھوں گا تو نیا کی ہر خوشی تمہارے قدموں میں ہوگی۔ تو یہ نفرت خود بخود محبت میں بدل جائے گی۔“

ماروی آپ سے تم پر آنے پر اور زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش سے۔ تب اٹھی۔

”کتنی رانیاں ہوتی ہیں۔ تمہاری حویلیوں میں اور کتنی کنیریں؟ میں اچھی طرح سے جانتی ہوں، یہ جھانسنے کسی اور کو دیتا۔“ وہ کہتے ہوئے غصے سے اٹھی، عمر سومرو نے اسے روکنے کو اس کا ہاتھ پکڑا۔

”رکو رکو۔“ وہ مخمور لہجے میں بولا۔
کینٹین میں سارے لڑکے لڑکیاں ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

سرگوشیاں مہیٹیاں، اور ہود، دلی دلی ہنسی کی مختلف آوازوں نے اسے غیرت کے کٹھنوں میں لاکھڑا کیا۔

”ہاتھ چھوڑو میرا جیسا انسان۔“ وہ چیخی۔
”نہیں نہیں، اتنے لوگوں کے سامنے پکڑا ہے تو چھوڑنے کے لیے تو نہیں۔“ وہ اپنی ڈویر اٹھاتے دھری سے بولا۔

ماروی جو دوسرے ہاتھ سے اپنی چہری سنبھالے ہوئی تھی اس نے ہاتھ کو آزاد کیا اور پوری طاقت سے اس کے منہ پر جڑا۔ عمر سومرو نشے میں لڑکھڑا گیا۔ ماروی کا ہاتھ خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماروی دونوں ہاتھوں سے اپنی چہری سنبھالتی ہوئی۔ تیزی سے کینٹین سے باہر نکلی تھی۔

عمر سومرو جس کو توجہ کے خلاف تھپڑا تھا وہ چند لمحوں تک پورے مجمع کے ساتھ نہیں آگیا تھا۔ اضطرابی طور پر اپنا ایک ہاتھ گل پہ رکھتے چینا۔

”نہیں چھوڑوں گا منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے چنان سے سر نکرایا ہے۔ پاش پاش ہو جاؤ گی۔“ اس دھمکی نے دروازے تک ماروی کا پیچھا کیا تھا۔

سب لوگوں کو ایسے سانب سو گھڑ گیا ہو۔ شمع اس کے سر کی طرح بریشان بیٹھی تھی۔ جس کے نہ چہرے پر ہونے بھی ڈانٹر کٹھن نے ناز بنا کر اس میں ڈال دیا

جو صرف ایل اور پیچ کے لیے ہو۔“
”السلام علیکم۔“ عمر سومرو کے سلام پر ماروی کو اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑی۔

”و علیکم السلام“ اسے عمر سومرو صاحب آپ ٹھیک وقت پر پہنچے، اصل میں ہم آپ کے تھر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ آپ لوگ تو با اختیار ہیں تھر میں ماں اور بچے کے لیے کوئی خاص اسپتال ٹوڈ پروگرام کیوں نہیں بناتے، ماروی کے پاس اتنی بہترین شجاریز ہیں۔“ شمع پر جوش ہو کر بولی۔

ماروی اس کی بات پر طنزیہ ہنسی۔
عمر سومرو الگ اس کے سلام کے جواب نہ دیتے پر

”ضرور، اگر ماروی کے پاس اچھی شجاریز ہیں تو میں اپنے بلا سامنے کے سامنے رکھوں گا۔“ عمر سومرو ماروی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”شمع اچھے بابا ہوں سے پورا تک رہی ہو۔ جو کاٹنے دیتا ہے وہ پھل نہیں دیتا۔“ ماروی نے ایک لمبے کو بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

”ماروی! ببول اگر انسانوں کو بیر نہیں دیتا تو بکریوں کو رزق ضرور دیتا ہے۔“ عمر سومرو دونوں ہاتھوں میں رکھتے جھک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے بولا۔

ماروی کو عمر سومرو کے اس جہازانہ انداز پر غصہ آیا۔
”آپ خواص نے عوام کو انسان سمجھایا ہی کب ہے۔ بھیڑ بکریاں ہی تو سمجھا ہے۔“ ماروی دوسری طرف دیکھتے ہوئی۔

”ہم آپ کو خواص میں جگہ دیں گے۔ خاص الخاص بنا دیں گے۔ آپ نگاہ تو ملا ہے۔“ عمر سومرو کی سرگوشی اس کے کانوں کے قریب ابھری۔ وہ اس کے اتنے قریب منہ لایا تھا کہ اس کے منہ سے اٹھنے والی بو سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ماروی کا پورا جسم جیسے جل اٹھا ہو۔

”بچھہ نفرت ہے، آپ جیسے لوگوں سے۔“ اس کی آواز میں غصے اور نفرت کی لرزش نمایاں تھی۔

طلباء کی معنی خیز دستکراہٹیں جلتی پرائیمل کا کام کر رہی تھیں۔ اب کس منہ سے یونیورسٹی جاؤں گا۔
"بابا سائیں دل پر بات نہ لیں، کبھی کبھی ایسی سر پھری لڑکیاں نصیب میں لگ جاتی ہیں۔" پھوگ
ذہار سے بندھا تھا۔

عمر سومو کا غصہ انتہا پر پہنچ رہا تھا وہ بچھتا رہا تھا کہ پھوگ کو اپنے ساتھ کیوں لایا اور نہ اس کا ڈر پ سین ہمیں کر دیتا۔



"پھوگ۔" وہ روہا نسا ہوتا۔
"حاضر سرکار۔" پھوگ مستعدی سے ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔
"جو خود چل کر آئے، وہ بے مول ہو جاتی ہے۔ جو کبھی نہیں اس کے مول بڑھ جاتے ہیں اور جو دونوں صورتوں میں نہ آئے وہ ان مول ہو جاتی ہے۔" وہ مسلسل پی رہا تھا۔ پھوگ نے اس کے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے خالی گلاس لیا۔

عمر سومو جس کی دھاک سندھ یونیورسٹی میں ہی نہیں اس کے پردس میں لہڑ اور مہران یونیورسٹی پر بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جو لڑکیوں کے درمیان راجہ اندر بنا رہتا اور دوستوں کو نوازنے میں اپنا مٹائی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ تینوں درس گاہوں میں پھیلا ہوا تھا۔ بہت سارے لوگ اس سے اپنا کام نکلوانے اور کنٹیکس، بٹورنے کے لیے اس سے جتنے ہوئے تھے اور بہت سارے لوگ صرف دوسرے لوگوں پر اپنی دھاک بیٹھانے کے لیے کہ عمر سومو ان کا دوست ہے اس کے گروپ میں شامل رہتے تھے۔

"بابا سائیں، دکھ نہ کر، آپ کا دل بھی ہوتا ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔"
"پھوگ، مجھ پر ہنسنا کبھی تدبیر کر اس کو چکر میں لانے کی۔" اب کبھی بار عمر سومو نے سنگریٹ جلائی۔ اس کے دھوئیں میں وہ حزد کو چھپا لینا چاہتا تھا۔ کون کہ اس کا دل دھواں بن گیا تھا۔

شاید کبھی کوئی لڑکی ہو، جس کی طرف اس نے نگاہ اٹھائی ہو اور وہ اس کے دام میں پھنسنے سے بچی ہو۔ یونیورسٹی میں اس کا آنا صرف بڑھائی یا ڈگری کے لیے نہیں تھا۔ یونیورسٹی کا چکر لگانا اس کے دل کا بھلاوا تھا۔

"کوئی لڑکی ہمارے سرکار کے لیے ان مول نہیں ہو سکتی یہ ماروی بھی بے مول ہو جاتے گی۔ بس اس کے لیے مٹڑی کا جالا بنا کر لے گا اور تو مٹڑی کی چال چلنی پڑے گی۔" پھوگ نے کہتے ہوئے اس کے پیر دبانے شروع کر دیے تھے۔

پہلی بار اسے کسی باگروار لڑکی سے ملا پڑا تھا اور وہ بھی غریب، ورنہ عمر سومو غریب لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ وہ اس کے مرتبے سے میل نہیں کھاتی تھی اور علاقے کی لڑکی کوئی غریب مگر حسین ہوتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے اس کے اوطاق میں پھینچا دی جاتی۔ اس ضدی، خود سر انا پرست، عمر سومو کے ساتھ یہ کیسا حادثہ ہوا کہ وہ اک غریب اور اپنے ہی علاقے کی لڑکی کے سامنے اپنا آپ ہار گیا۔

تیس ماروی ہوں، مجھے انی عصمت بچانا آتی ہے یہ دعا اس کے گلے کی پھانس بن گیا۔ اس ایکسویں صدی میں اس نے صدیوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اس کا کردار بھی کیا کردار تھا۔ جو صدیوں پہلے بنا صدیوں بعد بھٹائی نے گا کر امر کیا اور صدیوں سے گایا جا رہا ہے۔ وہی کردار نئے روپ میں سوہنود تھا۔ اور اس کردار کا امتحان بھی۔

وہ طوقان جو اس کے دل میں بل رہا تھا وہ آندھی میں گیا۔ وہ پورا دن کمرہ بند کر کے تشے میں بے سدھ پڑا رہا۔ رات گئے اس کا نشہ ٹوٹا اور کینٹین کا واقعہ اک بار پھر ذہن کی اسکرین پر چلنے لگا۔ اتنی ذلت اتنی رسوائی اتنی بے عزتی اس نے پوری زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔

ہاتھ تو کبھی اس کا کھیت نے بھی نہیں پکڑا تھا۔ مستی کے بعد وہ حیا کے رشتے میں بندھ گئے چھوٹے کی اجازت نہ ان کا معاشرہ دہتا تھا نہ دین اور نہ ہی حیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



عزت کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ صدیوں کا سفر جو میں نے طے کیا ہے اور میں تھکی نہیں، ابھی تک باہمت ہوں۔ ہر بار کردار لڑکی کے روپ میں جو اپنی عزت پر جان نثار کر دیتی ہے۔ میں وہ ماروی ہوں۔ اس کا عزم آسمان کی بلندیوں تک پہنچا۔



ان دونوں کا بلاوا آگیا عمر سومرو کے ڈرائنگ روم میں وہ نئے سرے سے پلاننگ کرنے لگے۔ عبداللہ اور شمع سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ساری کہانی الٹ ہو گئی۔ رائٹر کے ہاتھ سے نکل گئی اور اپنا آپ بننے لگی۔

منظر نامہ بدل چکا تھا۔ ڈائریکٹر نے سین غلام ڈال دیا۔ جو کردار ماروی کی نظر میں بلند کر کے دکھانا تھا۔ وہ گرا رہا تھا۔ لوز کرکٹر عمر نے اپنی مرضی کا سین ڈال کر اسکرپٹ کمزور کر دیا۔ وہ ہیرو سے ولن بن گیا۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔

عبداللہ کی ساری پلاننگ کو عمر سومرو کی ہاتھ پکڑنے کی غلطی نکل گئی۔

”اے کو، وہ مجھ سے معافی مانگے ان سب کے سامنے جن کے سامنے تھپڑ مارا تھا۔ اس کے بعد خاموشی سے میرا ساتھ دے، میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

وہ شلختے ہوئے بولا، ”اس کی پرانی عادت تھی بہت مضطرب ہوتا تو تیزی سے ادھر ادھر چلتا اور غصہ پڑھنے کے ساتھ اس کے چلنے میں تیزی آجاتی۔“

”اگر وہ نہ مانے تو؟“ عبداللہ بولا۔
 ”تو بھی کیا۔“ عمر سومرو استہزائیہ ہنسا۔ ”میں اسے قید کر لوں گا۔ کسی چیز کی ہمت کہ میرے سامنے پر مارے۔“ اس نے زور سے مٹھی بھینچ کر ”عمر سومرو کوئی خواہش کرے اور وہ پوری نہ ہو۔ ایسا ابھی نہیں ہوا۔ میں کبھی بھی اس سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ تم لوگ ڈیل کے تحت اسے راضی کرو۔ دوست بن کر سمجھاؤ۔ ڈراؤ، دھمکاؤ پھر بھی راضی نہیں ہوتی تو میرے پاس دوسرا آپشن موجود ہے۔“

کے تقاضے بھاننا حیا زار جانتے ہیں۔ وہ لوگ بے حیا نہیں تھے۔ مارو لوگ اپنی زندگی میں خوش، وہ اپنے پورے علاقے کی پہلی لڑکی تھی جو پڑھ رہی تھی اور یونیورسٹی کی سطح تک پہنچی تھی یہ سب چاہا سا جنرل پانڈھی اور کھیت کی مرہون منت تھا۔ وہ اس کے شوق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے ورنہ اگر کھیت سے نسبت نہ ہوتی تو کب کی اس کی شادی ہو چکی ہوتی اور وہ بھی ہزاروں عورتوں کی طرح اجڑی گود لیے رو رہی ہوتی۔

اور اس کھیت کی محبت کی راہ میں بادشاہی آرہی تھی۔ محبت ہمیشہ جیت جاتی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کھیت کی محبت پر وہ عمر سومرو کی بادشاہی کو فروغ دے، اس کا کھیت تو کھیت تھا۔ سینکڑوں عمر سومرو اس کے کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کھیت کی تھی۔

پھر اس کی نگاہ میں، عمل میں ہمیشہ احترام جھلکتا تھا۔ یہاں آنے کے بعد یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے کھیت کی کال اٹینڈ نہ کی۔ مسجز کا کوئی جواب نہ دیا۔

ماروی خود کو مجرم سمجھنے لگتی، اس کا ہاتھ جلنے لگتا۔

عمر سومرو کی بے حیالی، ڈھٹائی اور ہوس بھری نگاہیں اس کی برداشت سے باہر تھیں۔ سینہ تھچک تھی۔ کچھڑ تھی اس کی ذات پر اور وہاں موجود لوگوں کی نگاہیں مسکراہٹیں جو اب رہ رہ کر اسے یاد آ رہی تھیں۔ وہ

تماشا نہ ہوتے بھی تماشا بنادی گئی اس وقت اسے سخت طیش آ رہا تھا۔ تھپڑ کیا وہ اسے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ عمر سومرو نے اس کی عزت پر حملہ کیا تھا۔

تو ماروی تم پر بھی امتحان آئی گیا۔

اس نے چیزی کے پلو سے آنسو پونچھے اور ایک ہمت سے کھڑی ہو گئی۔ ثابت قدم رہنے کے عزم کے ساتھ۔

تم کیا سمجھتے ہو عمر سومرو! میں تمہاری دولت، امارت بردار ہو جاؤں گی، ہرگز نہیں میری دولت میرے مارو (مسکین لوگ) ہیں میری امارت میری محبت ہے۔ میں اپنی وفا اور عزت پر کبھی بھی سبج آنے نہیں دوں گی۔ میں ماروی ہوں جو صدیوں سے اپنی حیثیت غیرت اور



لیے وہ ڈیڑھ لاکھ روپے دھری سے باز نہیں آ رہا۔ کھیت مجھے احترام، محبت و وفا اور سب سے بڑھ کر سکون دے سکتا ہے۔ یہ ساری باتیں عمر سومرو میں ناپید ہیں۔

”پانگل ہو تم یار! آج کل ایسی چیزوں کو کون پوچھتا ہے۔ عقل سے پیدل ہو بالکل، وہاں آسائش کا جہان ہے۔ خوشیاں ہی خوشیاں جس طرف نگاہ اٹھاؤ خرید لو رسائی ہی رسائی۔ نارسائی کبھی قریب نہیں آتی۔“ شمع نے ہر ممکن اپنی بات میں وزن پیدا کیا۔

”اجھا، ایسی دولت سے وہ میرا دل تو خرید کر دکھا دے؟ شمع! خواہشات کی اندھی ٹی باندھ کر مت چلو، انسانیت کے لیے جیو، یہ سب خاک ہے، خاک میں مل جائے گا ایک دن اچانک ایک جھٹکے سے زندگی رک جائے گی اور آنکھیں بند سب کچھ ختم۔ پھر اس کے سامنے پیشی ہوگی، جواب دہی ہوگی۔ انسان کیا جواب دے گا۔ دولت کے لیے دین بیچ دیا۔ خواہشات کے لیے ایمان بیچ دیا۔ اس کو بھلا دیا؟ دنیا کی رنگینی میں کھو کر ماروؤں (اپنے دس کے لوگوں) کی محبت والدین کی اطاعت سب کچھ قربان کر دیا۔“ ماروی دلیل پر دستک دے رہی تھی۔

”انہو ماروؤں! تم بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔ جیتی جاگتی، سنی کو فوراً خاک میں ملا دیتی ہو۔“ شمع نے ماروی کے لیے انداز میں سر ہلاتے رکھا۔

”یہی حقیقت ہے، باقی سب فسانہ۔ انسان بے وقوف ہے جو ساری عمر اس سے بھاگتا رہتا ہے۔“ ماروی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”موت کا رقص میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آج کل تھر کے قحط زدہ بچے نگلنا موت کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔“ ماروی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”شمع تم کیا جانو! اجڑی گود، خالی جھولی کا درد، تم چاہو تو بھی محسوس نہیں کر سکتی، کے ایف سی، میکڈونلڈ، پراہٹ پر ہر قسم کے طعام تناول کرنے والے تھریوں کی بھوک محسوس نہیں کر سکتے کہ وہ کیسے جنگل کے پتے کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ کمزور پیدا ہونے والے بچے جب بھوک سے تھکتے ہیں تو ماں کی چھاتیوں میں دودھ

عمر سومرو نے اک بار میز پر مکا مارا۔ اک بار لات ماری اور مٹھیاں بھیج لیں۔ عبد اللہ اور شمع کو احساس ہوا کہ انہوں نے ڈیل کر کے کس سر پھرے سے سر نکلایا ہے۔ جو انسان کو انسان نہیں سمجھتا، جس کے سامنے اپنی خواہش ہر طرح سے مقدم ہے۔ اور چاہے سندھو نے پاسو کھے، تر سے یا برباد ہو، اسے کسی بات سے سروکار نہیں۔



”تم عمر سومرو سے نہیں نکل سکتیں۔ نہیں لڑ سکتیں، وہ بہت طاقت ور ہے۔ ماروی! خدا کے لیے اس سے معافی مانگ لو۔ یہ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ شمع کتنی دیر سے اس کی منتیں کیے جا رہی تھی۔

”ہرگز نہیں، کسی قیمت پر نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہکا جھنسن دیتے ہوئی۔

”معافی مانگنی ہی ہے، تو عمر سومرو کو مجھ سے مانگنی پڑے گی۔ پہلے وہ مجھ سے ہاتھ پکڑنے کی معافی مانگے۔ میرا تھپڑ اس کے ہاتھ پکڑنے سے ہلکا ہے، اس کا ہاتھ پکڑنا بہت بھاری بوجھ ہے۔“ ماروی کے لہجے میں نفرت نمایاں تھی۔

”ماروی! تم کیوں نہیں سمجھتیں، یہاں ہاتھ پکڑنا اک عام بات ہے۔ یار یہ اتنا بڑا شو نہیں۔“ شمع جل جاتی۔

”تم لوگ شخصی آزادی کے اتنے قائل اور عورتوں کے حقوق کے داعی۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ فزیکل ہراسمنٹ اور شخصی آزادی کی کھلی خلاف ورزی ہے، کسی عورت کا ہاتھ پکڑنا اس کی مرضی اور منشا کے خلاف۔“

”تم بے وقوف ہو، کھیت تمہیں کیا دے سکتا ہے، جب کہ عمر سومرو اتنا بڑا آدمی تم سے شادی کے لیے تیار ہے۔“

”کھیت مجھے وہ دے سکتا ہے۔ جو عمر سومرو نہیں دے سکتا۔ میں اس کی ضد ہوں، محبت نہیں۔ اس

نہیں ہوتا۔ وہ بلکتے بلکتے مرجاتے ہیں۔
 وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ شمع خاموش ہو گئی۔
 اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے، کیسے
 دلا سا دے۔

”سوری یارا تم میری باتوں سے دکھی ہوئیں، میں تو
 تمہارا بھلا چاہتی تھی۔ تب ہی اصرار کر رہی تھی۔“
 شمع نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پشت تھپکی، اپنی صفائی
 دینے لگی۔ مبادا وہ اس پر شک نہ کرنے لگے۔

ماروی کے دل پر اس کے خلاف شک کی چھائی گرد
 فوراً صاف ہو گئی۔

وہ ایسی ہی تھی۔ صاف دل، جو جیسا نظر آتا ہے،
 ویسا ہی سمجھنے کی عادی، ماروی جو تھی۔



ماروی کی ماں نے جب سے سنا کہ عمر سو مرنے اس
 کا رشتہ بانگا ہے تو خوف سانپ کی طرح کندھیاں مار کر اس
 کے دل میں بیٹھ گیا۔ وہ ساری ساری رات دھرتی کے
 دل سے اٹھ کر ماروی کی حفاظت کی دعا میں مانتی رہی
 پاندھی کہتا۔

”مارے بھاگوں بھری کیوں ڈرتی ہے۔ اللہ یہ
 بھروسہ رکھ رہیوں گا اللہ وارث ہے۔ وہ میری دھی کو
 اپنی پناہ میں رکھے گا۔“

مگر وہ ماں تھی اس کا دل بچنے کی طرح لرزتا رہتا۔ وہ
 کھیت کی منتیں کرتی۔

”ابا کھیت جا ماروئی کو لے آو اپس، وہ اس کے ساتھ
 پڑھتا ہے۔ پتا نہیں کیا کرے گا۔“

”چاچی! خطرہ تو اسے یہاں ہے وہاں نہیں۔ وہاں تو
 وہ ایک جگہ بیٹھی ہے۔ ہاسٹل کے اندر کوئی نہیں گھس
 سکتا۔ کوئی اس کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ تو پریشان نہ
 ہو، اللہ یہ بھروسہ رکھ، اللہ چننی کرے گا۔“ وہ ڈھارس
 بندھاتا اس کے چوہے میں لکڑیاں ڈالتا جاتا۔

”ابا! میں خوف سے مرجاؤں گی۔ میرا دل سینے سے
 باہر نکل آتا ہے۔ جب ماروی کا سوچتی ہوں، جسم
 لرزنے لگتا ہے گھر کا کام نہیں ہوتا مجھ سے۔“ بھاگی
 نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں نے دیکھا ہے سکھاں کا درد، جس کا بیٹا بھوک
 سے بلکتے مرا، میں نے وعدہ کیا ہے اس سے کہ جب تم
 دو سرا بچہ پیدا کرو گی میں اس وقت تھر کے لیے اک اس
 جی او بنا کر ماں اور بچے کی خوراک کا پروگرام شروع کر
 دوں گی۔ تمہیں اور تمہارے ہونے والے بچے کو
 خوراک اور دوا میں ملتی رہیں گی۔ یہ میرا اس سے وعدہ
 ہے، عہد ہے، اور تم کہتی ہو، میں سب وعدے توڑ کر،
 تمہارے عہد چھوڑ کر اس ظالم وڈیرے سے شادی کر
 لوں۔“ ماروی کے لہجے سے نفرت کی چنگاریاں اڑ رہی
 تھیں۔

”ماروی، وہ وڈیرہ ہے۔ وزیر کا بیٹا ہے۔ اس سے
 شادی کر کے تم بہتر پوزیشن میں آ جاؤ گی اپنے ماروؤں
 کے لیے کام کرنے کا بہتر سہیلٹ فارم مہیا ہو جائے گا
 بہت بڑے پیمانے پر کام کر سکو گی۔“ شمع بات کو گھما
 پھرا کر پھر اسی پوزیشن میں لے آئی۔

”ان سے بھلائی کی توقع رکھنا عبث ہے۔“ ماروی
 اٹھ کر کھڑکی میں آئی۔ اس ذکر سے اس کا دم گھٹ رہا
 تھا۔ ہوا کے تازہ جھونکے نے اسے آسجین پچالی۔
 اس نے گہری سانس لی۔

”یہ وڈیرے، جو تمہاروں کو لداؤ میں ملنے والی گندم
 بھی کھا جاتے ہیں۔ جو ہمارا خون پی کر لے لے ہیں، جنہوں
 نے غریبوں کا ماں کھا لیا ہے۔ اس سسٹم کا ایک فرد مجھے
 غریبوں کے لیے کام کرنے دے گا۔ یہ بھول ہے
 تمہاری، وہ میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر، داہشتہ بنا کر
 رکھے گا، تم کیا جانو؟ تمہارا کون سا پالا پڑا ہے۔ ان ظالم
 انسانوں سے۔ مجھے نفرت ہے ان ظالموں سے جو
 طاقت اور اختیار رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کرتے۔
 صرف دوٹ مٹنے آتے ہیں۔ وہ بھی ڈرا دھمکا کر لے
 جاتے ہیں۔ پھر پلٹ کر ایک بار بھی نہیں پوچھتے کہ
 مرے یا جیے ان کی بلا سے۔“ ماروی کے انک انگ

باندھی سوڑھے پر بیٹھا دیتا، کھیت کا شانہ تھپکتا، بابا یہ بھلی مائیں سمجھتی نہیں وہم بیٹھ گیا اس کی روح میں۔ ماروی کی کھیت سے شادی ہوگی۔ سارا ویس دیکھے گا، مہتری دھی کی دھوم دھام سے شادی ہوگی کیوں فکر کرتی ہے، انہوں نے رشتہ مانگا، ہم نے نہیں دیا۔ بات ختم خلاص۔ ”وہ ہاتھ چلاتے ہوئے بولا۔

”اس کا نام ماروی رکھ کر میں نے بڑی غلطی کی اللہ سائیں۔ ماروی کی حج رکھنا۔“ اس نے خود کلامی کی۔

”دیکھ اس کے کام۔“ پاندھی نے اس کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کھیت کو مخاطب کیا۔ کھیت ہنس دیا۔

بھاگی نے ناراضی سے پاندھی کو دیکھا۔

”ارے ارے چاچی! روٹی جل گئی۔“

کو اشتیاق دلانے میں۔ اس کے اندر انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی۔ ساجن کا بیٹا کھیت اس سے بازی جیت گیا تھا۔ سمن سرکار کے میلے پر اس کے تیل دوڑ میں بازی لے گئے تھے۔ رانی اور انعامی رقم اس کو ملی تھی اس انعامی رقم سے اس نے ماروی کی فیس دی اور دوسرے اخراجات اٹھائے تھے یہ دوسری بازی جو اس کی برواشت سے باہر تھی۔

”میں کیا کروں بابا، میرا بس نہیں چلتا۔“ وہ لاچار بی بی۔

”ہر وقت روح ماروی میں انکی ہوئی ہے۔ کھانا چینا سب زہر ہو گیا کچھ اچھا نہیں لگتا، جی کو۔“ اس نے پانچوں انگلیاں ہلا کر سینے پر رکھیں۔

ہر طرح سے عمر سومرو کو اس کا شوق دلانا چاہتا تھا۔ اور برا ہوا کہ عمر سومرو بخیر سٹی نہیں۔ سٹی نظر میں گھائل ہو گیا۔ اس وقت خود کو شکاری سمجھے والا اپنے زخم میں شکار ہو گیا۔ جیسے ہی پتا چلا وہ پاندھی کی بیٹی سے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ اس کی دسترس سے باہر نہیں۔

وہ پھوگ تھا جس نے ماروی کی محبت اس کے دل میں جگائی تھی۔

”سامیں! وہ پاندھی کی بیٹی صرف تیرے ہی لائق ہے۔ مور کی طنز، حسین، تلوار کی طرح تیز، مورنی کی چال، رنگت ایسی کہ جیسے سورج کی شعاعوں پر زیت چمک اٹھے، ہنستی ہے تو گال لال پھول بن جاتے ہیں۔“

”بل کھاتے بال و اسینگوں (سانپ کی اک قسم) کی طرح ڈستے ہیں بات کرتی ہے تو جیسے مائی بھاگی گنگنارہی ہو۔ لب ایسے بھگے رہتے ہیں، جیسے کارو بھر سے نکلے شمد سے تریکے ہوں۔“

”اور آنکھیں کیسی ہیں اس کی؟“ عمر سومرو بے تاب ہوا۔

اور پھوگ جو جھوٹا کھانے والا تھا۔ اس کے وارے نیارے ہونے لگے۔ وہ بھی عمر سومرو کا دل بھرنے کے بعد اس کو مل جائے گی۔ اس کی ران ٹپک پڑی اور وہ داؤ پر داؤ کھیلنے لگا۔ چال پر چال چلنے لگا۔ جال پر جال بچھانے لگا۔

”پھوگ۔“ وہ غصے سے چیخا۔

”جی سرکار۔“ پھوگ مستعد ہوتا۔ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔

”وہ کہتی ہے، میرا ہاتھ پکڑنا، بہت بھاری بوجھ ہے۔“ وہ طنز بہنستا۔ ”میں اسے بوجھ سے لا دوں گا۔ نہ سر اٹھانے کی ہمت ہوگی، نہ منہ دکھانے کی طاقت۔“ وہ تیز تیز چلتے راستے میں پڑی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا۔

”سامیں! آنکھوں کی تو بات ہی نہ پوچھیں، پہلی نظر میں ہی شکار کر لیتی ہیں، کھانٹ کر دیتی ہیں۔“ وہ بھی پھوگ تھا، کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، عمر سومرو

”سامیں کامیابی اس کے نصیب میں نہیں۔ وہ رانی بنا کر رکھنے کی لائق ہی نہیں۔ اسے رکھیل بنالیں، سرکار۔“ پھوگ اکساتا۔

”اب تو قتل کرنے کو دل کرتا ہے تمہیں۔“ شمع نے گھورا۔

”تمہارے قاتل کا فون آ رہا ہے۔“ ماروی نے واہریشن پر تھرکتے فون کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے پلٹ کر فون اٹھایا۔ ”ہائے اللہ مجھے پتا ہی نہ چلا۔“ وہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔

ماروی ہنسی۔ ”اب راز و نیاز شروع۔“ شمع نے اس کے آواز کئے پر دھیان ہی نہیں دیا۔

وہ اپنا سیل فون لے کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ کھیت کامیسیج اک بار پھر بڑھا۔

”ماروی بھول کر بھی کسی بھی کلام سے باہر مت نکلنا، میسٹر حتم ہوتے ہی میں تمہیں یہ آجاؤں گا۔“

”کھیت! تم اتنے بزدل تو نہیں، پھر کیوں مجھے ڈرا رہے ہو۔“ اس نے جواب لکھا، اسی وقت جواب آیا۔

”چارجی کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی دن میں دس بار آکر مجھے تمہیں واپس لانے کو کہتی ہیں، سب سمجھا دینا، تمہارا تھک گئے ہیں۔“

”اور سنو! تمہارا کھیت بزدل نہیں۔“ دو سڑامیسیج آیا۔

”مجھے پتا ہے، زیادہ اترا ہے، تمہاری ضرورت نہیں۔“ جواب دیا۔

”تمہاری محبت کا کھیس اوڑھ رکھا ہے، اترا تا تو بنتا ہے۔“ جواب آیا۔

”اچھا اب زیادہ پھیلو نہیں، اللہ واہی۔“

”تمہاری محبت سے پھل پھول رہا ہوں۔“ اس نے مسکراتا کارٹون بھیجا ماروی نے سیل چارجنگ پر رکھتے ہوئے پھر سے نکالا۔ اپنی باتوں میں الجھا دیتا ہے،

واپس میسیج کیا، مسکراتے ہوئے۔

”اور ہاں، اماں کو بھی سمجھا دینا کہ ماروی بھی بزدل نہیں، پریشان نہ ہوا کرے، وہ بیمار ہو جائے گی۔ تو مجھ سے پڑھا نہیں جائے گا، میرا پیغام صبح ہوتے ہی پہنچا دینا۔“

”حاضر سرکار! اور کوئی حکم۔“ فوراً ”جواب آیا وہ دل سے ہنسی۔“

”میرے سامنے بادشاہ ویسے بھی چرواہے کی بیٹی کیا اچھی لگے گی آپ کی جوہلی میں۔“

”جس طرح اس نے مجھے ٹھکرایا ہے۔ میرا دل بھی اب یہی چاہتا ہے۔ اب موقع تلاش کر اور اسے

میرے پیروں میں ڈال دے۔ بھاڑ میں جائے بابا، سامنے کا الیکشن۔“

”حاضر سرکار! جو حکم۔ وہ چیز یا اپنے گھونسلے سے جیسے ہی نکلتی ہے۔ میں اسے قید کر لوں گا۔“



شام نے رات کی چڑی اوڑھی۔ بہار رت کی ٹھنڈی ہواؤں نے اس کے مساموں میں تازگی بھری

دی تھی۔ وہ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی، دریاے سندھ کے پار حیدرآباد شہر کی عثمانی روشنیاں آسمان پر

ستاروں ایسی دکھتی تھیں۔ پت جھڑکا موسم آیا جاہتا تھا۔ درختوں کے پتے درختوں کی شاخوں پر اوس سے

غسل کر کے زرد لباس پہن رہے تھے۔

کینٹین سے آئے والا کھانا اس نے شکر کر کے کھایا، اور شمع نے بے دلی سے۔

”کیا مصیبت ہے یار، آخر تم باہر کیوں نہیں نکل رہیں۔“ شمع حسب معمول جھجھلائی۔

”مجھے کھیت نے منع کر دیا ہے۔“ وہ حسب توقع سکون سے بولی۔

”کھیت نے ٹیوشن پڑھانے سے منع کر دیا، تاہر نکلنے سے منع کر دیا۔ شاپنگ کرنے، آنے جانے، واک

کرنے پر پابندی لگادی، یہ تمہارا کھیت آخر ہے کیا بلا۔“ ماروی اس کے تیز تیز بولنے پر مسکراتی رہی۔

”کھیت نہ ہوا، دیوتا ہو گیا۔“

”دیوتا ہی ہے وہ۔“ ماروی نے جتلیا۔

”اور تم اس کی بیچارن۔“ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر لڑاکا عورتوں کی طرح کھڑی ہو گئی۔

ماروی کو بے طرح ہنسی آئی۔ صحیح سمجھیں آپ۔“ اس نے نچلا لب دانٹوں تلے دبا کر سر کو اشارت میں جنبش دی اور برتن سمیٹ کر کڑے میں رکھے۔



وضاحت پر وضاحت دینے چاہا تھا۔ پھوگ کی دھمکی نے اثر دکھایا۔ وہ ڈر گیا کہ ایمان بھی بچا مگر حاصل بھی کچھ نہیں ہوا۔

عمر سومرو اس کی وضاحتوں کو ”میں نہ مانوں گی صورت سن رہا تھا۔ عمر سومرو اس کی طرف دیکھنے کا روادار نہیں تھا اور پھوگ اسے مسلسل گھور رہا تھا“ عبد اللہ کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت برا پھنسا ہے۔ اس نے اپنی صفائی دینے کے لیے شمع کو فون کیا۔ ”شمع! اسے کسی بھی بہانے سے یا ہر نکالو۔“

”عبد اللہ میں نے ابھی ابھی اس سے کہا کہ چلو آج مرچی کا مزہ لیتے ہیں اس نے انکار کر دیا۔ کل بھی کہا تھا۔ المنظر پر پچھلی کھاتے ہیں ٹیلر کو کپڑے دیے ہیں۔ کچھ ضروری شاپنگ کرنی ہے۔ مگر باروہ ماٹھی میں آہر بار کھتی ہے تم میری مجبور کیا جانتی ہو پھر کیوں اصرار کرتی ہو۔ میں شرمندہ ہو جاتی ہوں۔“

کھلے ہوئے لکڑی کے دروازے سے اس کی آواز سنائی عمر سومرو تک پہنچ رہی تھی۔ ”اب یونگ چڑیا، کب تک بھاگے گی، مجھ سے اک دن آئی بھاگے گی، میرے پنجرے میں۔“ عمر سومرو ہنسا۔

”ارے عبد اللہ! تم عمر کے ساتھ ہو۔“ شمع عمر کی آواز پہنچان کر بولی۔

”ہاں ہم مری رہی ہیں بیٹھے ہیں تم آ جاؤ اسے لے کر تو مزہ آ جا۔“ عبد اللہ نے سیل منہ لکے قریب کر کے کہا۔

”ارے باروہ کاٹھ کی الرواقتی تب ناک بس کھیت کا کہا پھر لکیر ہے۔ اچھا میں فون بند کرتی ہوں شاید وہ آ رہی ہے۔“

عمر سومرو اٹھا۔ ات مارے والے انداز میں کرسی کو ہٹایا۔ ”تیلی اک دن میری ننھی میں آ جائے گی۔“ اس نے مٹھی بچھی۔ ”مارے رنگ! آ جا میں گے۔“ وہ ہنسا۔ پھوگ نے برہہ کر پر آڈو کا دروازہ اس کے لیے کھولا۔

”اسے باہر نکال عبد اللہ۔“ وہ فاسٹ فوڈ سے انصاف کرتے بولا۔ گاڑیوں کے شور میں اس کی آواز دب گئی تھی۔

”کیسے نکالوں بیار۔“ عبد اللہ زنج ہوا۔
”کوئی تدبیر کر۔“

”ہزار بار شمع کو کہا ہے اسے کسی بہانے اپنے ساتھ یونیورسٹی کی حدود سے نکالو مگر وہ کہتی ہے کھیت نے اسے منع کر دیا ہے۔ کیس بھی آنے جانے کو تیار نہیں۔“ عبد اللہ نے زینٹی کہا اب کا ٹکرا منہ میں ڈالا۔ ”دیکھو عبد اللہ صائب! جو کرسی دے سکتے ہیں۔ وہ چھیننے کا بھی اختیار رکھتے ہیں۔“ پھوگ کہہ کر استراحت ہنسا۔

عمر سومرو نے لب بھینچ کر اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ گاڑیوں کا شور شاپنگ کرنے والے لوگ، سنندہ پاد پر بچوں کو گھمائے والے، ہر کوئی اپنے آپ میں مگن تھا۔ ”بچے اندازہ ہے کہ ہم ڈیل کے تحت تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے، مگر یہ مسئلہ حقیقت ہے کسی کی نوبت دل میں زبردستی نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہم نے اپنے تئیں اردو کو لائسنس کرنے کا فیصلہ کیا ہے پھر پور کو شش بج گئی ہے۔“ عبد اللہ نے اپنی صفائی دی۔

”مجھے وہ ہر صورت چاہیے۔“ عمر سومرو ہنسی مسلسل ٹیبل پر مارتے بولا۔ ”میرے احسانات کا بدلہ تمہیں چکانا پڑے گا عبد اللہ۔“

وہ اب بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا اس کی نظریں گہرا ننھی کی طرف تھیں۔ کمانے سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ پرائیڈ رول، چکرن تکہ، اسپاٹسی بونی زینٹی، کباب، چیزبال، ٹولا کباب سب اس کے سامنے ویسے کے ویسے پڑے تھے۔

”ہم آپ بھی تمہارے ساتھ ہیں اور موقع کی ناک بھرنے ہیں اس احتیاط کے ساتھ کہ مارویں، کو ہم پر کوئی ہرگز نہ ہو، ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔“ عبد اللہ

”ماروی! کیلی نہیں ہم سب ہیں اس کے ساتھ۔ ہم ہیں نا۔“ کھیت نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ گاؤں کے لوگ گھروں کی اور کھٹکنے لگے۔ ”داغ چل گیا بے چاری کا۔“ ”وہم میں کوڑیل (وہم میں جکڑی ہوئی)۔“ ”ادھ چری“ (آدھی پاگل)۔

بھانگی بیمار ہو چکی تھی اسے خوف کھا گیا تھا۔ وہ ہنسا گیا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ تھکی تھکی سانس لیتی، ہر سانس سے ماروی کی سلامتی کی دعا جڑ جاتی۔ اور ماروی سے بات کرتی۔ ”بیاجی! اب تو صبح و شام ماروی سے بات کرتی ہے، اب تو مطمئن ہو جا۔“ ”ابا! اللہ سکون دے گا۔“ وہ دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر کہتی۔

کچھ دل جلی بھنبھنا نہیں ابھریں۔ مگر کھیت وہیں کا وہیں رہ گیا۔ ”چاچا تو بھی بیٹھ جا۔“ اس نے پاندھی کو پکڑ کر بٹھایا، موبائل جیب سے نکال کر دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔

ماروی اسے سارے دن کا احوال سناتی کہ صرف کلاسز اینڈ کر کے واپس ہاسٹل آئی ہے، وہ بھی لڑکیوں کے گروپ کے ساتھ، اس نے ڈیکوریشن جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ وہ سن کر کچھ دیر مٹھن ہرٹی پھر اس کا اطمینان رخصت ہو جاتا پھر سے وہی بن جاتی، وہ ذہنی مریض بن گئی تھی۔ سوتی تو ڈراؤنے خواب آتے۔ ماروی رو رہی ہے۔ اک کنواں ہے، ٹیلے ہیں اور ان کے بیچ دوڑتی ماروی ہے۔ اونٹوں کی ہنسی قطار اس کے پیچھے ہے، ظلمت کا اندھیرا چار سہ چھایا ہے ٹیلوں سے خنزیر اتر رہے ہیں۔

”ماروی سو رہی ہوگی۔ صبح اس کا پیر تھا، وہ اس کو ہر بات بتانے والا، یہ بات بتانے سے باز آیا۔ سمجھاتے سمجھاتے اسے دلاس دیتے دیتے صبح ہو گئی۔ حسب معمول اس کا فون نہ آنے پر ماروی نے خود کال کی۔“

وہ سوچ بار کر اٹھتی۔ ”میری ماروی! میری ماروی!“ بھانگی کی سوچ بھی کوسارا گاؤں اس کے ارد گرد گھومتی آئی ہے۔ کیا ہو آ بھانگی کتا ہوا بہانگی۔ ”میری ماروی! میری ماروی! آؤ وہ بیچ صحن میں چار پانی پر کھڑی ہو کر رہی، ہند اور گاری تھی۔ ”ڈاڑھے بابا، چری ہو گئی ہے۔“ پاندھی کھڑکھڑکانب رہا تھا۔ ”کوئی خواب دیکھ لیا، خواب خواب اسے آتے ہی رہتے ہیں۔“ اس کا اچھ لہڑ رہا تھا۔

”ہاں ماروی! رات چاچی کو بخار تھا، ابھی ابھی آگ لگی ہے، سو رنہ بات کروا دیتا۔“ اس کے سوال کا جواب لانا آیا، یہ کچھ گڑبڑ کی نشانی تھی۔

بھانگی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے خاموش کھڑی سب کو خالی خالی نظروں سے سنتی رہی۔ ”چاچی بیٹھ جا۔“ کھیت نے اسے ہاتھ ستہ پکڑ کر چار پانی پر بٹھایا۔ ”کیا ہوا چاچی۔“ کھیت نے سر پر دپٹہ اوڑھنا۔ تے نرمی سے بچے کی طرح پکڑا۔

”ہاں ماروی! رات چاچی کو بخار تھا، ابھی ابھی آگ لگی ہے، سو رنہ بات کروا دیتا۔“ اس کے سوال کا جواب لانا آیا، یہ کچھ گڑبڑ کی نشانی تھی۔ ”تم پریشان نہ ہو، آرام سے پیر دو۔“ میں لے کر جاتا ہوں چاچی کو پھر بات بھی کروا تا ہوں۔“ اس نے دلاس دے کر کال، کالی۔ بھانگی بالکل نم صم تھی۔ خاموش سارا جسم بخار میں جل رہا تھا اور وہ رہ کر اسے وہ خواب یاد آ رہا تھا۔

”یا اللہ! خیر کر۔“ کتنی ہی دیر یہی دعا اس کی زبان کا تالا توڑ کر ہواؤں پر تیرتی۔ اس نے اپنے باپ کے دوست چاچا یوسف سے اس کی جیب منگوائی، اسے مٹھی سول ہسپتال لے آیا۔ بخار سے اسے غشی ہو رہی تھی، خوف کی حالت بڑی شدید تھی۔ اسی خوف کی وجہ سے بخار کی شدت میں بھیجی اور وہی ہو رہا تھا۔ پیر کے بعد ماروی کا ہزدہں

”ابا! میری ماروی کیلی رہ گئی ہے۔“ وہ بولتی۔

خوش تو وہ بھی تھا۔ ماروی کو دیکھنے بلنے کی خوشی دل کی دھڑکنوں کو تیز کر رہی تھی۔



شع مسلسل اسے اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھی۔

”کیا کہہ رہا ہے اب۔“

”وہ مجھے آنے نہیں دے رہا، بار بار منع کر رہا ہے جان جاتی ہے ان وڈیروں سے ان کی۔“ اسے پہلی بار کھیت پر غصہ آیا۔ ”کیا کر سکتا ہے آخر عمر سومرو۔“

”زیادہ سے زیادہ تم سے شاوی۔“ شع نے چھیڑا۔
”بکواس بند کرو اپنی، نہ موقع نہ محل بہر وقت ٹھٹھول۔“ وہ سخت براہم ہوئی۔

”اچھا میری مدد کی کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ۔“ اس وقت عبداللہ کی کال آئی۔ اس نے بات سچ میں چھوڑ کر ریسیو کی۔

”ارے کیسے فون کروں تمہیں، صبح سے تو اس کی رونی شکل دیکھ رہی ہوں۔“ وہ عبداللہ کو من و عن اس کی صبح سے اب تک کی کتھانٹانے لگی۔

”سنو عبداللہ کہہ رہا ہے وہ میرا پور خاص جا رہا ہے اپنے دوست کی جیب میں، کو تو آگے مٹھی تک تمہیں چھوڑ آئیں اسپتال جانا ہے نا تمہیں۔“

وہ سوچ میں پڑی۔ ”عبداللہ کے ساتھ اکیلی ہم بھی چلونا میرے ساتھ۔“

”یار! اپنا پیر تو خراب کر رہی ہو، میرا بھی کرو گی کیا۔“ وہ فون کان پر رکھتے ہوئے دونوں طرف بات کر رہی تھی۔

”عبداللہ پر اعتماد نہیں ہے کیا۔ جیسی میں ویسا عبداللہ۔ بھائی ہے تمہارا۔“

”عبداللہ نے سنی ہوگی۔ تمہاری بکواس کیا سوچے گا۔“ ماروی براہم ہوئی۔ ”ٹھیک ہے۔ کس وقت نکلے گا۔“

”بھی پندرہ منٹ میں۔“

ماروی نے گھڑی دیکھی، سہ پہر کے تین بج رہے

منٹ بعد فون آ رہا تھا۔ فوراً وہ بات کرانے سے قاصر تھا۔ وہ ہوش میں ہوتی تو ماروی سے بات کرتی۔

”کھیت اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا، میں آرہی ہوں۔“

کچھ نہیں ہوتا۔ ”ماروی کی بے چینی حد سے سوہنی۔“

”یا گل ہو گئی ہو، اگر چاچی ہسپتال میں نہ ہوتی تو میں تمہیں خود لینے آتا مگر اب نہیں آسکتا۔ تم ذرا سا ٹھہر جاؤ۔ اکیلی مت آنا پلینز ماروی۔“ کھیت کے لہجے میں منت تھی۔

”کھیت میری ماں بیمار ہے۔ وہ مجھ سے بات نہیں کر سکتی اور تم۔“ وہ رو پڑی۔

”ماروی میری بات اوز مجبوری سمجھو، میں کل خود آجاؤں گا تمہیں لینے۔“

”آخر تم لوگ اتنے ڈرتے کیوں ہو۔“

”ہسپتال ڈرانے میں چاچی کے ڈراؤ نے خوابوں کا بھی ہاتھ ہے۔“ کھیت ہنسا۔

”کھیت پر سونا میرا پھر پیر ہے، میں آج آجاتی ہوں کل وہاں بے نکلون کی ٹیب ہی میاں پہنچوں گی۔“

اماں کو دیکھنا بہت ضروری ہے، میرے دل کو فرار نہیں آ رہا۔“ اس بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ڈاکٹر کے آگے کھیت کو بات ختم کرنا پڑی، اسپتال میں ہنگامی صورت حال نافذ تھی، بڑھتی ہوئی شرح اموات نے میڈیا کے ذریعے تھلکہ بجا رکھا تھا۔

آئے دن کوئی نہ کوئی بری شخصیت آئی اور بائیل رچ جاتی۔

”چاچی، ماروی آرہی ہے۔“ یہ سرگوشی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگی کے کان کے قریب آ کر

کرتا۔ اس کا اثر ہوا اور بھاگی کا بخار کم ہوا۔ اس نے آنکھ کھولی۔

”ماروی۔“ نحیف آواز وارڈ کے شوز میں گم ہوئی۔ کھیت اس کے نلتے لبوں سے سمجھ گیا کہ ماروی کا نام

ہو نٹوں پر آیا ہے۔

”آرہی ہے، آرہی ہے۔“ اس نے خوشی سے

اثبات میں سر ہلایا۔ بھاگی کے چہرے پر رونق مسکان

بن کر چھائی۔

تھے۔ اگر وہ اس وقت نکل جاتی ہے تو سات بجے تک تو پہنچ ہی جائے گی۔ وہ شش و پنج میں تھی۔

”اچھا بابا! میں چلتی ہوں۔“ سمجھ اس کی پریشانی اور دو مردوں کے ساتھ اکیلا جانے کی گھبراہٹ بھانپ گئی۔

”اوہ شکر ہے وہ کھل اٹھی۔“

اس نے اپنی کتابیں ضروری نوٹس بیگ میں رکھے چزی اوڑھ کر تیار ہو گئی۔



”اماں کی طبیعت اب صحیح ہے۔ ہم انہیں ڈسچارج کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے دوائیوں کا نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔

”سر! اگر آپ ایک دو دن اور رکھ لیتے ہاسپتال میں تو اماں بالکل ٹھیک ہو جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔“ اس نے سنت بھرے لہجے میں کہا۔

”دو نہیں، ہمیں یہ بستر خالی کرنا پڑتا ہے، زیادہ سیریس کنڈیشنز والے مریض ہماری پہلی ترجیح ہوتے ہیں اور بد قسمتی سے ہمارے ہاں وہ مریض زیادہ آگے ہیں اس لیے بخار اور معدوں امراض والے سارے مریضوں کو چھٹی دے رہے ہیں۔ یہ ہماری بھی مجبوری ہے۔“

ڈاکٹر نے نسخہ تھمایا۔

”ٹھیک ہے میں دوا میں لے کر آتا ہوں“ پھر اماں کو لے جاتا ہوں۔“

”مگر جلدی۔۔۔“

”بس سر! دن منٹ“ وہ کہتے ہوئے وارڈ سے باہر نکلا، اسٹور پر رکتے ہوئے اس نے ماروی کا فون نمبر ملایا۔ اور ساری بات بتائی۔

”میں نکل چکی ہوں وہاں سے۔“

”اب تمہیں مٹھی نہیں ٹنگر پار کر میں آنا ہوگا، روڈ پر چھوڑ دوں، میں وہاں تک تمہیں خود لینے آؤں گا۔“ اس کی آواز سے بے تابی جھلکتی تھی۔

اثبات میں جواب دینے پر اس نے دوائی لیں اور بھاگی انکو سارا دیتے ہوئے لاٹر گاڑی میں بٹھایا۔ گاؤں

پہنچے تو شام کے سائے لہرا رہے تھے، گاؤں کے سارے لوگ مزاج پر سی کو آمو جو ہوئے۔ کھیت کی ماں سب کو چائے بنا کر پلا رہی تھی۔

”ابا کھیت لڈرا بکریوں کی خبر گیری کر آ۔“ پاندھی کے کہنے پر وہ جو اسپتال میں ڈاکٹر نے کیا کہا، ہر آنے والے کو پوچھنے پر تیار ہاتھا۔ ساری باتیں جھوڑ کر بھٹوں (ٹیلوں) کی طرف روانہ ہوا۔

اس کی منتوں مرادوں سے مانگی ہوئی من کی مراد ماروی آ رہی تھی۔

بھٹوں پر آکر اس نے بکریوں کو دیکھا، اس میں پاندھی کی نشان زدہ بکریاں الگ کیں اور چھوٹے بکرے اور ”چھوٹی بکریوں“ کے منہ پر کپڑا باندھا، صبح تک یہ سارا دودھ نہ دیا جائیں۔ اس سے پہلے اس نے انہیں خوب کھلایا پلایا۔ اب وہ بے فکر تھا، یہ بکریوں کا نوڈ ساری زات بھٹوں پر رہا اور صبح سویرا پانڈھی آکر ان کو پہلے گھڑے آتا، منہ ازہ پیرے ان کا دودھ دیتا چائے پھی پی کر پھر ان کو چرانے لے جاتا۔ اس کی تو من محرم ماروی آ رہی تھی۔ وہ اس احساس سے سرشار ہو گیا۔

صحرا کی چاندنی رات، صحرا کو سحرزہ کر دیتی ہے۔ اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ایسے میں محبوب کی یاد پر پھیلائے من میں بسرام کرتی ہے۔ اور اگر ایسی رات میں محبوب کے ملنے کی امید مندھ جائے تو قیس مجنون بن جاتا ہے۔

مگر اس سے صحرائے تھر میں قیس نہیں کھیت مجنوں بنتا جا رہا تھا۔ تھر کی ریت اس کے تلوے چومتی جا رہی تھی اور اس سرشاری میں۔

اسے پتا ہی نہ چلا کہ وہ گاتے گاتے پکی روڈ پر پہنچ گیا ہے۔

”اوہاؤ! میرے یار! بھلی کرے آئیں۔“ ہوٹل

والے نے اس کے ہاتھ سے اونٹ کی مسار پکڑی۔ اونٹ کو چھیر ہوٹل کے لکڑی کے ستون سے

موبائل چھین لیے گئے ہو۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے
کی سینکڑوں سوچوں سے وہ دل کو بہلا رہا تھا، مگر دل میں
اک شک جو جڑ پکڑ چکا تھا، وہیوں کے اغوا کے قصبے
زبان زد عام تھے۔ وہ اس سے مکر نہیں سکتا تھا۔ بس
صرف یہ دعا کر سکتا تھا کہ ماروی ان کے ہتھے نہ چڑھی
ہو۔

وہ اپنے ارد گرد سے بے خبر بے سدھ پڑا ہوا تھا،
کنڈیکٹر نے آکر ٹکٹ کے پیسے لیے۔ ”حیدر آباد اترنا
ہے یا آگے کراچی تک جانا ہے۔“
”حیدر آباد۔“ اس کے منہ سے مری مری آواز نکلی۔

”بس تو جام شور و میل پر پہنچ چکی ہے، یہیں اتر جاؤ۔“
وہ غائب دماغی سے اترنے لگا۔
”بھائی! ٹکٹ کے پیسے تو دو۔“ کنڈیکٹر نے اسے
شانے سے پکڑا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جتنے
پیسے تھے نکال کر کنڈیکٹر کو تھمائے، یہ بھی غصہ سے تھا کہ
اسپتال میں جانے کی وجہ سے اس کی جیب میں کچھ رقم
باقی بچ گئی تھی۔

کنڈیکٹر نے اپنا کرایہ کاٹنے کے بعد بقیہ رقم واپس
دینے کے لیے ہاتھ بھایا۔ مگر وہاں موجود نہیں تھا۔
دروازے سے باہر دیکھا تو وہ مسافر ٹرین کے بیچ کھڑا تھا۔
”یا گل ہے یہ آوی۔“ وہ بڑھڑکا کر نیچے کودا، اسے ہاتھ سے
پکڑ کر اسٹاپا تھ پر کھڑا کیا۔ بقیہ پیسے واپس دیے اور
کوچ میں سوار ہو گیا۔ وہ غائب دماغی سے وہیں کھڑا تھا۔
یہ پل کر اس کرنے کے بعد ہی سندھ یونیورسٹی آتی تھی
اور وہ اپنی ماروی کو اسی سندھ یونیورسٹی میں پڑھنے کے
لیے چھوڑنے آتا رہا تھا اس نے نیچے دیکھا پانی کے
دھبے کہیں کہیں کھڑے دکھائی دیتے تھے۔

شدت سے اس کے دل نے خواہش کی کہ اس
وقت اس پل کے نیچے سیلاب ایسا پانی جوش مار رہا ہوتا
اور وہ اس میں کود کر جان دے دیتا۔ اس کی حیاتی کا
جوش ختم ہو جاتا۔ اس کی ٹانگوں میں اب جان نہیں
رہی تھی۔ وہ کھڑے کھڑے تھک چکا تھا وہیں لیٹ
گیا۔ نگاہ آسمان پر ٹھہراتے تاروں پر اٹک گئی۔ اس کی

باندھا۔
”آج پریس (محبوب) کی آمد کی تیاری ہے۔ پایادہ
چلے آئے ہو۔“ اس نے کھیت کے مٹی آلود پیروں کو
دیکھ کر کہا۔

کھیت ہنس دیا۔ ”ہاں ہاں چیل، زیت نکل گئی۔“
”اور تم نے اتنا وقت بھی نہیں لیا کہ ریت کھود کے
چیل نکال لو، کہیں پریس کو انتظار نہ کرنا پڑ جائے۔ محبت
ایسی ہی طاقت ور ہوتی ہے، سبے خود کر دینے والی۔“
ہوٹل مالک نے اس کا کندھا تھپکا۔

وہ سر جھکا کر مسکرایا جیسے اپنی محبت کو خراج تحسین
پیش کر رہا ہو۔ اس نے سیل نکال کر ٹائم دیکھا۔ اب
تک تو اسے پہنچ جانا چاہیے۔

”فون کر لے۔“ ہوٹل والے نے چائے کا کپ
اس کے سامنے رکھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے فون نمبر ملایا اس نے
سیل سے ”آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے“ کے جواب نے
کھیت کو بہلا دیا اس نے کئی بعد دیکر اسے اس کا نمبر ملایا
مگر جواب نداد۔ اس نے جمع کا نمبر پھر عبد اللہ کا نمبر
ملایا مگر ان کے نمبر بھی بند جا رہے تھے۔

”جس ہونی سے وہ ڈر رہا تھا وہ ہونی ہو گئی ہے
شاید۔“ اس خیال نے اس کے پیروں تلے سے زمین
کھینچ لی۔
وہ بغیر کسی منزل کا تعین کیے ہوئے کوچ میں سوار
ہو گیا۔

وہ غائب دماغی سے نمبر ڈائل کرتا رہا، بار بار نمبر
ڈائل کرنے کی وجہ سے موبائل کی بیٹری لو ہو چکی
تھی۔

اس کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج
رہی تھیں ذہن ماؤف، دماغ خالی خالی، جسم بے جان تھا
لوہی بج چادر، ہتھوڑے بن کے اس کے اوپر برستی
رہی۔

کیا ہو گیا تھا یہ، وہ پھر سے امید کو پکڑ کر دماغ سے وہم
دور کرتا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوا ہو گا ہو سکتا ہے
گاڑی خراب ہو گئی ہو، ہو سکتا ہے ان تینوں کے

عبداللہ اور شمع اس کو وہاں دیکھ کر حیران ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

زندگی میں رات اچکی تھی، اس کی زندگی کا آسمان سیاہ تھا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ستارے اپنے گھروں کو واپسی کی تیاری میں تھے پریشانی، جسمانی اور اعصابی تھکاوٹ نے چند لمحوں کے وقفے وقفے سے اس پر غنودگی طاری کر دی تھی۔

ریل کی چھک چھک سے اس نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ ٹرین پوری رفتار سے پل کے اوپر نی پھری سے گزر رہی تھی پورا پل اس کی چھک چھک کی آواز میں گم ہو رہا تھا۔ اس سے اس کا دل چاہا اس کی زندگی کا پل اسی پل میں زمین زد ہو جائے۔

ستارے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے، سورج انگڑائی لے کر بیدار ہونے کو پرتول رہا تھا۔ اس کی ماروی روز صبح آج کی سورشی جانی ہے اس خیال نے اس کے ہتھکے ہتھکے دہریس بجلی سی بھردی۔ وہ پوری توانائی سے تیز تیز چلے لگا۔ اسے ہر صورت ہاسٹل کے دروازے پر پہنچنا ہے اس کے اندر اتنی توانائی پتا نہیں کہاں سے آئی تھی، ارد گرد ڈرنک سے بے خبر اس کے لیے سارا جہان بے معنی تھا، مضحکہ خیز نظریں۔ کسے ہوئے فقرے اپنے اہتر حال، مہربان سے بے نیاز وہ دوڑنے والے انداز میں دیوانہ وار جا رہا تھا۔ ہاسٹل کے دروازے پر پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ کسی دے کے مریض کی مانند ہانپ رہا تھا۔ چونکیدار نے آنکھیں رگڑ کر اسے دیکھا۔

”کس سے ملنا ہے؟“

”ماروی۔“ اس کے منہ سے اک ہی لفظ نکلا تھا۔

”اچھا اچھا۔ ابھی دروازہ کھلنے میں پندرہ منٹ ہیں۔“

وہ کسی جیلز کی طرح رعب دار آواز میں بولا۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اسی وقت اک ٹیکسی آکر رکی عبداللہ اور شمع اترے تھے وہ دوڑ کر ان کے پاس گیا۔

”میری ماروی؟“ اس کے لہجے میں صحتوں کے سفر کی پیاس جھلکتی تھی۔

”وہ ہمارے ساتھ اپنے گاؤں جا رہی تھی، راستے میں میر پور خاص کراس کرتے ہی، اسے اغوا کر لیا گیا، ہمیں گاڑی سے باہر پھینک دیا گیا۔“ وہ آگے ساری تفصیلات بتاتے جا رہے تھے، مگر اس کی سوئی لفظ اغوا پر اٹکی ہوئی تھی۔ جس شک نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اس کے لیٹین پر وہ ڈھے سا گیا، وہ عبداللہ کے قدموں میں گرا تھا۔

”کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔“ وہ رو پڑا۔

”میرا فریڈکچر زوہ بازو دیکھو۔“ اس نے بینڈج کیا ہوا بازو آگے کیا۔ ”یہ زخم دیکھو جب انہوں نے مجھے گرایا تھا گاڑی سے۔“ عبداللہ نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔

”میں کیسے کہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ میں صبح کو ہاسٹل چھوڑنے آیا ہوں۔ ساری رات پریشانی میں گزری ہے۔“ وہ اپنی پریشانی بیان کر رہا تھا اور شمع اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ کھیت بے جان ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ عبداللہ کا منہ توڑ دے۔ اس سے سب کچھ سچ اگلاوے۔ مگر اس کے جسم میں سکت نہ تھی۔ وہ اس مسافر کی طرح تشنہ رہ گیا۔ جو دشت میں پیاسا سزا ب کے پیچھے دوڑتا دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس کے وجود سے جان نکلتی جا رہی تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

سرورق کی شخصیت

ماڈل ----- فریندا عجاز

میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر

فونو گرامی ----- موسیٰ رضا



”ہے۔“ اسے ترس آگیا مگر عینی کا سر ہنوز جھکا اور انداز میں غصیلہ اپنی نمایاں تھا۔

اس نے استفہامیہ نگاہوں سے کلاس کو دیکھا۔ ساتھ ہی عینی پر نظر پڑی وہ مقدور بھر آنکھیں نکال کر دیانت پس کر اور کلمے بنا بنا کر چھیڑنے والی کو کھور رہی تھی۔

”ایک جو میلی ٹیچر۔ عینی اپنی منگنی سے خوش نہیں ہے۔“

عینی کے ساتھ بیٹھی اس کی پکی دوست نے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے بھی غم میں شریک کرنا چاہا اور واقعی اس کے سر پر ہاڑسا ٹوٹ کر نظر میں عینی پر گئیں۔ جو ہارنے جواری کی طرح گردن کر کے دھپ سے ڈیسک پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا حلال طاری ہو گیا تھا کہ اس کا دل دھڑو دھڑو کرنے لگا۔ سیکنڈ ایئر کی طالبہ۔ نو عمر بھاری سی تھی۔

”اوس۔!“ فکر سے اس کے ہونٹ سٹک گئے۔

”کیوں بیٹا۔ کیوں نہیں پسند۔ کیا وجہ ہے؟“ وہ روسٹرم کے پاس سے ہٹ کر ڈیسک کی قطار میں آگئی۔

”بس ٹیچر۔!“ عینی کی آواز بھرا گئی۔ ساتھ ہی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔

”آپ کے پیرس نے آپ سے پوچھا نہیں تھا بی بی۔“

”پوچھا تھا!“ وہ بد بدائی۔ ”میں نے منع کر دیا تھا۔“ وہ رو ہی پڑی۔

”پھر بھی۔“ اس نے تشفی کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ویری سیڈ!“ وہ واقعی دکھی ہو گئی۔

”یہ آج کے والدین۔۔۔ بلکہ کل والے بھی۔۔۔“

”ٹیچر! اتنے اچھے موسم میں پڑھنے کو دل نہیں کرتا۔“

”پلیز ٹیچر۔!“ سب نے ایک دوسرے کو اشارے کیے تھے اور پوری کلاس یک زبان ہو گئی۔

”اچھا پڑھیں گے نہیں تو کیا کریں گے؟“ اس نے دونوں ہاتھ روسٹرم پر رکھ دیے۔

”باتیں کریں گے ٹیچر۔!“ یہ لاڈ بھری اکساتی آواز سی آر کی تھی۔

”دلیں۔ ٹیچر۔ پلیز ٹیچر!“ سب ہی چلانے لگیں۔

”اوکے اوکے مگر کون سی باتیں؟“ وہ جان چکی تھی کہ ان سب کو آن پڑھنا نہیں ہے۔

”بس یو ہی باتیں۔۔۔“ سی آر نے کندھے اچکائے۔

”مگر ٹاپک تو ہونا چاہیے نا۔“ اس نے اپنے نوٹس فائل میں رکھتے شروع کر دیے۔

”عینی کی منگنی کی بگڑ دیکھتے ہیں ٹیچر۔!“ صدف نے کھڑے ہو کر عینی کی طرف ہاتھ اٹھایا عینی تڑپ کر مڑی۔ وہ مسکرا دی۔ کالج میں البمز وغیرہ لانے کی پریشن نہیں تھی۔ مگر سب ہی جانتے تھے۔ یہ سرگرمیاں جاری رہا کرتی تھیں۔

”تو آپ لائی ہیں البم۔؟“ اس نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔

”نو۔ ٹیچر۔!“ وہ کھڑی ہو گئی چہرہ اتر ا ہوا تھا۔

”ٹیچر البم نہیں ہے۔ اس کے موبائل میں سب کچھ ہے۔“

”موبائل!“ اس نے بھنویں سکیرس۔ عینی کا سر جھک گیا۔

”چلیے منگنی کی خوشی میں۔۔۔ آج موبائل معاف“

بیٹیوں کو سونے کا نوالہ کھلا دیں گے مگر اس معاملے پر
آکرے "اس کو حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔
اس کی نظریں عینی پر ٹک گئیں۔ گندمی بے داغ

رنگت بڑی بڑی آنکھیں سیاہ بالوں کی موٹی اور چھوٹی
چوٹی دائیں کندھے پر ڈالے وہ بہت پیاری بچی تھی۔ مگر
آنکھوں کے آنسو اور چہرے پر تحریر غم۔ وہ مشکل



**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

”نیچر۔۔۔!“ سی آر خود پر قابو پا کر کھڑی ہوئی۔ ”اس سے یہ تو پوچھے اس کو اعتراض کیا ہے سنگیتر۔۔۔؟“ اس کا سوال منطقی مگر لہجہ متبسم تھا۔

وہ بے ساختہ یعنی کی سمت گھوم گئی۔ ”وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے نیچر۔۔۔!“ ضبط کی طنائیں چھوٹ گئیں۔ وہ روئی پڑی۔

”اوہ۔۔۔!“ نیچر کو نئے سرے سے دکھ ہوا، کلاس کی دی دی ہنی وقفے وقفے سے سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔

”نیچر اس سے یہ بھی پوچھ لیں اس کا آئیڈیل ہے کون؟“ ہنستے لہجے کی یہ آواز پچھلی کسی ڈیسک سے ابھری تھی۔ اس کی گردن بے ساختہ یعنی کی سمت مڑی۔ اور یعنی اس بار گھبرا گئی۔ وہ آئین بائیں نشان میں کرنا چاہتی تھی۔ مگر ایک بار پھر پچھلی ڈیسک سے لہجہ بلند ہوا۔

”اسے شرم آ رہی ہے روز نہ۔۔۔ تم ہی بتا دو ناں!“

”مجھے کیوں کہتی ہو تم خود بھی بتا سکتی ہو۔“ ”ہاں تو میں بتا دیتی ہوں اس میں کیا ہے۔ نیچر اسے رمن بھلہ پسند ہے۔ ان فیکٹ وہ اس کا آئیڈیل ہے۔“

”رمن بھلہ۔۔۔ وہ کون ہے۔“

”آپ رمن بھلہ کو نہیں جانتیں نیچر۔۔۔!“ صدے سے پھرتی یہ آواز یعنی کی تھی۔ ”رمن بھلہ۔۔۔ نام تو سنا سنا لگتا ہے۔“

”جی نیچر۔۔۔ وہی رمن بھلہ جو ”یہ ہیں محبتیں“ کا ہیرو ہے۔“

”اوہ۔۔۔!“ اس کے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔

”آپ نے دیکھا ہے ناں اسے نیچر۔۔۔؟“ اس کے چہرے پہ شناسائی کی روش دیکھ کر سب جوش سے بھر گئیں۔

”ہاں۔۔۔ نہیں لیکن۔۔۔“ وہ تو چکرا کر رہ گئی۔ اسے

کبھی شوق نہیں رہا تھا ڈراموں کا۔ اور وہ بھی انڈین سوپ۔۔۔ نا ممکن۔۔۔

میں پر گئی۔ اب کیا کہے۔ تب ہی کانوں میں ہنسی کی آواز ٹکرائی۔ ایسی ہنسی جو قابو سے باہر ہو گئی ہو، اس نے چونک کر سب کو دیکھا۔ یعنی بھی اپنا عم بھلا کر خشنک نگاہوں سے سب کو دیکھنے لگی تھی۔

وہ سخت ست کہنا ہی چاہتی تھی۔ مگر کا بکا رہ گئی۔ ہنسی کا غبارہ۔۔۔ غبارہ نہیں بم تھا جو پھٹ گیا تھا۔ لڑکیاں ایک دوسرے پر گرتی پر لی لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ انہیں نیچر کا خوف بھی نہ رہا۔ یعنی سے بھی نہ ڈریں۔

”کیس کو اسٹ کلاس!“ بالآخر اس نے دھاڑ ماری کلاس کو سانس سونکھ گیا۔ نیچر کے چہرے پر شدید پیش کے تاثرات آگئے تھے۔

”یہ مننے کا مقام ہے بھلا؟“ اس کا لہجہ سخت شرمسار کرنے والا تھا مگر۔

”بہت افسوس ہوا آپ سب پر۔۔۔“ وہ واقعی متاسف تھی۔

”مشکل مرحلہ ہوتا ہے یہ ہر لڑکی کے لیے۔ اور بیٹا یعنی! آپ کو بھی ایک بات کہوں، آپ ابھی بہت کم عمر ہیں انومنٹ ہیں، آپ کو اپنے اچھے برے کا نہیں پتا۔ لیکن وہ جو آپ کے والدین ہیں ناں وہ آپ کے لیے غلط فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

ایک وقت آئے گا جب آپ کو سب ٹھیک لگے گا آپ اپنے پیرمس پر لیو کریں۔“

اس کے بہت نرم اور متوازی جملوں پر یعنی کا سر نفی میں ملنے لگا۔

”ارہ بیٹا۔“ اس نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ سخت دکھی ہو گئی تھی۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایسے آنسو۔۔۔

تب ہی وہ ایک بار پھر بری طرح چونکی۔ پھنسی ہوئی ہنسی اور اگلے بل پوری کلاس چھت پھاڑ قہنتوں سے گونج اٹھی اور اس بار کسی پر بھی نیچر کی آگ برساتی گھوڑیوں کا اثر نہ تھا۔ ضبط نے اس کے چہرے کو سرخ کر دیا۔

لیکن بگھر میں یہ ڈرائیو چلتے ضرور تھے۔

بگھرتے ہیں۔

”نام تو سنا ہو گا۔ ہے ناں ٹیچر۔۔۔؟“

”یہ آپ کین لوگوں کے نام لے رہی ہیں؟“ وہ
بمشکل بول پائی تھی۔

”یہ ہیروز ہیں ٹیچر۔ بانی وڈ کے ہیروز۔ آپ شاہ
ریخ خان کو نہیں جانتیں؟“ وہ اچنبھے سے پوچھ رہی
تھی۔

”نہیں جانتی تو ہوں مگر۔ آپ سب لوگ کیا ذکر کر
رہی ہیں۔“ وہ واقعی انجان تھی۔

”ہم ہیروز کی بات کر رہے ہیں ٹیچر۔۔۔“
”ہیروز۔۔۔؟“

مگر۔۔۔

”تو آپ سب کے بھی آئیڈیلز ہوں گے پھر۔ یعنی
کی طرح۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ٹیچر۔۔۔“ جواب کو دس میں آیا۔
”او گاڈ۔۔۔“

”اے لگاؤہ کسی اور تیارے سے یہاں ابھی ابھی
پہنچی تھی اور ہر شے سے نا بلند ہے زبان سے طور
طریقوں سے خیالات۔“

”ویسے ٹیچر! آپ کے فیورٹ کون ہیں؟“

”میں۔۔۔ سرے۔“ وہ استعجاب ہی سے ابھرنے پاتی
تھی۔

”ٹیچر! ان سب کا جذبہ حب الوطنی فوت ہو چکا
ہے۔“ منعیہ عمیر کھڑی ہوئی اس کا سر اٹھا ہوا تھا
اس نے جملے میں بھاری بھر کم اردو استعمال کی تھی۔

”مجھے تو بس عاطف اسلم اور کیوٹی پسند ہیں۔“

سب ٹیچر کو بھلائے ایک دوسرے کو بچھاڑنے میں
لگ گئیں۔ اس کا ہاتھ روٹھم پر بہت زور سے بجا۔

پلک جھپکتے ساری کلاس میں ہو کا عالم طاری ہو
گیا۔ سب ہی ٹیچر کے چہرے کی خطرناک سنجیدگی سے
گھبرا گئی تھیں۔ گرتے پڑتے اپنی جگہوں پر بیٹھیں۔

”یہ سب لوگ آپ کے آئیڈیل ہیں۔ ہیروز۔۔۔!“
اس کے لہجے سے سناٹا جھلکتا تھا۔ ”یہ بھلے اور فواد خان

”دیکھئے ٹیچر ہم مانتے ہیں وہ گڈ لکنگ ہے۔
اسمارٹ بہت اسپر سیو ہے مگر صرف دیکھنے کی چیز ہی
ہے ناں۔۔۔ اب وہ منگیتر تو ہو نہیں سکتا۔“

”تذہب جنہی الگ ہے دونوں کا۔۔۔“ ایک اسکارف
والی طالبہ نے خوف خدا سے لرز کر سب کو یاد کروایا۔

”اوہاں مذہب بھی!“ سب سر جھننے لگیں۔
وہ ساکت کھڑی تھی۔ شوخ ’نو عمر آج کی لڑکیاں۔۔۔

بلکہ بچیاں‘ ابھی دو سال پہلے تو اسکول میں تھیں۔
اور وہ یعنی۔۔۔ جو ہاتھ کی پشت سے آنکھ پونچھ رہی
تھیں۔

”دیکھا کرنا تھا آپ نے۔۔۔ اس بھلہ کا؟“ اس کی آواز
کنزویں تھی۔

”اچھ بھی نہیں ٹیچر! بس وہ اچھا لگتا ہے۔ کس کا بولنا
۔۔۔ دیکھنا غصہ کرنا سب۔۔۔ وہ ہر لک میں پیارا لگتا
ہے۔“ وہ بے بسی کا شکار تھی۔

”اری ہیرو کی ڈاوی۔۔۔ وہ آل ریڈی میرڈ ہے۔ اصلی
ڈاوی شادی بھول گئی کیا؟“ پہلی رو میں بیٹھی شانے اپنی
ڈاوی کا انداز اپنایا۔

”تو کیا ہوا۔۔۔ اس سے اس کی پرسنالٹی کی انٹیکشن
کم تو نہیں ہوتی۔ وہ ہینڈ سٹے ہے۔“ یعنی نے

آنسو پونچھ کر گویا بازو چڑھالیے۔

”ایک دم بکواس۔۔۔ انڈسٹری میں اگر کوئی ہینڈ سم
ہے تو وہ صرف درون ہے۔“ دوسری لڑکی نے ہاتھ نچا
کر کہا۔

”جی نہیں۔۔۔ ٹائیکر شریف!“ ایک تلی آواز میں بلا
کی تیزی تھی۔ سب ہنس دیں۔

”ٹائیکر شریف۔۔۔ وہ شی من! صرف دوپٹے کی کسر
ہے ہی ہی ہی۔“

”بد تمیزی مت کرو۔ وہ سب سے اٹریکٹو ہے۔ اس
کی آئینہ اور ہائٹ۔“ تلی آواز والی نے ترنت کہا۔

”بھئی شاہ ریخ خان کے آگے سب۔۔۔ پان

وہ شکستہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ جانتی تھی کوئی جواب نہیں دے پائے گی۔ اور یہی ہوا سب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ آدھے ادھورے جملے آنے لگے۔

”جو آپ کو سب سے اچھا لگے۔ جس کی طرح ہونے کا دل چاہے جس کا ہونے کو دل چاہے۔ ٹیچر۔ جو سب سے بہتر ہو، ون آف دی بیسٹ ہو، مکمل۔“ اس کا سر نفی میں ہلا۔

”وہ جو میرا آئیڈیل تھا میرا ہیرو۔ وہ سب سے اچھا تھا۔ اس کی طرح ہونے کی خواہش میں آج تک پوری نہیں کر سکی وہ سب سے بہتر بھی تھا۔ ون آف دی بیسٹ۔ اور سب سے بڑی بات میں چاہا کہ بھی اس کی ہو نہیں سکتی تھی یہ ممکن ہی نہ رہا۔ ساری کلاس دم بخود رہ گئی۔ ٹیچر کے چہرے پر پھلتی مسکراہٹ غم اندوزہ رنگے بیچ سے پھولتی مسکراہٹ۔ اور اسی عیاں تھی۔

جیسے تازہ قبر پر پڑا اکلوتا گلاب۔ خوشی و غم کا امتزاج۔ کیسا عکس تھا چہرے پر۔ یاد کی جگہ کا ہٹ آنکھوں کی نمی یوں جیسے پانی پر تیرنا دیا۔

”میرا ہیرو۔ ذرا الٹی کہاں ہے۔“ وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔

”پلیز ٹیچر۔“ ساری کلاس نے یک زبان ہو کر اصرار کیا تھا۔



یہ جاتی بہار اور آتی گرمی کی کشمکش کے وہ دن تھے۔ جب آنسو غظیم آٹھ نو برس کی کھلے بالوں والی لاپرواہ بچی تھی۔ وہ گڑیا گڈے کا بیباہ رجحانی تھی۔ ساری ساری دوسیر ہم چولہوں کے ہمراہ پھرا کیلی خو وکلامی کرنی پہل دوج کھیلتی تھی۔ سرکس کی مشاق کرتب دکھانے والی لڑکی سی پھرتی سے دیواریں چڑھتی اور چھتیں پھلا نکلتیں۔

آج سوچ کو زبان دینے کے لیے آرٹیکل لکھنے میں ماہر تھی۔ تب بس پہروں سوچتی تھی۔ یونہی ادھر ادھر

اور دوسرے۔ اسے نام بھول گئے۔

”یس ٹیچر۔! کلاس اپنی بات قائم تھی۔“

”آپ لوگ انہیں اپنے ہیروز کہتی ہیں۔“

صدے نے اس کے الفاظ کم کر دیے تھے۔

طالبات اس بار بھی پورے وثوق اور فخر سے ”یس ٹیچر“ کہنے والی تھیں مگر تب ہی انہیں اس کی حالت کا احساس ہوا، وہ بے یقین تھی، حد سے زیادہ مگر ساتھ ہی لگتا تھا جیسے کسی نے اسے ادھیڑ دیا ہے۔ کتر دیا ہے، بکھیر دیا ہے۔

”تو پھر ہمیں کس کو ہیرو کہنا چاہیے ٹیچر۔؟“ کوئی ایک تھی جو سوال میں جیسے سوال تک پہنچی تھی۔

”کم از کم ان سب کو تو کبھی نہیں۔“ اس کا پورا وجود انکار میں کر سب کو حیران کر گیا۔

”تو پھر کون۔؟“ بہت لمبے سے کیا آ آ کے بعد تین لفظی ادھورا جملہ تو تھا مگر سوال مکمل تھا۔

”آپ کرکٹز کو ہیرو کہتی ہوں گی مس۔؟“

سنیہہ، عجبو کے لہجے میں اس کے لیے ترحم سا تھا۔ وہ انکار میں سر ہلاتے ہلاتے رہ گئی۔

”میں نے شک کہا کہ میرا ہیرو کرکٹ تھا۔“

وہ استاؤ تھی اسے اپنا لہجہ بے سکون رکھنا ہی تھا، ہنسی کو بریک لگا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ٹیچر کی سنجیدگی، آنکھوں میں حیرت، حزن۔ شکستگی، مایوسی، یاد۔۔۔

”جیسی ان کی ڈرنگ ہے۔ اسکارف، فیل سلیوز، سیدھی سادی سی، دیکھ لینا یہ کسی مذہبی شخصیت کا نام لیں گی۔“ یہ سرگوشی، بل چباتی ڈیزی نے کی تھی جو شروع سے ہی کانوں میں پینڈز فری ٹھونسے ہوئے تھی۔

”تو پھر کون تھا آپ کا ہیرو۔ آپ کا آئیڈیل؟“

سب چلا اٹھیں۔

”پہلے آپ بتائیے۔ آپ لوگ آئیڈیل یا ہیرو سے کیا مراد لیتی ہیں۔“ ڈیفائن کریں؟“

کی خواہ مخواہ کی باتیں۔ ذرا الگ تھلک ہی رہتی مغورو فکر کرتی۔

تین دن سے چڑھا بخار آج صبح کم ہو چکا تھا۔ وہ بستر سے نکل کر ناشتے کے بعد سیلیوں کے گھروں کی طرف نکلی۔ مگر وہ سب اسکول روانہ ہو چکی تھی۔ بخار کے باعث وہ رخصت پر تھی۔ اس نے پہل و دج کھیلنا چاہا مگر بخار کی نقاہت نے جلد ہمت توڑ دی۔ گڑیا سے بھی کھیلنے کو دل نہ کیا۔ ابو اور باقی بہن بھائی کام اور اسکول جا چکے تھے۔ امی پیچھے کا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے چھت پر چلی آئی۔ وسیع و عریض آسمان اسے اپنی طرف کھینچتا تھا اور وہ چاروں طرف گھوم کر آسمان کا کنارہ ڈھونڈا کرتی تھی۔ نیلا آسمان جس میں جا بجا سفید دھبے تھے۔ نگاہ کی حد پر نظر آتی چیلیں جو پروں کو پھڑپھڑائے بنا ایسے اڑتی دکھائی دیتی تھیں جیسے پانی پر پھولوں کی پتیاں تیر رہی ہوں۔ خزاں خزاں بے آواز۔

آئی چھت پر آسمان کی جانب منہ اٹھائے گول گول گھوم رہی تھی۔ وہ چیلوں کو گنتا چاہتی تھی۔ دور کہیں بجتے ڈیک نے توجہ کھینچی۔
 ”ہوا ہوا اے ہوا۔ جو تھوڑا سا
 کہاں کھلی ہاں کھلی زلف بتا دے
 اب اس کا پتا دے۔ میں اس کے ملوں گا ایک بار
 ملا دے
 ہوا ہوا۔ اے ہوا۔“

وہ گھومتے گھومتے ساکت ہو گئی۔ یہ یقیناً ”دودھ والے کی دکان پر بچھا ڈیک تھا۔ گانا نیا تھا اور بہت مزے کا تھا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھنا چھوڑ کر اب بغور سن رہی تھی۔

تب ہی سر کے اوپر سے گزرتے تربیتی جنگی جہاز کی چنگھاڑ نے اسے نہ صرف چونکا یا۔ لڑکھڑایا بلکہ بدمزہ بھی کر دیا تھا۔ گانا سننے میں کتنا مزہ آ رہا تھا۔ اس نے فوراً ”سراٹھا کر دیکھا تھا۔ مسور بیس اس علاقے سے کچھ ہی دور تھا۔ اور جہاز یہاں سے گزرتے ہوئے پہنچے پرواز کیا کرتے تھے۔ ایک کے بعد ایک گزرتے جہاز

یہاں کے مینوں کے لیے قطعاً باعث حیرت نہ تھے۔ مگر اس جہاز کی آواز اور بے حد عجیبی پرواز سے چونکتی آئی کی آنکھیں اس وقت پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے جہاز کو عین اپنے سر کے اوپر دکھا اور یہ کیا اس کی دم میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اڑتے جہاز کے پیچھے ایک روشنی کا لپکا تو ہمیشہ ہی نظر آتا تھا مگر یہ آگ تھی بھڑبھڑکتی۔ آئی بچے کے گھر میں رہتی تھی اور اس کے عین سامنے بڑے گراؤنڈ کے بعد فلیٹ تھے۔ کیا یہ جہاز فوراً فلور کی نیلے شیشے والی کھڑکی میں گھس جانا چاہتا ہے۔ اس نے دہل کر سوچا۔

یا آج وہ کسی فلیٹ کی چھت پر اترنا چاہتا تھا۔ اتنا آآئیچھے۔

”امی امی۔ امی جی۔“ وہ بے حد گھبراہٹ کے عالم میں چلاتے ہوئے کنارے پر آئی۔

”کیا ہوا آئی۔ پیچھے ہوا مگر جاوگی۔ کیوں چلا رہی ہو۔ کنارے سے دور تو ہو۔“

”امی وہ۔ وہ جہاز کو آگ لگ گئی امی۔“
 ”کون سے جہاز کو۔؟“

”وہ جو ابھی اوپر تھا۔“ اس نے جواب دینے کے ساتھ ہی منہ اٹھایا۔ اوپر تو کچھ بھی نہ تھا۔ آسمان صاف۔ وہی بے آواز اڑتی چیلیں۔ وہی دودھ والے کا بچھا ڈیک۔
 اے جولی جولی۔ جولی کا دل تجھ پر آیا جولی۔

تیرے لیے چڑھ جاؤں سولی۔

تو ہی تو میری جان ہے جان ہے جان ہے جان ہے۔

جولی جولی۔“

”پاگل تو نہیں ہو گئی۔ بخار میں جا کر چھت پر ٹنگ گئی اور اوپر سے انوکھی باتیں غورا“ نیچے آؤ۔ آرام کرو۔ خدا نخواستہ چکر کھا کر نیچے گر گئی تو۔“

”میں سچ کہتی ہوں امی۔ وہ جہاز بہت نیچے تھا اور اس کی دم کو آگ۔“ اپنی صفائی دیتے دیتے اس نے جملہ اوجھڑا چھوڑ دیا۔ نیچے سے ایک دم ایک شور ابھرا تھا۔ وہ چھت پر ہی گئی کی نسبت بھاگی اور نیچے جھانکا۔

سیدھی جانب جانا تھا نا یہ غلط سمت کیوں گیا؟

”ارے میں یہی تو کہہ رہا ہوں، عوام کے خون پسینہ کا پیسہ خرچ ہوتا ہے ان جہازوں کی خریداری اور مہینٹی نینس پر۔ آج تو جہاز سے ہی کسی انٹری کے ہاتھ میں جسے یہ تک نہیں بتا کہ جانا کہاں ہے۔“

مختلف آرا۔۔۔

زہر میں بجھے جملے۔۔۔
کسی دل جلے نے کچھ گالیوں سے جملے کے سابقے لاحقے کی ترتیب کی تھی۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ قیافے، گمان، شکوک اور فکر کے ہمراہ شدید حیرت یہ منظر شاید تمام لوگ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ سوجوش و جھجھو بہت زیادہ تھی ایکسٹنٹمنٹ کی۔

تب ہی ایک عجیب سا منظر سب کو حیران کر گیا۔ جہاز کے انڈر سے کوئی سیاہ سی گٹھڑی نکلی تھی جس کوئی چیز مگر کیا ہے کوئی نہ سمجھ سکا۔ وہ اتنی دور اور پلند تھی کہ اپنے وجود کی وضاحت نہیں کرے سکتی تھی۔ سیاہ گٹھڑی نیچے کو گرتی ہوئی اور حیران کن بات یہ ہوئی کہ گٹھڑی کا بوجھ اتار پھینکنے کے بعد جہاز نے تیزی سے سرخ بدلا۔ وہ اونچائی سے ایک دم بہت نیچے ہوا تھا اور اگلے ہی پل وہ ایک بار پھر آئی لگے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اس کے گرد جھکارا رہا تھا۔

وہ اتنا نیچے تھا کہ آن کوڑکا اگر اس کے ہاتھ میں ایک برٹا بانس ہو تو وہ جہاز کو شاید چھو لے۔ وہ وہاں سے چلا کیوں نہیں جاتا۔ اس نے جہاز کو بلندی پر تو دیکھ رکھا تھا۔ مگر اتنا نزدیک اف۔۔۔ !!

جب جہاز گرتا ہے تو جہاں گرتا ہے تو وہ جگہ تو جہاں ہو جاتی ہے نا۔ تو کیا وہ تھوڑی دیر بعد مرجائے گی اگر جہاز اس کے سر پر گر گیا اور اگر وہ سر پر نہ بھی گرا تو اس کے گھر پر گر گیا مسجد پر۔ اور فینٹس میں بھی تو اس کی بہت سی مسہیلیاں تھیں اور گراؤنڈ میں جہاں وہ سائیکل چلانے جاتی تھی۔ اور جہاز اسی گراؤنڈ کے اوپر منڈلا رہا تھا۔ وہ وہیں ٹک گیا تھا گویا۔ یعنی ہر دو صورت

نقصان آتی ہی کا ہوتا تھا۔

وہ کبھی دامن طرف گرون موڑ کر گراؤنڈ پر بہت نیچی پرواز کرتے جہاز کو دیکھتی اور کبھی ہاتھ کاچھاماتھے برٹکا کر گٹھڑی کی تلاش کرتی جو نجانے کہاں جاگری تھی۔ اور اس گٹھڑی میں کیا ہوگا۔ اس کا نشانہ بن سوج نہ پاتا۔ کوئی خزانہ یا راز یا بہت سارے نوٹ۔۔۔ یا۔۔۔ یا کیا؟

وہ ابھی تک چھت پر تھی، مگر اسے اندازہ تھا کہ ایک ونیا گراؤنڈ کے نزدیک ہوگی۔ دفعتا ”جہاز نے ایڑاں بھری، وہ دامن جانب اڑا تھا۔ پرواز بہت نیچی تھی۔ وہ کہاں جا رہا تھا، کیا ہمیں؟ مگر اس سوال کے جواب سے پہلے ایک شور نے اسے متوجہ کیا۔ چھت پر کھڑے لوگ انگلی سے بائیں جانب اشارہ کر رہے تھے اس نے کھوج کی تو آسمان پر کچھ تھا۔ وہ چیل۔۔۔ ہی نہیں تھی کو ابھی نہیں تھا وہ۔۔۔ ایک۔۔۔ آئی نے پالیا۔ وہ چلائی۔

آسمان پر گڈا ہے، چھتری کے نیچے لٹکتا گڈا۔ جہاز نے گڈا گرایا تھا؟

”ارے یہ تو پائلٹ ہے جو پیراشوٹ سے اتر رہا ہے۔“

”کیا؟“ سب کے منہ کھلے کھلے رہ گئے۔ پیراشوٹ سے اترتا پائلٹ (گڈا) وہ بہت اور بڑا تھا۔ سب جہاز کو بھول کر گڈے کو دیکھنے لگے۔ وہ شور کے الامان۔ تب ہی ایک دھماکے کی آواز اور کالے دھوئیں نے سب کے منہ بند کر دیے اور گرد میں دامن جانب موڑ دیں۔

گراؤنڈ سے بہت دور جہاں گودام اور فیکٹریز تھیں جہاز منہ کے بل روٹی کے گودام میں جاگرا تھا۔ ساتھ کوئی بیٹری فیکٹری تھی۔ روٹی کے گودام سے آگ کے شعلے بھڑکنے لگے ایک ہنگامے کے سے عالم میں لوگ فیکٹری کی طرف بھاگ رہے تھے۔ آئی سرعت سے نیچے اتر آئی۔ وہ ماں کی نظر بچا کر گودام کی جانب بھاگنا چاہتی تھی مگر تب ہی اسے لگا کہ آسمان سے اترتا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ، سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کالے دھوئیں بنی لکیر تھی اور بائیں جانب وہ سیاہ پوش۔

ہجوم کے ساتھ دوڑتی آئی کلج کے گراؤنڈ کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ چھوٹی تھی اور بڑوں کی ٹانگوں میں سر گھسا گھسا کر جگہ بناتی اب سب سے آگے کھڑی تھی۔

سیاہ پوش اب سروں کے عین اوپر تھا اور کسی بھی لمحے نیچے اترنے والا تھا، اسے دیکھنے کا شائق ہجوم جو مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ جب اسے دھیرے دھیرے زمین کے نزدیک ہونا دیکھنے لگا تو کسی کے بھی حکم کے بغیر خود بخود پیچھے سرکنے لگا۔ بہت بڑا کھلا میدان اترنے میں معاون تھا، مگر ہوا کا سرخ! اگر وہ کسی درخت سے جا لگتا تو سیاہ بڑے گیٹ سے تین گاڑیاں اندر داخل ہو رہی تھیں ان میں سے نکلنے والے درووں میں لباس تھے، مگر وہ آگے نہ بڑھے۔ وہیں رک کر دیکھنے لگے۔ ان کی نظر اترنے والے پر تھی وہ اتنا نزدیک ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے کے نقش واضح ہو رہے تھے۔ وہ نجانے کتنی دیر سے ہواؤں سے نبرد آزما تھا، کتنے گھنٹوں سے۔

ہجوم ساکت تھا۔ سراسیمہ۔ بے یقینی پھٹی آنکھوں والے لوگ۔ بوڑھے جو ان پہلی بار اس چیز کا تجربہ کر رہے تھے۔

وہ اگلے لمحوں میں زمین پر اترنے ہی والا تھا۔ اس کے قدم زمین کو چھونے والے تھے۔ سب کی سانسیں رک گئی تھیں۔ اسے کچھ ہونہ جائے، لیکن اسے کچھ نہ ہوا، بے حد مشاقی سے بھاری بوٹ زمین سے ٹکرائے تھے۔

وہ رکتے رکتے بھی گراؤنڈ میں کتنا ہی بھاگ لیا، دھیرے دھیرے سرکتا، مدہم ہوتا بہت آرام سے

کوہلے کے زور پر نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا سر شاید چکرا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا تھا۔ ہجوم زرا تباہ آگے ہوا تھا، مگر نیچے کھڑے فوجی جوان الرٹ تھے، ان کے نقطہ ہاتھ کے اشارے نے سب کو اسٹاپ

گذا اب بہت واضح ہو گیا ہے۔ اس کے سر پر چھتری کھلی تھی اور دونوں ٹانگیں فضا میں وی کی طرح کھلی تھیں۔

آنی نے فوری فیصلہ کیا وہ گودام نہیں جائے گی وہ گڈے کے پیچھے بھاگے گی۔ اسے یہ گڈا چاہیے۔ ہر صورت۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ وہ جلد از جلد جائے تاکہ سب سے پہلے پہنچ کر اس گڈے کو اپنے قبضے میں لے لے۔ پھر وہ سب کو تائے کی کہ اس کا گڈا وہ ہے جو کرنے والے جہاز نے پھینکا تھا اور اب وہ اس کا ہے۔

لیکن گڈا ابھی بہت دور تھا۔

وہ اگر آبادی سے نکل کر دائیں سڑک پر جائے اور پھر اس راستے پر زمین پر بھاگتی جائے جہاں جہاں اور گڈا اڑ رہا ہے تو جب وہ نہیں بھی گئے گا۔ اترے گا تو وہ اسے پکڑے گی، مگر آنی کی یہ سوچ غلط ثابت ہوئی وہ اکیلی گڈے کا تعاقب کرنے والی نہیں تھی اور بھی کتنے بہت سارے لوگ اسی جانب بھاگ رہے تھے جہاں "گڈے" کے اترنے کا امکان تھا۔ روڈ کے اختتام پر الیکٹرونکس کمپنی تھی اور ساتھ ہی پوائنٹ کلج اور بھاگتا روڈ۔ اور اسے تو آبادی کے باہر آنے والے روڈ تک پر جانے اجازت نہیں تھی، تو وہ پیچھا کرتی کہاں تک جائے گی؟ اور اگر گم ہو گئی تو۔۔۔ اسی کتنا ماریں گی۔ امی نے گم ہو جانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

لیکن وہ اکیلی تو نہیں جو گڈے کا تعاقب کر رہی ہے، اسی کی گلی کے کتنے لوگ لڑکے اور انکل اور بچے بھی۔ وہ ان ہی کے ساتھ واپس آجائے گی، مگر یہ گڈا گیا کہاں۔ اس نے دفعتاً "چونک کر دیکھا، پریشان ہونے سے پہلے وہ اسے دکھائی دے گیا۔ وہ کلج کے

عین اوپر تھا اور اب واضح ہو گیا تھا۔ وہ گڈا نہیں تھا کہ جس سے کھیلا جاسکتا یا وہ اپنی گڑیا کا بیہ رچا لیتی وہ تو بہت بڑا تھا۔ اس کے ابا کے قد کے برابر یا شاید ان سے بھی بڑا۔ لیکن اب یہاں تک آکر وہ واپس کیوں جائے وہ اسے دیکھے تو ضرور۔۔۔ آسمان پر وہیں جانب

کر دیا۔

یہ جشن نجانے کب تک برپا رہتا، مگر گاڑیوں میں آئے فوجیوں نے ذرا سختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بمشکل اسے ہجوم کے ہاتھوں سے نکال کر گاڑی تک پہنچایا، ہجوم جسے رخصت کرنے میں تک جانا چاہتا تھا، مگر یہ سب پیدل تھے اور وہ گاڑیاں تھیں، فضا میں مسلسل نعرے بلند ہو رہے تھے۔

شدت جذبات سے لوگوں کے چہرے سرخ تھے وہ ایک دو سرے سے لپٹ کر نجانے کس شے کی مبارک باد دے رہے تھے۔ گاڑیاں چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوئی تھیں۔ آئی سائیکس و صامت کھڑی تھی۔ وہ تو گڈے کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بھاگی آئی تھی۔

لوگوں کی زبانوں پر قصے ہی قصے تھے، سب داستان کے لیے وہ وہ حاشیہ آرائی کر رہے تھے کہ بس۔
دائیں جانب کالا دھواں ہنوز تھا۔



”ان کے پاس پیٹرول ختم ہو گیا تھا اور فنی خرابی اس کے علاوہ۔“ ابو نے رات بتایا۔

”تو دونوں کو چاہئے نا اب اسے ایک ہی کو دیا؟“ یہ آئی کا بھائی تھا۔

”دونوں ہی کو دینا چاہتے تھے اور اس کی اجازت بھی ہوتی ہے۔ اپنی جان کی حفاظت سب سے اہم ہے۔“
”تو پھر کیوں نہ کو دے۔“ آئی نے عجلت سے پوچھا۔

”بیس تک جانے کے لیے اونچی پرواز کرنی پڑتی تھی، جو خرابی کے باعث ممکن نہ تھا اپنی جان بچاتے تو سب سے موزوں جگہ جہاز گرانے کے لیے یہی آبادی اور اس کے ارد گرد کا علاقہ تھا۔ چاروں اطراف بڑی بڑی فیکٹریز۔ جہاز گراتے تو آگ سے سب سس نہیں ہو جاتا۔“

ایک بوڑھی خاتون اپنے گھر سے دودھ منگوا کر اسے پلا دینا چاہتی تھیں کہ اس نے کتنی مشقت جھیلی، کب سے تو اڑ رہا تھا۔

اور وہ واقعی کسی نقاہت کے زیر اثر تو تھا۔ فوجی اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ وہ اس کی مدد کر رہے تھے۔ پیرا شوٹ کھولنے میں اور پتا نہیں کیا کیا۔ وہ سب مسلسل کچھ بول رہے تھے، اسے اٹھنے پر اکسار رہے تھے پھر کسی نے شاید سہارا دینا چاہا ایک نے ہاتھ بڑھایا کہ وہ اٹھ جائے، ہجوم خدشات میں گھرا تھا کیا وہ کھڑا ہو سکے گا اتنی دیر تک ہوا میں رہنے کے بعد؟ دل کا نینے لگے اور آنکھ بھرنے۔ خشک حلق نے زبان کو بھی آگڑا دیا تھا۔

دونوں ہاتھوں کا دباؤ زمین پر ڈال کر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ہجوم میں سرور کی تعداد زیادہ تھی اور بچے۔ بچے بس حق دق تھے۔ اور مرد۔ کون کہتا ہے مزد کو درد نہیں ہوتا اور اس کی آنکھ بہتی نہیں۔ یہاں تو ہر آنکھ اشکبار تھی اور پل جاتے تھے کہ وہ سب اسے آگے بڑھ کر کسی بھی طرح اٹھا لیتے۔ وہ نجانے کس تکلیف میں تھا، مگر یہاں کھڑے تمام لوگ اذیت سمیٹنے کی آخری حد میں تھے۔ وہ آخر کھڑا کیوں نہیں ہو جاتا۔

اور ایسا کیا کیا جائے کہ وہ بس جلدی سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے۔ تب ہی آئی نے دیکھا اس نے ایک بار پھر زمین پر ہاتھ جمائے (اٹھنے کی کوشش) ہجوم نے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔ اور وہ ذرا سا لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہجوم بے قابو ہو گیا۔ ایک خود ساختہ حد بندی کا حصار توڑ کر وہ آگے بڑھے تھے اور اگلے پل ”آئی کا گڈا“ ہجوم کے کندھوں پر تھا۔ وہ نعرہ تکبیر بلند کر رہے تھے۔ پاکستان زندہ باد، پاک فوج زندہ باد کے

نعرے لگا رہے تھے وہ اسے چھوٹا چاہتے تھے اور جو مناوہ گوشت پوست کا بنا جیتا جاگتا انسان نہ ہوتا، شاید اس کے ٹکڑے کر کے بطور تبرک آپس میں بانٹ لیتے۔

”تو ہمارے سر پر ہی کیوں چکر لاتے رہے؟“ آئی کی نگاہوں سے منظر ہٹا ہی نہیں تھا۔

”وہ آبادی پر نہیں گرانا چاہتے تھے۔ بڑے گراؤنڈ کو بار بار جانتے تھے۔ گراؤنڈیسٹ تھا مگر جہاز گرنا تو ساتھ کھڑے فلیٹ بھی شاید گر جاتے۔“

”تو ابو جب جہاز کا گرنا طے ہو چکا تھا تو دونوں پیراشوٹ سے چھلانگ لگا لیتے ایک ہی نے کیوں لگائی؟“

”ایک نے اس لیے لگائی کہ دونوں اپنی جان بچانے کے لیے جہاز کو بے لگام چھوڑ کر کود جاتے تو جہاز ڈولتا ہوا کہیں بھی گر جاتا، فیکٹریز پر، روڈ پر یا یہاں ہمارے گھر پر۔“

”میرے اوپر ابو۔۔۔“ ان کے سینے پر سر رکھ کے انھماک سے سنتی آئی نے تیزی، مگر شدید بے یقینی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بیٹے آپ۔۔۔ کسی پر بھی۔۔۔“

”کسا نہیں پتا تھا کہ نیچے آئی ہے۔ یعنی زمین ہوں آنسو عظیم۔۔۔؟ کیا میں انہیں نظر آ رہی تھی؟“

”بالکل نظر آ رہی تھی اور اگر نہ بھی نظر آتی تو وہ دونوں جانتے تھے نیچے بہت ہی آسمان رہتی ہیں۔“

”آپ صحیح کہتے ہیں ابو۔ انہیں پتا تھا نیچے صرف میں ہی ہوں باقی تو سب نیچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ مجھے تو بخار تھا نا، وہ صرف مجھے بچانے کے لیے دیر تک جگہ ڈھونڈتے رہے اور سارا پیٹریول ختم ہوئے پر خود ہی جلدی سے بھاگ کر روٹی کے گوانڈ میں گر گئے۔ کیا انہوں نے جہاز اڑانے وقت مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں چھت پر تھی نا؟“ وہ ابو کی بات پر دل سے ایمان لے آئی۔

”ویسے تو سخت پورا لگا دیا گیا تھا جہاز کے بلے کے گرد، مگر وہ حاجی صاحب کا بیٹا بتا رہا تھا تین پاؤں تک کی گوشت کی ایک ڈھیری سی ملی ہے باقی سب خاکستر ہو گیا۔“ اسی نے ذرا مدہم آواز میں کہا۔

”اوں ہوں بچوں کے سامنے ایسی بات نہیں کرتے۔“ ابو نے سرزلش کی۔

”ابو! خبروں میں بتایا تھا کہ مرنے والے پائلٹ کی یہ آخری پرواز تھی۔ وہ دو دن بعد چھٹی پر جا رہے تھے۔“

ان کی شادی تھی۔“

”مرنا نہیں کہتے۔ شہید کہتے ہیں بیٹے۔“ ابو نے تنبیہ کی۔

”شہید کیا ہوتا ہے ابو؟“ یہ آئی کے لیے نیا لفظ تھا۔

”شہید۔“ ابو نے شعوری وقفہ لیا۔ وہ آسان سے آسان الفاظ میں معنی بتانا چاہتے تھے۔

”وہ جو اللہ کی راہ میں جان دیتے ہیں اپنے ملک اور قوم کو بچانے کے لیے لڑتے ہیں اور لڑتے لڑتے مر جاتے ہیں، وہ شہید کہلاتے ہیں جیسے آج شہید ہونے والا پائلٹ اتنے بہت سارے انسانوں کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل گیا۔ اس نے سوچا کہ میں اکیلا ہوں اور نیچے اتنے سارے۔“

”نیچے میں ابو۔۔۔“ آئی نے ان کا گھٹنا ہلا کر تھپتھپ کی۔

”ہاں بیٹے ہر وہ شخص جو کسی دوسرے کی جان بچانے کے لیے۔“

”ابو! میں۔۔۔ میری جان بچانے کے لیے۔ ایسے کہیں آئی کی جان بچانے کے لیے مرحلے والے کو شہید کہتے ہیں۔“

اس نے ابو کو پورا جملہ بنا کر دیا۔ ان کی مشکل آسان کر دی۔ سلیس اور مکمل تشریح و وضاحت۔

ابو کی یقینہ بات سنیں ہی رہ گئی۔ بیٹی کی غلط فہمی کو دور کرنا کسی اور وقت پر چھوڑ کر وہ اس بات میں سر ہلانے لگے۔

چھوٹے سے داغ میں چھوٹی سی بات بٹھانا ہی اس بل مناسب لگا۔

جب وہ بڑی ہوگی تو بڑی بات خود بخود سمجھ جائے گی۔

اپنے بچپن کا ایک ناقابل فراموش واقعہ بیان کرتے کئی بار آنسو عظیم کی آواز بھرائی تھی۔ زبان لڑکھرائی اور آنکھ جھلملا گئی تھی۔ شدت جذبات سے ہونٹ لرز لرز جاتے تھے، مگر اس نے حرف بہ حرف بیان کیا تھا۔ اس کی قصہ گوئی میں تمام لوازمات موجود تھے۔

جذبات نگاری، منظر نگاری، ڈرامائی وقفے، سسپنس کے ساتھ ساتھ تھرر ایکشن سب، مگر اس قصے میں ان

جانثاروں کے لیے محبت تھی، یقین تھا اعتماد بھروسہ۔ عقیدت کیا کیا نہیں تھا۔

وہ گراؤنڈ کے اوپر چل پھیریاں کھاتے اس جنگی تربیتی جہاز کو دیکھ رہی تھی۔ کتنا آسان تھا اس بے نام بالٹ کے لیے۔ اپنے دوسرے ساتھی کو اتار کے خود وہ کسی محفوظ جگہ کو کھوٹا رہا جہاں جہاز گرائے تو نیچے کسی کا کوئی نقصان نہ ہو اور اس تلاش لا حاصل کے وقت وہ بخوبی جانتا تھا۔ وقت کم ہوتے ہوتے ختم ہو رہا تھا یہاں تک کہ روٹی کے گودام میں جہاز کی نوک دھنس گئی۔

بولتے ہوئے کئی بار اس کے ہاتھ ٹھنڈے بھی ہوئے تھے۔ کبھی وہ سر تپا کیکیا جانی لڑکیاں ساکت تھیں ایسے واقعات کو سن کر ایک منٹ کی خاموشی کے بعد ہم سب بھول جاتے ہیں۔

مگر جو لوگ ایسے واقعات کو جھیلتے ہیں یا پھر کسی نہ کسی طرح ان کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہ پھر زندگی کو کس آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ زندگی ان کے لیے کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔

وہ کچھ نظریات میں کے ہو جاتے ہیں، کبھی نہ بدلنے کے لیے اور آنسہ عظیم کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ ایک دنیا مخالفت و تضحیک (سچی یا جھوٹی) کا علم لے کر گھومنی ہو جاتی، مگر اس نے ایک انچ پیچھے نہ سرکنا تھا اس نے ہوش سنبھالنے سے پہلے کچھ چیزیں طے کر لی تھیں۔

کچھ خیالات جو بچتے ہو گئے تھے۔ ایک عقیدت جو نظریں اٹھانے ہی نہ دیتی تھی۔ ایک اعتماد جو کبھی ڈرانا ہی نہ تھا۔ ایک محبت جس نے جی بھر کے۔ جو لطف اٹھایا وہ پھر اور کہاں۔

یعنی نے پانی کا گلاس آنسہ عظیم کے لیے بھرا تھا۔ سب اسے گھونٹ گھونٹ پانی حلق سے اتارتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ آنسہ کے لیے اور اٹھنا چاہتی تھی یا نہیں۔ کہہ چکی؟

”یہ بہت خاص مٹی سے ڈھلے لوگ ہوتے ہیں، ہماری ہی طرح دو ٹانگوں پر چلنے والے انسان۔ دیکھنے میں ہم جیسے لگتے ہیں، ہم ہی سے ہوتے ہیں، مگر اصل میں یہ انسان بھی نہیں ہوتے، فرشتے بھی نہیں۔ آپ انہیں جن بھی نہ سمجھے گا۔ وطن مذہب اقدار پر شمار ہو جانے والے کوئی اور ہی مخلوق ہوتے ہیں۔“

آنسہ کے حلق میں گولا سا انکا اس کی آنکھوں میں تقریباً ”چوبیس چوبیس برس پہلے کا واقعہ ایک فلم کی طرح چل رہا تھا، وہ جوانی میں اڑتے گڑے کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے کوپا بالٹ کو پیراشوٹ دے کر اتار دیا۔ وہ خود کیوں نہ اترے؟ چھوڑ دیتا جہاز کو ڈانوا ڈول۔ اور خود بحفاظت اتر آتا۔

اس نے ایسا کیوں نہ کیا کسی نے کہا اس کے جواب۔ میرے ہیرو نے میرے لیے زندگی قربان کر دی۔ اس نے میرے خاطر جان دے دی۔ اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا ہے کسی کے لیے؟

آنسہ عظیم کو کھلے بالوں فراک نیکر پاؤں میں پلاسٹک کی ریف ہوئی سے روڈ پر اندھا دھند بھاگتی، آئی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

جسے ”گندے“ کو حاصل کرنا تھا۔ دھونکنی کی طرح چلتا سنا نہیں اور مسلسل بھاگتی آئی۔

آنسہ عظیم کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔ اس نے اپنے کاغذ پینے شروع کر دیے تھے وہ لکھڑی ہو چکی تھی۔ یہاں مزید بھرناب مشکل لگ رہا تھا۔ مگر ہر کی جانب قدم بڑھاتے بڑھاتے وہ رک گئی۔ ”میرا ہیرو ایک فوجی تھا۔“

ایک نے میری خاطر جان قربان کر دی اور دوسرے کو میں پانہیں سکی۔“ اپنی بات کہہ کر پھر آنسہ عظیم سے رکانہ گیا۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ پیچھے پھیلا سناٹا اونچی اونچی آواز میں چلا رہا تھا۔ زبان بند تھی اور دل بول رہا تھا۔

اور دل کی بولی سمجھنے کے لیے دل والا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

تسلی

فرزند نازنین!

ایک دفعہ ایک کشتی میں سوار ہوا ایک بادشاہ
ساتھ ایک بچی غلام کے
اور غلام نے نہ دیکھا تھا کبھی دریا
اور نہ کبھی اٹھائی تھی کشتی کی تکلیف
لگا وہ رونے دھونے اور کانپنے لگا اس کا بدن
کر کر رہا ہو گیا اس سے بادشاہ کا سارا مزہ

کہ نہیں رہ سکتی تھی اس کی نازک طبع ایسی باتوں کو
لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی کوئی تدبیر
تھا اس کشتی میں ایک عقل مند بھی
بولتا وہ بادشاہ سے۔ ”اگر ہو حکم تو خاموشی کراؤں
اس کو ایک طریقے سے؟“
کہا بادشاہ نے ”بڑی مہربانی ہوگی۔“
اس مطابق اس دانا آدمی کے حکم کے

پھبیسویں قسط

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

اے پیٹ بھرے! تجھے اچھی معلوم نہیں ہوتی جو
کی روٹی۔
جو چیز تجھے بری معلوم ہوتی ہے وہ ہی میرے لیے
بھلی ہے

بہشت کی حوروں کے لیے
اعراف دوزخ ہے۔

دوزخیوں سے پوچھ

کہ اعراف بہشت ہے!

(ایک رائے کے مطابق اعراف جنت اور جہنم کے
اس درمیانی مقام کو کہا جاتا ہے جہاں وہ لوگ کھڑے
ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہو جائیں گی۔)
(حکایت سعدی از کتاب گلستان سعدی)

آسمان پہ سورج سنہرے تاروں کا جال بن کر سب
کے سروں پہ تانے کھڑا تھا۔ مورچال کی سبز بیلین اس
دھوپ میں چھلس رہی تھیں۔ حالانکہ ابھی صبح بھی
پوری طرح جا سی نہیں ہوئی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے

مکمل ناول

لوگوں نے پھینکا غلام کو دریا میں
کھائے غلام نے چند عموٹے
پھر پکڑا لوگوں نے اس کو سر کے بالوں سے
اور لائے کشتی کے آگے
وہ غلام لٹک گیا دونوں ہاتھوں سے کشتی کے دنبالے

میں
پھر جب نکلا دریا سے تو ایک گوشے میں
بیٹھ گیا اور اس کو سکون ہو گیا۔
ہوا بادشاہ کو تعجب پوچھا اس نے
”کیا تھی دانتی اس عمل میں؟“
جواب دیا عقل مند نے کہ
غلام نے اس سے پہلے نہ اٹھائی تھی
تکلیف ڈوبنے کی اور وہ ناواقف تھا
کشتی میں محفوظ رہنے کی قدر سے
آرام کی قدر وہی کرتا ہے
چونچھس جائے کسی مصیبت میں۔

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے سر ہلاتے ہوئے گہری سانس لی۔ "اور اگر اس نے مجھ سے کچھ ایسا پوچھا جو میں نے آپ کو بھی نہ بتایا ہو تب؟"

زمر چند لمحے اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ "تم نے مجھے کیا نہیں بتایا؟"

سعدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر شانے اچکائے۔ "مجھے یاد نہیں۔" اور وہ دونوں ہنس پڑے مگر وہ ذرا فکر مند ہو گئی تھی۔

"ذکیل سے کچھ نہیں چھپاتے سعدی! مجھے بتاؤ۔" وہ آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کپ رکھ کر بولا۔ "جیسا کہ میں نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا، مجھے یاد نہیں۔"

"اگر تم سے کچھ ایسا ہوا ہے جو جرم کے زمرے میں آتا ہے تو تم مجھے بتا سکتے ہو۔"

"میں نہیں بتانا چاہتا لیکن اگر اس نے مجھ سے اس بارے میں پوچھا تو مجھے کیا کہنا چاہئے؟"

"سچ بولنا۔ بالکل سچ۔" وہ تاکید کر کے اٹھ گیا۔

جب وہ بیگ اور فون لیے لاؤنج میں آئی تو سامنے ندرت کے کمرے میں کھڑی حسین تیار ہوتی نظر آ رہی تھی۔ قریب میں ہی فارس بھی ندرت کے ساتھ صوفے پہ بیٹھا تھا۔ زمر جو کھٹ پتہ کھری تو حسین نے اسے دیکھا۔ پھر فوراً بولی۔

"میں آج بھی کورٹ جاؤں گی۔ پلیز کوئی منع نہیں کرے گا۔ جب آپ وہ جعلی ای میل دکھائیں گی تو مجھے ہاشم کا چہرہ دیکھنا ہے۔"

اور وہ جانتی تھی وہ اس موقع پہ اپنے ہاتھ پہ کیا لکھ کر اسے دکھائے گی۔ سوچ کر ہی مڑا آتا تھا۔ سوچ کر ہی تکلیف ہوتی تھی۔

"ہاں آجاؤ۔" پھر فارس کو دیکھا۔ "تم نہیں آؤ گے۔"

"مہوڈ نہیں ہے۔" اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

زمر نے گہری سانس لی۔ "پتا نہیں تم کب اس

جھاٹو تو بلا سڈز کے ہیٹلز سے گول میز دکھائی دیتی تھی جس کے گرد وہ دونوں بیٹھے تھے۔ زمر سیاہ کوٹ پہنے گھنکر بالے بال آدھے باندھے چائے کے گھونٹ بھرتی غور سے سعدی کو دیکھ رہی تھی جو قدرے کم صم سا بیٹھا تھا۔ گہرے سبز کرتے میں ملبوس، نیلے بالی برش کیے، تازہ دم اور تیار تھا۔ البتہ آنکھیں اداس تھیں۔ عائب دماغی سے کپ کے کناروں پہ انگلی دائرے میں پھیر رہا تھا۔

زمر نے نرمی سے اسے پکارا۔ "سعدی!" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آج تم کٹرے میں کھڑے ہو گے اور تم سے جرح کی جائے گی۔ تم نروس ہو؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یہ موقع تو آنا ہی تھا، جب تم نے اس عدالتی جنگ کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو میں نے شبہ ہی نہیں بتا دیا تھا کہ یہ موقع آئے گا۔ تمہیں کٹرے میں جانا ہو گا۔ پہلے میں تم سے سوال کروں گی، پھر وہ تم سے جرح کرے گا۔ تم خود کو کیسے پریزنٹ کرتے ہو، یہ تم پہ منحصر ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں اور میں ٹھیک ہی رہوں گا۔" وہ ذرا سا مسکرایا۔

"کوئی بھی سوال جس کا جواب مشکل لگے، تو کہنا مجھے یاد نہیں۔ جس سوال کے جواب میں سچ نہ بولنا ہو تو کہنا، جیسا کہ میں نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا۔ اور پھر انٹرویو والی لائن دہرا دیتا۔"

"یہ غلط بیانی تو ہو گی نا۔ پتا نہیں مجھ میں اور ہاشم میں کیا فرق رہ جائے گا جب ہم دونوں جھوٹ بولیں گے تو؟" وہ لختی سے بولا۔

"محتاج الفاظ کا چناؤ جھوٹ بولنا نہیں ہوتا قانون میں۔ اور ہمیں ایک پورے معاشرے کو ایسے لوگوں سے پاک کرنے کے لیے ایسی چھوٹی موٹی غلط کاریوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔"

"سچ! خود کو بھلا نے کو یہ خیال اچھا ہے۔ حیرت

اندر ڈانٹنگ ہال میں بیٹھی جو اہرات بیچنے والے کے پاس بیٹھی، مسکراتی نظروں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ایک فاتحانہ نظر اپنے مقابل بیٹھے نوشیرواں پہ ڈالی (ہاشم اب سربراہی کرسی پہ بیٹھتا تھا اور وہ دونوں اس کے دائیں بائیں)۔ نوشیرواں سوٹ میں ملبوس بے دلی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جو اہرات کو پچھلے برس کے یہ دن یاد آئے۔ تب شہری کے لیے کیسے وہ بے چین رہتا تھا۔ شکر! یہ بھوت تو اترا۔

”تو آج سعدی یوسف کشرے میں آئے گا اور اس سے جرح کی جائے گی۔“ اس نے سعدی کا ذکر چھیڑا۔ آج بھی نوشیرواں کا حلق کڑوا ہوا، مگر وہ اظہار نہیں کر سکا۔ آج اسے گولی مارنے کی خواہش بھی نہیں ہوئی۔ گولی مار کے دیکھ لی تھی۔ کوئی فائدہ نہ تھا۔

”ہاں، آج ہم حکایت سعدی سنیں گے۔“ ہاشم نے طنزاً کہا تھا۔

”تمہیں یقین ہے وہ جھوٹ نہیں بولے گا؟“

”وہ سعدی ہے۔ وہ اسٹینڈ یہ جھوٹ نہیں بولے گا۔“ ہاشم فون دیکھتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔ ”اور اسے ضرورت ہی نہیں ہے۔“

وہ ڈانٹنگ ہال نیپور کر کے لاؤنج تک آیا تھا تو سامنے سے بریس آٹا دکھائی دیا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر ہاشم رکت گیا۔ لاؤنج کے کونے میں کرسی پہ بیٹھے، لیپ ٹاپ سامنے رکھ کر کام کرتے اجبر شفیق کی حیات بھٹی ادھر ہی متوجہ ہو گئیں۔

”سر یہ دیکھیں! یہ کولہو سے ہماری بیم کو ملا ہے۔“ ہاشم نے کانڈ پکڑتے ہوئے جیب سے عینک نکالی۔ ”کیا ہے یہ؟“

”نصیح کی لاش مل گئی ہے۔ گواہوں کے مطابق وہ سعدی یوسف کو قتل کرنے گیا تھا۔ مگر سعدی نے اسے مار ڈالا۔ نصیح اب صرف غائب نہیں ہے، وہ مرجکا ہے۔“

یہ سن کر ہاشم کی آواز نے جہاں ہاشم کو چونکایا وہیں مزے اور اطمینان سے دلیہ کھانی جو اہرات کے ہاتھوں

ٹراکل کو سنجیدہ لوگ۔“

”جس دن تم لوگ یہ ٹراکل ہار جاؤ گے۔“ وہ پتائے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔ زمر ہونہ کر کے باہر نکل گئی۔

ندرت نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”منہ سے بدقال نہ نکالا کرو۔ کیوں ہاریں وہ مقدمہ؟ دعا کیا کرو کہ جیت جائیں۔“

”ہاں جی! بالکل ایسا ہی ہوگا۔“ وہ برا سامنہ بنا کر چپ ہو گیا۔ ندرت اٹھ گئیں تو بال برش کرتی حنین اس کی طرف گھومی۔ وہ پیر میز پہ رکھے نیم دراز سا آنکھیں چھتہ مرکوز کیے کسی سوچ میں تھا۔

”نہیں دے سکتے؟“ قارس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مجھے لگتا نہیں ہے، مجھے یقین ہے۔ یہ جو کورٹ میں سارے جج بیٹھے ہوتے ہیں نا، یہ اس بات کا فیصلہ نہیں کرتے کہ کون سچا ہے۔ اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کون زیادہ اچھا جھوٹ بولتا ہے۔“

”مگر بجائے ان کی مخالفت کرنے کے ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔“

”تم گروہ میں دیر سے آؤں گا۔“ اس نے سر جھٹکا۔ باہر کورٹ جانے کی تیاری کا شور مچ چکا تھا۔

اتنی شہرت بھی کہاں چاہی تھی خود سے میں نے اپنے ہی شہر کا ہر شخص عدو میرا ہے

قصر کاردار کا لان اس صبح بارونق لگ رہا تھا۔ ملازموں کی آمدورفت لگی ہوئی تھی۔ شہرین گھوم پھر کر ایونٹ آرگنائزر کو سمجھا رہی تھی کہ اسے کون سی چیز کہاں چاہیے۔ اس کے سنہری بال پچھلے سال کی بہ نسبت لمبے ہو گئے تھے اور اونچی پونی کی صورت گردن کی پشت پہ جھول رہے تھے۔ ماشے پہ بل لیے اور ناک چڑھائے وہ سونیا کی ساگرہ کی دعوت کے تمام انتظامات دیکھ رہی تھی۔

وہ اب کیا کر رہا ہو گا اور مسکرا کر فون رکھنے لگی۔ یکدم ایک خیال آیا۔ ملی سی آنکھوں میں چمک ابھری۔ لب دانتوں میں دبائے اس نے پیغام لکھا۔

”یاد ہے فارس! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ملکہ نے دونوں قیدیوں کے قتل کا حکم دیا ہے۔ میرے پاس ثبوت ہے۔ اگر چاہیے تو آج ڈرپہ میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

اور پیغام بھیج دیا۔ لبوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اب تو وہ ضرور آئے گا۔ اسے یقین تھا۔



میں اپنے رونے ہوئے قبیلے کی سازشوں میں گھرا ہوا ہوں تم اجنبی ہو تو میرے آنکھوں کی دستخون سے ذراے نہ رہنا کورٹ روم میں اوائلی پریل کی جھڑپ کھڑکیوں سے چھین کر اندر گر رہی تھی۔ سعدی یوسف کٹرے میں کھڑا تھا اور زمر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ چند قدم نیچے۔ اس کے سوالات پوچھ رہی تھی۔

”پلیز ریکارڈ کے لیے اپنا نام بتائیے۔“

سعدی زہد الفقار یوسف خان۔“

”آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟“ وہ سنجیدگی سے رسی کارروائی دہرا رہی تھی۔ ہاشم خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ اس کے ساتھ رکھی امرتی کرنی خالی تھی۔

باہر پکھری کے بجرام میں ایک ریلواری میں احمر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تیز تیز۔ ہجوم میں بالکل گم۔ احتیاط سے آگے پیچھے بھی دیکھ لیتا تھا۔ پھر تیزی سے ایک موٹر مڑ کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ ایک خالی کورٹ روم تھا۔ کرسیاں اور میزیں الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور پھولے سانس کے ساتھ واپس گھوما۔ سامنے ایک کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے فارس بیٹھا تھا۔ منہ میں مسلسل کچھ چبا رہا تھا۔ سر سے پیر تک ہانپتے ہوئے احمر کا جائزہ لیا۔

”تنتی کیا ایمر جنسی تھی اسپین؟ تمہارے مالک

سے بچ پھسلا۔ اس کا رنگ فق ہوا تھا۔ نوٹیرواں بھی سراٹھا کر دیکھنے لگا۔

”دس از گنڈ!“ ہاشم دلچسپی سے کاغذ دیکھ رہا تھا۔ ”لیکن نصیح کو اسے زندہ گرفتار کرنے کا حکم تھا اس نے اسے مارنے کی کوشش کیوں کی؟“

”ہارون صاحب سے بات ہوئی ہے۔ وہ خود شاکڈ ہیں۔ نصیح ان کا دایاں ہاتھ تھا۔ وہ کبھی بھی اس کو موت کی طرف نہیں دھکیلیں گے۔“

”پھر نصیح کیوں مارنا چاہتا تھا سعدی کو؟ سلف دینفس کے علاوہ تو سعدی اسے کبھی قتل نہیں کرے گا۔“ وہ سر جھکائے کاغذ پڑھتا سوچتے ہوئے کمرے میں کہہ رہا تھا۔ ”کوئی ٹھوس ثبوت ہے کہ نصیح کو سعدی نے ہی مارا ہے؟“

”کانفی شناپ کی مالکن نے بتایا ہے کہ وہ اس کے ساتھ نکلا تھا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں بھی نصیح اس کو یہ غمائل بنا کر آگے لے جاتا دکھائی دیتا تھا۔ مگر بعد میں سعدی زندہ سلامت واپس آئی اور نصیح کی مسخ شدہ لاش کھائی سے ملی۔“ احمر چہرہ اٹھائے ہکا بکا سا دیکھ رہا تھا۔

دور بیٹھی جو اہرات بے اختیار اپنی گردن کی پشت ہاتھ سے دبائے لگی۔ پھر اس نے سیل اٹھایا اور آب دار کو میسج لکھا۔ ”مجھے میری امانت آج رات تک مل جانی چاہیے۔“

ہوا کے دوش پہ وہ پیغام اڑتا ہوا۔ پہنائے جھیل۔ سر سبز میدان عبور کرتا۔ ہارون عید کی رہائش گاہ کی دیواروں کے پار گھسا اور آب دار کی بیڈ سائڈ ٹیبل پہ رکھے موبائل کو چمکا گیا۔

تھر تھر اہٹ پر اس نے خود پر لحاف ہٹایا۔ سُرخ سلکی بال تکیے پہ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کو چہرے سے ہٹائی اٹھی اور موبائل ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔ پیغام پڑھ کر اس نے کچھ نہیں لکھا۔ جیسے توجہ ہی نہ دی ہو۔ عادتاً ”کانٹیکٹ لسٹ کھولی۔ اور عادتاً“ فارس کے نام پہ کلک کیا۔ اسے کلاسٹ سین دیکھا۔ اندازہ لگایا کہ

”کسی نے اس کے پاسپورٹ کے فکڑے جمع کر کے ہاشم کو بھیج دیے ہیں۔ افغانستان کے ذریعے آنے کا فیصلہ درست تھا، لیکن اب یہ چیز اس کو دہشت گرد بھی ثابت کر سکتی ہے۔ تمہیں اس کیس کو سیریس لینا ہوگا۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بار بار پیشانی چھوتا تھا۔ نفی میں سر ہلاتا تھا۔ ”سعدی کا پاسپورٹ ان کے ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ سعدی نے خود مجھے بتایا ہے کہ وہ اسے ختم کر چکا ہے۔ سعدی ایسا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔“

”مگر اب ایسا ہو چکا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہوا پاسپورٹ دیکھا ہے اور ہاشم نے مجھے اس کا مسجھو دکھنا کر اسے ٹریس کرنے کو کہا، مگر میں نہیں کر سکا۔ اس شخص کا کبھی مکمل طور پر ان کو ہٹا دینا ہے۔ تمہیں اب کچھ کرنا ہوگا۔ کیونکہ کوئی ہے جو اسے سعدی کے بارے میں معلومات دے رہا ہے اور یہ تمہارے قریب کا کوئی بندہ ہے۔“

فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ ناگواری سے اس کے ماتھے پر ہل چڑھے۔ اسے جیسے برا لگا تھا۔ ”ہمارے قریب ایسا کوئی بندہ نہیں ہے جو ہمارے ساتھ یوں دھوکا کرے۔“

”سب کے قریب دھوکے باز ہوتے ہیں۔ میں بھی تو ہاشم سے اس وقت دھوکا ہی کر رہا ہوں۔“

”نہیں۔“ اس نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔

وہ شدید ڈسٹریب لگ رہا تھا۔ ”ہمارے قریب ایسا کوئی نہیں ہے۔ یہ ہاشم کا کوئی بندہ ہے۔“

”مسز زمر نے مجھے بتایا تھا کہ دو ماہ پہلے تمہاری بھانجی

کے کمرے سے وہ میموری کارڈ چوری ہو گیا تھا جس میں میرا اعمال نامہ موجود ہے۔“

”وہ یقیناً کارڈار کا بھیجا ہوا کوئی بندہ ہوگا۔ میں نے بہت ڈھونڈا، مگر کوئی سراغ نہیں ملا، لیکن میں نہیں مان سکتا کہ ہمارے گھر میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے۔“

”ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ بلکہ دو مسئلے۔“ اس نے کرسی کو فارس کے سامنے رکھا اس پر بیٹھا اور آگے کو جھک کر ہاتھ باہم پھنساے پریشانی سے بتانے لگا۔

”کیا ہوا ہے؟“ فارس نے گہری سانس لی۔

”ہاشم کے پاس عدالت میں پیش کرنے کے لیے خطرناک مواد ہے۔“

فارس نے ہاتھ جھٹکا کر گویا ٹاک سے مکھی اڑائی۔

”عدالت کی پروا کسے ہے؟“

”غازی! تمہیں اس کیس کو سیریس لینا ہوگا۔ ہاشم کے پاس ثبوت ہے کہ سعدی نے دو قتل کیے ہیں اور کچھ دیر بعد وہ عدالت میں سعدی سے یہ بات پوچھے گا۔“

فارس کا مسلسل چلتا منہ رکا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ”دو قتل؟“ اسے دھچکا لگا تھا۔

”ہاں، دون عبید کے ملازم فصیح کی لاش مل گئی ہے۔ یعنی شاہدین نے سعدی کو اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسے سعدی سے مازا ہے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ شدت حیرت سے ہکھلایا۔

”ایسا ہو چکا ہے۔ تم لوگوں کو سعدی کو یہ بات بتانی ہوگی تاکہ وہ ذہنی طور پر تیار رہے۔“

”دو قتل!“ وہ اب جیسی بے یقینی سے دہرا رہا تھا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میرے جانے کے بعد ہوا ہوگا۔ مجھے اسے وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔“

”اور تم نے اسے مشورہ دیا تھا افغانستان کے راستے سے ملک میں آنے کا؟“

فارس بالکل ساکت رہ گیا۔ ”تمہیں کیسے پتا؟“

”کسی نے سعدی کا پاسپورٹ ہاشم کو بھیجا ہے۔ اس پر سعدی کا نام حیدر ہمایوں خان ہے۔ اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کے راستے سے آیا ہے۔“

واپس۔“

فارس بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتے لگا۔ ”یہ

ناہنگن ہے۔ سعدی اپنا پاسپورٹ ڈیپوز آف کر چکا

”گدگد“ اجمر نے مسکرا کر اس کا شانہ تھپکا۔ فارس نے اپنا کندھا بے زاری سے پیچھے کیا۔
 ”اب جاؤ۔ تمہاری ماکنن تمہیں مس کر رہی ہوگی۔“ اجمر جانتے جانتے مڑا اور تنک کر اسے دیکھا۔
 ”نلاہرے۔ ملازم پیشہ آدمی ہوں، مگر سو سو رہی۔ تم جیسے جا ب لیس فارس لوگ کیا جانیں کہ ملازمت کیا چیز ہوتی ہے۔“
 ”جا۔ جا۔ داغ خراب نہ کر میرا۔“ اس نے غصے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ شدید مضطرب نظر آ رہا تھا۔

”ہاں ہو سکتا ہے کہ باہر کا کوئی بندہ ہو، مگر میں جانتا ہوں کہ اسے کیسے پتا چلا ہوگا کہ کارڈ تمہاری بھانجی نے کہاں رکھا ہے۔“ اجمر نے گہری سانس لے کر کہا۔
 ”حنین نے کارڈ کی فائلز دیکھنے ہی مجھے کال کی تھی۔ کارڈ وارز کے علاوہ بھی یقیناً کوئی تمہارے فون ٹیپ کر رہا ہوگا۔ اس کال کے بعد ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے حنین کے لیپ ٹاپ کو rat (ریٹ) کر کے اس کا ویب کیمرہ آن کر لیا ہو۔ آج کل یہ بہت آسان ہے اور اس نے دیکھ لیا ہو کہ حنین اپنے کمرے میں وہ کارڈ کہاں رکھ رہی ہے۔“

اب کے فارس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیس یہ سب تم تو نہیں کر رہے۔“ پھر سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ ”حنین نے کہا تھا اس سرخ مفلر والے آدمی کا قد چھوٹا تھا۔“

”اللہ کو مانو۔ مجھے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ اجمر ابلین گیا تھا۔ ”اور اگر میں یہ کرتا تو پھر آجی جان پہ کھیل کر تمہیں آگاہ کرنے کیوں آتا؟ سعدی کہتا ہے کہ اس کی یو ایس بی کی فائلز ڈیلیٹ کر دی گئیں، اب اس میں صرف فروزن پڑی ہے۔ سعدی کا ایجو پورٹ سے بچھا لیا جاتا ہے اور اس کا یا پورٹ چوری کیا جاتا ہے۔ حنین کے کمرے سے ایک کارڈ چوری ہو جاتا ہے۔ غازی یہ تمہارے قریب کا کوئی بندہ ہے۔“ وہ پر یقین تھا۔

فارس کے کان سرخ ہو گئے اور وہ شدید بے بس اور غصے میں نظر آ رہا تھا۔ ”وہ جو بھی ہے میں اسے ڈھونڈ لوں گا اور میں واقعی اس کی جان لے لوں گا۔“
 ”اور کیس کا کیا کردے؟ نوٹسرواں کو سزا دلوانی ہے یا نہیں؟“ فارس چند لمحے چپ رہا، پھر گہری سانس لے کر ایک عزم سے بولا۔

”پہلے مجھے اس کیس میں دلچسپی نہیں تھی لیکن اب۔ اگر ہاشم اس طرح کے اونچے ہتھکنڈوں پہ اتر آیا ہے تو نھیک ہے۔ ہم سب مل کر اس کیس میں اس کو ٹنڈا ٹنڈا کریں گے۔“

چلے جو زکر۔ فشتوں کی بارشانی کا تو زیر بحث مقام بشر بھی آتا ہے۔
 ”پورونٹس“ (آپ کا گواہ) زمر کٹرے کے سامنے سے نیچے اتر آئی تھی اور ہاشم کو اشارہ کیا تھا۔ اب گواہ اس کا تھا۔ جیسی چاہے جرح کرے۔
 جب وہ نیچے آکر بیٹھی تو پیچھے سے کسی نے اسے شوکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پچھلی نشستوں پہ فارس آ بیٹھا تھا اور اس کے کہنے پہ حنین اٹھ کر جنگلے تنک آئی تھی اور پین سے زمر کے کندھے کو چھو کر اس طرف توجہ دلا رہی تھی۔ زمر نے فارس کو دیکھا۔ وہ قدرے مضطرب سا اسے اشارے میں کچھ بتا رہا تھا، زمر نے لبوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور واپس گھوم گئی۔

”پزلیل۔“ وہ بے بسی سے بڑبڑایا تھا۔ زمر اس کی پروا کیے بغیر سنجیدگی سے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں ہاشم سعدی کے مقابل، مگر چند قدم پیچھے کھڑا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے چند کاغذ لہرائے۔
 ”کیا آپ کمار نامی اس سنہالی باشندے کو جانتے

ہیں؟ یا کیا آپ فصیح نامی اس پاکستانی باشندے کو جانتے ہیں سعدی یوسف؟ کیونکہ ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ کمار کو زہر کا ٹیکہ لگا کر اور فصیح کو گردن

ایسا سوال جس کے جواب میں مجرم کو اعتراف جرم کرنا پڑے (سوال نہیں پوچھا جاسکتا؟) وہ بحث کر رہی تھی۔

”مگر یور آئر“ وہ ملزم کی دفعہ ہوتا ہے جیسے نوشیرواں کے پاس خاموش رہنے کا حق ہے۔ سعدی یوسف اس کیس میں ملزم نہیں ہے۔ گواہ ہے اور جہاں تک گواہ کی بات ہے تو قانون شہادت آرٹیکل 9 کے تحت کسی گواہ کو سیلف ان کریمینٹیشن کے باوجود خاموشی کا حق نہیں ہے۔ گواہ جواب دے گا۔ بھلے جواب میں اسے اعتراف جرم ہی کرنا پڑے۔ گواہ کو جواب دینا ہے۔ ہاشم دوبدو بولا۔

”مگر یور آئر۔“ زمر مزید کچھ کہنے لگی تھی مگر جج صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”سعدی یوسف ملزم نہیں ہے گواہ ہے اور گواہ کا کردار جاننا واقعی ضروری ہے۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ سعدی یوسف جواب دے۔ اعتراف کر دیا جاتا ہے۔“

جج نے سعدی کو اشارہ کیا۔ زمر گہری سانس لے کر بیٹھی۔ حین نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا۔ فارس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مٹھی لبوں پہ جمائے وہ فکر مندی سے سامنے کھڑے سعدی کو دیکھ رہا تھا۔ سعدی نے گہری سانس لی اور پھر بولا۔

”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“

”اور یہ بات آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتے ہیں؟“ ہاشم نے آواز میں تعجب بھر کے دہرایا۔

”جی ہاں۔ میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے ان دونوں آدمیوں کو قتل نہیں کیا۔“

”آپ کو معلوم ہے پر جری کیا ہوتی ہے سعدی یوسف؟“ کورٹ میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا جرم ہے؟“

ہاشم اب تاسف سے پوچھ رہا تھا۔

”جی مجھے معلوم ہے۔ پر جری وہ ہوتی ہے جو ہاشم تم اپنے ہر گواہ سے یہاں گرواؤ گے، مگر میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“ اس نے اپنی اعتماد سے چہرہ اٹھا کر جج

توڑ کر آپ نے قتل کیا ہے۔ کیا آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر اپنے انٹرویو کا حوالہ دے کر بغیر بتائیں گے کہ آپ ان دو لوگوں کے قائل ہیں یا نہیں؟“

ہمت سی سائیس ایک ساتھ رکی تھیں۔ حنین بالکل سن ہو گئی۔ اسامہ شل ہو گیا۔ احمر نے فکر مندی سے گہری سانس لی۔ جواہرات مسکرائی۔ نوشیرواں بے چین ہوا۔ فارس نے اضطراب سے پہلو بدلا۔ ایسے میں زمر نے گردن موڑ کر فارس کو دیکھا اور پلکیں جھپک کر اسے تسلی دی۔ صرف وہ پرسکون تھی یا سعدی جو کھڑے میں گردن تلے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔ پھر وہ دھیرے سے بولا۔

”کیا آپ اپنا سوال دہرائیں گے کاردار صاحب؟“

کریم عدالت میں پھر سے مقدس سانسنا چھا گیا۔

”سعدی یوسف کیا آپ نے ان دو افراد کا قتل کیا ہے؟“ ہاشم نے تصاویر پھر سے دکھاتے ہوئے چبا چبا کر پوچھا۔ زمر کھڑی ہوئی۔

”آپ جیکشن یور آئر۔ اس سوال کا کیس سے کیا تعلق ہے؟“

”تعلق ہے یور آئر۔ ہمیں عدالت کو دکھانا ہے کہ الزام لگانے والا خود کہتے کردار کا حامل ہے۔“

”یور آئر! اگر وہاں دفاع کو سعدی یوسف پہ قتل کا الزام لگانا ہے تو اس کے لیے وہ الگ سے پیشینہ دائر کر سکتے ہیں لیکن قانون شہادت کے تحت وہ گواہ کو ڈس کریڈٹ کرنے کے لیے اس کے اوپر بغیر ثبوت کے ایسے الزام نہیں لگا سکتے۔“ وہ بلند آواز میں بولی گئی۔

جج صاحب نے جواباً ہاشم کو دیکھا۔ وہ فوراً بولا۔

”یور آئر۔ قانون شہادت کے تحت اگر گواہ کا کردار کیس کی سچائی جاننے کے لیے ضروری ہے تو ایسے سوال پوچھے جاسکتے ہیں۔ مسز زمر کو قانون شہادت دہرانے کی اشد ضرورت ہے۔“

”یور آئر کیا صارا قانون آرٹیکل تیرہ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی شخص سے زبردستی ان کریمینٹیشن (یعنی

صاحب کو دیکھا۔ ”میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔“

ہاشم نفی میں سر ہلاتا کاغذات لے کر جج کے چوترے کی طرف آیا۔ ”یور آزر یہ دونوں قتل سعدی یوسف نے ہی کیے ہیں اور۔۔۔“ مگر سعدی کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں نے ان دو انسانوں کی جان ضروری ہے یور آزر! مگر میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔“

بہت سی سانسیں ایک دفعہ پھر رکی تھیں۔ چند لمحے کو تو ہاشم بھی سنائے میں رہ گیا۔ جج صاحب ذرا مزید ترچھے ہو کر بیٹھے۔ وہ اب پوری طرح سے سعدی کی طرف متوجہ تھے۔

”یور آزر! کمار نای گارڈ نے مجھے قتل کرنا چاہا تھا قید کے دوران۔ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اس کو مارا تھا۔ فصیح بھی مجھے قتل کرنے آیا تھا اور میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اس کو بھی مارا۔ یور آزر! سیلف ڈیفنس کی عالمی تعریف کے مطابق یہ قتل نہیں ہوتا۔ دین میں یہ گناہ نہیں ہے۔ سو میں بے گناہ کیا ہے نہ قتل میں نے صرف ان کو مارا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا“ مگر میں ان کا قائل نہیں ہوں۔ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے ان کو مارنا تھا۔ یہ میرا حق تھا۔“

کمرہ عدالت میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ہاشم نے بہت پار لب کھولنے پھر بند کیے۔ اسے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ نوشیرواں بالکل سن سانس سعدی کا چہرہ ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ (وہ کیسے اتنے لوگوں کے سامنے کسی کو مارنے کا اعتراف کر سکتا ہے؟ اتنا بہادر وہ کیسے تھا؟)

ہاشم جج کی طرف متوجہ ہوا۔

”مگر ہم کیسے مان لیں کہ یہ سیلف ڈیفنس ہی تھا۔ یور آزر! سعدی یوسف ایک پاکستانی شہری ہے اور وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی جرم کرے گا پاکستان پینل کوڈ کا اطلاق اس پر ہوگا۔ ملک واپس آنے سے قانون کے مطابق اس کے تفتیش کی جائے گی اور اگر جرم ثابت

ہو گیا تو سزا بھی سنا لی جائے گی۔ یہ سیلف ڈیفنس تھا یا نہیں، اس کا فیصلہ بھی عدالت کرے گی۔ یور آزر! میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ سعدی یوسف کے اس اعتراف جرم کی بنا پر ایک جے آئی ٹی تشکیل دی جائے جو اس کے ان جرائم کی تفتیش کرے اور پھر اسے پراسیکیوٹ کیا جاسکے۔“

”یور آزر!“ زمر مسکرا کر کھڑی ہوئی اور چوترے کی طرف بڑھی۔ ”میرا خیال ہے کاردار صاحب کو اپنا کمنٹ لاء دہرانے کی اشد ضرورت ہے۔“

سب کی نگاہیں سعدی سے ہو کر زمر کی طرف اٹھیں۔

”ایکسکیوزی؟“ ہاشم نے ناگواری سے پوچھا

تھامس نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔ ”قانون شہادت کے جس آرٹیکل نائن کو یہ نظر رکھتے ہوئے عدالت نے گواہ کو خاموشی نہ رہنے کا حکم دیا ہے، جناب عالی! اس آرٹیکل نائن میں لکھا ہے کہ گواہ ملزم نہیں گواہ کو خاموشی کا حق حاصل نہیں ہے، چاہے اس کا بیان اس کے اپنے وجود کو ملوث جرم ظاہر کرے۔“

اس نے مسکرا کر ہاشم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وقفہ دیا۔ ”بشرط یہ کہ اس بیان کی بنیاد۔۔۔ اگر دوسرے کوئی ثبوت یا گواہ نہ ہوں تو۔۔۔ اس کو پراسیکیوٹ نہیں کیا جاسکتا۔“ پھر جج کی طرف چہرہ کر کے فاتحانہ انداز میں بولی۔ ”یور آزر! ہمارا قانون کہتا ہے کہ گواہ کے اپنے اعتراف جرم سے اس کو قانونی حفاظت حاصل ہے۔ ہاشم کاردار یا کسی کے پاس ایسے کوئی ثبوت یا گواہ نہیں ہیں جو سعدی یوسف کو مجرم ظاہر کریں۔ سعدی یوسف کے خلاف کہیں بھی کسی قسم کا کوئی کیس اس ایک اعترافی بیان پر نہیں کھولا جاسکتا۔ دراصل ہاشم کاردار اس بات کو صرف ایک اسکیڈل بنا کر سعدی کو ڈس کریڈٹ کرنا چاہتے ہیں، تو اس لیے میں چاہوں گی کہ معزز عدالت کاردار صاحب کو یہ یاد دلائے کہ عدالتی حکم نامے کے تحت کئی ہفتے سے اس ٹرائل پر میڈیا میں بحث منج ہو چکی ہے اس لیے وہ ان باتوں کو میڈیا پر

نہیں اٹھا سکتے۔“

”یہ درست نہیں ہے۔ میں نظر بچا کر نہیں سب کے سامنے کھلم کھلا گیا تھا۔“

ہاشم کا چہرہ بے بسی بھرے غصے سے متغیر ہو چکا تھا۔ ”یور آئر“ ایک آوی اپنے منہ سے دو بندے مارنے کا اعتراف کر رہا ہے اور۔۔۔“

”کیوں؟“

”نہیں نہیں!“ جج صاحب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی بات کالی۔ ”سمنز مرکا پوائنٹ ویلڈ ہے۔ گواہ کو پروٹیکشن حاصل ہے، آپ نے اپنے منہ سے کہا ہے کہ سعدی یوسف اس کیس میں گواہ ہے۔ ملزم نہیں۔ اگر نو شہرواں کاردار اپنے منہ سے اعتراف جرم کرتا تو عدالت اس کو پھانسی کی سزا فوراً سنادیتی کیونکہ وہ اس کیس میں ملزم ہے۔ سعدی یوسف گواہ ہے اور گواہ کو قانونی حفاظت حاصل ہے۔“

زمر تک کاغذ پہنچا تو اس نے اسے کھولا۔ آدھی توجہ سعدی کی طرف تھی۔

”آپ کو کوئی اور سوال پوچھنا ہے کاردار صاحب؟“ اب کے جج صاحب نے ملٹی سے پوچھا تھا۔ ہاشم چند لمحے غم و غصے سے وہیں کھڑا رہا۔ پھر گہری سانس لی اور سر جھٹکنا سعدی کے سامنے آیا۔

”میں نے قانون پڑھ کے کرنا ہی کیا ہے؟ دنیا جہاں کے لوگوں کو انصاف دلانے کے لیے آپ موجود ہیں نا۔ میں تو آرام سے ڈنر کرنے جا رہا ہوں اپنے سے پیچھے بیٹھی خوب صورت لڑکی کے ساتھ۔ وہ کہہ رہی ہے کہ اسے ایک ثبوت دینا ہے مجھے۔“

زمر مسکرا کر مڑی اور ایک چٹ جنگلے کے پیچھے بکریوں پہ بیٹھی حنین کی طرف برہائی۔ حنہ جس کی جان میں جان آئی تھی اس نے وہ چٹ فوراً اسے فارس کو پاس کی جو بظاہر تنے تاثرات کے ساتھ بیٹھا تھا، مگر اعصاب اب ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ اس نے کاغذ کھولا۔ اندر زمر نے لکھا تھا۔

”میں نے اب کے گردن موڑ کر اسے گھورا تو آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ فارس نے آنکھوں میں سادگی لیے بٹانے اچکا دیے۔ زمر نے ”مہوہ“ لکھ کر کے منہ واپس پھیر لیا۔ ادھر سعدی کہہ رہا تھا۔“

”ڈیسٹ بس مینٹ۔ یونیورسٹی کلاسز میں ہر وقت مجھے دیکھنے اور میری محبت میں گرفتار رہنے کے بجائے اگر تھوڑا بہت بڑھ لیا ہوتا تو آج یہ قانون معلوم ہوتا تمہیں۔۔۔“

”میں نے کوئی نیکلس یا زیور نہیں چرایا تھا۔ نہ کوئی نقدی وغیرہ۔“

فارس نے استغفر اللہ کہہ کر سر جھٹکا تھا۔ منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا تھا۔ بازو برہا کر حنین کا قلم اچکا اور نیچے کچھ لکھا۔ پھر کاغذ تہہ کر کے آگے پاس کیا۔ ادھر ہاشم کی آواز گونج رہی تھی۔

”سعدی یوسف خان“ مجھے صرف اتنا بتائیں کہ جب آپ نے گہرا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے کوئی نیکلس نکلا تھا یا نہیں؟“

”سوئیا کی پچھلی سالگرہ پہ یعنی ایک سال پہلے کیا یہ درست ہے کہ آپ سب سے نظر بچا کر میرے کمرے میں آگے آئے؟“

”چونکہ میں نے کوئی نیکلس نہیں چرایا تھا اس لیے میں نے جب کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے کوئی نیکلس نہیں نکلا۔“ اس نے مزے سے دہرایا۔ حنین نے گہری سانس لی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ نیکلس حنہ نے اس کے کوٹ سے نکالا تھا، خود اس نے نہیں۔

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ خیر میں کیا کر سکتا ہوں۔ چلیے۔ یہ تصویریں دیکھیے سعدی!“ ہاشم اب اس کو پروجیکٹر اسکرین پہ چند سائز دکھا رہا تھا۔ ”یہ ہارون عبید کے اس ہونٹ کے سبب حنین کی تصاویر ہیں جنہاں بلیئے طور پہ آپ کو قید رکھا گیا، بقول آپ کے“

لیکن جب امیڈیا کے نمائندے وہاں گئے تو یہاں جالے لگے تھے اور پرانا کاٹھ کباڑا تھا۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟“ سعدی نے ایک نظر اسکرین کو دیکھا۔

”میرے یہاں سے نکلنے کے قریباً ایک ماہ بعد امیڈیا کے نمائندے یہاں گئے۔ ایسا سیٹ اپ لگانے کے لیے ایک دن بھی بہت ہوتا ہے۔“

”تو آپ ابھی بھی مصر ہیں کہ نو شیرواں کارواڑ نے آپ کو یہاں قید رکھا؟“

ہاشم نے مصنوعی تعجب ظاہر کیا۔ وہ کن اکیوں سے زمر کو دیکھتا رہا اس کے اٹھ کر آجھکشن ہونے کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ اطمینان سے بیٹھی فلم دانتوں میں دبائے رہی۔ اس نے اپنا گواہ تیار کر کے بھیجا تھا۔

”ذرا اس تصویر کو زوم کیجئے کارواڑ صاحب۔ یہ اس طرف سے۔“ سعدی اطمینان سے انگلی اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ ہاشم نے سر کو خم دیا اور متعلقہ جگہ سے زوم کیا۔

”یہ کونے میں دیوار ہے۔“ سعدی اشارہ کر کے جانے لگا۔ ”جی بالکل ان گنڈے کاٹھ کباڑے ڈبوں کے پیچھے دیوار ہے چند لکیریں نظر آرہی ہیں۔ عدالت میں جمع کردانی گئی تصاویر میں بھی یہ لکیریں واضح ہیں۔

ہازون عبید کے آدمیوں نے ان کو اس لیے چھوڑ دیا کہ شاید یوں یہ دیوار مزید خستہ ہو جائے۔ مگر پور آنریہ پورٹی 247 لکیریں ہیں۔ 21 مئی سے 23 جنوری تک کے دن میں نے کن رکھے تھے۔ میں روز ایک لکیر کا اضافہ کرتا تھا۔ آپ ان کو گنوا کر دیکھ لیں۔ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا کہ یہ بھی اتنی ہی ہوں جتنے دن میں قید میں رہا ہوں۔“ وہ اعتماد اور سکون سے بول رہا تھا۔ ہاشم ایک دم لاجواب ہو گیا تھا۔ جج صاحب اب دلچسپی سے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے فائل میں ایک نقطہ نوٹ کیا۔

”سعدی یوسف آپ کا کہنا ہے کہ آپ کو کارواڑ کے آدمی نے پاسپورٹ دیا اور یوں آپ ملک واپس آ گئے۔“ ہاشم نے موضوع بدلا۔

”جی کارواڑ میں سے ہی کوئی تھا۔“

”سعدی یوسف آپ کا کہنا ہے کہ آپ کو کارواڑ کے آدمی نے پاسپورٹ دیا اور یوں آپ ملک واپس آ گئے۔“ ہاشم نے موضوع بدلا۔

”جی کارواڑ میں سے ہی کوئی تھا۔“

حسین نے فوراً ہی فارس کو دیکھا۔ (اودھا کارواڑ) وہ ڈھٹائی سے سامنے دیکھتا رہا۔

”لیکن آپ کے پاسپورٹ کے مطابق آپ افغانستان میں بھی رکے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہاں آپ کا کیا کام تھا؟“ اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی فائلوں کے درمیان سے ایک شفاف پیکٹ نکالا اور

اوپر جج صاحب کے سامنے رکھا۔ سعدی بالکل سن رہ گیا۔ پاسپورٹ نکلنے نکلنے تھا۔ یہ وہی پاسپورٹ تھا جو اس نے پھینکا تھا۔ اب کے ہاشم نے فاتحانہ نظروں سے سعدی کو دیکھا۔

”کیا آپ کے افغان طالبان گروہوں سے تعلقات ہیں سعدی یوسف اور یہ سارا ڈراما آپ فساد پھیلانے کو کر رہے ہیں؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ سعدی بولا تو اس کی آواز غصے سے کانپی تھی۔

”آجھکشن ریور آنری۔ اس بات کا کہیں سے کیا تعلق ہے؟“ وہ فوراً کھڑی ہوئی۔

”اودر رولڈ۔ تعلق تو ہے۔“ جج صاحب نے ہاتھ اٹھادیے۔

”نور آنری! سعدی یوسف نے کہا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اگلی سماعت پر دفاع اس بات کے خلاف Rebuttal (تردید) ثبوت پیش کرے گا جو یہ ثابت کر دے گا کہ سعدی یوسف طالبان کے آلہ کار کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ ہاشم نے سرد مہری سے جج صاحب کو اطلاع دی۔

”نور آنری میں دہشت گرد نہیں ہوں۔ میں فیس کام کا ایک انجینئر ہوں۔ میرے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہیں۔“ وہ پھٹ بڑا تھا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”میں انصاف مانگنے آیا ہوں اس عدالت میں یہ مجھے ایسے دہشت گرد پرانڈے کیسے کر سکتے ہیں؟“ اس کی آنکھیں گلابی بڑ رہی تھیں۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ زمر نے اسے کھڑے سے اترنے کا اشارہ کیا۔

ہاشم نظر انداز کر کے اب اختتامی فقرے دہرا رہا تھا۔ وہ دل برداشتہ سا وہاں سے اترتا۔

ہاشم نے موضوع بدلا۔

”جی کارواڑ میں سے ہی کوئی تھا۔“

فارسی اپنی نشست سے گھوما اور مرکز ابدار کو دیکھا۔

”آپ کے پاس واقعی کچھ ہے مجھے ڈنرہ دینے کے لیے؟“ سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ تقاضے سے مسکرائی۔

”جی۔ ایک ٹائی پن گیرے میں ریکارڈ مسز کاروار کا وہ حکم نامہ جو ثابت کرتا ہے کہ فصیح سعدی کو مارنے گیا تھا۔ چاہیے تو جو وقت اور جگہ میں ٹیکنسٹ کر رہی ہوں اوھر آجائیے گا۔ میں دو لوگوں کی ٹیمیل بک کروا چکی ہوں۔“

”مجھے زبان دیں کہ آپ اسے ڈنرہ ساتھ لائیں گی۔“

”دعوت! اس کی آنکھیں بہت محبت سے چمکیں۔ وہ خاموش رہا۔“

کورٹ روم سے سب سے پہلے ابدار نکلی تھی۔ پھر کاردار۔ نو شیرواں نکلتے ہوئے بالکل شبلی سا کہہ رہا تھا۔ ”اس نے دو قتل کا اعتراف کیا مگر اسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ کیا اگلے دن ہے یہ؟“

”سوری سر کر اسے of the Land Law کہتے ہیں۔“ احمر اس کو سمجھاتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ ”یہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ پولیس یا کوئی اور کسی سے جبری اعتراف جرم نہ کروا سکے۔ اور۔۔۔ ان کی آوازیں مدہم ہوتی گئیں۔“

وہ پانچوں ایک ساتھ باہر نکلے تھے۔ رانڈازی میں تیز بہتے ہجوم کے باوجود وہ رکے ہوئے تھے۔

”آپ نے بھائی بس۔ دو لوگ۔۔۔“ حنین کہتے رک گئی۔ یہ وقت نہیں تھا ایسی باتوں کا۔ کیونکہ پہلی دفعہ سعدی پریشان لگ رہا تھا اور فارس کو از سر نو غصہ چڑھ گیا تھا۔

”تم نے مجھے کہا تھا کہ تم نے وہ پاسپورٹ ڈسپوز آف کر دیا ہے۔ یہ ڈسپوز آف کیا ہے تم نے؟“ وہ دبا دبا سا غرایا ساتھ میں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور بھی رہا تھا۔

”میں نے کر دیا تھا۔ مختلف جگہوں پہ پھینکا تھا۔ کسی کو کیا پتا میں اوھر آ رہا ہوں۔ کیسے کسی نے اس کو

اٹھایا۔ پھر جوڑا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔

”اس اوکے اتنا پر مسئلہ نہیں ہے۔“ زمر نے بھاؤ سے کہتے ہوئے تسلی دی۔ ”یہ تمہاری سیلف ڈیفنس موو تھی۔ تمہیں کوئی اس پہ کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ ہمیں اس وقت ڈاکٹر سارہ پہ فوکس کرنا ہے۔ ان کو گواہی دینی ہوگی ہر حال میں۔“

فارس نے ایک ملامتی نظران دونوں پہ ڈالی اور سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ حنین اس کے پیچھے لپکی۔ شور ہجوم اور اس ساری چہل پھل کے درمیان میں سے گزرتی وہ اس کی رفتار سے جا ملی۔

”تو ہاسم اب اس پاسپورٹ کے ذریعے بھائی کو دہشت گرد ثابت کرے گا؟ بھائی بہت ہرٹ ہوگا ماموں! ہم اس کا ہرٹ کیسے کم کریں؟“ وہ فکر مند اور ناخوش لگتی تھی۔ فارس نے رفتار بدل کر بولی۔ ”پھر چند گہری سانسیں اندر کھینچیں۔“

”تمہیں اب اس بات کو یقینی بنانا ہوگا حنین کہ تمام گواہ درست گواہی دیں۔ اور سب سے پہلے ہمیں سارہ کو راضی کرنا ہوگا۔ ہمیں زمر اور سعدی کی مدد کرنی ہوگی اور اس ٹرائل کو سنجیدہ لینا ہوگا۔“ وہ اب اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حنہ سر ہلاتی سن رہی تھی۔

”سیم زمر کی مدد کرنا۔۔۔ سو پور ٹلک۔“ وہ ناراضی سے بولی تھی۔

پیکری کے باہر لمبی سیاہ شیشے والی کارز کی طویل قطار لگی تھی۔ جواہرات کو گوکہ ہر پیشی پہ آنے کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ ہر دفعہ نیا سیاہ ڈیزائنڈ اور نئی جیولری پین کے ضرور آتی۔ اسے معلوم تھا کہ ہاسم جیت جائے گا سو وہ اس ساریے دورانیے میں بھرپور میڈیا کی توجہ سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنی کار میں آکر بیٹھی تو احمر فرنٹ سیٹ نہ بیٹھا موبائل دیکھ رہا تھا۔ جواہرات نے ایک نظر نو شیرواں اور ہاسم کی گاڑیوں کو آگے نکلتے دیکھا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہ ابدار فارس وغیرہ کے ساتھ کیوں بیٹھی

تھی؟

اور خود ذکیہ بیگم سب خاموش تھے۔ جب ندرت بولتیں تو وہ اسے دیکھتے، جب سارہ بولتی تو اسے۔ ٹینس کے بیچ کی طرح نگاہیں دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں واپس آتیں۔

”آپ! آپ سب کچھ جاننے کے باوجود ایسا کیسے کہہ سکتی ہیں۔“ سامنے والے سڈگل صوفے پر فکر مند اور بے بسی بھرا دبا دبا غصہ لیے بیٹھی سارہ نے شاکی انداز میں کہا تھا۔ وہ ابھی آفس سے آئی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے۔ پرس ساتھ ہی رکھا تھا۔ چہرے پہ تھکان تھی مگر آنکھوں میں خفگی بھی تھی۔ ”خاور نے مجھے ہراساں کیا تھا۔ وہ لوگ میرے بچوں کو مار دیتے، کیا یہی چاہتے ہیں آپ لوگ؟“

”اچھا ٹھیک ہے وہ سب پیچھے رہ گیا۔ لیکن اب تو سارہ، تم عدالت میں پیش ہو جاؤ ورنہ سعدی کا کیس بہت کمزور ہو جائے گا۔“ ندرت نے رمان سے سمجھانا چاہا۔

”ہمیں کیسے عدالت میں جا کر یہ سب کہوں؟ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ آپ لوگ مجھے سمجھانے کے بجائے خود کیوں نہیں سمجھتے؟“ وہ ڈری ہوئی نہیں تھی، وہ ان کی عقلوں پہ متوجہ تھی۔

”سارہ! انہوں نے جو سعدی کے ساتھ کیا، تم اس کے لیے کوئی گواہی نہیں روگی کیا؟“

”ناکہ جو سعدی کے ساتھ کیا ہے وہی میرے بچوں کے ساتھ کریں؟ کیا اب بھی آپ لوگوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔“ اس نے حیرت سے ان سب کو دیکھا۔

”میرا شوہر مرا۔ فارس کی بیوی مری۔ زمر کے ساتھ جو ہوا۔ سعدی کے ساتھ جو ہوا۔ اب بھی آپ لوگ ان کے خلاف جانا چاہتے ہیں؟“ وہ حیرت سے اپنی سبز آنکھیں پھیلائے کہہ رہی تھی۔

”سارہ!“ فارس ہلکانا کھنکارا۔ پھر زرا آگے کو ہونے بیٹھا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ دوبارہ کسی کے ساتھ ایسا نہ ہو۔ اس لیے ان کو سزا دلوائی جائے۔“

”کیا دارلش کی منطبق تھی ایسی زمر، سعدی اور تم

”وہ تو دو ماہ سے ہر پیشی پہ آکر ادھر ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ ظاہر یہ کرنا چاہتی ہیں کہ ہمارے ساتھ نہیں بیٹھنا ان کو۔“ وہ موبائل سے کھیلتا ہوا بولا۔ کاراب سڑک پہ دوڑ رہی تھی۔

”اور تم کہاں تھے؟ آتے ساتھ ہی غائب ہو گئے۔ پھر تم اور فارس باری باری کورٹ روم میں داخل ہوئے۔ ہاں احمر؟“ وہ نرم مگر گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ احمر نے پورے سکون سے چہرہ موڑا۔

”غازی نے بلایا تھا مجھے۔ وہ بات کرنا چاہتا تھا۔“ وہ پورے اعتماد سے اسے بتا رہا تھا۔ ”وہ اس مقدمے سے خوش نہیں ہے۔ آپ کے لیے یہ پیغام بھیج دیا ہے کہ ڈاکٹر سارہ کو تنگ نہ بھیجے گا ورنہ وہ ہر حد تک جائے گا۔“

”تمہارا دوست رہا ہے۔ کچھ اور نہیں پوچھا اس نے تم سے؟“

”اگر میں اتنی آسانی سے ہٹانے والوں میں سے ہوتا تو آپ کی کار کی فرنٹ سیٹ پہ نہ بیٹھا ہوتا۔“ مسکرا کر تبا بعد اری سے بولا تھا۔ جو اہرات کے لب بھی مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ سر کو خم دیا اور باہر دیکھنے لگی۔ اسے احمر پہ پورا اعتبار تھا۔



جو سیلابوں کی رو میں بہ گئے ہیں کرے گا کون ان قبروں کا نام؟ سارہ کے گہرے لونگ روم میں اس وقت شدید تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ ایسے جیسے ہر شخص کی گردن سے ڈوریاں بندھی ہوں، اور ان ڈوریوں نے ساری فضا میں گھنچاؤ پیدا کر دیا ہو۔ کوئی ڈھیلا پڑنے کو آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔

”سارہ! اگر تم نے وہ سب کچھ دیکھا تھا تو تمہیں کسی سے تو کہنا چاہیے تھا۔“ ندرت لڑال سے کہہ رہی تھیں۔ پچھلے ڈھائی ماہ میں وہ یہ بات کئی دفعہ دہرا چکی تھیں۔ سامنے صوفوں پہ موجود زمر، فارس، حنین

”جی سارہ! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے دو بچے نہیں ہیں۔ میرے تین بچے ہیں اور میں یہ سب ان ہی کے لیے کر رہی ہوں۔“

حنہ مسکرا دی۔ بہت سی ڈوریاں جیسے ٹوٹ گئیں۔ تناؤ گویا فضا میں گھل گیا۔ بہت سے لوگوں نے سکون کی سانس لی۔ سارہ چند لمحے کو تو بول نہیں سکی، پھر اٹھ گئی۔

”مجھے ایک مینٹگ میں جانا ہے۔ اور میں مزید یہ بات نہیں کرنا چاہتی۔“ پھر ایک ملا متی نظر فارس پہ ڈالی۔ ”اب تم بھی مجھے سیف راستہ نہیں دینا چاہتے کیونکہ تمہیں بھی اب اس ٹرانگل والی منطق سے اتفاق ہو گیا ہے۔“

”آپ کے لیے گواہی دینا بہتر ہے سارہ، گواہی دینے سے بولا تھا۔ سارہ سر جھٹک کر آگے بڑھی۔ سب خاموش رہ گئے۔ ماحول افسردہ ہو گیا، پھر فارس کھنکھارنا۔

”میں بھی چلتا ہوں۔ مجھے بھی۔“ زمر کو دیکھا۔

”اسی کے ساتھ ڈنر کرنا ہے۔“ زمر یوسف جو چند لمحے پہلے تک پرسکون بیٹھی تھی اب کے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تو ان سے آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

”تو ڈنر کے نام نہ جانا۔ ابھی سے کیوں جارہے ہو؟“

”اچھا ہے نا۔ ذرا گپ شپ لگانے کا وقت مل جائے گا۔ کبھی کبھی تو ایسا بہانا ملتا ہے۔“ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے وہ سادگی سے بولا تھا۔

(دو نمبر آدمی!) وہ بڑبڑا کر رخ موڑ گئی۔ سارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ اب اپنا والٹ اور چابیاں اٹھا رہا تھا۔ زمر کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے روک لے مگر اب سنت تو کر نہیں سکتی تھی۔

(اب یہ اس کے ساتھ ڈنر کرے گا۔ پتا نہیں کتنے گھنٹے اچھا بہانا ہے۔ ہونہر ثبوت مالی فٹ۔ دو نمبر قسم کے بہانے) وہ کتنی ہی دیر خاموش بیٹھی کلسٹی رہی تھی۔

نے کیا۔ تم لوگ میرے بچوں کو اب ایک سے تجربے کی بھیٹ چڑھانا چاہتے ہو؟“ وہ صدمے سے بول رہی تھی۔

”ڈاکٹر سارہ! آپ کو کورٹ نے سمن کیا ہے، آپ کو آنا تو پڑے گا۔ اسٹینڈ یہ کھڑے ہو کر حلف تو لینا ہو گا۔ پھر جھوٹ بولیں گی کیا آپ؟“ زمر جو ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی مسلسل نیلی انگوٹھی گھما رہی تھی رمان سے بولی۔

”سوری زمر! لیکن میں کسی عدالت میں نہیں جا رہی۔ اور پلیز مجھے ان جج مینٹل نظروں سے نہ دیکھیں۔ آپ میری جگہ نہیں ہیں۔ اس لیے نہیں سمجھ سکتیں۔“

ڈاکٹر سارہ! میں آپ کی جگہ پانچ سال پہلے تھی اور میں نے کورٹ میں گواہی دی تھی۔ میں جھب کر گھر میں نہیں بیٹھ گئی تھی۔ گواہی چاہے غلط تھی یا صحیح تھی پھپھان نہیں تھی میں نے۔“

”آپ نے فارس کے خلاف گواہی دی تھی، کاردارز کے خلاف نہیں۔ بھری عدالت میں کاردارز کو قائل نہیں کہا تھا آپ نے؟“

”میں پچھلے دنوں سے بھری عدالت میں کاردارز کو ہی قائل بول رہی ہوں سارہ، اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ مجھے ایک دفعہ بھی انسوپ نے دھمکی نہیں دی۔ اتنے ہائی پروفائل کیس میں ہائیم جیسے لوگ گواہوں یا وکیلوں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ وہ ہم سے ڈرے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان سے نہیں ڈرنا۔“

زمر اسی انداز میں کہہ رہی تھی۔ سارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ ”آپ نہیں سمجھ سکتیں زمر! آپ کے دو چھوٹے چھوٹے بچے نہیں ہیں جن کے لیے آپ کو ڈرنا پڑے۔“

لاؤنج میں ایک ریم سٹانا چھا گیا۔ فارس نے بے اختیار نگاہیں چرائی تھیں۔ پتا نہیں کس سے۔ حنہ کے دل کو کچھ ہوا۔ ندرت نے پہلو بدلا۔ مگر زمر اسی طرح آرام سے بیٹھی رہی۔ آنکھوں کے تاثرات پر سکون رہا۔

”میں نے گواہی دی تو تم جیل میں پڑے ہو گے
ڈرو اس وقت سے۔“

نوشیرواں نے فون سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا، وہ بھی
ابرو اچکانے والے انداز میں۔

”اعتراف جرم اتنی بڑی بات نہیں ہوتی شہرین۔
میں نے آج دیکھا سعدی کو۔ اپنی آنکھوں سے
دیکھا۔“ دو انگلیوں سے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ
کیا۔ ”اس نے بھری عدالت میں کہا کہ اس نے دو
بندے قتل کیے ہیں۔ لیکن کسی نے اس حقارت اور
نفرت سے نہیں دیکھا جیسے اس روز قلب میں لوگوں
نے مجھے دیکھا تھا۔ میری گولی سے وہ مرنا تو نہیں تھا، میں
اقدام قتل کا مجرم ہوں، قتل کا تو نہیں۔ اس نے تو دو
افراد۔ دو انسان مار دیے اور کسی نے اس کو ایسے نہیں
دیکھا۔ قانون پولیس سب اس کو پروٹیکٹ کر رہے
ہیں۔ یہ کہنا کہ میں نے کسی کو مارا ہے، اتنی بڑی بات
نہیں کہی شہرین۔ غلطیوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ان
کو نہیں کرنا چاہیے۔ یا تو ہاشم بھائی کی طرح ان کے
لیے ایک ہزار ٹاویلیٹس کھریں یا چاہیں یا پھر سعدی
کی طرح ان کا اعتراف کر کے ان کو اون کرنا چاہیے۔
اپنے خوف اور ڈر کو اون کرنا چاہیے۔“

شہرین نے بے زاری سے اس کی بات کانی۔ ”شہر
میں تمہارے خلاف گواہی نہیں دیں گی، اگر تم مجھے
اپنی کمپنی میں شیرزاور۔“

”یہ ہے شہری میں کتنے مہینوں سے، بلکہ ایک سال
سے مختلف قسم کے واہموں اور خوف کا شکار رہا ہوں۔
سرخ شہرت دیکھوں تو خون نظر آتا تھا، وہ سرائٹھائے
لوپر جھولتے فانوس پہ نگاہیں جمائے کہہ رہا تھا۔ وہ
عجیب سی ذہنی کیفیت میں تھا۔ ”کتے کو ماروں تو لگتا تھا
انسان کو مار دیا ہے۔ ہاتھوں پہ سرخ دھبے نظر آتے
تھے۔ گیلے دھبے خون ہر جگہ تھا۔ میں بڑے خواب
دیکھتا تھا۔ مگر یہ ہے کیا شہری۔ آج میں نے دیکھ لیا
ہے۔“ اور ابھی اس کی آنکھوں میں فانوس کی
جھلکتی دو شہنشاہ اتر آئی تھیں۔ ”میں نے دیکھ لیا
ہے کہ ہمارا ہی ہونا ہے جو اپنے خوف کو دبوچ دے اور

سوج کا آئینہ دھندلا ہو تو پھر وقت کے ساتھ
چاند چہروں کے خدو خال بگڑ جاتے ہیں
ہوٹل کی لابی میں معمول کی گھما گھمی تھی۔ دیوہیٹل
دیواروں اور عالی شان ستونوں سے مزین لابی میں اونچے
فانوس لٹک رہے تھے، زرد روشنیوں نے خوبناک سا
ماحول بنا رکھا تھا۔ ایک طرف اونچے شیشے کے بار
مصنوعی آبشار بہ رہی تھی۔ پانی اوپر سے نیچے آکر
جوض میں گرتا بہت دل فریب معلوم ہو رہا تھا۔ شیشے کی
دیوار کے قریب جہاں بہت سے سیاح رک رک کر
آبشار کے ساتھ تصاویر بنوا رہے تھے وہاں نوشیرواں
بھی کھڑا تھا۔ مگر اس کی پشت شیشے کی طرف تھی۔ وہ
آبشار کو نہیں اپنے فون کو دیکھ رہا تھا۔

دفعتا ”سامنے سے شہرین آئی دکھائی دی۔ اس کے
سنہری بال اونچی پونی میں بندھے تھے، اور آنکھوں میں
شدید بے چینی کا تاثر تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اس کے
قریب آئی۔

”تھینک گاڈ، تم آگے۔“ شور کے باعث اسے بلند
آواز میں نوشیرواں کو مخاطب کرنا پڑا تھا۔ شیرو نے بے
گالگی سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔
”تم نے کہا تھا کہ اس کا تعلق میرے کیس سے
ہے، اسی لیے آنا ہوں۔ بولو۔“

شہرین نے انہوں سے اسے دیکھا۔ ”قسم ہاشم کی
طرح ہوتے جا رہے ہو۔ اسی ایک سال پہلے کی بات
ہے جب تم مجھ سے۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”اچھا، او
کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”بیٹھ کر بات کرنے سے تمہاری کڑوی باتوں میں
مٹھاس نہیں ٹھل جائے گی۔ جو بتانا ہے، یہیں بتاؤ۔“
شہرین نے سینے پہ بازو لپیٹ لیے اور تندہی سے
اسے دیکھا۔ ”تمہیں مجھ سے ذرا احتیاط سے بات کرنی
چاہیے۔ یہ مت بھولو کہ تم میرے سامنے اعتراف
جرم کر چکے ہو اور کورٹ نے مجھے گواہی کے لیے بلایا
ہے۔“

”تو جاؤ دے دو گواہی۔“ اس نے شانے اچکائے
تھے۔ اس کے انداز میں کچھ عجیب سی بے پروائی تھی۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں :-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجن

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

سرخ بان کرپہ کرے ہوئے تھے اور اس نے سرخ چھونا سا رومال ہینو بینڈ کی طرح ماتھے سے ذرا اوپر سر پہ لپیٹ رکھا تھا۔ وہ کلابی میں چوڑا سا واٹ گولڈ برسلسٹ پہنے ہوئی تھی۔ لپاس سلور سلک کا تھا اور دیگر جیولری بھی واٹ گولڈ کی تھی۔ اس سارے سفیدین میں سرخ اس کا رومال تھا یا پھر لپ اسٹک۔ وہ مسکرا کر چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتی آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی۔ دفعتاً اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔

فارس کا پیغام سامنے ہی چمک رہا تھا۔
 ”اٹھ بچے تک آنا ٹھیک رہے گا؟“ اور جواب میں
 ”آب دار کا“ دلیس“ لکھا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے
 گھڑی دیکھنے لگی۔ ابھی پورا آٹھنٹہ پر تھا۔
 نیچے واپس آؤ تو لاؤنج میں مخالف صوفوں پر ہاشم اور
 ہارون بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ ہارون صوفے کی
 پشت پر ہارون پھیلائے بیٹھے چائے کے گھونٹ بھرتے
 ہوئے بغور ہاشم کو دیکھ رہے تھے جو ذرا ڈھیلا ہو کر بیٹھا
 تھا۔ آنکھوں کو سکینر کے کسی غیر مرئی نقطے کو بوجھ دیکھ
 رہا تھا جیسے کسی انجان شخص کو پہچاننے کی سعی کر رہا
 ہو۔

”تمہاری پوزیشن دن دن کمزور ہوتی جا رہی ہے
 ہاشم!“ ہارون ہمدردانہ سمجھے میں گویا ہوئے۔ گھاگ
 نگاہیں ہاشم کے چہرے سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔
 ”ہمارے دوست تمہارے بارے میں شکوک و
 شبہات کا شکار ہو رہے ہیں۔“

ہاشم نے چونک کر ان کو دیکھا۔ بھنویں اسٹریں۔
 ”کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”ہمت سے لوگ بہت سی باتیں کہہ رہے ہیں۔
 تمہارے ساتھ اب وہ مزید کام نہیں کریں گے۔ اسلحہ
 خریدنے کے لیے بیسہ وہ کسی اور سے لانڈر کروانے
 کے آپشن پر غور کر رہے ہیں۔ تمہے ایک ڈوٹا
 ہوا۔ ٹالی ٹینگ ہو۔ ہاشم!“

ہاشم کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ بکھری۔
 ”ہو نہیں“ اس نے سر جھٹکا۔ ”مجھے ڈونانا اتنا آسان
 نہیں ہے ہارون۔“

پھر بھونک مار کر اس کو راکھ کی طرح اڑا دے۔ خوف
 سے بھاگنا سنے کا حل نہیں ہوتا۔ خوف کے اندر غوطہ
 کھانا اور پھر اس سے نکل آنا انسان کو اصل آزادی دیتا
 ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آزاد ہونے جا رہا ہوں۔ مجھے

دائیں سے بائیں وہ ہوٹل کی طویل لابی کی اونچی
 چھت سے لٹکتے فانوس پہ نظر ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”مجھے روشنی نظر آنے لگی ہے۔ اور جب تک میں
 اپنے آپ سے بچ نہیں بولوں گا، میں آزاد نہیں
 ہو سکتا۔ اب مجھے روشنی نظر آنے لگی ہے۔ ہاں
 اب۔۔۔ اب کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے۔“
 ہاشم نے منہ کھولے اسے یوں دیکھ رہی تھی گویا اس
 کا دل بچ گیا ہو۔

”شیر اور گھومو میری بات سنو، تم خواہ مخواہ چلنی ہو کہ
 اپنا کس بہت خراب کرو۔ یوں تمہے۔“

”تھینک یو۔ میری بات سننے کے لیے۔ اب میرا
 دماغ کلیر ہوا ہے۔“ وہ سر ہلاتا، اس کا شکریہ ادا کر رہا
 تھا۔ وہ ابھی تک کسی دوسری دنیا میں تھا۔ جیسے دل و
 دماغ بہت سی آلائش سے پاک ہو گئے ہوں۔

عرصے بعد اسے ایک روشنی کی امید نظر آئی تھی
 اور یہ روشنی دکھائی دے والا بھی سعدی تھا ایک دفعہ پھر وہ
 اس سے آگے نکل گیا تھا مگر آج حسد بخنوس نہیں ہوا
 تھا



خن درو اس منافقت سے تو خود کسی کا شعار سیکھو
 زبان کا زخم زخم ہونا، حرف کا کھردرے نہ رہنا
 ہارون عبید کی رہائش گاہ شام کے مبہم اندھیروں
 سے ڈھکی دکھائی دیتی تھی۔ ڈرائنگ روم سے گفتگو کی
 آوازیں آرہی تھیں۔ ان کو نظر انداز کر کے تم گول
 سیڑھیوں کو پھلاکتے اور جاؤ اور آبدار کے دروازے کی
 کی ہول سے اندر جھاٹو تو وہ اس طرف پشت کیے
 ڈرائنگ ٹیبل کے ساتھ بیٹھی نظر آرہی تھی۔ آئینے
 میں اس کا عکس جھلکا رہا تھا۔ سرخ بال۔ سیدھے

سپاٹ پر نہ وہی سرد مسکراہٹ تھی۔ ہاشم کاردار کو اندر تک جیسے کسی نے جلا ڈالا تھا مگر اس بات کا جواب وہ دے نہیں پایا تھا۔

وہ جس وقت باہر پورچ کی طرف جا رہا تھا اسے لان عبور کر کے آتی آب دادر دکھائی دی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر ٹھٹکے تھے۔ دونوں کے قدم ٹھہر گئے تھے۔ نگاہیں ملیں۔ ہاشم نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔ وہ کانی تیار اور سچی سنوری لگ رہی تھی۔ سُرخ لب اسٹک زیادہ واضح تھی۔

”ریڈ۔“ وہ مسکرایا۔ زخمی سا انداز تھا۔ آب دادر سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی۔ ہاتھ میں کلچ تھا، تباہی منے کار تیار تھی جس کا دروازہ کھولے کھڑے ڈرائیور نے چابی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی گویا آبی کے حوالے کر رہی تھی کہ وہ خود ڈرائیو کر کے جائے۔ ہاشم نے ہر چیز اور غور سے دیکھا۔ وہ اس کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ بولا۔

”پوچھ سکتا ہوں، کتا خاص کون ہے جس سے ملنے جا رہی ہو؟“

آب دادر لمحے بھر کو ٹھہری۔ چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ رہا۔ ”ہائیں“ کار کی طرف دیکھتے ہوئے خشک مزاجی سے بولی اور آگے بڑھی۔

ہاشم کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس کے انداز سے اسے عین مطابق وہ اکیلی ڈرائیو کر کے جا رہی تھی۔



وہ بھی کیا لوگ ہیں محسن جو وفا کی خاطر! خود تراشیدہ اصولوں سے بھی اڑجاتے ہیں اطالوی ریسٹورنٹ کے برآمدیے میں چمبھی میزوں میں سے ایک پہ آبدار عبید جیشی تھی۔ کمرے جیسے نکائے اور کہنی کرسی کے ہتھے پہ جما کر اپنے ایئر رنگ سے کھیاتی وہ منتظر نظروں سے داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لان میں لگی میزوں پہ موجود افراد پہ بھی بار بار اس کی نظر پھنکتی۔ کبھی اکلانی پہ بندھی گھڑی دیکھتی۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تھا مگر ابھی وقت پڑا تھا۔

”سنائے تمہارے اور سعدی یوسف کے گیس کا بیج کافی ایماندار اور سخت ہے۔ بڑے بڑے فیصلے کیے ہیں اس نے ماضی میں۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ کم از کم سعدی اسے خرید یا ڈرا نہیں سکتا۔“

”پھر تم بھی اسے نہیں خرید سکتے۔“ ہارون کے لہجے میں تعجب اور آہ۔

”وہ ہارون! تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ مجھے بیج کو خریدنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ قانون نو شیرواں کے ساتھ ہے۔ قانون ملزم کا ساتھ دیتا ہے ہمیشہ۔ ملزم قانون کی محبوب اولاد ہوتا ہے۔ قانون کے جھول سے بری کروادیں گے بہت جلد۔ رہے ہمارے دوست تو ان سے کہنا، اگر میں ڈوبا تو سب کو لے کر ڈوبوں گا۔“

کالر کھڑکا کر وہ رعونت سے بولا تھا۔

”حیرتم سعدی کو نصح کے قتل کے جرم میں پکڑوا نہیں سکتے کیا؟“

”مگر گواہی تو ہوگی مگر ایک بات مجھے تنگ کر رہی ہے۔ سعدی نے کہا تھا کہ اس نے سیلف ڈیفنس میں قتل کیا ہے۔“ وہ بوجھے ہوئے بول رہا تھا۔ ”یعنی نصح نے اس کو مارنے کی کوشش کی۔ پہلے گارڈ مارنے بھی اس کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ میری ناک کے نیچے دو لوگ اس کو کیوں قتل کرنا چاہیں گے ہارون؟“ اور چبھتی ہوئی آنکھیں ہارون کے چہرے پہ جمادیں۔

ہارون اسی طرح ٹھنڈے انداز میں اسے دیکھے گئے۔

”ہو سکتا ہے سعدی جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”مجھے لگتا ہے مجھ سے کوئی اور جھوٹ بول رہا ہے۔“

”تو پھر اپنی ناک کے نیچے رہنے والوں سے سوال کرو۔ مجھ سے نہیں۔“ ہارون مسکرا کر بولے تھے۔

ہاشم اپنی چبھتی نظروں سے انہیں دیکھے گیا۔

”مگر تمہاری کوئی انوالومنٹ نکلے ہارون تو۔“

”وہ وقت گزر گیا جب تم میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مجھے دھمکاتے تھے ہاشم! جاؤ اپنے بھائی کو بچا جانے کی فکر کرو۔“ ہارون کے چہرے پہ اب بھی وہی

وہ جو مگن سی بیٹھی تھی، آہٹ پہ چونکی۔ پھر مسکراتی ہوئی نظریں اٹھائیں، مگر جیسے ہی آبدار نے سامنے موجود ذی نفس کو دیکھا اس کی مسکراہٹ خائب ہوئی۔ آنکھوں میں ابھرن سی ابھری۔

”سوری... آپ کون؟“ جاننے بوجھتے بھی اس نے سوال کیا۔

سامنے کھڑی حنین نے مسکرا کے کرسی کھینچی۔
 ”میں حنین یوسف ہوں، مجھے فارس غازی نے بھیجا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کیس میں ہماری مدد کرنا چاہتی ہیں کسی اہم ثبوت کے ساتھ۔ میں وہی لینے آئی ہوں آپ سے۔“ اپنا برسینے پتے رکھا اور دونوں کہناں میز کی سطح پر رکھ کر چہرہ ہنسلیوں پہ گرائے وہ معصومیت سے بولی۔

”اور یہ فارس! وہ شہنشاہ رہ گئی تھی۔“
 ”وہ تو مجھے ڈراپ کر کے چلے گئے۔ اکثر ایسی طرح مجھے ڈراپ کرتے ہیں اور عموماً اسی وقت کسی کا قتل ہو جاتا ہے۔ بس خدا کرے آج کوئی جان سے نہ جائے۔“ ٹھہر جھری لے کر وہ بولی تھی۔

آبدار کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ ماتھے پر سلوٹیں در آئیں۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اندر غصے کے اہال اٹھنے لگے تھے۔

”میں نا اچھی خاصی ایسی کیورین ہوں۔ نوڈی! صحیح قسم کی نوڈی۔ اس لیے اپنا آرڈر تو میں فوراً کر رہی

ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ کھیل رہی تھی۔

مور چال میں آٹھ بجے والے ڈرامے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ ندرت مسلسل اونچا اونچا ڈانٹ کر اسامہ کو خاموش ہونے کے لیے کہہ رہی تھیں جو سارا اسکول کا کام لاؤنج میں بیٹھ کر ہی کرنے کی ٹھانے ہوئے تھا۔ ساتھ میں مسلسل بڑے ابا کو بتا رہا تھا کہ حسینہ کو صداقت نے کتنا قیمتی سام سنگ کا اسمارٹ فون لے کر دیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ چائند والا نہیں بلکہ خالص اصلی والا ہے۔ ندرت نے چپل اٹھائی تو وہ خاموش ہوا۔

سعدی قانون کی موٹی سی کتاب اٹھائے لاؤنج کے ایک کونے میں بیٹھا خاموشی سے پڑھ رہا تھا۔ اور ان سب سے لا تعلق زمر گئے کمرے میں اسٹرائیٹ میبل پہ بیٹھی تھی۔ بار بار گھڑی دیکھتی، چہرے پہ بے چین بھینگی تھی اور غصہ بھی۔

”کیا اب وہ اس کے ساتھ بیٹھا ہوگا؟ ڈنر منگوا رہا ہوگا۔ ثبوت کے تو بس بہانے ہیں۔ موقع چاہیے فارس کو بس۔“ وہ سخت خفا لگ رہی تھی۔ بار بار موبائل اٹھائی پھرنے لگی تھی۔
 ”میں کیوں فون کروں؟ مجھے پرواہ تھیوڈی ہے۔ ہونہ۔“ وہ مسلسل خود سے بولنے جاری تھی۔

ریستوران میں واپس آو تو وہاں کھانے کی اشتہاء انگیز خوشبو پھیلی تھی۔ آبدار اسے داخلی دروازے سے ہی نظر آگئی۔ اس نے گہری سانس لی اور قدم اس کی طرف بڑھا دیے۔

آلی نے یقیناً اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ مگن سی، مسکراتی ہوئی، سوچ میں گم بیٹھی نظر آرہی تھی۔ اس نے آبدار کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے لان پار کیا، بہت سی میزوں کے درمیان سے راستہ بنایا اور پھر برآمدے کے زینے عبور کیے۔ چند ڈگ مزید بھرے، یہاں تک کہ آبدار کی میز سامنے آگئی۔ اس نے قدم روک لیے۔ آلی کے بالکل سامنے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

نصیحتیں

ملک احمد

ہوں۔ آپ کیا لیں گی؟“ حنین مینویک اٹھا کر ویٹر کو اشارہ کرتے ساڑگی سے پوچھ رہی تھی۔ آبدار نے تندی سے اسے دیکھا۔ ماتھے پر کٹے بال اور لمبے بالوں کی فرینچ چوٹی گوندھے وہ لیسن پلگر کے لان کے نفیس سے جوڑے میں ملبوس ساہ سی لڑکی تھی۔ گندی رنگت کی حامل مگر چمکتی سیاہ آنکھوں والی۔ آبدار سر جھٹک کر موبائل اٹھا کر کال ملانے لگی۔ حنین اسی بے نیازی سے ویٹر کو آرڈر لکھوا رہی تھی۔

”آپ آرڈر نہیں کریں گی؟“ معصوم حنین نے پلکیں جھپک کر پوچھا۔

”میں یہاں کیوں آئی ہو؟“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”کیونکہ آپ کے پاس کوئی اہم ثبوت ہے جو آپ ہمیں دینا چاہتی ہیں۔ ماموں نے کہا جا کر آپ سے لے لوں۔ اس لیے میں آئی۔“

”جو دینا ہے وہ میں ان کو وہی دوں گی۔ تمہیں نہیں۔ خیر تمہیں کچھ اور نہیں کہنا تو میں چلتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی۔

”ویسے تو میں اپنا بل خود ادا کروں گی۔ جی ایس ٹی بلا کر پورے دو ہزار پیاس بنیں گے۔ دو ہزار ہیں میرے پاس۔ آپ پیاس روپے اوصار دے دیں۔“

”ٹرائل پہ جب آپ سے ملوں گی تو وہ دے دوں گی واپس۔ پھر آپ بے شک چلی جائیں۔“ حنین نے پھر سے آنکھیں جھپکائیں۔

آبدار نے ایک تیکسی نظر اس پہ ڈالی، کلچ کھولا اندر سے کریڈٹ کارڈ نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ نظر اٹھا کر ویٹر کو دیکھا جو سرونگ کی تیاریوں میں نظر آتے تھے۔ چونکہ ہدایات کڑی تھیں اس لیے اس کے ”مہمان“ کے آتے ہی وہ چونکے ہوئے تھے۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ یہ مہمان مطلوبہ شخص نہیں ہے۔

”پے منٹ ہو جائے گی۔ تم کھانا کھاؤ۔“ وہ بے زاری سے بولی تو حنین نے شانے اچکائے۔

”آپ کی مرضی!“ اور فیکن گود میں بچھایا۔ چھری کا شادر ہست کر کے رکھا۔ ”ویسے چاہیں تو ماموں سے ایک دفعہ پوچھ لیں۔ وہ بہت پر لیتیں تھے کہ آپ وہ

فلش ڈرائیو دینے بغیر نہیں جائیں گی۔“ آبدار کو اس کے مشورے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی موبائل پہ نمبر ملا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جیسے ہی فارس نے کال پک کی وہ میز کے پیچھے سے نکل کر ڈور پر چلی آئی۔

”آپ کہاں ہیں؟“ رستوران کے برآمدے میں کھڑی ناراضی سے وہ فون پہ پوچھ رہی تھی۔

”کام سے نکلا ہوا ہوں۔ کیوں؟“

”آپ کو خود یہاں آنا تھا۔ اس کو کیوں بھیجا؟“ گردن موڑ کر ایک خفا نگاہ حنین پہ ڈالی جو چہرہ ہتھیالیوں میں گرائے بیٹھی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ آبی کو نئے سرے سے غصہ آنے لگا۔

”اگر کچھ واقعی ضروری ہے آپ کے پاس تو آئے دے دیں۔ آگے آپ کی مرضی۔“

”ڈر گئے کیا مجھ سے؟“ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

”میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کسی مصیبت میں پڑیں۔“ مصیبت میں تو میں پڑ چکی ہوں۔“ وہ سختی سے مسکرا کر بولی۔ ”بہر حال میں اس کو کچھ نہیں دے رہی۔ بلکہ میں جا رہی ہوں یہاں سے۔“

”مرضی آپ کی۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ دوسری طرف سے لائن ڈنڈ ہوئی۔ آبدار واپس آئی تو ماتھے کے بل گہرے ہو چکے تھے۔ کھانا میز پر لگ چکا تھا اور حند مزے سے شروع بھی کر چکی تھی۔

”میرے بھائی کا انٹرویو کرنے کے بعد بھی آپ اصل گیم سمجھ نہیں سکیں؟“ لزانہ کا بڑا سا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں نکالتی حنین نے مگن سے انداز میں پوچھا تھا۔

”سوری؟“ وہ کھڑے کھڑے کلچ میں موبائل رکھتی چوکی۔

”نہیں آیا سمجھ میں؟“ حند نے حیران نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ چند لمحے لے کر منہ کا لقمہ چبایا۔ پھر سائٹ ڈرائنگ کا گھونٹ بھرا۔ پھر چہرہ اٹھایا۔ آبدار

گیا۔ آواز کا پی۔ آنکھوں میں کرب سا بھرا۔ دل کھویا تھا اور واپس حاصل بھی کر لیا تھا مگر کھونے کا درد اور واپسی کے جتن کی اذیت آج بھی ویسی ہی تھی۔

”یہاں ہاشم کا کیا ذکر؟“ آب دار نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ حنین چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ ان ہی کھوجتی رشک بھری نظروں سے۔ پھر لبوں سے پھسلا۔

”کیا ہے آپ میں جو اسے کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیتا۔“

آب دار دھیرے سے مسکرائی، پھر آگے کو ہوئی اور حنا کی سادہ چمک دار آنکھوں میں جھانکا۔ ”چھوٹی لڑکی! کیا تمہیں ہاشم پر کرش ہے۔“

حنین اسی طرح اسے دیکھے گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ البتہ اس کے رخسار گلانی ہوئے تھے۔

”ہاشم کو متاثر کرنے کے لیے سامنے والے میں کھاس“ ہونی چاہیے۔ ”وہ پیچھے کو ٹیک لگاتے ہوئے خبردار کرنے کے لیے انداز میں گویا ہوئی۔ ”خوب صورتی ہونی چاہیے۔ متاثر کن اسٹائل ہونا چاہیے۔ زہانت اور اعتماد ہونا چاہیے۔ ایسی لڑکی جو اس کی گتھی تھام کر جب چلے تو ایک دنیا اس کو دیکھے۔ وہ ڈھیروں دولت اور جاہ و ختم بن جائے۔ اس کا اعلا خاندان ہو۔ وہ شاہزادیوں جیسی ہو۔ وہ کیریئر وومن ہو۔ بڑے بڑے سیدان مارے ہوں اس نے۔ سبھی ناز اور ورکشاپس میں تقریر کرے تو ایک دنیا اس سے متاثر ہو۔ اس سے کم ہے وہ کبھی راضی نہیں ہوتا۔ شہرین اپنی جوانی میں ایسی ہی تھی۔“

”اور آپ بھی ایسی ہی ہیں۔“ وہ اسے جھکتے ہوئے بے خودی کے عالم میں بولی تھی۔ آبدار نزاکت سے مسکرائی۔

”میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی، مگر تم ایسی بالکل بھی نہیں ہو۔ وہ تمہیں کبھی نہیں چاہے گا۔ وہ ہر کسی کو نہیں چاہ لیتا۔“

حنین ہلکا سا مسکرائی۔ ”مجھے اس کی خواہش بھی نہیں ہے، میرے لیے یہی کافی ہے کچھ سے فارس

اسی طرح شش و پنج میں کھڑی تھی۔

”یہی تو سارا مسئلہ ہے آبدار صاحبہ۔ فارس غازی ہم سے اپنا کام ایسے نکلواتے ہیں کہ ہمیں لگتا ہے یہ ہمارا ہی تو آئیڈیا تھا۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سچ سچ۔ میں سمجھاتی ہوں آپ کو۔“ رک کر کانٹے میں پھنسا پیریا ستا اور قیے کا ٹکڑا منہ میں رکھا۔ لذیذ اشیاء زبان کو چھوتے ہی گویا اندر گھل گئیں۔ اس نے نوالہ تسلی سے کھایا پھر بولی۔

”آب ہارون عبید کی بیٹی ہیں نا اور فارس ماموں کو معلوم تھا کہ ہارون صاحب کا سعدی بھائی کے اغوا میں ہاتھ ہے تو انہوں نے بس اتنا کیا کہ بھائی کے میمورل ڈیے۔ یہ میری تقریر سے پہلے ڈاکٹر توقیر بخاری سے کہا کہ اپنی تقریر میں اتنا کہہ دیں کہ سعدی یوسف کلینکل ڈیٹھ کا شکار ہوا تھا۔ فارس غازی کو پتا تھا کہ یہ فقرہ ہارون عبید کی بیٹی کو کلک کر جائے گا۔ وہ سعدی یوسف کو ڈھونڈنے کی اور اس کو فالو کرتے ہوئے ہم اسے ڈھونڈ لیں گے۔ آپ کو بھائی نے بتایا کہ وہ کسی کلینکل ڈیٹھ میں نہیں گیا، صرف خواب دیکھا تھا اس نے مگر آپ نہیں مانتیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ اغوا کے وقت سعدی یوسف تو ہوش میں آیا ہی نہیں تھا، پھر ڈاکٹر توقیر بخاری کو کیسے پتا کہ اس نے کچھ دیکھا یا نہیں؟ آپ کرتی ہیں نا ایسے لوگوں کا انٹرویو۔ یوں آپ نے بھائی کو ڈھونڈا اور ہم بھی بھائی تک پہنچ گئے۔ اب آیا سمجھ میں؟ آپ کو استعمال کیا ہے فارس غازی نے۔“ وہ کھاتے ہوئے بولتی جا رہی تھی جیسے خبر نامہ پڑھ کر سن رہی ہو۔ آبی متحیر سی کھڑی تھی۔ سن۔ بالکل۔ پھر وہ آہستہ سے بیٹھی۔

”تو وہ ہمیشہ سے مجھ سے نظر رکھے ہوئے تھا۔“ وہ بولی تو آواز میں تقاضا تھا۔ حنین نے ہاتھ روک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے برا نہیں لگا تھا۔ اسے ناز ہوا تھا۔

”آپ تو کسی اور کی بھی نظر میں ہیں۔“

”کس کی؟“ وہ چونکی۔

”ہاشم کی۔“ وہ بولی تو دل جیسی لکڑی کی طرح سنگ

غازی محبت کرتے ہیں اور وہ ہر کسی سے محبت نہیں کر لیتے۔ بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں ان کی محبت دوستی اور اعتماد جیتنے کے لیے۔ وہ مجھے اپنی ”میم“ کہتے ہیں۔ میں ادا اس بیٹھی ہوں تو محسوس کر لیتے ہیں اور میں خوش بیٹھی ہوں تو ہمیشہ میری خوشی بانٹتے ہیں۔ مجھے ایسی باتیں بھی بتا دیتے ہیں جو زمر کو تہیں بتاتے۔ میں خوش ہوں کہ مجھ سے محبت کرنے والے بہت اچھے انسان ہیں۔“

آبدار کی مسکراہٹ پھکی پڑ گئی تھی مگر اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ ”تم ان کی بھانجی ہو۔ یہ تو پچھل ہے۔“

”گویا آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ میرے اندر چاہے جانے والی کوئی خوبی نہیں ہے؟“

”میرا تم سے کیا مقابلہ ہے!“ وہ مسکرا دی اور پھر شانے اچکائے۔ عجب اوائلے نیازی تھی۔

”تو پھر مجھے وہ ثبوت نہیں دیں گی آپ؟“ حنین پلیٹ پرے دھکیل کر نشو سے ہاتھ اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولی۔ آبدار نے مسکرا کر نفی میں گردن ہلائی۔

”فارس غازی سے کہو اسے اگر وہ چاہے تو خود آکر مجھ سے ملے۔ میں دے دوں گی مگر صرف اتنی کو۔ تم میرے پیر بھی چھو دو تب بھی نہیں تمہیں نہیں دوں گی۔“

”آپ کی مرضی ورنہ میں تو آپ کے پیر پھونے والی تھی!“ حنین مایوسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پرس کندھے پر ڈٹکایا۔

”کھانا اچھا تھا مگر اتنا اچھا نہیں۔ اٹالین میں دسی نیچ آ رہا تھا۔ بل آپ ادا کر دیجیے گا۔ میں تو ویسے بھی کسی قابل نہیں۔“ اور کندھے اچکا کر مڑ گئی۔ آبدار نے سر جھٹکا۔ اس کی نظروں نے دد جاتی حنین کا آخر تک پیچھا کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے آخری جملوں میں طنز محسوس ہوا تھا۔

بل ادا کرنے کے بعد اس نے کرنڈٹ کارڈ والپن رکھنے کے لیے پرس کھولا تو ایک دم جھٹک گئی۔ اوپر کا

سائیس اور اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ پرس کی اندرونی زپ کھلی تھی اور وہ خفیہ جیب خالی تھی۔ یہ خفیہ جیب جس میں اس نے وہ ٹائی پن ڈرائیو رکھی تھی۔

”کہاں گئی!“ آبدار بدحواسی سے پرس کو کھنگالنے لگی۔

باہر پارکنگ میں فارس کی کار کا فرنٹ ڈور کھول کر حنین اندر بیٹھی اور ٹائی پن کیمرہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”چار منٹ بھی نہیں لگے مجھے۔ پہلے اس کا پرس کھلوایا۔ پھر جب وہ آپ سے بات کرنے کے لیے سائیڈ گئی تو اسے نکال لیا۔ مجھے لگا تھوڑی احتیاط سے چھپائے گی اسے مگر وہ محترمہ تو ایسے شاہانہ زعم میں کافی لاپرواہ ثابت ہوئی ہیں۔ اب بیٹھ کر سوچ رہی ہوگی کہ کون کتنا قابل ہے۔ ہونہ۔“

وہ خفگی سے بڑبڑائی۔ فارس نے ایک اتھ میں ننھا کیمرہ پکڑا اور دوسرے سے ڈرائیو کرنا شروع کر کے لے گیا۔ تھوڑی دیر جا کر اس نے گاڑی کی محبت لگی۔ لائٹ آن کی اور غور سے اس ڈیوائس کو دیکھا۔ پھر جیب میں رکھ لی۔

”ویسے آپ خود بھی ان سے مل کر یہ لے سکتے تھے۔“ کانی دیر بعد حنین دنگ اسکرین کے پار نگاہیں جمائے سوچتے ہوئے بولی۔

”جب آپ کو یہ معلوم ہو حنین کہ کسی سے آپ کا ملنا یا بات کرنا آپ دونوں کو فتنے میں مبتلا کر سکتا ہے تو پھر اس راستے سے احتراز برتنا چاہیے۔ یہ نہیں کہہ بانے بہانے سے اس سے ملا جائے اور خود کو صفائیاں دی جائیں کہ یہ آخری بار ہے اس دفعہ بات کر کے اس قصے کو ختم کرنا ہے مجھے۔ ایسے نہیں ہوتا۔ جب تعلق توڑنا ہوتا ہے تو کسی خدا حافظ کسی الوداع کے بغیر اسی لمحے توڑا جاتا ہے۔“ وہ ساہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ حنین کو بہت کچھ یاد آ گیا مگر بظاہر بشارت سے بولی۔

”صاف کہیں نہ بیوی سے ڈرتے ہیں آپ۔“

”بیوی سے کون نہیں ڈرتا یا ر!“ اس نے ہنسنے لگی۔

”میرا پاس مجھ سے استغنی مانگ رہا ہے۔“
اس وقت لوگ اس پاس تھے۔ وہ جلدی میں تھا۔
اس کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ مگر
اس نے بار بار کہا تھا۔

”تم انتظار کرو۔ میں کرلوں گا سب کچھ ٹھیک۔ بس
تم استغنی نہیں دو گے۔“

آخری دفعہ جب اس نے وارث کا چہرہ دیکھا تو
اس پہ ایک امید سی تھی۔ سخت پریشانی کے درمیان
موجود سی امید۔ ایک بان۔ اعتبار سا تھا کہ فارس
سنبھال لے گا۔ اور وارث سر کو اثبات میں خم دیتے
ہوئے اپنی کار کی طرف مڑ گیا تھا۔ یہ آخری دفعہ تھا
جب اس نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ زندہ چہرہ۔

وہ حنین کو ہونٹ لے آیا۔ اس کی دوست سے پے
در پے سوالات کرتے ہوئے بھی اسے مسلسل کوفت
ہو رہی تھی۔ ذہنی طور پر وہ وارث کے جسٹس میں اٹکا
ہوا تھا۔ سالگرہ کی تقریب سے واپس آکر بھی وہ ایسا ہی
اجبھا ہوا تھا۔ زرتاشہ کو ہاتھ میں کچھ کہہ دیا تھا وہ اس پر
خفا ہو رہی تھی۔ فارس کا کھولتا دماغ مزید ابلنے لگا تھا۔
اسے خود بھی یاد نہیں کہ اس رات اس نے کس کس کو
جھڑکا تھا۔ علیشما، حنین، زرتاشہ، ہاشم، سارا غصہ اور
چڑچڑاپن اس لیے تھا کہ وہ وارث سے مل نہیں سکا
تھا۔ اسے ٹھیک سے سمجھا نہیں سکا تھا۔

زرتاشہ آف موڈ کے ساتھ سوئی تھی۔ وہ مسلسل
وارث کو کال کر رہا تھا مگر اس کا فون بند تھا۔ اس رات وہ
سویا نہیں تھا بلکہ سبالکونی میں بیٹھا رہا تھا۔ پیر لے کر
کے میز پر رکھے وہ سوچے جا رہا تھا۔ سامنے ہاشم کے
کمرے میں ایک لیمپ آن تھا۔ پردوں کی جھری سے
صاف دکھائی دیتا تھا ہاشم بھی صوفے پر لے پیر کر کے
بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ
تھیں اور وہ کسی اور ہی کیفیت میں لگتا تھا۔

فارس پھر بالکونی میں ٹھہرنے لگا۔ دائیں سے بائیں۔
بائیں سے دائیں۔ وہ بے چین تھا۔ جانے کون سی چیز
بے سکون کر رہی تھی۔ دن خراب تھا۔ دماغ بھی ٹھیک
نہیں تھا۔ کیا کرے۔ کس سے کہے؟

کی بی۔ وہ ہنس دی۔ پھر راستہ دیکھتے ہوئے بولی۔
”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“
دو تہمیں گھر ڈراپ کر کے میں فاطمی صاحب کے
پاس جا رہا ہوں۔“

حنین ٹھنکی۔ ”الیاس فاطمی!! وارث ماموں کا
باس؟“ یہ نام ذہن میں پانچ سال سے بیٹھا ہوا تھا۔
”ہوں۔ وہ گواہوں کی لسٹ میں ہے۔ اس لیے
مجھے اس سے ملنا ہے مگر سنو! گھر جا کر زمر کو مت بتانا کہ
میں اس سے ملنے گیا ہوں۔“ یاد دہانی کرائی۔
”تو انہیں کیا بتاؤں کہ آپ کس سے ملنے گئے
ہیں۔“

”جس سے تم مل کر آ رہی ہو۔“ وہ محظوظ ہوا تھا۔
حنین کے ابرو خفگی سے بچنے۔ ”اس کہنی
حرکت کو کیا کہوں میں؟“
”اسے تم فارس ازم کہو۔ خیر سے زمر بی بی کی ڈیزیز
کرتی ہیں۔ اب اترو۔“ گھر آ گیا تھا۔ فارس نے اس کو
مسکرا کر اترنے کا اشارہ کیا۔ حنین خفا سی اتر گئی۔ وہ
مسکراتے ہوئے کار آگے لے گیا۔ اسے جیسے سوچ کر
ہی مزا آ رہا تھا۔

شدت غم میں بھی زندہ ہوں تو حیرت کیسی؟
کچھ ایسے تندر خواں سے بھی لڑ جاتے ہیں
وہ ایک عجیب رات تھی۔ بے چین۔ مضطرب۔
ڈھیر سارا ذہنی دباؤ لیے ہوئے۔

وہ سونیا کی سالگرہ میں جانے سے پہلے وارث سے ملا
تھا۔ حنین اس کے ساتھ تھی۔ اسے حنین کو اس کی
کسی دوست سے ملوانے جانا تھا۔ یہ بھی ایک بہانا تھا۔
زمر سے ملنے کا بہانا نہ ڈھونڈنے کا بہانا۔ جب کوئی
تعلق نہیں رکھنا تو کیا بار بار اس کا سامنا کیا جائے؟ یہی
سوچ کر وہ راہ فرار اختیار کر رہا تھا۔ حنین کار میں بیٹھی
تھی اور ذہن باہر کھڑا تھا۔ وارث سے اس کی بات تب ہی
ہوئی تھی۔ وہ کچھ پریشان تھا۔ ظاہر نہیں کر رہا تھا مگر
پریشان تھا۔

تھی۔ اس کے لیے تو یہ روز کی بات تھی۔ آج ایک قتل ہوا تو آج دو۔ وہ بے تاثر انداز میں معمول کا کام کرتی رہی۔

ابتدا اس نے فارس یہ شک سے کی۔ اس وقت وہ غصے میں اتنا اندھا ہو جانے والا آدمی تھا کہ زمر بی بی کے انداز پر اس کا داغ کھول اٹھا تھا۔ وہ غیر جانب داری سے اپنا کام پختا رہی تھی مگر وہ مضطرب تھا بے چین تھا۔ وہ چاہتا تھا جلد از جلد قاتل پکڑا جائے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ وہ پولیس آفیسر نہیں ہے جسے چودہ دن میں تفتیش مکمل کرنی ہو اور چالان جمع کروانا ہو، وہ وکیل ہے اور وہ کیلوں کی تفتیش تو مہینوں، سالوں چلتی ہے۔ ان دنوں وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کوشش کے باوجود بھی نہیں۔ داغ پہ چڑھی سرخ دھند نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تک سلب کر دی تھی۔

اسے سب سے زیادہ غصہ زمر پر آ رہا تھا۔ ملال یا عہدہ نہیں۔ صرف غصہ۔ وہ اس پہ کیوں شک کر رہی تھی؟ خشک سے وہ اسے اپنی اہلی بانی سے ملوادے کا مگر وہ اس پہ شک کر کے اچھا نہیں کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ زمر سب سے پہلے اس کو پر شک اور شبہ سے پاک کر کے پھر آگے بڑھنا چاہتی تھی تاکہ کوئی اس پہ انگلی نہ اٹھائے کیونکہ وارث کا موبائل اور پینڈا اسی کی کار سے ملا تھا، مگر سرخ دھند اسے کچھ سوچنے نہیں دیتی تھی۔

کوئی اس پہ شک کیسے کر سکتا ہے؟ سب اندھے ہیں کیا؟ وہ اپنے بھائی کا قاتل کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ اتنا فضول تھا جس پہ فارس غازی کے خیال میں کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے اس امکان کو ذہن سے خارج کر رکھا تھا۔ مگر یقین کرنا کسے تھا؟ صرف شک ہی کافی ہوتا ہے۔ آدمی کو "ملزم" صرف شک بناتا ہے۔ یقین تو مجرم بناتا ہے۔ وہ ملزم بننے جا رہا تھا اور وہ خود اپنی قسمت سے لاعلم تھا۔ سارا دھیان صرف ایک چیز میں اڑکا تھا۔ وارث کا پاس۔ الیاس ناظمی۔ صرف وہی جانتا ہے کہ وارث کو کس نے اور

وہ عجیب بھاری سی برائت تھی۔ گویا دل پہ کوئی بھاری سل بڑی ہو جس کو اٹھائے تو کیسے اٹھائے؟ گرائے تو کسے گرائے؟ کوئی سراپا تھا نہ آتا تھا۔ صبح صادق ابھی تھیک سے نمودار بھی نہیں ہوئی تھی جب اس نے بنا کچھ کھائے پیے حتیٰ کہ منہ دھوئے بغیر چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ اسے وارث سے ملنا تھا۔ جلد از جلد۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ کہیں کچھ ہونہ جائے۔ عجیب سے دل ہے آتے تھے ذہن میں۔

مگر وارث اپنے اسپتال کے کمرے میں نہیں تھا۔ صرف اس کا جسم تھا۔ نکلنے سے جھولتا ہوا۔ وہ بھاگا اور اس کے پیر پکڑ لیے، گردن کو سہارا دیا، مگر اس گردن کو ٹوٹے کئی گھنٹے بیت چکے تھے۔ وہ اب نہیں رہا تھا۔

انگلے چند دن یوں گزرے گویا آنکھوں کے سامنے لال دھند سی چھائی ہو۔ عجب کرب تھا، عجب درد تھا۔ پہلے دن وہ صدمے سے چپ رہا تھا۔ وارث کی بیٹیوں کو روٹے ہوئے دکھتا رہا۔ ویران آنکھوں سے سب دکھتا رہا۔ ویران دل سے سنتا رہا۔ پھر جب وہ وارث کی بیٹی کے ساتھ اس کی قبر کے سامنے بیٹھا تو اس روز سارے احساسات جاگنے لگے تھے۔ غم پہ غصہ غالب آنے لگا تھا، اتنا کہ گشتا تھا دل پھٹ جائے گا۔ تب اس نے عہد کیا تھا۔ قسم کھائی تھی کہ وہ انتقام لے گا۔ شاید تب وہ انتقام کو انصاف کے مترادف سمجھتا تھا۔ وہ ضرور اپنے بھائی کے قاتلوں کو کیفر کر وار تک پہنچائے گا، اس کا عہد تھا خود سے اور جتنا وہ اس بارے میں سوچتا تھا، اتنا غصہ عود کر آتا تھا، دل چاہتا تھا، ساری دنیا کو نہیں نہیں کر دے۔ جلا کر راکھ کر دے۔ کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ عقل پہ پڑا سرخ پر وہ اتنا موٹا تھا کہ سارا منظر دھندلا گیا تھا۔

وہ اور سعدی زمر کے پاس گئے۔ اب اسے پرواہ نہ تھی کہ وہ اس کی کون تھی۔ اب صرف یہ اہم تھا کہ وہ خود کون تھی۔ وہ پراسیکیوشن آفس میں ایک اہم عہدے پہ تھی۔ وہ اس کیس کو دیکھ سکتی تھی وہی کچھ کر سکتی تھی۔ مگر اس کا رویہ بھی خشک سا تھا۔ وہ جیسے چھٹی لے کر جانے کے بعد زبردستی واپس بلائی گئی



بیٹھ جاتا کیونکہ اگر تم شور کر کے کسی کو بلاؤ گے تو بات پھیلے گی۔ ہاشم نے گاتو سمجھے گا کہ تم اور میں ملے ہوئے ہیں اور یہ صرف ایک کوراہ تھا ایک بھونڈی کوشش جس سے تم اس پہ یہ ثابت کر رہے تھے کہ تم مجھ سے ملے ہوئے نہیں ہو۔ وہ مزید تم پہ شک کرے گا۔“

فاطمی نے ڈور ناب چھوڑ دیا۔ اسے خشکیوں نگاہوں سے گھورتا ہوا وہ سامنے آیا اور کرسی کھینچی۔

”کیا چاہتے ہو تم؟ ہاشم کو اپنی اور میری کورٹ میں ہونے والی ملاقات کا جانے کس ڈھنگ سے بتایا ہے تم نے کہ وہ میری ایک ایک موویہ نظر رکھنے لگا ہے۔ اب کیا چاہتے ہو تم؟“

”بیٹھ جاؤ۔ اپنا ہی گھر سمجھو۔“ فارس نے پھر سے اشارہ کیا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں سکون تھا اور بے نیازی بھی۔

فاطمی چیز لے کر اٹھا، پھر بیٹھ گیا۔ ایک گہری سانس لی۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“

”تمہیں پرسوں کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں سچ بولو۔“

”میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ بھڑک کر بولا تھا۔

”تعلق تو ہے اور تم کورٹ میں اس کے بارے میں بتاؤ گے اور پھر تمہیں فارس نے پیرینچے گئے آگے کو ہو کر بیٹھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔“ تم اپنی جانب سے استغفیٰ دے دو گے۔“

فاطمی کی آنکھیں پہلے حیرت اور پھر ناگواری سے پھیلیں۔ ”میں استغفیٰ کیوں دوں؟“

”کیونکہ میں ایسا کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں ایسا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں تمہارے کیس کا جج، جیوری اور جلاڈ ہوں۔“ وہ سرد آنکھیں اس کے چہرے پہ گاڑنے ہوئے بولا۔ ”آج میں تم سے استغفیٰ مانگ رہا ہوں، لیا س فاطمی!“

”اور اگر میں نے ایسا نہ کیا تو کیا کرو گے؟ مجھے زہر دو گے؟ میری بیٹی کو مارو گے؟ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اسے باہر سیشنل کراؤنگا ہوں۔ وہ

کشتی جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فراز اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر لیا س فاطمی اپنی اسٹڈی میں بیٹھا تھا۔ کمپیوٹر کے سامنے فائلوں کا انبار لگا تھا جس کے صفحات کا وہ اسکرین پر نظر آتے ہندسوں سے موازنہ کر رہا تھا۔ اسٹڈی میں سفید بتیاں جلی تھیں۔ کھڑکی کے بلائینڈز بند تھے۔ پیچھے ریکس میں ترتیب سے رکھی کتابیں نظر آتی تھیں۔ وہ عینک لگائے کام میں پوری طرح منہمک تھا۔ مگر اس آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ کوئی آہٹ ہی تھی شاید۔

وہ چونک کر آگے پیچھے دیکھنے لگا۔ پھر عینک اتار کر فائل پہ دھری اور کرسی سے اٹھا۔ احتیاط سے اُدھر دیکھا۔

ماہر آیا۔ راہداری اور سیڑھیاں نیم روشن تھیں۔ سارا گہرا خاموش تھا اور گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

”لاؤنج“ پگن لانی اس نے باری باری ہر جگہ دیکھی۔ دروازوں کے تالے اور کھڑکیوں کی چٹخنیاں چیک کیں۔ سب مقفل اور پرسکون تھا۔ وہ سر جھٹکنا واپس اسٹڈی میں داخل ہوا، دروازہ بند کیا اور جیسے ہی واپس گھوما اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

سامنے اس کی کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔ پیر لے کر اس کی اسٹڈی میبل پر رکھے تھے یوں کہ جو گرز فائلوں کو چھو رہے تھے، اور ٹیک لگائے بازوؤں کا تکیہ بنا کر گردن کے پیچھے رکھا ہوا تھا۔ نظریں اس پر جمی تھیں اور جب اسے متوجہ پایا تو سر کو خم دے کر سلام کیا۔

”کیا حال ہیں فاطمی صاحب؟“

فاطمی کی نظریں اس کے وجود سے ہوتی ہوئیں میز تک گئیں، جہاں برٹا پستول رکھا تھا۔ فارس نے نظروں سے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ فاطمی نہیں ہلا۔ ذرا کھڑا رہا۔ اس کا ذہن ممکنہ آپشنز پہ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہاتھ ڈور ناب پہ ہنوز جمنا تھا۔

”دو گریں تمہاری جگہ ہوتا تو چپ چاپ یہاں آ کر

تمہاری پہنچ سے اب بہت دور ہے۔“ وہ حقارت سے بولا تھا۔

”مجھے تمہاری بیٹی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر ہاں تمہارے بیٹے سے ہے۔ تمہارا لاڈلا بیٹا جس کی کار کے لیے تم نے میرے بھائی کو مصلوب کیا تھا۔ جو باوجود کوشش اور سفارشوں کے مقابلے کا امتحان پاس نہیں کر سکا اور آج کل اسی پرائیویٹ فرم کو چلا رہا ہے جسے اس نے دو ڈھائی سال پہلے بنایا تھا۔ مجھے تمہارے بیٹے سے سروکار ہے۔“

”کیا کرو گے تم میرے بیٹے کا؟“ وہ چونکا تھا مگر ڈرا نہیں تھا۔

”سپیل۔ میں اس کے کمرے میں اسے سنبھالنے سے لگا کر اس کی گردن توڑ دوں گا۔ جان کے بدلے جان۔ گردن کے بدلے گردن۔ اب فیصلہ تم کو کرنا ہے۔“

پستول اٹھا کر جیب میں اڑسا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کے لیے بھی الیاس فاطمی سے نظریں نہیں ہٹائیں۔

”تم ایسا نہیں کرو گے۔ میرے بیٹے کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ وہ بے تابی سے بولا مگر خوف زدہ اب بھی نہیں تھا۔

”میں نے کہا تھا فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ عدالت میں سچ بولو ورنہ تمہیں تمہارے لاڈلے بیٹے کی لاش بہت جلد سنبھالنے سے مجھوتی ملے گی۔“ پھر ہاتھ ہاتھ تک لے کر سلام کیا۔

”پھر ملتے ہیں۔“ اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد ویسا ہی سناٹا چھا گیا۔ الیاس فاطمی اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر غصہ بھی تھا اور تفکر بھی۔ مگر خوف نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

فارس اس ہاؤسنگ سوسائٹی کی تاریک اسٹریٹ پر قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا جب جیب میں رکھا فون تھر تھر آیا۔ اس نے چلتے چلتے اسے نکالا۔ اسکرین دیکھ کر لب مسکرائے اس نے فون کان سے لگایا۔

”جی! حکم۔“

”کہناں ہو؟“ خفا خفا سا پوچھا گیا۔

”اسی کے ساتھ ہوں۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

”زمر خاموش ہو گئی۔ پھر لہجہ سرسری سا بنایا۔“ مجھے پوچھنا تھا کہ۔۔۔“

”بڑا اچھا ریٹورنٹ ہے یہ۔ پہلے بھی آیا ہوا ہوں میں یہاں مگر آج زیادہ خوب صورت لگ رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں۔ ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں۔“

”میں تم سے پوچھ رہی تھی کہ تمہاری بلیو شرٹ۔“

”یار! ویسے بہت اچھا کھانا ہے ادھر کا۔ اور یہ کینڈلز بھی بہت اچھی ہیں۔ یا شاید میرا موڈ اچھا ہے۔ پتا نہیں کیوں میں کافی انجوائے کر رہا ہوں۔“

”فارس!“ اس نے بمشکل ابلتے غصے کے اور بند باندھا۔ ”کل کے لیے تمہارے روم سے کپڑے استری کرواؤں۔ اگر تم تیار تو میں صداقت کو۔“

”تم ایسے ہی اس لڑکی کو اتنا غلط سمجھتی ہو۔ ایک معصوم سی خواہش تھی اس کی یہاں کھانا کھانے کی اور وہ میں نے پوری کر دی۔“

”میں نے تمہیں وہ ثبوت دیا یا نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”اوہ۔ وہ تو میں بھول گیا۔ اصل میں باتوں میں اتنا لگن ہو گیا تھا کہ۔۔۔“

”تم!“ زمر کا لب نہیں چل رہا تھا کہ اس کو فون پر ہی شوٹ کر دے۔ ”تم نا“ آج رات گھر نہ آنا۔“

”مطلب اجازت دے رہی ہو اس کے گھر رکنے کی۔“ سادگی سے پوچھا تھا۔ زمر نے آنکھیں بند کر کے کپٹی سہلائی۔ پھر آنکھیں کھولیں اور جیسے لہجے میں گویا ہوئی۔

”تمہارے کپڑے اب میں کوئی استری و ستری نہیں کروا رہی۔ خود کرنا۔ ہونہ۔“ اور فون کھٹ سے رکھ دیا۔ اس کا چہرہ تمتمارہا تھا اور تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔

”دو نمبر آدی!“



انگلی صبح شہزادہ بہتری تو ایسی گرم اور جبین آلود گویا پتھروں کو بھی پکھلا دے گی۔ مقامی چھٹی کی وجہ سے سارہ کو آفس نہیں جانا تھا۔ وہ یونہی سستی سے بستر میں لیٹی رہی۔ اے سی بھی بند نہیں کیا۔ اہل اور نور کب کی اٹھ چکی تھیں اور یقیناً اس وقت ناشتا کر رہی تھیں۔ سارہ تکیے پہ سر رکھے چھت کو تکتی رہی۔ رہ رہ کر زمرا اور فارس پہ غصہ آ رہا تھا۔ کوئی بھی اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ سب خود غرض نئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی کبھی خفگی سے کسی دور غیر مرنی نقطے کو دیکھتی، کبھی سر جھٹکتی۔ اسے ساری دنیا سے شکایتیں تھیں۔

پشاور کے جس پلازہ پہ سورج اس وقت اپنی ساری حدت بڑھا رہا تھا اس میں موجود لوگ کہیں سے بھی ست نہیں لگتے تھے۔ زیر تعمیر پلازہ کے سینٹ زوہ ستون اور پے در پے منزلوں پہ لگے مٹی اور بھری کے ڈھیر سے ایک طرف نظر ڈالو تو ایک بالائی منزل پہ ہاشم کاردار کھڑا دکھائی دیتا تھا۔ وہ پلازہ کے ایک وسیع و عریض ہال کے دبانے پہ کھڑا تھا جس کی کھڑکی کی جگہ خلا تھا۔ (ابھی چار دیواری دروازے کھڑکیاں تعمیر نہیں ہوئے تھے، صرف ڈھانچہ جہاں ستونوں کے ذریعے کھڑا تھا۔) اور اس وسیع خلا سے گویا نیچے سارا شہر دکھائی دیتا تھا۔

ہاشم نیچے نظر آتے منظر سے بے نیاز، ہم موڈ میں کھڑا تھا۔ نیوی بلیو کوٹ پینے مال جیل سے جمائے وہ ہاتھ پہ بل لیے سامنے والے شخص کو گھور رہا تھا جو کان کھجاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یہ آپ سے کس نے کہا کہ ہم آپ پہ اعتماد نہیں کرتے یا آپ کا مقابل ڈھونڈ رہے ہیں؟“

”لوگ باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ دانت پہ دانت جما کر بولا تھا۔

”کاردار صاحب! ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے ساتھ ہی کام کرنا ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ اس سعدی یوسف بڑا اکل سے آپ کی پوزیشن خراب ہوئی ہے، لیکن ہم آپ کے دوست ہیں، آپ کو مشکل سے

نکالنے کے لیے ہر ممکن تعاون کریں گے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ ”مجھے اس لڑکے سعدی یوسف کو دہشت گرد ثابت کرنا ہے۔ اس کی سب سے بڑی کوالٹی یہ ہے کہ وہ صرف تھرگول کا انجینئر نہیں ہے، وہ ایک راکٹ سائنٹسٹ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میزائل ٹیکنالوجی کے معاملے میں بہت اچھا ہے۔ ایسے لوگ ماچس کی ڈلی سے بھی بم بنا سکتے ہیں۔ مجھے اس کو ٹی ٹی پی کا بم میکر ثابت کرنا ہے اور آپ کو میری مدد کرنی ہوگی۔“

”ہو جائے گا ثابت، آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ بتائیں، آپ کو ہم سے کیا چاہیے۔“ وہ پوری ذمہ داری سے اسے یقین دلا رہا تھا۔

سیکڑوں میل دور۔ اسلام آباد میں سارہ اپنے کمرے سے بے دلی سے نکلی تھی۔ بالوں کو جوڑے مین باندھا اور بیروں کو نرم فرکے سے چیروں میں گھسیٹتی وہ ست رومی سے ڈائمنگ ٹیبل تک آئی۔ ڈائمنگ ٹیبل پچھلے چند دنوں سے، کسی فونکٹی کے باعث گاؤں گئی ہوئی تھیں۔ آج کل میں واپسی تھی۔ ان کے بغیر ادا اس لگتا تھا۔

ملازمہ اسے دیکھتے ہی ناشتے کا پوچھنے لگی۔

”بچوں نے ناشتا کیا ہے؟“ اس نے پھلوں کی ٹوکری سے مطلوبہ پھل ڈھونڈتے ہوئے پوچھا۔

”جی کر لیا تھا۔“

”ابھی کہاں ہیں؟“

”باہر لان میں کھیل رہی ہیں۔“

”اتنی گرمی میں کون سا کھیل، کھیل رہی ہیں؟“

ویسے تو سارا دن موبائل اور ٹیبلیٹ ہوتے ہیں ہاتھ میں۔ جاؤ ان کو اندر لے کر آؤ۔“ وہ خفا ہوئی تو ملازمہ فوراً باہر کو لپکی۔

سارہ سیمیل فون پہ انگلی۔ پھیرتی ای میلز دیکھنے لگی، دو سرے ہاتھ میں سیب تھا جسے وہ کھا رہی تھی۔ تب ہی ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی۔

”ڈاکٹر صاحبہ! ڈاکٹر صاحبہ۔“ سارہ نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ دہشت زدہ ہو کھلائی ہوئی ملازمہ ہانپتی

ان کی آواز باہر ڈاکٹنگ روم تک آرہی تھی۔ جہاں زمرا تعلق سی کرسی پر بیٹھی چائے کے گھونٹ بھرتی اپنا موبائل دیکھ رہی تھی۔ اور وہ اس کے مقابل کھنیاں میز پر لگا کر بیٹھا مک ہاتھ میں لیے آنکھیں اس پر جمائے ہوئے تھا۔ پھر دفعتاً وہ کھنکھارایا۔ وہ نظر انداز کیے رہی۔

”کل رات میں۔۔۔“

”ابا! آپ نے اخبار پڑھ لیا تو مجھے دے دیں۔“ وہ کرسی پر پیچھے کو گھومی اور لاؤنج میں بیٹھے ابا کو پکارا۔ وہ عینک ٹاگ پہ لگائے اخبار کھولے، سر جھکائے، جواباً بولے۔

”تم کب سے صبح اخبار پڑھنے لگیں۔ ساری خبریں تو موبائل پر بڑھ لیتی ہو۔“

فارس ہلکا سا مسکرایا۔ ”یہ دیکھنا چاہ رہی ہیں کہ شاید میری تیسری شادی کی خبر لگی ہو۔“ جہاں زحر نے مڑ کر اسے کھورا، وہاں ابا نے بھی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ فارس کی مسکراہٹ سٹ گئی۔ ”ذائق کر رہا تھا۔“ اور

ذرا رخ موڑ کر چائے پینے لگا۔ (سارا خاندان ہی۔۔۔) دفعتاً اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے عام سے انداز میں موبائل اٹھایا، پھر ذرا ٹھہرایا۔ ”سارہ کا فون ہے۔“ ہلکا سا برہنہ آیا۔ ”زمر جو ٹک کر اسے دیکھنے لگی۔“

”شاید وہ پریس (گواہی) کے لیے آنا چاہتی ہوں۔“ زمر کو اب بھی امید تھی۔ فارس نے موبائل کان سے لگایا اور باشاشت سے پہلو کہا۔ دوسری طرف سے اس کے الفاظ سن کر اس کی رنگت بدلی۔ ابرو اکٹھے ہوئے۔ چونک کر زمر کو دیکھا۔ پھر۔۔۔ ”جی۔۔۔ جی۔۔۔“ کرتا اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

کسی ان ہونی کا احساس تھا پاپا کیا، زمر اس کے پیچھے لپکی۔ جب تک وہ اندر آئی وہ فون رکھ چکا تھا اور والٹ اور چابیاں اٹھا رہا تھا۔ چہرے پر شدید پریشانی تھی۔ ”کیا ہوا؟“ فارس چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر دہلی

انداز میں بولا۔

”واڑت کی بیٹیاں۔۔۔ صبح صبح کوئی ان کو لے گیا

کا پتہ اس کی طرف آرہی تھی۔ سارہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ سارے واسے سارے ڈر درست ثابت ہونے والے تھے۔

”بچیاں باہر نہیں ہیں۔ چوکیدار کہہ رہا ہے وہ ذرا دیر کو ہاتھ روم گیا تھا، پھر واپس آیا تو بچے نظر نہیں آئے وہ سمجھا اندر چلی گئی ہیں۔“

سیب، سیل فون ہرٹے اس کے ہاتھ سے پھسلی تھی۔ وہ اسی طرح باہر بھاگی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا اور سانس رک رک کر آرہی تھی۔

لان ویران پڑا تھا۔ برآمدہ خالی تھا۔ پورچ میں کھڑا چوکیدار افسوس سے ہاتھ مل رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ سارہ حواس باختہ سی اس کی طرف بھاگی۔

”کہاں ہیں امل اور نور؟“ آواز گھٹی گھٹی سی نکلی تھی۔ وہ بالکل کی طرح پیچھے دیکھ رہی تھی۔ ”مجھے بتائی نہیں چلا بیگم صاحب۔ یہ دیکھیں یہ گیٹ کے اندر پڑا ملا ہے۔“

سارہ نے تقریباً ”چھپنے کے سے انداز میں وہ کاغذ تھاما۔“

”آپ کے بچوں کو آپ کی اجازت کے بغیر لے کر جانے کے لیے بہت معذرت، مگر پرسوں کی تاریخ کو یادگار بنانے کے لیے یہ ضروری تھا۔“ H

”ایچ! پرسوں سے تاریخ؟“ سارہ کا دلچ وور اندر ڈوتا جا رہا تھا۔ اس کی بیٹیوں کو کون لے کر گیا تھا۔ سب عیاں ہو گیا تھا۔



مور چال میں بھی وہ ست سی صبح نمودار ہو رہی تھی۔ چھٹی کے باعث ندرت کو رستوران جلدی جانا تھا، اس لیے وہ بچن میں کھڑی حسینہ کو جلدی جلدی ہدایات دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی پرس میں موبائل اور بٹوہ بھی اڑس رہی تھیں۔

”آج ایک اہم بریج اور پھر دو سالگرہ کی تقاریر ہیں، میں گھر کا چکر نہیں لگا سکوں گی، تم یوں کرنا کہ۔۔۔“

ہے۔ سارہ بہت رورہی ہیں۔ ہمیں ان کے پاس جانا ہوگا۔

”ہاشم سے اہمیت کی امید کی جا سکتی ہے۔“ زمر نے جھرجھری لی تھی۔

”نہیں۔۔۔“ سعدی نے سختی سے نفی میں سر ہلاتے چہرہ اٹھایا۔ ”ہاشم کسی کے بچے نہیں اٹھا سکتا۔ ہاشم۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ وہ چھوٹے بچوں کو اس میں انوالو نہیں کرے گا۔“

”تمہیں اب بھی ہاشم سے امید ہے۔“ زمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”وہ بچوں کو پیٹیم کر سکتا ہے دو سروں کی بہنوں کو استعمال کر سکتا ہے، کسی کے بچے کو ہسپتال سے اغوا کر سکتا ہے، مگر ہاں وہ بچوں کو اٹھوا نہیں سکتا۔“

”پتا نہیں۔“ سعدی نے سر جھٹکا۔

”اس نے نوٹ یہ اپنے نام کا حروف سائن کیا ہے سعدی۔“ سارہ روٹے ہوئے بولی تھی۔ ”اور وہ نوٹ پر نشان ہے، ہم اس سے کچھ ثابت نہیں کر سکتے، مگر وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔“ پھر اس نے فارس کو دیکھا۔

”پیارے میرے بچے واپس لاؤ کچھ کرو فارس۔“

”میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا سارہ! وہ شام سے پہلے گھر ہوا۔ آپ تھوڑا سا حوصلہ کریں۔“ وہ اسے مسلسل تسلی دے رہا تھا۔ سعدی اٹھ کر ایک دم باہر نکل گیا۔ زمر چند لمحے بعد اس کے پیچھے گئی۔

وہ ہر آمدے میں رکھی گری پی بیٹھا دور آسمان کو دیکھتا، کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ بہت اداس لگتا تھا جیسے اس کا بہت کچھ سورج کی حدت میں بھاپ بن کر اڑ گیا ہو۔ کھو گیا ہو۔

”ہاشم ایسا کر سکتا ہے سعدی۔“

”ہاں واقعی۔۔۔ اس دنیا میں کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔“ سعدی نے سختی سے سر جھٹکا۔ وہ اس کے کندھے کے پیچھے کھڑی رہی، بیٹھی نہیں اور وہ اسی طرح دور آسمان کو دیکھتا رہا۔

”تو تم نے دو لوگوں کی جان لی تھی!“ اس نے موضوع چھیڑا۔ سعدی کے اندرانی سی اتر گئی، مگر بہت ضبط سے اتنی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اوہ میرے اللہ!“ اس کا دل وہل گیا تھا۔ ”میں ندرت بھا بھی کوس۔“ وہ مڑنے لگی تھی کہ فارس نے بازو سے پکڑ کر اسے روکا۔

”ان کو اور بڑے ابا کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حسین اور اسامہ ویسے بھی سو رہے ہیں۔ خواہ مخواہ بات مزید بگڑے گی۔ صرف سعدی کو بلاؤ اور ہم تینوں وہاں جاتے ہیں۔ میں پولیس کو کال کرتا ہوں۔“ پھر وہ چابیاں اٹھائے باہر کو لوپ کا تھا۔



دوپہر کا سورج آگ برسا برسا کے بھی تھک نہیں رہا تھا۔ گویا سب کے دل اندر تک جلا ڈالے گا۔ لاؤنج میں صرف سارہ کے رونے کی آواز تھی۔ ذکیہ بیگم مسلسل اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ روئے جا رہی تھی۔ زمر سامنے مضموم سی بیٹھی تھی اور سعدی بالکل خاموش سر جھٹکائے ہوئے تھا۔ وہ سارہ سے نظریں تک نہیں ملا پا رہا تھا۔

دفعتا ”فارس موبائل جیب میں رکھتا اندر داخل ہوا۔“

”ہمیں پولیس اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں ہے، پولیس اپنی پوری کوشش کر رہی ہے۔ مختلف جگہوں پر تاکہ بندی کی جارہی ہے، سی سی ٹی وی کیمروں کی فوٹیج کے ذریعے پتا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ کس کار میں سوار تھے۔ ایک دفعہ گاڑی مل جائے تو پھر ان کو ڈھونڈنا آسان ہوگا۔“

پھر وہ اس کے سامنے بیٹھا جس کی آنکھیں رو رو کر گلابی ہو رہی تھیں۔

”سارہ! ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم ان کو شام سے پہلے ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔“

سارہ نے بیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”فارس! میں اپنے بچوں کے بغیر کیا کروں گی۔ کیا اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟ وہ میرے بچے کیسے لے جا سکتا ہے۔“

جاری تھیں۔ ایسے میں جواہرات مسکرا کر چند حضرات سے کہہ رہی تھی۔

”میں یقیناً اس دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں۔ جس کے دو جوان بیٹے اس کے دونوں بازو بنے ہوں، اس کا سہارا ہوں اور ماشاء اللہ دونوں اپنے بزنس میں سیٹ بھی ہوں، اس سے زیادہ کئی کون ہوگا؟“ وہ نفاخ سے کہہ رہی تھی اور سامنے والے تائید کر رہے تھے۔

اودھر ہاشم دو افراد سے ہنستے ہوئے باتوں میں لگن تھا۔ آنکھ کے کنارے سے وہ آب دار کو بھی دیکھ رہا تھا جو سب لوگوں کے درمیان بھی الگ تھلگ سی کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بار بار اپنے موبائل کو دیکھتی جیسے بوری ہو رہی ہو۔ ایکوا تھم کی پارٹی میں جہاں ہر شخص نے سمندری مخلوق جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ (کیونکہ سونیا کا نیا کرش فائنڈنگ ڈوری کے ٹریڈ کے بعد سمندری مخلوق تھی)۔ اب دار نے نیو کارنگی رنگ زیب تن کر رکھا تھا، مگر سر کا رومال سرخ ہی تھا، وہ اس اور بوری نظر آتی تھی۔ ہاشم گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کن اکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ خود مکمل سفید سوٹ میں لباس تھا اور سونیا کے پوچھنے پہ اس نے کہا تھا کہ وہ آئس برگ کے برف کا تودہ جو نیلے سمندر میں سزا ٹھاکر کھڑا ہوتا ہے۔ نہ پگھلتا ہے، نہ ٹوٹتا ہے اور بڑی بڑی کشتیوں کو ڈبو دیتا ہے۔ سونیا اسے کافی دیر خاموش ہو کر دیکھتی رہی تھی۔

”میرا میسج ملا آب دار؟“ جواہرات کی آواز پہ آئی چونک کر مڑی۔ سامنے بنی سنواری مسکراتی ہوئی جواہرات کھڑی تھی۔ لباس شارک کے جیسا سلور تھا اور آنکھوں میں بھی ویسی ہی تندی تھی۔

”مل گیا تھا اور میں نے اس ویڈیو کو تباہ کر دیا۔ مکمل ختم اب کوئی آپ کو اس کے ذریعے بلیک میل نہیں کر سکتا۔ اس لیے بے فکر رہیے۔“ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”ہاشم تم پہ حملہ کرنا سکتا ہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”وہ سب ہاشم نے نہیں، اس کی ماں نے کرایا تھا۔“

”کیوں؟“ وہ چونکی۔ سیرپات اس کے لیے نئی تھی۔

”وہ مجھ سے خوف زدہ تھیں۔ میرے پاس ایک راز ہے ان کا۔“

”کیسا راز؟“ عقب سے آتے فارس نے پوچھا۔ وہ

بھی اس بات پہ چونکا تھا۔ زمر نے مڑ کر اسے دیکھا۔ دونوں نے حیران نظروں کا تبادلہ کیا، مگر سعدی اسی طرح بیٹھا رہا۔

”ابھی بتانے کا فائدہ نہیں ہے اور اس وقت تو

قطعاً نہیں۔“ پھر اس نے آنکھوں کو انگلیوں سے

مسلا۔ ”مجھے سارہ خالہ کو کبھی یوں فورس نہیں کرنا

چاہیے تھا گواہی کے لیے یہ سب۔ یہ میری غلطی

ہے۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں ذمہ دار ہوں

اس سب کا۔“

فارس نے آگے سے دیکھا۔ ”شٹ اپ، پلیز!

اب تم کچھ نہیں بولو گے۔“ اور واپس اندر کی طرف مڑ

گیا۔

ماحول ہنوز بوجھل تھا اور وہ دونوں بالکل چپ

کھڑے تھے۔ کئی گویا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

اس شام قصر کاردار میں رنگ و بو کا سیلاب سا نظر

آتا تھا۔ سارے گھر اور سبزہ زار کے درختوں کو خوب

صورت روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ وسیع و عریض

لونگ روم اور ڈائنگ ہال میں سونیا کی سالگرہ کی پارٹی

زور و شور سے جاری تھی۔ اگلے ہفتے سونیا کو اسکول

ٹریپ کے ساتھ باہر جانا تھا، اس لیے سالگرہ آٹھ دن

پہلے منعقد کی گئی تھی۔ ایک کٹ چکا تھا۔ مہمان

نولیوں کی صورت گھر اندر ادھر ادھر بٹل رہے تھے۔

احمر کان میں لگے آگے کو درست کرتا میکورٹی کے

اسور کا جائزہ لے رہا تھا۔ غرض معمول کی مصروفیات



لاؤں گے میں بیٹھے افراد کی سوگواری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کسی نے بتیاں نہیں جلائی تھیں۔ پورچ اور پی وی کی روشنی نے ہی کمرے کو مدہم سا روشن مدہم سا اندھیرا کر رکھا تھا۔ ایسے میں فارس بیرونی دروازے سے داخل ہوا تو سعدی بے اختیار کھڑا ہوا سارہ نے بھی امید سے اسے دیکھا۔ اس کے آنسو اب خشک تھے مگر آنکھیں سرخ تھیں، من میں امید بھی تھی اور خوف بھی۔

”کیا ہوا؟ کچھ پتا چلا۔“

فارس نے ماپوسی سے نفی میں سر ہلایا۔
”کسی نے انہیں جلتے نہیں دیکھا، کسی جگہ نہیں ہیں وہ۔“

سارہ اسے دیکھتی رہی۔ آنکھیں جھپکے بغیر ہمیشہ خشک آنکھیں اس پہ جمائے رکھتیں۔ سعدی کو کیس بتا رہا تھا۔ پولیس کے ٹاکے کسی کمانڈی ٹریل۔ یہ وہ

ذمہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ایک دم سارہ پھٹ پڑی تھی۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تم سب ذمہ دار ہو۔“ وہ نفرت سے فارس اور سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔

”تم لوگوں نے میرے بچوں کو ایک اور تجربے کی بھیجٹ چڑھا دیا ہے۔ یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی لیے نہیں رکھتی تھی تم سے کوئی تعلق۔ اسی لیے تمہاری طرف آنا جانا چھوڑ رکھا تھا کیونکہ تم لوگوں کی وجہ سے میں مصیبت میں پڑوں گی، میرے بچے نقصان اٹھائیں گے۔ تم لوگوں نے دھکیلا ہے ہمیں اس سب میں۔“

لاؤں گے میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی کچھ نہیں بول پارہا تھا۔
”سارہ وہ بچوں کو نقصان نہیں پہنچائے گا، تھوڑا سا صبر کریں ہم۔“ فارس نے کہنا چاہا۔

”صبر؟“ وہ ایک دم اٹھی، کٹن پرے پھینکا اور فارس کو دیکھ کر غرائی۔ ”کتنا صبر؟ آٹھ ماہ صبر کروں بیسے سعدی کی ماں نے کیا؟ آٹھ ماہ سے پہلے تو نہیں چھوڑیں گے وہ میرے بچوں کو۔ نہ کوئی کل آئے گی اور ان ماں کا جائے گا۔ میں تو پہلے ہی نہیں دے رہی

”مجھے یقین نہیں ہے۔“ جواہرات بظاہر مسکرا کر بولی تھی۔
”تو میں کیا کروں؟“ وہ شانے اچکا کر اکھڑے سے انداز میں بولی تھی۔

یہاں سے ہاتھ کو آوازیں سنائی نہ دیتی تھیں مگر انداز سارے عیاں تھے۔ وہ ان دونوں کے بیچ کی ساری حدت محسوس کر سکتا تھا۔ سو اپنے مصاحبین سے معذرت کر کے آبدار کی طرف آیا۔

”ریڈ! تم ٹھیک ہو؟“ نزی سے اسے پکارا۔ جواہرات اس کی آواز سنتے ہی آگے بڑھ گئی۔
”البتہ آب دار سے دیکھ کر جبراً ڈر سا مسکرائی۔“

”ہاں سبالکل۔“ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”سوئیہ کی سالگرہ کی تقریبات کی بہت شہرت سنی تھی کراچی میں۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ میں اس شرکت میں آ رہی ہوں اور کافی لطف اندوز ہو رہی ہوں۔“
”وہ مسکراتے ہوئے اسے غور سے دیکھ بولا۔ ”مجھے بار بار ایسا لگتا ہے تم کسی کے ہمسج جیہا کال کے انتظار میں ہو۔“

آب دار کی رنگت ذرا بدلی مگر سنبھل کے مسکرائی۔ ”بابا نہیں آئے نا۔ تو سوچ رہی ہوں ان کے آنے کی امید رکھوں یا نہیں۔“
”اچھا۔ اس نے سر خم کر دیا۔ مگر اسے یقین نہیں آیا تھا۔ یہ تڑپ یہ بے نالی سب بہت عیاں تھا۔

دور کھڑی شہرین نے گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے تیکھی نظروں سے اس منظر کو دیکھا تھا۔ ہاتھ ایک نئی اڑان کی تیاریوں میں تھا۔ یوں شہری کا تعلق اس محل سے ٹوٹنے کے قریب تھا۔ یہ شہزادی اسے کہاں داخل ہونے دے گی دوبارہ؟ اب وہ کیسے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سیٹھے، اس کا ذہن ناکام قسم کے تانے بانے بن رہا تھا۔ فرسٹریشن سی فرسٹریشن تھی سوہ کیا کرے؟

شام آگے سائے گرتے ہوئے تھے۔ سارہ کے

تھی گواہی پھر کیوں اٹھایا میرے بچوں کو؟“ آنسو پھر سے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہنے لگے تھے۔
 ”میں نے تو بار بار کہا تھا سب کو کہ میں گواہی نہیں دوں گی۔ پھر کیوں کی میری گواہی۔“

”آپ کوئی گواہی مت دیں سارہ ہمیں دعا کریں ہم انہیں ڈھونڈ لیں ہے۔“ زمر نے کہنا چاہا مگر اس نے سر جھٹک دیا۔ اب جیسے کسی کی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا غم اب غصے میں بدلنے لگا تھا۔
 فارس جو ابھی تک کھڑا تھا خاموشی سے واپس مڑا تو سعدی بول اٹھا۔
 ”آپ کدھر جا رہے ہیں؟“
 ”ہاشم سے ملنے۔“ وہ سپاٹ سرد سے انداز میں بولا تھا۔

”خیریں بھی آؤں گا۔“ وہ اس کی طرف لپکا تو زمر دہل کر آگے آئی۔

”پاکل ہو تم سعدی! اس کے گھر دعوت ہے آج ایک دنیا ہوگی وہاں تم نہیں جا سکتے ادھر۔ تم اس سے نہیں مل سکتے۔“

”مگر مجھے جانا ہے۔“ وہ دکھی لگتا تھا۔
 ”تم بیس رکو صرف میں جا رہا ہوں۔ میں نے کہانا واپس بیٹھو۔“ فارس نے سختی سے منع کیا تو سعدی برے موڈ کے ساتھ صوفے پر بیٹھا۔
 وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اسے پیچھے اندھوں کی آواز آئی۔
 وہ آگے گھوما۔

”سعدی! میں نے کہا ہے نا تم۔“ وہ ٹھہر گیا۔ سارہ بیروں میں چیل ڈالتی آنکھیں رگڑتی آرہی تھی۔
 ”میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“

”ہرگز نہیں سارہ! وہ تیز سے پریشان ہو کر بولا تھا۔ سارہ نے رک کر اسے دیکھا تو آنکھوں سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔
 ”تم مجھے روک سکتے ہو؟ تم مجھے روک سکتے ہو کیا؟“
 اور فارس کو احساس ہوا واقعی یہ اسے نہیں روک سکتا۔ وہ اس وقت صرف ایک ماں تھی۔

تصویر کا دروازے کے لوگ رویم میں اونچے سروں میں بچتی موسیقی اپنے عروج پہ تھی۔ کھانا کھایا جا رہا تھا۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ ایسے میں ان سب سے بے نیاز نوشیرواں اپنے کمرے میں بے سدھ لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔ باہر کا ماحول اسے بے زار کر رہا تھا۔ وہ تیار تک نہیں ہوا تھا۔ یونہی شب خیالی کے لباس میں لیٹا تھا۔ دراز آدمی کھلی نظر آتی تھی اور اندر رکھی پڑیاں ملفوف دکھائی دیتی تھیں سفید پاؤڈر کی طلب سے دراز کھولی مگر بے زاری سے وہیں چھوڑ دی۔ آج اس سے بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب کوئی غم یوں منانے سے نہیں مٹا تھا۔ اب کیا روکی جائے اس مرض کی؟
 نیچے لاؤنج میں آئیں تو ہاشم ایک ذرا پھر آب دار کے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ دونوں نے ہاتھوں میں لپٹیں اٹھا رکھی تھیں اور وہ بات کرنے کے ساتھ کھا رہی رہے تھے۔

”خیریں۔۔۔ کیس لڑ رہا ہوں۔“ اس نے نگاہیں آب دار کے حجرے پہ جمائے سسرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”آب دار نے نگاہیں چرائیں۔“
 ”میں نکال رہا ہوں اپنے خاندان کو اس میں سے۔“ وہ اسے باور دلوا رہا تھا۔

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں اب آگے بڑھ چکی ہوں۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتی ایک دم بے چین سی لگنے لگی تھی۔

”مگر یہ سب تم چاہتی تھیں۔“ آب دار نے تندی سے اسے دیکھا۔

”لیکن کیا تم نے میرے کہنے پہ یہ کیا ہرگز نہیں۔ اب مجھے نہیں پتا کہ تم نے یہ کیوں کیا مگر تم نے مجھے صاف انکار کر دیا تھا مائی ڈر گریم ریپر! اور اب تم خود کو اس اسکینڈل سے نکال لو تو مجھے کیا۔ تمہاری پارٹی میں اس دفعہ اتنے لوگ نہیں آئے کہ تم لان بھر سکو۔ اور جو آئے ہیں وہ مسلسل ٹرائل کی باتیں کر رہے ہیں۔“
 ہاشم کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کر ابھری۔ اس سے پہلے کہ وہ بہت حد تک کچھ کتا کان میں لگا آگے بولا۔ ہاشم کے تاثرات پر چہنبرے میں بدلنے۔

ڈالی۔ پھر برہمی سے بولا۔ ”مجھے نہیں پتا آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”ہاشم کاردار سے تمہارے آدمی صبح میری بیٹیوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ میں۔۔۔ ان کی ماں۔۔۔ ان کے باپ کے قاتل سے پوچھنے آئی ہوں کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔“ وہ چلا کر بولی تھی۔

فارس اس کے عین پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ ایک گارڈ اس کے چلانے پہ برہمی سے اس کی طرف بڑھنے لگا تو فارس نے فوراً ”جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک دم سے بہت سی رائفلوں کے لوڈ ہونے کی آواز آئی۔ فارس نے آہستہ سے ہاتھ باہر نکالا تو اس میں سیل فون تھا۔

”اگر تم لوگوں نے ہمارا ساتھ دیا تو اس کا بھی غلط سلوک کرنے کی کوشش کی تو میں ایک مین و بولنگ گا اور سوشل میڈیا پہ یہاں کی لائیو کوریج جانا شروع ہو جائے گی۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے سامنے تم اور تمہاری باندے آن لائن ہوں گے اس لیے بند وقتیں۔۔۔ نیچے کی گوت۔“ وہ جھٹک کر بولا تھا۔ آپ دیر صرف اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ وہ ابھی تک سن رہی تھی۔

”ہوا کیا ہے؟“ ہاشم نے بے زاری سے اس کی بات کاٹی، ساتھ ہی گارڈز کو اشارہ کیا، انہوں نے اسلحہ نیچے کر لیا۔

”ہاشم! میرے بچے کہاں ہیں؟“ وہ پھر حلق کے بل چلائی تھی۔

”میں آپ سے پوچھ رہا ہوں ڈاکٹر صاحبہ! کہ ہوا کیا ہے۔“ وہ چبا چبا کر بولا تھا۔

”ہاشم!“ وہ ایک قدم مزید آگے آئی اور ان آہنی سلاخوں کو تھاما جو دونوں کے بیچ حائل تھیں۔ نگاہیں لمبے بھیر کے لیے بھی اس کے چہرے سے ہٹائے بغیر وہ غرائی تھی۔

”تم کیا سمجھتے ہو، میں کوئی ڈر بوک عورت ہوں۔ بزدل ہوں۔ تم نے سمجھا کیا ہے مجھے؟ ایک کم ہمت عورت؟“ عذرت سے اس نے سر جھٹکا۔

”فارس؟ آریو شیور؟ وہ ادھر کیوں آیا ہے؟“ کان پہ ہاتھ رکھ کے کف لنک میں لگے آلے میں بولا تھا۔ وہ جتنا حیران ہوا تھا، آئی اتنی ہی چونکی تھی۔

”فارس آیا ہے؟“ وہ بے اختیار بولی تھی۔

ہاشم تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ وہ چند لمحوں تو ہکا بکا کھڑی رہی پھر اس کے پیچھے بھاگی۔ گیٹ کے باہر نیچے کو جاتی سڑک پہ کار کھڑی تھی اور دو افراد دروازے کے ساتھ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان کے گرد آدھ درجن گارڈز جو کتے سے کھڑے تھے۔ گویا ادھر وہ کوئی حرکت کریں، ادھر وہ انہیں شوٹ کر دیں۔ ہاشم تیز قدموں سے چلتا داخلی چوکی تک آیا۔ اسے دیکھ کر سب اس طرف متوجہ ہوئے۔

”کیا مسئلہ ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟“ گھر کی بیرونی چار دیواری کی بیٹوں کے باعث سارا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ہاشم گیٹ کے قریب آیا اور اسے کھولا۔

فارس اس کے پکارنے پہ اس طرف گھوما۔ ہاشم کے کندھے کی آؤٹ سے آب دار نے دیکھا۔ وہ رف سی چیئر اور پوری اسٹین کی شرت میں بلبوس تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ تھا اور ہاتھ پہ گہری سلوٹس۔ وہ تیر کی سی تیزی سے ہاشم کی طرف لپکا اور اسے گریبان سے پکڑا۔

”کدھر ہیں ابل اور نور؟“ وہ غرایا تھا۔ جہاں آب دار سن رہ گئی وہاں بہت سی رائفلیں اس کی طرف تن گئیں۔

”off Hands“

ہاشم نے جھٹکے سے اس کے ہاتھوں کو نیچے جھٹکا اور ایک قدم پیچھے گیا۔ ایک گارڈ نے گیٹ بند کر دیا۔ ایسے میں سارے پھر کر گیٹ کے قریب آئی۔

ہاشم اب سلاخوں والے دروازے کے پار کھڑا تھا۔ وہ اس سے دو فٹ فاصلے پہ رکی اور سرخ انگارہ آنکھیں اس پہ جمائے بلند آواز میں غرائی۔

”میرے بچے کہاں ہیں؟“

ہاشم نے کالر جھاڑتے ایک نظر اسے دیکھا، دوسری اپنے کندھے کے پیچھے کھڑی حیران سی آب دار پہ

ہاشم کاردار نہیں وہ عورت ہوں جس کے بیچے وہ ہزار مرد بھر کے ان صحراؤں میں کام کرتے ہیں جہاں تمہارا یہ ایئر کنڈیشنڈ پہ پلنے والا جسم دس منٹ میں پگھل جائے۔ میں وہ عورت ہوں جو میزائل بناتی ہے بم بناتی ہے۔ میں اگر محتاط تھی تمہارے ساتھ منسلحت سے کام لے رہی تھی تو اس کو تم میری کمزوری مت سمجھنا۔ میری انگلیوں کے چند کلک اور

ایک ڈرون کی مارے تمہارا یہ سارا محل۔ میں اس قابل ہوں ہاشم! کہ تمہیں تمہارے اس محل سمیت زمین بوس کرنے میں مجھے چند کلکس اور ایک ڈرون کی ضرورت ہوگی۔ اور یقین مانو میرے خلاف کوئی ایف آر بھی نہیں کئے گی کیونکہ میں حساس ادارے کی سائنس دان ہوں۔ میرے پاس بہت سے پرو میکٹر ہیں۔ سو میری سنو ۴ گرے ۴ ٹکلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ تمہارے بیچے ایک گھنٹے کے اندر اندر واپس گھر آئے تو تم دیکھنا میں تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔

”کلاس معاف۔“ ہاشم رسکون سا کھنکھار کر بولا۔ ”مگر آپ لوگ یہ ڈرامہ کہیں اور جا کر کریں تو زیادہ بہتر ہوگا سوشل میڈیا پر ہٹس لینے کے لیے اس طرح کے ٹانگ کرنا خالی کرنی ہوئی حرکت ہے۔ میں بچوں سے جھگڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔“ حقارت سے ان کو دکھا اور پھر ہاتھ جھٹکا کر اشارہ کیا۔ ”ٹاؤ گیٹ لائنس پلیز۔ میں ذرا مصروف ہوں۔“ اور واپس مڑ گیا۔ سارہ ابھی تک اونچی آواز میں کچھ بول رہی تھی۔ شاید بد دعائیں دے رہی تھی۔ فارس اب اسے واپس لے جا رہا تھا مگر وہ غصے سے چلائے جا رہی تھی۔

ہاشم چند قدم چل کر رکا۔ اور چونک کے آب دار کو دیکھا وہ پیچھے آتے آتے رک گئی۔ تھی بالکل ششدر، گم صم۔

”تم نے ان کے بچے اغوا کر لیے؟“ وہ بے یقین تھی۔

”اوہ کم آن۔“ وہ کہا تھا۔ ”بے جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا۔“

آب دار نے ایک ملا متی نظر اس پہ ڈالی اور نفی میں سر ہلایا۔ ”سعدی کی دفعہ بھی تم نے یہی کہا تھا۔“ ہاشم چند لمحے کے لیے کچھ بول نہیں سکا۔ اس کے منہ پہ جیسے آب دار نے ایک دفعہ پھر نیچے دے مارا تھا۔ وہ اس کو تاسف سے دیکھتی آگے بڑھ گئی تھی اور وہ بالکل منجمد کھڑا رہ گیا تھا۔ برف کے مجتھے جیسا ٹھنڈا اور بے جان۔



سارہ جب واپس گھر میں داخل ہوئی تو وہ کافی تھکی تھکی دکھائی دے رہی تھی۔ فارس خاموشی سے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ رات اتنے لمبی تھی اور ساری امیدیں دم توڑتی جا رہی تھیں۔ انہیں آنے دیکھ کر سعدی اور زمر بے اختیار کھڑے ہو گئے تھے۔

”کچھ پتا چلا؟ کیا کہا اس نے؟“ سعدی نے پوچھا تھا کہ زمر چیپ رہی۔ بالکل چیپ۔

فارس نے شخص نفی میں سر ہلایا۔ سارہ چیپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گئی۔ گھنوں پہ ٹھوڑی پہ جھانکی اور خشک آنکھوں سے دور خلا میں دیکھنے لگی۔

سب خاموش ہو گئے۔ لاؤنج میں عجیب و وحشت زدہ سناٹا چھا گیا۔ سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی یا خشک آنسوؤں کی۔

”پولیس سے؟“ زمر نے فارس پہ نگاہیں جمائے یک لفظی استفسار کیا۔ اس نے گہری سانس لی۔

”کچھ معلوم ہوگا تو وہ بتائیں گے۔ ابھی تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔“ زمر اسے دیکھتی رہی۔ کچھ بولی نہیں۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

جانے کتنے سے گزرے، کتنی گھڑیاں بیتیں جب باہر آوازیں سنائی دیں۔ ہلچل۔ بولنے کی آوازیں گاڑی کے کھلتے بند ہوتے دروازے، انجن کے چلنے رکنے کی آواز اہل کی آواز فارس تیزی سے اٹھا کر سارہ اس سے پہلے ہی ننگے پیریا ہر بھاگی تھی۔ برآمدے میں آکر وہ رک گئی گویا منجمد ہو گئی۔

گریٹ سے اہل اور نور اندر داخل ہو رہی تھیں۔ سارہ

ساتھ میں مسلسل بولتی جا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں گفٹ پیکس تھے اور شاپنگ بیگز بھی، سارہ ایک نمک ان کو دیکھے گئی۔ پھر کوئی سکتہ سا ٹوٹا، وہ بھاگی اور ان دونوں کو خود سے لپٹا لیا۔ ان کے چہرے چھوٹے بالوں پہ ہاتھ پھیرا پریشانی سے وہ ان کو جیسے ٹٹول رہی تھی۔

”تم ٹھیک ہو؟ تم لوگ کدھر تھے؟ انہوں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟“ وہ بے تالی سے پوچھ رہی تھی۔ بچیاں اس کے اس انداز پہ ایک دم الجھن کا شکار ہو گئیں۔ اور تب ہی سارہ کو احساس ہوا کہ گیٹ سے کوئی اور بھی اندر داخل ہو رہا ہے۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے چہرہ اٹھایا۔

”ہم ان کو نقصان کیوں پہنچائیں گے سارہ خالہ؟“ اندر داخل ہوتی خنین بہت برامان کر بولی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی شاپنگ بیگز اور گفٹ ریپر کی رول شدہ شیٹس تھیں۔ سارہ نے بچیوں کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ تھیر تھیر کھڑکی ہوئی۔ بے یقینی سے خنین اور اس کے پیچھے آتے۔ ہم کو دیکھا۔

”خنین۔۔۔ بچے ہمارے ساتھ تھے؟“ پیچھے سے سعدی حیران سا اٹکے آیا تھا۔ زمر اور فارس نا سمجھی کے عالم میں برآمدے میں ہی رپک گئے تھے۔

”ہا!“ سعدی کو دیکھ کر بچوں نے خوف سے چیخ ماری۔ ”اوہ نو۔“

”آپ ادھر کیا کر رہے ہیں بھالی؟“ خنین پریشانی سے چلائی تھی۔ پھر ان ٹینوں کزنز نے اپنے ہاتھ میں پکڑے گفٹس کو دیکھا۔ ”سارا سر پر اتز خراب کر دیا۔“

”تم تم لے کر گئی تھیں ان کو خنین؟“ سارہ کے لب بے یقینی سے پھر پھڑکائے تھے۔

”کیا مطلب؟ آپ کو میرا نوٹ نہیں ملا؟ سوری میں نے آپ سے پوچھا نہیں، مگر صبح صبح پروگرام بنا اور ہم لوگ جلدی میں تھے۔ کل بھائی کی سالگرہ سے نا ہم نے سر پر اتز برتھ ڈے پارٹی کی تیاری کرنی تھی۔ صبح سے شاپنگ کر رہے ہیں اور پھر ریسٹورنٹ کے اوپر

وایسے ہال کو سجاایا۔ آفس پورے دن کی محنت اور سارا سر پر اتز ختم ہو گیا۔“ وہ روہاسی ہو کر کہہ رہی تھی۔

”خنین! تم میرے بچوں کو مجھ سے پوچھے بغیر کیسے لے جاسکتی ہو؟“ سارہ حلق کے بل چلائی تھی۔ حنہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ایک دم سعدی اور سارہ اس پہ ایک ساتھ غصہ کرنے لگے تھے۔

”خنین! تم اتنی غیر ذمہ دار ہو۔“

”خنین، تمہیں احساس ہے تم نے کیا کیا ہے۔“

”کیا یار۔ میری کزنز ہیں۔ میں لے جاسکتی ہوں۔ اور ای تھیں ریسٹورنٹ میں ہمارے ساتھ سوہ تو آج سنگل نہیں آرہے تھے نہ مال میں نہ ریسٹورنٹ میں ورنہ میں کال کر دیتی۔ کیا ہو گیا؟ آپ لوگ غصہ کیوں کر رہے ہیں؟“

”نہا! آج اتنا مزہ آیا۔“

”لیکن اب تو سارا سر پر اتز خراب ہو گیا۔“ وہ تینوں لڑکیاں ایک ساتھ بول رہی تھیں۔ اور اسامہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

”آپ کو چوکیدار چاہانے نہیں بتایا؟ شاید یہ اس وقت ادھر تھے نہیں ورنہ ہمارے ساتھ ریسٹورنٹ کا ڈرائیور تھا۔“

وہ چاروں بچے اس وقت بچوں کے شدید عتاب اور لعن طعن کے زیر اثر تھے۔ وہاں سے ہو رہے تھے کہ آپ نے ہمارا سارا سر پر اتز خراب کر دیا۔ مگر سارہ سن نہیں رہی تھی۔ وہ ڈانٹے جا رہی تھی، اہل کو تو اس نے ایک پھیڑ بھی لگا دیا تھا۔ فارس کچھ کہنے کے لیے آگے بڑھا تو زمر نے اسے بازو سے تھام کر اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ قدرے حیران ہوا مگر اس کے انداز میں کچھ تھا جو وہ اس کے پیچھے آیا۔

لاؤنج میں آکر وہ اس کی طرف گھوی اور سینے پہ بازو لپیٹ کر تندہی سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”یہ کیا تھا؟“

”کیا مطلب کیا تھا؟ ایک غلط فہمی تھی۔“ وہ حیران ہوا تھا۔

”پتا ہے میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ تم ایسے بھاگ دوڑ نہیں کر رہے جیسے تمہیں کرنا چاہیے۔ ہر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



چیز پولیس پہ چھوڑے بیٹھے ہو مگر تمہارے اور سارہ کے جانے کے بعد میں نے ایس پی صاحب کو کال کی اور پھر متعلقہ تھانے میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے سرے سے پولیس کو کال ہی نہیں کی تھی۔ اور منج آپ نے مجھے منع کیا کہ میں ندرت بھابھی کو نہ بتاؤں اور ماشاء اللہ تجد کے وقت سے آپ جاگے ہوئے تھے آج اور آپ نے بولا کہ حنین اور اسامہ سو رہے ہیں جبکہ وہ تو صبح سے نکلے ہوئے تھے۔ سو میرا نہیں خیال کہ یہ کوئی غلط فہمی تھی۔“

”اچھا تو مجھے گرفتار کر لیں، پراسیکیوٹر صاحب! وہ اس کی طرف جھک کر تپانے والے انداز میں بولا تھا۔“
”یہ سب تمہارا پلان تھا، ہے نا۔“ وہ دبا دبا سا غرائی
تھی۔ احتیاط سے دروازے کو بھی دیکھ لیتی جس کے باہر
وہ سب ابھی بھی بول رہے تھے۔ ”تم سارہ کو اتنا خوف
زور کر کے کیا کرنا چاہ رہے تھے۔“

”آپ بگے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ کیوں؟ آپ نے
نہیں کہا تھا کہ آپ چاہتی ہیں سارہ کو ابھی دیں۔“
”میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس کے بچے اغوا
کر لو۔“

”اغوا کس نے کیے؟ وہ اپنے کزنز اور اچی پھیو کے
ساتھ تھے۔ اور وقت یہ واپس آئی آگے۔“
”اگر سارہ کو پیشکش کیے کچھ ہو جاتا تو؟ کون ذمہ دار
ہوتا؟“ وہ صدے نہیں تھی۔ ”تم اتنے بے حس کیسے
ہو سکتے ہو۔ وہ تمہارے بھائی کی بچیاں ہیں۔“

”جس سارہ کو میں جانتا تھا وہ وارث کی موت سے
پہلے کی سارہ تھی وہ بہت بہادر اور باہمت عورت تھی۔
مگر اس کے خوف نے اسے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ جو
ڈوبنے سے ڈرتا ہو زمر، اسے پانی میں پھینک دینا
چاہیے اور پھر چند ڈبکیاں دے کر نکال لینا چاہیے۔
اس کا سارا خوف زائل ہو جائے گا۔ پھر اسے پتا چلے گا
کہ پانی اس سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ اور تب ہی
اسے کشتی میں محفوظ رہنے کی قدر کا احساس ہو گا۔ وہ
جان جائے گا کہ وہ خود کتنا خطرناک سے کتنا بڑا
سردیور ہے۔ میں صرف سارہ کو اس خوف سے نکالنا

چاہتا تھا۔“
”تم یا گل ہو کیا؟ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو؟“ وہ
شدید غصے سے بولی تھی۔ دروازے سے آہٹ ہوئی تو وہ
دونوں فوراً سیدھے ہوئے۔ سارہ مسلسل برہمی سے
بولتی اندر آرہی تھی۔

”انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویہ تھا یہ تمہارا حنین۔ اور
تم دونوں، کیا تم ماں سے پوچھے بغیر کہیں بھی چلی
جاؤ گی؟“ وہ ڈیپٹ رہی تھی۔ کیسے کیسے خیالات آتے
رہے تھے اسے۔ اور وہ شاپنگ کر رہی تھیں؟ سالگرہ
کے لیے اہتمام کر رہی تھیں؟

نور نے منمنانے کی کوشش کی (حنہ نے کہا تھا ماما کو
نہیں بتانا) مگر اہل نے اسے کنبھی مار گئے چپ
کر لیا۔ (گرلز سیکرٹس۔ یونو)

”ماما! سارا سر پر اترا خراب ہو گیا ہمارا۔“ اہل اب
الٹا اس پر غصہ ہو رہی تھی۔ سارہ ان کو لے کر آگے
چلی گئی تھی اور سعدی باہر کھڑا ندرت کو فون کر کے ان
کو خبر لے رہا تھا۔ ایسے میں حنین ان دونوں کے پاس
آکھڑی ہوئی اور معصومیت سے بولی۔

”سوتوری ہنس وہ سنگلز کا پر اہلم رہا آج تو؟“ زمر نے
تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”ارے ہاں، تم کنبھی معصوم ہو، تمہیں تو کچھ پتا ہی
نہیں تھا۔ یہ جو دو چار آؤں کو جوڑ کر تم لوگ جیمو زینا
لیتے ہو وہ تو لگا کے ہی نہیں ہوں گے تم نے ریسٹورنٹ
میں تاکہ سنگلز بند ہو جائیں۔“ حنین نے فوراً ”فارس
کو دیکھا، اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ وہ پھر سر
جھکاتے ہوئے گویا ہوئی۔

”اصل میں زمر۔“

”چپ!“ وہ گھرک کر بولی۔ سارہ واپس آرہی
تھی۔ اور وہ بیک وقت غصے، اطمینان اور آکٹاہٹ کا
شکار تھی۔

”کل ہم سالگرہ پہ آئیں گے فارس، لیکن
میں۔“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر حتمی لہجے میں
بولی۔ ”گواہی، گورٹ، ٹرائل، ان الفاظ کو سننا بھی نہیں
چاہتی دوبارہ۔ میرا نام تم لوگ گواہوں کی فہرست سے

خارج کرو اور آئندہ مجھے کوئی کورٹ سمن نہ جاری ہو سنا تم نے۔

”ایسا ہی ہو گا۔“ فارس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اسے بھرپور تسلی دی تھی۔ سارہ نے گہری سانس لی۔

”میں کھانا لگواتی ہوں۔ بہت ہی ہیکٹک دن رہا آج کا۔ اب بیٹھ جاؤ۔ چلو یہ سب بھول کر کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ جھنجھلائی ہوئی سی لہجہ کی طرف برہہ گئی۔

سعدی فون بند کرتا ان کی طرف آیا اور ایک نظر سارہ کو آگے جاتے دیکھا۔ پھر سوالیہ نظروں سے فارس کو دیکھا۔ ”کیا کہہ رہی تھیں وہ؟“

”وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ گواہی دیں گی، لیکن ابھی ان سے اس بارے میں کوئی بات نہ کی جائے۔“ سعدی تو سعدی زمر اور حنین نے بھی بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”انہوں نے یہ نہیں کہا فارس!“

”م نہیں نے یہی کہا ہے۔ ٹرسٹ می!“ اس نے مطمئن سے انداز میں یقین دلایا تھا۔

”اب تو وہ بالکل گواہی نہیں دیں گی، تھینکس ٹو یو۔“ غصے سے حنین کو دیکھا۔ ”ہمارا سب سے اہم گواہ گنواہیا ہے تم ہی۔“ اور سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

حنین نے ٹانگ سکوز کر ”ہونہہ“ کیا اور فارس کی طرف گھومی۔ ”میرا خیال ہے آپ کو تیسری شادی کر ہی لینی چاہیے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے!“ وہ گہری سانس لے کر ملال سے بولا تھا۔ پھر ٹھہری دیکھی۔ ”میں ایک فون کر لوں۔“ اور موبائل نکالتا آگے بڑھ گیا۔



قصر کی رونق ماند پڑ چکی تھی۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ جو اہرات اپنے کمرے میں بیٹھی زیورات اتار رہی تھی۔ شادک جیسا سلور گاؤں پیروں کو ڈھانپتا فرش پہ پھول کی مانند بکھرا پڑا تھا۔ باہر ملازم کیٹرننگ کا سامان سمیٹ رہے تھے اور گھر کو درست حالت میں لا رہے تھے۔ ایسے میں ہاشم اپنے کمرے کو جانی

سیرھیال بڑھ رہا تھا۔ انداز میں جھکان تھی۔ تب ہی اس کا موبائل بھرتھرایا۔ اس نے نکال کر دیکھا تو لبوں پہ سچ مسکراہٹ بکھر گئی۔ فارس غازی کالنگ۔

”کل جب میں سچ صاحب کو بتاؤں گا تمہاری اس حرکت کا کہ کیسے تم لوگوں نے میرے گیٹ پہ ڈراما کیا، تو تمہارا کیس مزید خراب ہو گا۔“ وہ فون کان سے لگائے مسکرا کر بولتا کمرے میں داخل ہوا اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ اتارنے لگا۔

”نہیں! تم ایسا نہیں کرو گے۔“ فارس غازی مطمئن سا بولا تھا۔ ”بلکہ پولیس جو فصیح کے قتل کی انکوائری کر رہی ہے، اس کو بھی تم رکوا کے اپنا دعوا واپس لے لو گے۔“

”اور میں ایسا کیوں کروں گا فارس؟“ اس نے گہری سانس لے کر پوچھا تھا۔

”کیونکہ ایک ثبوت ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ سعدی یوسف نے وہ قتل سلطنت ڈیفنس میں کیا تھا۔“

”تمہارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ اس نے کوٹ ایک طرف رکھا اور حقارت سے بولا۔

”میرے پاس نہیں ہے، واقعی۔ کیونکہ اب وہ تمہارے پاس ہے۔“

”کون سا کھیل، کھیل رہے ہو تم؟“ ہاشم بے زار ہوا، مگر وہ چونکا بھی تھا۔

”شاید تم نے اپنی ٹائی پن نہیں دیکھی۔ کیا پارٹی ابھی تک ختم نہیں ہوئی؟“

ہاشم نے بری طرح چونک کر گردن نیچے جھکانی۔ اس کی سلور ٹائی پہ سیاہ ٹائی پن نتھی تھی۔ جو کافی اوپری لگ رہی تھی۔ اس نے تو آج ٹائی پن سرے سے پہنی ہی نہیں تھی تو ایسے؟ اسے فارس کا اپنا گریبان پکڑنا یاد آیا۔

”میں تمہیں یہ فائل ای میل بھی کر سکتا تھا، لیکن وہ کیا ہے کہ احمر شفیع سے خطرہ رہتا ہے، وہ ہر آنے جانے والی میل پہ نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ تم سے زیادہ تمہاری ماں کا وفادار لگتا ہے مجھے اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ اسے تم تک پہنچنے نہیں دے گا۔ لیکن

جواہرات کے کمرے کا دروازہ اس نے جوتے کی ٹھوک سے کھولا تھا۔ وہ جو سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی، چونک کر گردن گھمائی۔ حیرت سے اسے دیکھا۔
”تمہیں کیا ہوا؟“ ہاشم نے ٹیبلٹ اس کے سامنے جا کر پٹا۔

”یہ کیا ہے می؟“ اس کے سر پہ کھڑا سے گھورتے ہوئے وہ غرایا تھا۔

گردن پہ مو سچرا زرتلے جواہرات کے ہاتھ ست ہوئے۔ اس نے ایک نظر ٹیبلٹ کی اسکرین پہ چلتی ویڈیو کو دیکھا اور پھر چہرہ اٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔

”کیا ہے یہ؟“ اس کی رنگت دھیرے دھیرے بجھ رہی تھی۔

”آپ نے فصیح کو حکم دیا تھا ان دونوں کو مارنے کا؟“

جواہرات نے تھوک نکلا اور ٹشو نکال کر ہاتھ دھو بیٹھی۔

”میں نے جو بھی کیا تھا بہت سوچ سمجھ کر تم دونوں کے لیے کیا تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ جب سے آب دار کے پاس اس ویڈیو کی موجودگی کا اسے پتا چلا تھا وہ خود کو اس لمحے کے لیے تیار کرتی آئی تھی۔

”می! ہاشم نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔“ آپ یہ سب کیسے کر سکتی ہیں؟“

”اگر یہ سب ہو جاتا تو ہم آج اس میں نہیں میں نہ ہوتے۔“ وہ جواباً اسے جھٹک کر بولی تھی۔ ”نہ کوئی گواہ بچتا نہ کوئی ثبوت۔ یہ سب تمہیں گزنا چاہیے تھا۔ مگر تم نے نہیں کیا تو اپنے خاندان کی حفاظت کے لیے مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ اور مجھے ایسے مت دیکھو۔ میں تمہاری ماں ہوں آپنے خاندان کے لیے مجھے جو ٹھیک لگے گا میں کروں گی۔“

”آپ نے مجھے دھوکا دیا“ آپ نے میری بیٹھ پیچھے اتنا بڑا کام کر دیا۔ ہارون کو راز دار بنایا مجھے نہیں۔“ وہ غصے اور صدمے سے نفی میں سر ہل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت تونج گریجاں تھیں۔

چونکہ میں تمہارا کزن ہوں اور مجھے تم سے ہمدردی ہے سو میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ضرور دیکھو۔“
”کیا ہے یہ؟“ وہ سختی سے بولا تھا۔ ٹائی پن اتا کر اب وہ اسے انگلیوں سے ٹول کر دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری ماں کا اعمال نامہ! اور لائن ویڈ ہو گئی ہاشم کے کان سرخ ہوئے، ابرو بھینچ گئے۔ اس سے منہ سے گالیاں نکلیں۔ پھر تیزی سے اسٹڈی ٹیبل کی طرف آیا ٹیبلٹ اٹھایا اور یو ایس نی کا پیگ اس میں گھسایا وہ کوئی پھندا کوئی دائرس کچھ بھی ہو سکتا تھا، مگر اس کا ماتھا کسی شے کی بنیاد پہ ٹھک رہا تھا۔

اسکرین روشن ہوئی اور اس پہ جواہرات کا ردار کے آفس کا نظریاں ہوا وہ اندر آنے والے کمرہ میں خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ آواز سے وہ فصیح لگتا تھا۔ ہاشم دم سا دھے سنتا گیا۔ اس کا سانس گویا رک چکا تھا۔ ”خاور کی رنجیریں گھول دو“ اسے سعدی کے ساتھ کھلنے ملنے دو۔ وہ دونوں ہمارے لیے بے کار ہیں، میرا بیٹا یہ بات نہیں سمجھ رہا، اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم خود کوئی قدم اٹھائیں کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے وہ دونوں فرار کا سوچ رہے ہوں گے۔“ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جواہرات کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ سارے الفاظ گڈگڈ ہو رہے تھے۔

”مگر ہو سکتا ہے فصیح کہ کسی دن خاور سعدی کو قتل کر دے اور پھر خود کشی کر لے۔“ اسکرین پہ مسکرائی ہوئی جواہرات کہہ رہی تھی۔ ہاشم اپنی جگہ سے اٹھا۔ ٹیپ ہاتھ میں تھا۔

”تم کرو گے فصیح! اور اتنی صفائی سے کرو گے ایک رات یہ سب کہ اگلی صبح ان دونوں کی لاشیں ملنے کے بعد تم یہ کہہ سکو گے کہ تم تو اس جگہ تھے ہی نہیں۔ میرے بیٹے کو خبر بھی نہیں ہوگی۔“

ہاشم کو سانس نہیں آرہی تھی۔ اس کی رنگت غیض و غضب سے سرخ پڑ رہی تھی۔ وہ ٹیپ ہاتھ میں لیے دھڑ دھڑ زینے اتر رہا تھا۔ بار بار آستین سے پیشانی صاف کرتا اسے پسینہ بھی آ رہا تھا۔

تھی اور وہ سفایاں اور وہ سارے فیصلے سنا کر چلا گیا تھا۔ وہ
دل تھام کر زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔



”آپ دھوکے میں اس حد تک جا سکتی ہیں، میں
سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

جواہرات کا دل کانیا، مگر وہ بظاہر خود کو سنبھالے اپنی
جلگہ سے اٹھی اور اس کا بازو تھامنا چاہا۔ ”ہاشم! میں نے
یہ تمہارے لیے کیا تھا۔“

”ہاتھ مت لگائیں مجھے۔“ وہ اپنا بازو پیچھے کرتے
ہوئے غرایا تھا۔

”میں نے می، آپ لوگوں کے مسئلے حل کرنے
میں اپنی خوشیاں اپنی محبت سب کو مانوی کر دیا۔ می،
آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا، میں دھوکا نہیں دیا اور
آپ۔۔۔ آپ میرے ساتھ اس حد تک خیانت کی
میں تکب ہو سکتی ہیں۔“

”ہاشم! میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو۔“ آپ
کے اس کی آواز بھی کانپی تھی۔ آنکھوں میں آنسو چمکے
تھے۔ مگر ہاشم نے نفی میں سر ہلایا۔

”سعدی سچ کہتا تھا۔ وہ دونوں جیل سے اس کے
بھاگے تھے کیونکہ آپ ان کی جان لینا چاہتی
تھیں۔ اور کیا کیا جھوٹ بولے ہیں آپ نے مجھ سے؟
کیا میرے باپ کو بھی خاور نے مارا ہے یا خاور کی ڈھال
تلے کسی اور کو چٹائی ہے آپ؟“ وہ حلق کے بل چلایا
تھا۔ غصہ، پسینہ، آنکھوں میں اترا خون۔ جواہرات
اندر تک دبل گئی۔

”ہاشم! تم اپنی جان بہت شکت کر رہے ہو۔“
دلچسپ تو اب بھی نہیں کروں گا آپ پہ۔ کبھی
نہیں۔“ وہ غصے سے چیخا تھا۔

وہ بے اختیار آگے بڑھی۔ ”ہاشم! ایک دفعہ میری
بات سنو میں۔“

”میں نے کہا، مجھے ہاتھ مت لگائیں۔ اکیلا چھوڑ
دیں مجھے۔“ غصے سے بازو چھڑاتا وہ باہر نکل گیا۔

جواہرات کے آنسو ٹپ ٹپ کر رہے تھے۔ وہ تھی
دست، تھی واماں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ساری دنیا
لححوں میں بھرنی تھی۔

وہ جو کبھی میں روز بیتی تھی، تو وہ نرا ڈرامہ تھی۔
اصل عدالت تو اب لگی تھی۔ جہاں نہ عدالت چلی

اگلی صبح نوڈلی ایور آفٹر یہ ٹھنڈی سی اتر رہی تھی۔
ساری رات بارش ہوتی رہی تھی اور اس بارش نے
گوایا ساری زمین دھو ڈالی تھی۔ ریسٹوران کے اوپری
ہال کے شیشے کی دیوار پہ بوندوں کے سوکھ جانے کے
نشان اب بھی موجود تھے۔ وہ ہال غباروں اور دیواروں
کے خوب صورت بیک ڈراپ سے سجا تھا۔ میز پہ
تختے ہیک کا بجا کھچا حصہ، برتن وغیرہ رکھے تھے۔ آگے
پیچھے بہت سی گرسیاں رکھی تھیں جن پہ وہ لوگ ٹولپوں
کی صورت بیٹھے تھے۔ تقریباً گونا گونہ قسم ہونے کے
قریب تھی، اور کھانا کھایا جا چکا تھا۔ خیر کھانا کیا تھا،
سنڈے بریج تھا۔ پرسوں کے بجائے آج بھی کھلی گئی
تھی دعوت یوں اس برس نہ سونیا کی سالگرہ اصل
تاریخ پہ منائی گئی تھی نہ سعدی کی۔

ایک طرف دو گرسیاں ترچھی کر کے رکھی
تھیں۔ ایک پہ زمر بیٹی پلٹ اٹھائے ایک کو کانٹے
سے ٹورنے میں لگن تھی۔ دوسری پہ فارس ٹانگ پہ
ٹانگ جمائے بیٹھا، سوٹ ڈرنک کے گھونٹ بھرنا
دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں اس رات۔۔۔“ ذرا کھنکھار کر گویا ہوا۔

”آب دار سے ملنے۔“ زمر نے نظریں اس کی طرف
پھیریں۔ بس اس کے تاثرات دیکھنے کی دیر تھی، وہ
سادگی سے بولا۔ ”آب دار سے ہی نئے گیا تھا۔“

”پتا ہے میں تمہارے کپڑے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ
اس نے بھی یہی رنگ پہن رکھا تھا۔“

اب کے زمر نے مشکوک نظروں سے اسے
گھورا۔ ”پچھلے دو دن میں تم اس کے کپڑوں کے پانچ
رنگ بتا چکے ہو مجھے۔ اب تو مجھے اس بات پہ یقین بھی
نہیں آ رہا۔ تم سچ سچ گئے بھی تھے یا۔۔۔“ کچھ سوچ کر
مسکرائی۔ ”ہاشم نے دروازے سے ہی بھگا دیا؟“

”ہونہ۔ اس کی اتنی مجال۔“ وہ بڑبڑا کر گویا برامانتا

ہوا رخ پھیر گیا۔
 ”ویسے ہے تو وہ تمہارا کزن، لیکن ایک بات ہے اس کی کلاس اس کا گریس، اس کا مخالف کو مسکرا کر چیت کر دینے کا انداز، یہ سب تم میں اس جیسا نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں ہاشم اگر اچھا آدمی ہو تا تو میں اس کی سب سے بڑی فین ہوتی۔“ فارس نے سافٹ ڈرنک کا گلاس میز پر بیچ دیا اور خفگی سے اسے دیکھا جو معصومیت سے بولے جا رہی تھی۔
 ”اگر تم نے ہاشم کی باتیں ہی کرنی ہیں تو میں اٹھ کر جا رہا ہوں۔“

”جلتے ہو اس سے؟“ ایک اور سوال۔ وہ جواب دینے بنا اسے گھورتے ہوئے اٹھا اور آگے بڑھ گیا۔ زمر نے اسے دیکھا اور ایک کا بقیہ حصہ کھانے لگی۔ اب آیا تھا اصل نماز۔

ان سے ہٹ کر دیکھو تو ایک طرف ٹولیاں بنا کر حنین اور اس کی دونوں کزنز بیٹھی تھیں اور وہی کے نشان بنا کر بیہیلی لے رہی تھیں۔ سارہ ہدایت اور ذکیہ بیگم بھی خوش گوار موڈ میں گفتگو میں مگن تھیں۔ ایسے میں صرف سعدی تھا جو ایک نیبل کے گرد اکیلا بیٹھا موبائل پر مصروف تھا۔ وہ اور اس تھا اور خاموش تھا۔ فارس اس کے قریب آکر بیٹھا تو اس نے محض سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر دوبارہ موبائل کو دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”ہاں، سب کچھ افسس سے کال آئی تھی۔ مجھے اب کسی قسم کی انکوائری کے لیے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالباً ہاشم نے اپنا دعوا اور تعاون واپس لے لیا ہے۔ وہ نصیح کی لاش تھی یا گواہوں نے میرے بارے میں کچھ کہا سب واپس لے لیا ہے اس نے تھینک یو۔“

فارس نے محض سر کو خم دیا گویا شکریہ قبول کیا پھر کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مسز کاردار کا کون سا راز ہے تمہارے پاس؟“
 ”میں اس پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ کچھ رازد سروں کی زندگیوں بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔“

”ہم نے ایک فیصلہ کیا تھا سعدی کہ ہم ایک

دوسرے سے کچھ نہیں چھپائیں گے۔“
 ”نہیں اس فیصلے کے وقت آپ کے ساتھ نہیں تھا۔“ وہ معصوم سا مسکرایا۔ فارس خاموش ہو گیا۔
 پیچھے سے ندرت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ تینوں لڑکیوں کو ظہر کی نماز کے لیے اٹھا رہی تھیں۔
 ”اٹھتے ہیں نا امی۔“ حنین نے تابعداری سے کہتے ہوئے ایک اور تصویر بنائی۔

”تم لوگ تو جوان ہو۔ جلدی جلدی اٹھ سکتے ہو پھر اتنی دیر کیوں لگاتے ہو؟“ وہ گٹھنوں پر زور دے کر اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”جوانی میں دین بائی چوائس ہونا چاہیے بائی چانس نہیں۔ جس جذبے اور دل سے تم لوگ اس عمر میں عبارت کر سکتے ہونا، یہ برہا پے میں نہیں ہوگا۔ غلط لگتا ہے تم لوگوں کو کہ بو ڈیسے ہو کر عبارت کی ساری کمی پوری کر لو گے۔ برہا پے میں روز کیلیم کھانا جوانی کے دنوں کے روز میں گلاس خالص دودھ پینے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ روح جسمی ہڈیوں کی طرح ہے۔ جوانی سے اسے عبارت یا نائل کرو گے تو برہا پے میں درد اور تکلیف کم ہوگی۔“

”اٹھ جاؤ نا، اس سے پہلے کہ امی یہ مہذب زبان بدل کر اپنی نارمل ٹنن میں واپس آجائیں۔“ سیم نے حنین کی طرف جھٹک کر مشورہ دیا تھا۔ جو امی نے سن لیا تھا۔ وہ جو بال اتارنے چکی تھیں۔
 ”بے غیرت، بے بدایت، مجھے تو میں ابھی بتاتی ہوں۔“ سیم فوراً نیچے کی طرف بھاگا تھا۔ بہت سے تھمے بلند ہوئے تھے۔

”سوری! میں کل کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔“
 سارہ، سعدی کے ساتھ آکر بیٹھی اور نرمی سے بات شروع کی وہ معصوم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ پس منظر کی ساری آوازوں سے بے نیاز، وہ اس کے سامنے بیٹھی، اب سادگی سے اپنا مدعا بیان کرنے لگی تھی۔ فارس اٹھ گیا۔

”مجھے لگا میں جو کر رہی ہوں، وہ زیادہ بہتر ہے۔“
 خاموش رہ کر اپنا کام کیے جاؤ، اور اپنے پراجیکٹ کو کامیاب بنا کر کارڈز کو اس مقام پر اٹکست دو۔ پازینو

www.paksociety.com

سے ہمیں ادھر ادھر ہٹانے کے لیے شیطان کئی طریقوں سے ہم پر حملہ آور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ آگے سے آتا ہے۔ آگے مستقبل ہوتا ہے۔ وہ ہمیں مستقبل کا خوف دلاتا ہے۔ یہ کرو گے تو تمہارا کیریئر نہیں بنے گا۔ تمہاری فیملی کا کیا ہوگا۔

(سارہ کا سر جھک گیا۔)

تمہاری شادی نہیں ہوگی، تم یہ اچھا کام کرو گے تو بالکل انٹینی سوشل ہو جاؤ گے۔ پھر وہ ہمارے پیچھے سے آتا ہے۔ ہمیں ماضی کے کام یا دولا کر ان کے گلٹ میں ایسا مبتلا کرتا ہے کہ ہم کوئی اچھا کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ وہ کہتا ہے، تمہارے تو ماضی میں اتنے افسوس رہے، اب تو تمہاری شادی بھی اپنے جسے بد کردار سے ہوگی۔ تم نے ماں باپ کا استا دل دکھایا، اب تو تم کبھی بدایت باہی نہیں سکتے۔ تم سے ہزاروں چھوڑ دیں، اب تو تم کبھی نیک ہو ہی نہیں سکتے۔

اس کے بعد وہ دائیں سے آتا ہے، ہمیں اچھے کاموں کی ترغیب دیتا ہے اور ہم سے گناہ کروانا ہے۔ ثواب کا جھانسنہ دے کر بد عتیں کروانا ہے۔ نئے دین میں داخل ہونے والوں سے کہتا ہے اسلام تو ساری خواہشات نارے کے کا نام ہے، سوٹاٹ پہ سوؤ اور روکھی سوکھی کھاؤ۔ جو راستہ تیار کرنا ہے، اس سے قطع تعلق کر لو۔ سب سے پہلے ماں باپ کو ان کے گناہوں پہ ٹوکو، ہر وقت دوسروں کے عیب پہ ان کو نصیحت کرو، اور ایسے کئی غلط کام وہ ہمیں ”دین“ کا نام دے کر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

ان تینوں راستوں کے بعد وہ آتا ہے بائیں سے، ہم سمجھتے ہیں کہ وہ صرف آتا ہی بائیں سے ہے۔ مگر شیطان کا یہ یہ آخری راستہ ہوتا ہے۔ وہ ہمیں برے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔ جھوٹ، چوری، قتل، فحش کام، یہ سب وہ آخر میں کرتا ہے جب اس کو ہمارے بگڑنے میں کوئی شاک نہیں رہ جاتا۔ وہ ان کاموں سے شروع کبھی نہیں کرتا۔ آدم علیہ السلام اور نبی ہوا کے پاس بھی وہ ”آگے“ سے آیا تھا۔ ان کو مستقبل کا ایک دل فریب خواب دکھایا تھا۔ شو شیطان وانے کام صرف

انرجی سے باہر مقصد کام کرنا۔ مصلحت پسندی، احتیاط، تھوڑی سی بزدلی، یہ سب تمہارے اندر، مگر مجھے ہمیشہ لگا کہ میں صحیح انتخاب کر رہی ہوں۔“

”سارہ خالد!“ وہ اسی اداس مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ ”ویسے تو اللہ کا قرآن سارے کا سارا بہت خوب صورت ہے، لیکن کچھ آیات دل پہ کسی اور ہی طرح سے اثر کرتی ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں میری سب سے پسندیدہ آیت کون سی ہے؟“

اگر خنین سامنے ہوتی تو ہر روز اپنی پسندیدہ آیت سے اسے دو چار فتوے تو ٹھونک ہی دیتی مگر سارہ مسکرا کر اسے دیکھتی اور سنتی گئی۔

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو جنت سے دھک کار کر دیا میں بھیجا اور اسے مہلت دی تو اس نے کہا۔

سورہ اعراف کی آیت۔

”اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری ”سیدھی“ راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا۔ آگے اور پیچھے دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔“

وہ سانس لینے کو روکا۔ سارہ اسے سنے گئی۔ پوری توجہ سے۔

”میں سوچتا ہوں، ابلیس، جب جانا تھا کہ اللہ کا راستہ ”سیدھا“ ہے تو اس نے کیوں چھوڑا اسے؟ اور اگر چھوڑتا ہی تھا تو اسے سیدھا راستہ بولا؟ شاید ابلیس نے مستقیم سے مراد درست نہیں بلکہ straight (سیدھا) لیا ہو۔ سیدھے راستے کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ذرا سا ترچھا چلو تو شروع میں تو بس سیدھی لائن سے ذرا سا فاصلہ پیدا کر لیتا ہے انسان جیسے جیسے آگے بڑھتے جاؤ، آپ سیدھی لائن سے مزید دور ہتے جاتے ہیں۔ 90 ڈگری کی لکیر سے ایک ڈگری ہٹو تو آگے جا کر آپ سیدھی لائن سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ پھر آپ کو صراط مستقیم والی منزل نہیں ملتی۔ راستہ بدلتا ہے تو منزل بدل جاتی ہے۔ اور اس راستے

فائدہ جس کو لے کر سزا اللہ کو کھودے۔ تو جو قدر کرنا جانتا ہے، جان کی امان کیا رشتوں کی، دولت اور وقت کیا ہدایت کی، اس کے اوپر اور نیچے کے راستے کھلے رہتے ہیں اور وہ اس کی ڈھال بن جاتے ہیں۔ جو ہے، اس کی قدر کیجئے۔ پھر جو نہیں ہے، وہ نہ آپ کو ڈرائے گا نہ عم زدہ کرے گا۔“

اور یہ کہہ کر وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

”میں نے اپنے ہاتھوں سے دو آدمی مارے ہیں سارہ خالہ! اور یہ کرنے کے بعد میں ماضی کے گلٹ میں اتنی دور تک گھر گیا تھا کہ مجھے لگتا تھا اب میں خود کو دوبارہ حاصل نہیں کر سکوں گا اور میں سوچتا تھا کہ جو لڑکا میں چند سال پہلے تھا، وہ مجھے اب دیکھے گا تو کیا سوچے گا؟ مگر سارہ خالہ! وہ لڑکا اس سب سے نہیں گزرا تھا جس سے میں گزرا ہوں، اس لیے میں اب اپنے بھیلوں کی قدر کرنا چاہتا ہوں۔ دو انسانوں کی جان نہیں لی میں نے بلکہ ایک انسان کی، یعنی اپنی جان بچائی ہے ان سے۔ یہ برا کام نہیں تھا۔ میں اپنے احساسِ ندامت سے نکل رہا ہوں۔ آپ بھی اپنے خوف سے نکل آئیں۔“

سارہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ سعدی پر جہی اس کی نظروں میں نیچے تارے چمک رہے تھے۔

”میں گواہی دینا کی سعدی!“ وہ ایک عزم سے بولی تھی۔ ”میں سچ بولوں گی کورٹ میں۔ اور میں نہیں جانتی کہ اس کے بعد ہاشم میرے اور تیرے بچوں کے ساتھ کیا کرے گا، لیکن اگر بہت سی ماؤں کے بچوں کو بچانے کے لیے یہ قدم ضروری ہے تو ٹھیک ہے۔ ہم جگر آزماتے ہیں۔“

”اور اسے تیرا آزمانے دیتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا تھا۔ بہت سا بوجھ کندھوں سے ہٹا تھا۔ روشنی بس تھوڑی دور دکھائی دے رہی تھی۔



”غلط“ کام نہیں ہوتے، بلکہ مستقبل کا خوف ماضی کا غم اور نیکی میں انتہا پسندی بھی شیطان کا جھانسہ ہوتی ہے؟“

”تو پھر قصور ہمارا ہوا یا شیطان کا؟“ وہ گہری سانس لے کر بولی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”شیطان تو صرف کہتا ہے، کرتے تو ہم خود ہیں۔ ہم سب آپ کو کہتے رہے، گواہی دیں، آپ نے نہیں بات مانی۔ انسان اپنے آپ کو خوب جاننے والا ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کا یہ مطلب نہیں کہ شیطان کے آگے ہم بے بس ہیں۔ کیا آپ نے نوٹ نہیں کیا، شیطان نے چار سمتوں کا ذکر کیا ہے۔ آگے، پیچھے، دائیں، بائیں۔ مگر در راستے اس نے کھلے چھوڑ دیے۔ اوپر اور نیچے کا راستہ۔“

”اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور ہے دعا کا راستہ اور نیچے۔ اس نے نیچے کی جانب انگلی موڑی۔“ نیچے ہے سجدے کا راستہ۔ وہ ان دو راستوں پر نہیں بیٹھ سکتا۔ جانتی ہیں اس نے اپنے چار راستے کہہ کر کیا کہا اللہ سے؟ اس نے کہا، ”آپ انسانوں کی اکثریت کو شکر گزار نہیں یا میں گے۔ تو سارہ خالہ! سارے مسئلوں کا حل ہے شکر۔ اور شکر کہتے ہیں قدر دانی کو۔“

جو کتنی میں نیچے رہنے کی عاقبت کی قدر کرتا ہے، اسے ڈوبنے کا خوف نہیں ہوتا۔ جو گریہی کے بعد ہدایت یا لینے کی قدر کرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، ماضی کے گناہ اس کو غم زدہ نہیں کرتے۔

جو اپنے دین کی آسانیوں کی قدر کرتا ہے، شیطان اس کو دین کے نام پر بہکا نہیں سکتا اور چونکہ قدر دان انسان دوسرے کی ایک خامی کو دیکھ کر اس کی ساری خوبیوں کی قدر کرنا نہیں چھوڑتا تو وعظ و نصیحت کے نام پر شیطان اس سے دوسرے انسانوں کے جذبات نہیں مجروح کروا سکتا۔

اور جس کو اللہ کی قدر ہوتی ہے، وہ برے اور فحش کاموں کی طرف نہیں پلکتا کیونکہ ایسی تسکین کا کیا

ہاشم بیٹھا تو اس کا لیٹنا شتا کر رہا تھا۔ شتا بیٹھی بیٹھی سمجھی سمجھی سی جو اہرات صرف چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی اور دوسری جانب بیٹھانوشیرواں اچھبے سے ہاشم کو دیکھ رہا تھا۔

”سو آپ مئی سے اس لیے خفا ہیں کیونکہ مئی نے سعدی کو مروانے کا حکم دیا؟ اسی سعدی کو بھائی! جسے میں نے گولیاں ماری تھیں اور آپ نے اسپتال سے اغوا کروایا تھا۔“ وہ جتا کر بولا تھا۔

”مئی نے مجھے دھوکا دیا اور یہ بھولنے میں مجھے کچھ وقت لگے گا۔“ وہ ماں کو نظر انداز کر کے درستی سے بولا تھا۔ جو اہرات کی آنکھ سے آنسو ٹوٹ کر گرا۔

”میں نے ساری عمر تم دونوں کے لیے لگادی اور آخر میں مجھے یہ صلہ ملا بہت اچھا میرے بیٹے! وہ دکھی صورت بنائے کہ رہی تھی۔“

”یہ Card victim کھیلنا میرے اور اتر نہیں ڈالتا مسز کاردار۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

جو اہرات نے کیل آنکھوں سے نوشیرواں کو دیکھا۔ ”کیا تم بھی مجھ سے خفا ہو؟ میں نے جو کیا تمہارے لیے کیا۔“

”میرے لیے اگر ایسے سعدی مر جاتا تو کل کو ڈاکٹر سارہ تو یہی گواہی دیتی تاکہ نوشیرواں نے اسے گولیاں ماری ہیں۔ میں تو قاتل بن جاتا ایسے گناہوں پہ دوسروں کو ”دجہ“ بنانے کے بجائے ان کو غور نہیں کریں مئی۔“

وہ بھی اکھڑا کھڑا سا کہہ کر ناشتا کرنے لگا۔ جو اہرات ابھی اسے سخت سنا نے ہی لگی تھی کہ ہاشم زینے پھلانگتا واپس آتا دکھائی دیا۔ چند کاغذ اور قلم اس نے جو اہرات کے سامنے لائے۔

”ان پہ دستخط کریں۔“

”یہ کیا ہے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”آپ کمپنی میں اپنے شیئرز میرے نام منتقل کر رہی ہیں آپ بورڈ آف ڈائریکٹرز سے استعفیٰ دے رہی ہیں اور آپ اپنے بینک اکاؤنٹس میں مجھے

جو اسٹاک ہولڈر بنا رہی ہیں۔ آج کے بعد آپ آفس نہیں آئیں گی نہ ہی میری اجازت کے بغیر ایک دھیلا بھی خرچ کر سکیں گی۔ اپنی تمام جائیداد کا پاور آف اٹارنی آپ میرے نام منتقل کر رہی ہیں۔“

وہ ایک ایک کاغذ کی تفصیل بتاتا گیا۔ جو اہرات کا چہرہ سرخ ہوا۔ آنکھوں میں غصہ در آیا۔ آنسو وغیرہ سب عقاب ہو گئے۔

”تم میرے ساتھ یہ کیسے کر سکتے ہو؟“

”آپ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ آپ کے لیے میں زیادہ اہم ہوں یا یہ سب مادی چیزیں تو دستخط کریں اور ثابت کر دیں۔“ ہاشم اب کے ذرا دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ وہ اس کے سر پہ کھڑا تھا اور جو اہرات ششدر سی بیٹھی ان کاغذوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے نفی میں سر ہلایا۔

”میں ان پہ سائن نہیں کروں گی۔“ وہ غرائی تھی۔

”کیا کرو گے تم یہاں؟“

”میں یہ کروں گا۔“ ہاشم ہتھیلی میز پر رکھ کر جھکا۔

پہن لٹھایا اور دھڑا دھڑا ان کاغذات پہ دستخط کرنا لگا۔ ہو ہو جو اہرات کے دستخط۔ جو اہرات کا سانس رک گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں جاگت ہو گئیں۔

”تم۔“

”تھینک یو مئی! آج کے بعد آپ کو آفس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ کاغذ مسمیٹنا سیدھا ہوا اور پلٹ گیا۔ جو اہرات نے بے یقینی سے نوشیرواں کو دیکھا۔ ”یہ غیر قانونی ہے۔“

”تو گرفتار کروادیں بھائی کو۔“ وہ بھی بے زاری سے بولتا اٹھ گیا تھا۔ جو اہرات ایک ٹک اس کی شکل دیکھے گئی۔

اس کو جائیداد سے بے دخل کرنے کی پاداش میں جان سے مارا تھا نا اس نے اور نگ زیب کو؟ کیا اس اولاد کے لیے؟ کیا یہ دن دیکھنے کے لیے؟ وہ ششدر سی بیٹھی تھی۔

اس دن ہر گرجی کا زور گویا ٹوٹ سا گیا تھا۔ صبح پھر

”جی ہاں۔ یہی تھا۔“ سارہ نے پیچھے کر سٹیوں پہ بیٹھے شیرد کی طرف اشارہ کیا جو سیاٹ شکل بنائے بیٹھا تھا۔ آج جو اہرات موجود نہیں تھی۔

”جس وقت آپ کے بقول نوشیرواں نے سعدی کو گولی ماری، کیا آپ نے اس وقت اس کے ہاتھ میں پستول کو جھٹکا کھاتے دیکھا تھا؟“

”میں وہیں تھی ہاشم! میں کبھی خوف سے سراندر کر لیتی۔ اور کبھی باہر نکالتی، اس کو پستول پکڑے، اس کو بولتے، سعدی کو بوٹ سے مارتے، میں نے سب دیکھا تھا۔“

”ڈاکٹر سارہ! جب گولی پستول سے نکلتی ہے تو آگ کا شعلہ سا ساتھ نکلتا ہے اور پستول جھٹکا کھاتا ہے۔ میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کیا آپ نے وہ لمحہ دیکھا تھا یا نہیں؟“

سارہ نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کیں۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا، اور نوشیرواں کی ساری باتیں سنی تھیں میں نے وہی تھا سعدی کا حملہ اور اور۔“

”ڈاکٹر سارہ! آپ نے وہ لمحہ دیکھا تھا یا نہیں؟ پان یا نال؟“ وہ دہشتی سے اونچا سا بولا تھا۔ زمر نے بے اختیار لب کاٹے تھے۔

”نہیں!“ سارہ کی آواز دھیمی ہوئی۔

”اوکے بات ختم۔ آپ نے نوشیرواں کو گولی چلاتے نہیں دیکھا تھا۔“ وہ سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔ ”ڈاکٹر آپ بائی پروفیشن ایک اہم پراجیکٹ کی ہیڈ ہیں، ایک حساس ادارے کی سائنس دان ہیں، آپ کی انگلیوں کے چند کلکس کی مار ہے ڈرون پروگرام، آپ تو راکٹ سائنٹسٹ ہیں۔ آپ جیسی عورت اتنے ماہ کیوں خاموش رہی؟“ وہ حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

”کیونکہ آپ اور آپ کا خاندان مجھ سے زیادہ طاقت ور اور با اثر ہے۔ اور چونکہ آپ کے دست راست نے مجھے میرے گھر میں گھس کر ہراساں کیا تھا اس لیے میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔“

”چھنا جب آپ خوف زدہ کیوں نہیں ہیں؟“ سارہ ہلکا سا مسکرائی۔ ”اب بھی ہوں۔ بہت

بارش ہوئی تھی اور موسم ٹھنڈا مگر جسمیں آلود ہو گیا تھا۔ ایسے میں کمرہ عدالت میں بھی گھٹن سی تھی مگر کارروائی اتنی دلچسپ جا رہی تھی کہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ زمر کٹہرے میں کھڑی سارہ سے سوال پوچھ رہی تھی اور فارس کچھلی نشنتوں پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ کبھی وہ سارہ کو دیکھتا، کبھی اپنے قریب مگر دوسری رو میں بیٹھے الیاس فاطمی کو۔ آج وہ اہم گواہ پیش ہوئے تھے اور فارس غازی کافی مطمئن نظر آتا تھا۔

”اور آپ کو یقین ہے کہ وہ کرنل خاور ہی تھا جس نے آپ کے گھر آکر آپ کو دھمکایا۔“ زمر پوچھ رہی تھی۔ کٹہرے میں کھڑی سارہ نے سفید لباس پہن رکھا تھا اور چہرہ بھی سفید مگر سیاٹ سالگ رہا تھا۔ نظریں اگتھاد کے زمر پہ جمائے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”جی۔ وہ وہی تھا۔“

زمر الیس گھوی اور ہاشم کو اشارہ کیا۔
Your Witness (آپ کا گواہ) وہ کوٹ کا بین
چند کرتا اٹھا اور اپنے چمکتے ہوئے جوتے فرش پہ آگے بڑھتا سارہ کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”ڈاکٹر سارہ! ہم نے آپ کا پورا بیان بہت تھل سے سنا۔“ وہ رساں سے اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے کہہ رہا تھا۔ ”اب آپ سے، میں کچھ سوال پوچھنا چاہوں گا تاکہ عدالت خود فیصلہ کر سکے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔ کیا آپ جواب دینے میں کھفرو ٹیبل ہیں؟“

”ایسے ظاہر مت کرو ہاشم! جیسے تمہیں میری بہت پرواہ ہے، میرے بچوں کے باپ کو جس سنگ دلی سے مروایا تھا، اسی سنگ دلی سے جرح کرو۔ میں تیار ہوں۔“ وہ رکھالی سے بولی تھی۔

ہاشم ہلکا سا مسکرایا اور سر جھٹکا۔ ”خیر۔ آگے چلتے ہیں۔“ ہاتھ باہم پھنسا کر کٹہرے سارہ کو دیکھتے ہوئے اس نے چہرے پہ سنجیدگی طاری کی۔

”آپ کا کہنا ہے کہ سعدی لوہے کے ساتھ اتنے رات آپ نے میرے موکل کو دیکھا تھا۔“

سے مخاطب تھا۔ زمر ایک دم کھڑی ہوئی۔
 ”ہاشم! آپ کو کیسے پتا؟“
 ”کیا؟“ ہاشم اس کی طرف گھوما۔

”یہی کہ اس کالونی میں اس وقت بجلی نہیں تھی؟
 کیونکہ جب سعدی کو وہاں سے اٹھایا گیا تب تو بجلی آ
 گئی تھی اور اس کالونی کے تمام گھر زیر تعمیر تھے اس
 پاس کی کئی گلیاں زیر تعمیر اور ویران تھیں وہاں کوئی
 بندہ تو تھا نہیں تو آپ کو کس نے بتایا کہ وہاں اس وقت
 بجلی نہیں تھی؟“

نوسیرواں نے چونک کر زمر کو دیکھا تھا البتہ ہاشم
 کے اطمینان میں فرق نہیں پڑا۔ ”سعدی یوسف نے
 اپنے بیان میں کہا تھا شاید۔“
 ”میں نے اپنے بیان میں ایسا کچھ نہیں کہا۔“ وہ بلند
 آواز میں بولا تھا۔

”بجلی والی بات ہاشم! آپ کو نہیں تو آپ کو
 کیسے معلوم؟“ وہ دوبارہ کہہ رہی تھی۔ ہاشم نے ہلکا سا
 ہنس کر سر جھٹکا۔
 ”میں اپنا ہوم ورک مکمل کرتا ہوں۔“ زمر نے مجھے
 معلوم ہے کہ وہاں اس وقت بجلی نہیں تھی جب نیاز
 بیگ نے سعدی یوسف یہ جملہ کیا۔“

”تمہارے بھائی نے بتایا ہے تمہیں ہاشم! ان لوہ۔“
 سارہ حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ حج
 صاحب کو اپنا تھوڑا بچانا پڑا تھا۔ ایک دم شور سا جو
 اٹھ گیا تھا۔ ایسے میں کافی سے لطف اندوز ہوتے فارس
 کے تاثرات بدلے۔ وہ چونک کر بائیں طرف دیکھنے لگا
 جہاں چند کرسیاں چھوڑ کے ایک شخص آکر بیٹھا تھا۔
 اس نے نسواری رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، آنکھوں
 پہ گول عدسوں کا چشمہ لگایا ہوا تھا اور بال گیلے کر کے سر
 پہ جمے تھے ہاتھ میں ایک لائٹ تھا جسے وہ بار بار کھول
 بند کر رہا تھا۔ نشست سنبھال کر وہ اب تسلی سے ساری
 کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔

فارس فوراً ”اپنے فون پہ جھکا۔“ ”یہ آدمی کون ہے؟“
 لکھ کر احمر کو بھیجا۔
 ہاشم کی نشست کے قریب بیٹھے احمر کی جیب

زیادہ۔ اگر کیس کا فیصلہ سعدی کے حق میں نہ ہوا تو تم
 ہمارے ساتھ کیا کرو گے، میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔
 لیکن اب میں ڈر ڈر کے بھی تھک چکی ہوں۔ اس لیے
 میں تمہیں اور تمہارے بھائی کو ان کے منطقی انجام
 تک پہنچانا چاہتی ہوں۔“

وہ اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر کہنے
 لگا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ اپنے شوہر کی مبینہ طور پر
 خودکشی کے بعد ڈاکٹر مہرین وقار سے سائیکھلوک سیشن
 لیتی رہی ہیں؟“
 ”ڈیم اٹ!“ زمر نے سر جھکا کر پیشانی مسلی تھی۔
 سعدی نے پریشانی سے اسے دیکھا مگر اب وہ کچھ نہیں
 کہہ سکتی تھی۔

”جی ہاں کبھی کبھار۔ میں بیوہ ہوئی تھی۔ میری
 جا بھئی۔ بچے چھوٹے تھے اور مہرین میری فرینڈ
 ہے۔“ سارہ حیران ہوئی تھی۔
 ”کیا یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر مہرین نے آپ کو چند
 اینٹی ڈپرینٹ تجویز کیے تھے جو آپ باقاعدگی سے لیتی
 ہیں۔“

”آج کل کون سا پیرا جنیک ڈائریکٹر سائنس دان یا
 کون سی کیمریوومن ہے جو اینٹی ڈپرینٹ نہیں کھاتی؟“
 ”آپ اینٹی ڈپرینٹ لیتی ہیں یا نہیں لیتیں؟“
 ”ہاں ٹھیک ہے میں لیتی ہوں مگر۔“
 ”اور اینٹی ڈپرینٹ کے سائیڈ افیکٹس میں۔“

paranoia Vision blurry
 یہ سب شامل ہوتا ہے۔ اس رات بھی آپ کے
 جسم کے اندر اینٹی ڈپرینٹ کا مادہ گھلا ہوا تھا۔
 نوسیرواں کو گولی چلاتے آپ نے نہیں دیکھا پھر بھی
 مصر ہیں کہ وہی مجرم ہے۔ ایک عورت جس کی ذہنی
 حالت اور بصارت مکمل طور پر درست نہیں ہے وہ
 رات کے اندھیرے میں جبکہ اس کالونی میں بجلی بھی
 نہیں تھی ڈاکٹر سارہ کا کسی کو دیکھ کر پہچان لینا انتہائی
 حیرانہ بات لگتی ہے یور آرائز۔“ وہ اب حج صاحب

”وہ نہیں، میں ان صاحب سے ٹکسٹناؤ انفک ہوں۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے وکیل صاحبہ کہ میری ان سے ملاقات ہوئی رہی ہے؟“

تھر تھر آئی تو اس نے فون نکالا اور ذرا ترختتا ہوا کر میسج دیکھا۔ پھر آہستہ سے گردن موڑی اور پچھلی نشست سے کچھ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا۔ ایک بھر پور نگاہ نوآر وہ بھی ڈالی۔

”کوئی رپورٹ ہو شاید۔“
”اس کی تصویر لے کر بھیج دو میں پتا کروا تا ہوں۔ رپورٹ نہیں ہے۔ رپورٹرز تو اس جانب بیٹھتے ہیں۔“

”راجریاس!“ اصرار نے چند منٹ بعد اسے اپنی ایک سیلفی بھیجی جو اس نے ابھی اتاری تھی۔ پیچھے وہی شخص نظر آ رہا تھا۔ فارس نے وہ تصویر ایک نمبر پر سینڈ کی اور ساتھ لکھا۔ ”یہ شخص کون ہے؟ اس کی تصویر فیشنل ریگنیشن میں ڈالو۔ اور اس سے نسٹلک کوئی پاسپورٹ یا شناختی کارڈ ملے تو مجھے بھیجو۔“

ساتھ میں وہ گاہے بگاہے اس شخص پر بھی ایک الجھی ہوئی نظر ڈال لیتا تھا۔ کون ہو سکتا ہے یہ؟

”شاید وہ پاسپورٹ اور میموری کارڈ۔“ وہ بار بار کچھ سوچتا، پھر نفی میں سر ہلاتا۔ پھر بمشکل اس نے دھیان سامنے جاری کارروائی کی جانب منڈول کیا۔

سارہ اب اتر آئی تھی اور الیاس فاطمی کمرے میں کھڑا تھا۔ گردن کو اگڑا کر سیدھا اٹھائے وہ رجمنٹ سے زمر کو دیکھ رہا تھا جو کانغذات کا پلندہ لیے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”فاطمی صاحب! ہاشم کاروار سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“
”ہاشم ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھے اب دلچسپی اور غور سے جاری منظر دیکھ رہا تھا۔“

”میرا ان صاحب سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے۔“
زمر جو مصروف سے انداز میں اگلا سوال پوچھنے جا رہی تھی، بے اختیار رکی۔ جیسے حیران ہوئی ہو۔

لا جواب ہوئی۔ جیسے وہ اس جواب کی توقع نہ کر رہی ہو۔ اس نے مڑ کر فارس کو دیکھا جو اب سیدھا ہوا کر بیٹھا تھا اور خفگی سے فاطمی کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا آپ ذاتی طور پر ہاشم کاروار کے دوست نہیں ہیں؟ کیا آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہوتی رہتی؟“

اس کے انداز میں بے چینی سی تھی۔

”فاطمی صاحب کیوں جھوٹ بول رہے ہیں؟ آپ نے خود ہمیں یہ معلومات دی تھیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ پچھلے ایک سال میں آپ اور ہاشم ان مقامات پر ان تاریخوں میں ملے تھے؟“ وہ اب ایک کانغذ ہاشم کے سامنے رکھتے ہوئے چند تاریخیں بتا رہی تھی۔ ہاشم نے کانغذ اٹھا کر غور سے پڑھا پھر نظریں اٹھا کر اتنے ہی غور سے فاطمی کو دیکھا۔

”یہ غلط ہے۔ اور میں نے آپ کو کوئی معلومات نہیں دیں۔“

”مگر آپ نے خود ہمیں بتایا تھا کہ آپ کے بیٹے کا اسپاتی ویسٹ استعمال کر کے اگر نل خاور نے اس کیس کی اہم سی سی بی وی فونیکشن مختلف اداروں کے ریکارڈز سے مثالی کی ہیں۔ کیا یہ درست نہیں ہے؟“

”میرے بیٹے کا ایسا کوئی سافٹ ویئر نہیں ہے۔ یہ سب الزام ہے۔“ زمر نے پلٹ کر پھر سے بے بسی سے فارس کو دیکھ کر شانے اچکائے جیسے وہ سخت خفا ہو۔ وہ بس تند و تیز نظروں سے فاطمی کو گھور رہے جا رہا تھا۔

”اور کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہاشم نے اس کیس میں گواہی نہ دینے کے لیے آپ کو سے مہینز میں ایک نیا ڈاؤنٹ کھلو کر دیا تھا اور۔“

”آپ کے پاس کسی چیز کا ثبوت نہیں ہے۔ آپ لوگ صرف شہرت کے طالب ہیں۔“ وہ برہمی سے کہہ رہا تھا۔

زمر فوراً ”تیزی سے حج صاحب کی طرف رخ کر کے بولی۔“ یو آؤ! میں الیاس فاطمی کو بطور ایک پراسیکیوشن اپ گیوٹنس کرتی ہوں۔ فاطمی صاحب آپ جاسکتے ہیں۔“

حج صاحب نے ہاشم کو دیکھا جو اب بھی بہت غور سے اس سارے تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ زمر کی پریشانی، اس کا دلپس جا کر مز جوڑے سجدی سے گفتگو کرنا، دونوں کا جستجیلاہٹ سے نفی میں سر ہلانا، پیچھے بیٹھے

فارس کا فاطمی بکو گھوڑنا۔ وہ ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے، الیاس فاطمی ان سے ملا ہوا ہے اور نکر رہا ہے۔“ انہوں نے اس کے قریب سرگوشی کی۔

ہاشم ہلکا سا مسکرایا اور گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ نہیں۔ وہ ان کے ساتھ نہیں ملا ہوا۔ یہ سب اوکاری کر رہے ہیں۔ مجھے یہ امپریشن دے رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ معلومات ان کو میرا کمپیوٹر وغیرہ ہیک کر کے آسانی سے مل گئی ہوں گی۔ رہی آخری اکاؤنٹ والی بات تو ہو سکتا ہے وہ تم نے ان کو بتائی ہو۔“

”سزا کرنا میرا کام ہے۔ وہ لمحے بھر کو کچھ بول نہیں سکا تھا۔“

”میرے والد مر چکے ہیں اور میں آئندہ سے اپنی چھٹی طبقہ پر بھروسہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں پریقین نہیں ہوں کہ تم تمہاری سزا لیں، لیکن تم فارغ ہو۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور آج کے بعد مجھے میرے گھر یا میری ماں کے گرد بھی نظر نہ آؤ۔“

مسکرا کر مگر چہچہا کے اکتاؤہ احمریہ گویا ٹھنڈا پانی ڈال گیا۔ احمریہ بالکل ٹھنڈا بیٹھا رہ گیا۔ ہاشم نے چہرہ اسی جج صاحب کی طرف موڑ دیا تھا۔ اس کے انداز کی سختی اور قہر۔ احمریہ چیزیں ابھی سے سینٹے لگا تھا۔

الیاس فاطمی اب کٹھن سے اتر کے نیچے آ گیا تھا اور کرسیوں کے پاس سے گزرتا دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جس لمحے وہ فارس کی کرسی کے قریب آیا، لمحے بھر کو ٹھہرا۔ فارس نے صرف خشکیوں نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا مگر وہ اسے اتنی ہی تندی سے گھور رہا تھا۔

”تم میرے بیٹے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ یہ ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں نہ تم اس کا پیچھا کر سکتے ہو، نہ اس کو بال برابر نقصان پہنچا سکتے ہو۔“

گھمنڈی انداز میں کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ کمرہ عزالت سے نکل کے وہ راہداری میں چلتا جا رہا تھا جب اسے اپنے پیچھے مانوس آہٹ کا احساس ہوا۔ فاطمی نے

پلٹ کر دیکھا، فارس اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالنے، وہ عدالتی کمرے والے تاثرات کے برعکس بالکل پرسکون سا لگ رہا تھا۔

”کیا ہے؟“

”میں قائل نہیں ہوں، نہ میں تمہارے بیٹے کو مارنا چاہتا تھا۔“

”اچھا۔ اور کچھ؟“ وہ خشک سے انداز میں بولا اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

”میرا ایک بھائی تھا الیاس صاحب، اور وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ وہ بیچ بولتا تھا۔ ایمان داری سے اپنا کام کرتا تھا۔ لیکن پھر اس کو اس دنیا سے جانا پڑا۔ اسے مجھے سے لڑکا کر ہاتھ پاؤں باندھ کر، اس کی گردن توڑی گئی لیکن تمہارا بیٹا، تمہارا لادلا بیٹا ایک مہنگی کار کا خواہش مند تھا۔“ وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی اور اس میں زمانوں کا دکھ سمویا ہوا تھا۔ ”اس کے ناز خیرے اٹھانے والے باب نے میرے بھائی کو بیچ دیا اور کار خریدی۔ یہ سب کچھ آج جہاں ہم ہیں اور جہاں تم ہو، یہ سب تمہارے بیٹے کی ایک کار کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس کی ایک اندھی خواہش کی وجہ سے۔ تو سزا تو اس کو بھگتنی ہوگی۔“

”تم میرے خاندان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ اب اس ملک میں نہیں ہے۔“

”میں اس کو مارنا نہیں چاہتا تھا، وہ بس بہت عرصے سے امریکہ واپس نہیں جا رہا تھا۔ میں صرف اسے واپس بھیجنا چاہتا تھا تاکہ جب غیر قانونی اسپانی ویزے کے لیے امریکی مٹی استعمال کرنے پر لایف بی آئی اس کو گرفتار کرے تو وہ امریکہ میں موجود ہو۔ جس وقت تم اپنی گواہی دے رہے تھے، اس سے تین گھنٹے پہلے تمہارا بیٹا گرفتار ہو چکا ہے۔ چند گھنٹوں میں تم تک آفیشل خبر بھی پہنچ جائے گی۔ ایف بی آئی کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی ٹپ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔“

”واٹ وا۔“ الفاظ اس کے لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ وہ بالکل سن سنا فارس غازی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ فارس دو

جواب یہ واپس جانا تھا اور وہ اس وقت اسی کی تیاری کر رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کے باہر اب ایک اور لڑکا پھولوں کا اسٹال لگا تا تھا۔ گل خان اور اس کا خاندان دو ماہ قبل بست سے افغان باشندوں کے ساتھ ڈی پورٹ کر دیا گیا تھا۔

سعدی کام کرنے کے بجائے کتنی دیر باہر نظر آتے ان پھولوں کو دکھاتا رہا تھا۔ رانے لوگ آہستہ آہستہ جا رہے تھے، نئے لوگ آرہے تھے اور ہر گزرتے دن ہم سب بھی تو ایک نئے انسان میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ وہ انسان جس کو بعض دفعہ پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان جس کے بارے میں ہمیشہ سوچا تھا کہ ہم یہ تو نہیں بنیں گے۔ مگر قسمت کے آگے سب بے بس تھے۔

”اونہوں۔ غم نہیں کرنا۔“ سعدی نے نفی میں سر ہلا کر خود کو ٹوکا۔ پھر کام کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہی۔ مگر فون بجنے لگا۔ اس نے اٹھائے دیکھا۔ ایک نیوز چینل کے رپورٹر کی طرف سے پیغام آیا تھا کہ ”بچے والے شو میں اس کو لایا سولائن پہ لیں گے۔ اسے عدالت میں کیس کی سیر ہی کرنے کا کوئی فائدہ ہے بھی کہ نہیں اس موضوع پر بات کرنی ہوگی۔“

چھوٹے گھونٹھ پائے کے بالوں والا لڑکا اسی سے اس پیغام کو دیکھے گیان کیا عدالت میں کیس کی پیروی کرنے کا اپنے اور اپنے خاندان والوں کے سرعام رسوا کرنے کا، ان کو کتنے لوگوں کی بندو قوں کی تان یہ لے لے آنے کا کوئی فائدہ تھا؟ کیا ساحر و کھاء کے دلائل کا کوئی توڑ تھا؟ بیچ اور حق یہ ہونے کے باوجود کیس مسلسل ہارنے کی پوزیشن میں ہونا اور اپنے ہر ثبوت کا ہاشم کے ہاتھوں مشکوک بنائے دینا۔ کیا اس سب سے نجات کا کوئی راستہ تھا؟

اس کے پاس ان سوالوں کے کوئی جواب نہ تھے۔ اس نے خاموشی سے فون آف کر دیا اور لیپ ٹاپ کی طرف توجہ مبذول کر دی۔ اسے خاموشی سے اپنا کام کرنا تھا۔

قدم آگئے، آیا، ہمدردی اور تاسف سے فاطمی کے شانے کی گرد جھاڑی، پھر اس کی ٹائی کی ٹائٹ ذرا کسی تاریدہ سلوٹ ہاتھ پھیر کے دور کی اور اسی ملال سے کہنے لگا۔

”وہ تمہارا اکلوتا بیٹا ہے اور فیڈرل کورٹ میں اس پہ ایک طویل مقدمہ چلنے والا ہے۔ اس کا مسلمان ہونا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گا۔ اب تمہیں وہاں جانا ہو گا، یہاں سے استعفیٰ دے کر، اور وہ ساری دولت جو تم نے میرے بھائی کو بیچ کر بنائی تھی، الیاس فاطمی اب تم اس کی ایک ایک پائی جوڑ کر امریکہ کے ہسٹل و کیلوں کی فہمیں بھرنے میں لگے رہو گے۔ اور اس کے بعد بھی اس کے رہا ہو جانے کی امید کم ہوگی۔ سو اب تم اپنے آفس جاؤ اور وہ کرو جو میں نے کہا تھا۔“ اس کے کان کے قریب چہرہ لے جا کر وہ دھیرے سے بولا۔

”اپنا استعفیٰ لکھو، الیاس فاطمی! مجھے تمہارا استعفیٰ چاہیے۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو، بکو اس کر رہے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔“ اس کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ وہ غصے سے اس پر غزبیا اور پھر جھانک کر نکالتا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اب وہ پریشانی سے کسی کو کال ملا رہا تھا۔ اس کی رنگت بدل رہی تھی، اور وہ بار بار بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتا تھا۔ پسینے کے ننھے قطرے اس کی پیشانی پہ بکھرے تھے اور فارس غازی سینے پہ بازو لپیٹے ملال سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ یہ منظر دیکھ کر اچھا محسوس کرے گا۔

مگر وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر پاتا تھا۔



وہ شام جب شہرہ اتری تو اس میں بارش کے بعد کی گیلی مٹی کی سوندھی سی خوشبو رچی بسی تھی۔ ایسے میں سعدی یوسف فوڈی اور آفٹر کے نیچے والے ریسٹورنٹ ایریا میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا اور سامنے لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا۔ راستے کل سے اپنی

اسامہ کے علاوہ ندرت بھی بیٹھی دکھائی دیتی تھیں۔
آبدار بھی ان کے قریب ہی موجود تھی۔ اس نے اپنی
طرف کی کرسیوں پہ نگاہ دوڑائی۔ نو شیرواں اور
جواہرات وہاں خاموش بیٹھے تھے۔

وہ بھاری قدم اٹھاتا اپنی نشست کی طرف بڑھ گیا۔
عدالتی کارروائی شروع ہونے میں چند منٹ رہتے تھے
وگلا اپنی فائلوں کو پڑھ رہے تھے، کورٹ رپورٹر
ٹائپنگ کے لیے تیار ہو رہا تھا، صحافی حضرات فون پہ
لگے ہوئے تھے۔ ایسے میں وہ تمام لوگ اس بات سے
ناواقف تھے کہ کمرہ عدالت میں موجود ایک شخص بہت
جلد اسی کمرے میں موجود ایک دوسرے شخص کا قتل
کرنے جا رہا ہے۔

(باقی آئندہ نمبر ان شاء اللہ)

اس صبح ہاشم اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ کرسی پہ بیچھے
کو ٹیک لگائے، وہ چھت کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا
تھا۔ فون پہ الیاس فاطمی کے لا تعداد پیغام اور کالز کو وہ
مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ وہ اس شخص سے
کسی قسم کا تعلق فی الحال انور ڈ نہیں کر سکتا تھا۔
”سر!“ ر میں نے اندر جھانکا۔ ہاشم چونک کر
سیدھا ہوا، پھر اسے بلایا۔

”عدالتی سماعت کا وقت ہونے والا ہے۔ لیکن اگر
آپ کے پاس چند منٹ ہوں تو۔۔۔“ وہ ایک موبائل
ہاتھ میں لیے اندر آیا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ آپ کو
میں آبدار کا موبائل چاہیے۔ ان کے ایک ملازم نے
یہ کام کر دیا ہے۔ ہو ہوا اس جیسا موبائل ری پلیس کر دیا
ہے، مگر وہ ڈیڈ ہے۔ اور یہ میں آپ کے لیے لے آیا
تھا۔ اس ریپلاس ورڈ وغیرہ نہیں لگا ہوا۔“

اس نے موبائل اوپن کی اس کے سامنے رکھا۔
ہاشم نے ہاتھ جھٹکا، اس کو واپس جانے کو کہا اور پھر
موبائل اٹھا لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسکرین
دکھان کی۔

وائس ایپ سناتے ہی تھا۔ اس نے chats
کھولیں۔ فہرست میں اوپر ایک نام جگمگا رہا تھا۔
فارس غازی۔

اس نے اٹکٹھا اس نام پہ دبایا۔ سامنے ایک طویل
گفتگو کھل گئی، جس میں پیچھے آب دار کے ان گنت
پیغام تھے جن کا اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ گفتگو
اوپر کرتا گیا۔ اس کے جڑے کی رگیں کھینچتی گئیں۔
پیشانی کی سلو میں بڑھتی گئیں۔ سانس کی رفتار تیز
ہوتی گئی۔

”قریباً“ گھنٹے بھر بعد وہ کمرہ عدالت میں داخل ہوا تو
اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کسی
خواب کی سی کیفیت میں وہ ڈگ بھرتا آگے بڑھ رہا تھا۔
استغاثہ کی کرسیوں پہ اسے ان کا سارا خاندان نظر آیا
تھا۔ آج سعدی، زمر اور فارس کے ساتھ آئین اور

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سوچ نگر کی رانی



روحانیہ جمیل

قیمت - 350 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر
32735021

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی

عمیرہ احمد

ڈاڑھی کا کام

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایرنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تازہ پیداوار کے حوالے سے کوئی سزا مل جاتا ہے۔

3۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون اور ادویات کے بغیر سو نہیں پاتی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سولا

خواتین ڈائجسٹ 248 ستمبر 2016

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM



گرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔
6۔ اسپیلنگ بی کے بائوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں واؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نیسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست بچے جتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مسماں بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔
A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بدذیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور آرمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔
7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔
4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ 249 ستمبر 2016ء

وہ خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اور وہ وہاں مقام ملتزم کے سامنے کھڑا تھا۔ کتنی بار وہ یہاں آیا تھا اور کتنی بار یہاں آکر کھڑا ہوا تھا۔ اسے اب کتنی بھی بھول چکی تھی، لیکن ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ وہاں اسی حالت میں کھڑا تھا۔ بیت کے عالم میں۔۔۔ عجز کی کیفیت میں۔۔۔ دنیا کی کوئی جگہ سالار سکندر کو مٹی نہیں کرتی تھی، صرف وہ جگہ تھی جو اسے خاک بنا دیتی تھی اور وہ "خاک" بننے ہی وہاں آتا تھا۔۔۔ ہر بار اپنی اوقات جاننے اور اس کی یاد دہانی کے لیے۔۔۔ ہر بار جب دنیا اسے کسی چوٹی پر بٹھاتی تھی تو وہ اپنے نخر اور تکبر کو دفنانے یہاں آتا تھا۔۔۔ آج بھی آیا تھا۔۔۔ بلکہ بلایا گیا تھا۔

خانہ کعبہ کا دروازہ کھولا جا رہا تھا۔۔۔ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔۔۔ اور وہ دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ان دس مسلمانوں میں شامل تھا، جنہیں خانہ کعبہ کے اندر ہونے والی صفائی کی سعادت کے لیے چنا گیا تھا۔ اور یہ اعزاز اس کے حصے کس تنگی کے عوض آیا تھا، یہ ابھی تک سمجھ میں اس کی نہیں آ رہا تھا۔ کرم اور کرم تو اس پر اللہ کا ہمیشہ رہا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نامہ اعمال میں ایسی کوئی تنگی کھوج رہا تھا جو ایسے کرم کا باعث بنتی۔

وہ شاہی خاندان کا مہمان بن کر پچھلے سالوں میں کئی بار عمرے کی سعادت حاصل کر چکا تھا۔ امامہ کے ساتھ بھی، اس کے بغیر بھی۔۔۔ مگر یہ دعوت نامہ جو وہاں سے اس بار آیا تھا۔ وہ سالار سکندر کو کسی اور ہی کیفیت میں لے گیا تھا۔ ایسا انعام اور اتنا انعام۔۔۔ ایسا کرم اور اتنا کرم۔۔۔ وہ خطا کار اور گناہ گار تھا۔ ایسا کیا کر بیٹھا تھا کہ وہ لمبے درگزر کر رہا تھا، یوں عطا کر رہا تھا، وہ تنگی جو وہم و گمان میں بھی نہ آنے والی باتیں ہوں۔

وہ لہسن دعوت نامے کو آنکھوں سے لگا کر روٹا رہا تھا۔ کیا صاف کرنا تھا اس نے وہاں جا کر۔۔۔ سب صفائی تو اس کے اپنے اندر ہوئے والی تھی اور ہوتی آرہی تھی۔

امامہ بھی وہاں تھی، ایک دوسری قطار میں ابن ہنیٰ افرادی کی فیملیز کے ساتھ۔۔۔ وہ اسے بھی ساتھ لایا تھا اور وہ اسے رشک سے لکھ رہی تھی، اس کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتی تھی۔ اس کے کھڑا ہونے سے لے کر والدہ "مہمان" اس بار اس کے لیے ایسی سعادت لانے والا تھا، اس کا اندازہ تو اسے تھا، نہیں۔ وہ اسے ہمیشہ سربراہ کرنا تھا، بغیر بجائے آجاتا تھا، جب کبھی بھی اسے وقت ملتا تھا۔۔۔ دونوں کے لیے، تین دن کے لیے۔۔۔ اس بار بڑے عرصے کے بعد اس نے امامہ کو اپنی آمد کے بارے میں پہلے سے بتایا تھا۔

"تمہارے لیے ایک سربراہ ہے۔" اس نے امامہ سے کہا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح سربراہ بوجھ گئی تھی، ایسا کبھی نہیں ہوا تھا اس نے وہ یہ سہانہ نہ بول سکتی ہوں جو سالار اس کے سامنے رکھتا تھا۔

"تم مجھے عمرے پر لے کر جاؤ گے۔" اس نے ابن ہنیٰ کے لگانے کے بعد اس سے فون پر کہا اور اس کے ہنسنے پر امامہ نے ناخمانہ انداز میں کہا۔

"مجھے بتا تھا۔"

لیکن جس سعادت کے لیے اللہ نے اسے اسے اس بار بلایا تھا، اسے اس کا اندازہ نہیں تھا، وہ اسے نہیں بوجھ سکتی تھی اور جب اس صبح اس نے بالآخر امامہ کو وہ دعوت نامہ دکھایا تھا تو وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی اور پھر وہی ہوا تھا جو ہوا تھا، وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

"تم اس لیے رو رہی ہو کہ یہ دعوت نامہ تمہارے لیے نہیں ہے؟" سالار نے اس کے ہتے آنسو روکنے کے لیے جیسے اسے چھیڑا۔

"نہیں میں صرف اس لیے رو رہی ہوں کہ۔۔۔" وہ آنسوؤں کے درمیان رکی۔ "اللہ تم سے اتنا پیار کیوں کرتا ہے۔" وہ پھر رونے لگی تھی۔ "حسد نہیں ہے، رشک ہے۔۔۔ تمہارا اعزاز ہے، لیکن مجھے لگ رہا ہے میرے سربراہ بن کر سجا ہے۔" وہ آنسوؤں کے بیچ کہتی جا رہی تھی۔

"جو بھی اعزاز ہے، تمہاری وجہ سے ہی آئے ہیں امامہ۔۔۔ پہلے بھی۔۔۔ اب بھی۔۔۔ کوئی اور زندگی کا ساتھی ہوتا تو یہ سب نہ ہوتا۔" اس نے جواباً اس سے کہا تھا۔

اور اب خانہ کعبہ کے کھلتے ہوئے دروازے سے وہ سالار سکندر کو سیڑھیوں پر چڑھ کر اندر جاتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اندر جانے والا آخری شخص تھا۔

معجزہ ہی تھا وہ زندہ تھا۔ صحت مند، تندرست، چاق و چوبند۔ اس عمر میں بھی بیس بائیس گھنٹے کام کرتے رہتے کی سکت کے ساتھ۔

ڈاکٹر کہتے تھے اس کی زندگی معجزہ تھی اور اس کی ایسی صحت مند زندگی معجزے سے آگے کی کوئی شے۔ بیالیس سال کی عمر میں اسے نیومر ہوا تھا اور وہ اب چھپن سال کا تھا۔ جو نیومر اسے ہوا تھا۔ وہ سات سے دس سال کے اندر انسان کو ختم کر دیتا تھا اور وہ چودہ سال سے زندہ تھا۔ ہر چھ مہینے کے بعد اپنی رپورٹس کو دیکھتا تھا۔ اس کے داغ میں موجود نیومر آج بھی تھا۔ اسی جگہ پر۔ اسی سائز میں۔ اور بس۔

وہ رب جو سمندروں کو باندھ دیتا تھا اور انہیں ان کی حدوں سے باہر نکلنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے سامنے وہ چند ملی میٹر کا ایک ناسور کیا شے تھا؟

موت اور اس کے بیچ زندگی نہیں دعائیں آکر کھڑی ہوئی تھیں اور سالار سکندر کو خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے بھی یہ یاد تھا کہ وہ کس کی دعاؤں کی وجہ سے وہاں آج بھی اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ وہ امامہ ہاشم کے علاوہ کسی اور کی دعائیں ہوئی نہیں سکتی تھیں جو اسے زندگی بن کر یوں لگی تھیں۔

”کتنے سال سے میں نے اپنے لیے کوئی دعا ہی نہیں کی۔ جو بھی دعا کی ہے تمہارے اور بچوں سے شروع ہو کر تم اور بچوں ختم ہو جاتی ہے۔ جب تک مجھے اپنا آپ یاد آتا ہے۔ مجھے دعا ہی بھول جاتی ہے۔“ وہ اکثر اس سے منتے ہوئے کہا کرتی تھی۔ یوں جیسے ایک ماں اور بیوی کی پوری کہانی لکھ دیتی تھی۔

”دیکھو اللہ تمہیں کہاں کہاں بلا تے ہیں کہاں کہاں دعا کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔“

یہاں آتے ہوئے امامہ نے بڑی حسرت سے اس سے کہا تھا اور اب خانہ کعبہ کے اندر کھڑے وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اسے جہاں بھی بلا تا تھا وہ اسے ہر اس جگہ پر اسے کو بھی یاد رکھنا تھا۔ جیسے اسے جانا اور جانا، وہ کہ اسے کسی بوجے والی عورت کا ساتھ دینا کتنا گناہ تھا۔

اس گھر کے اندر کی دنیا اور دنیا تھی۔ اس کائنات کا حصہ ہوتے ہوئے بھی وہاں کہڑوں نہیں آتے تھے ڈاکھوں نہیں ہزاروں نہیں۔ بس ہر صدی میں چند سو۔ اور ایک وہ صدی تھی جب وہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔ اسے وجود کے علاوہ تو اسے وہاں بیانیہ کرنے والی کوئی شے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔

”تم اندر جا کے کتنا مانگا؟ سالار؟“ اس نے خانہ کعبہ آتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”تم بتاؤ کیا مانگوں؟“ سالار نے جواباً اس سے پوچھا۔

”پتا نہیں کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔“ وہ رونے لگی۔ اور اس دعوت نامہ کو دیکھنے کے بعد بار بار یہی ہو رہا تھا وہ بار بار بات کرتے ہوئے رونے لگتی تھی۔ جیسے دل بھر آتا ہو۔ جیسے خوشی کی حد ختم ہو جاتی ہو۔

”تم سارے ستونوں کو ہاتھ لگا کر آنا۔ ساری دیواروں کو۔۔۔ ان کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی چھوا ہوگا، کسی نہ کسی کو۔۔۔ پھر تم باہر آؤ گے تو سب سے پہلے میں تمہارا ہاتھ چھوؤں گی۔“ وہ بچوں جیسے انداز میں کہہ رہی تھی۔

اور خانہ کعبہ کے اندر اس کی دیواروں، ستونوں کو آب زم زم سے دھوئے، چھوئے سالار سکندر کی سمجھ میں آ گیا تھا، امامہ ہاشم کیوں یاد آتی ہے ایسی ہر جگہ پر۔۔۔ کیوں دعا والی ہر جگہ پر سب سے پہلے اس کے لیے دعا کرنا یاد آتا تھا۔ کیوں کہ وہ عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ خالص۔ غرض کے بغیر تھا۔۔۔ قربانیوں سے گندھا تھا، یہ کیسے ممکن تھا وہاں سے جواب نہ ملتا۔۔۔ بھلا دیا جاتا۔

”تم نے اندر جا کر میرے لیے کیا مانگا؟“ اس کے باہر آنے پر امامہ نے عجیب بے تابی سے اس سے پوچھا تھا۔ وہ اب بھی اس کے پاس آیا ہی تھا اس کے دونوں ہاتھ پکڑے وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی۔

”مانگا ہے کچھ۔۔۔ پتا نہیں سکتا۔“ سالار نے جواباً عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جب پوری ہو جائے گی دعا پھر بتاؤں گا۔“ اس نے اسے جیسے اگلا سوال کرنے سے روک دیا تھا۔ ”میں جانتی ہوں کیا مانگا ہے۔۔۔ لیکن میں بھی بتاؤں گی نہیں دیکھتی ہوں قبول ہوتی ہے تمہاری دعا یا نہیں۔“ امامہ نے جواباً عجیب ہی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسفند کی موت کی اطلاع عائشہ عابدین کو دیا جبریل سکندر کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اس بچے کی ماں سے ملنے آیا تھا اور عائشہ عابدین کو دیکھتے ہی کچھ دیر کے لیے وہ گنگ ہو گیا تھا۔ کچھ ایسا ہی حال عائشہ عابدین کا تھا، وہ دونوں کئی سالوں بعد ایک دوسرے سے ملے تھے اور ملتے ہی ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے اور اب یہ شناخت جیسے ان کے حلق کا کانٹا بن گئی تھی۔

عائشہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ امریکہ کے بہترین اسپتال میں بہترین ڈاکٹر کے ہاتھوں بھی اس کے بچے کی جان جاسکتی تھی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی اسفند کی چوٹ کی نوعیت اور سنگینی کو جانتی تھی، لیکن وہ خود جس اسپتال میں کام کر رہی تھی وہاں اس نے اس سے بھی زیادہ سنگین اور پیچیدہ نوعیت کے آپریشنز کے بعد بھی مریضوں کو صحت یاب ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اس کا اپنا مینا ان خوش قسمت لوگوں میں شامل کیوں نہیں ہو سکا تھا۔ اس سوال کا جو جواب عائشہ عابدین نے دھونڈا تھا، وہ ایک لمبے عرصے تک اسے بھوت بن کر ہنسا رہا تھا۔

اس نے غم کو پہلی بار مجسم حالت میں دیکھا تھا، اس شخص کی شکل میں جو اسے اس کی متاع حیات چھین جانے کی خبر سنانے آیا تھا۔ اور یہ وہ شخص تھا جس کے سراب نے عائشہ عابدین کو اس عذاب میں ڈالا تھا جس میں وہ تھی۔ ایک ڈاکٹر کی طرح جبریل اسے بتا گیا تھا کہ آپریشن کیوں ناکام ہوا، اسفند کی حالت کیوں بگڑی... کیوں نہیں سنبھل سکی... اور ان تمام تفصیلات کو دہراتے ہوئے جبریل سکندر کے لاشعور میں ڈاکٹروں کے ہاتھ کی وہ حرکت بار بار آتی رہتی بار بار سر جھٹکنے کے باوجود... وہ ایک بت کی طرح کم صم اس کی بات سنتی رہی جیسے وہ اس کے بیٹے کے بارے میں نہیں کسی اور کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

”آپ کے ساتھ کوئی اور ہے؟“ اپنی بات کے جواب میں ایک مکمل خاموشی رکھنے کے باوجود جبریل اس سے ایک بار پھر پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے وہ اس وقت نارمل نہیں لگ رہی تھی اور اسے احساس ہوا تھا کہ اسے اس کی فیملی میں کسی اور سے بات کرنی چاہیے تھی۔ یا لگتا تو اب کر سکتا تھا تو اب کرے۔

عائشہ عابدین نے اس کی بات کے جواب میں نفی میں سر ہلا دیا۔ جبریل اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس سے اگلا سوال کیسے کرے... سوال ہونے کے باوجود... خاندان نہیں تھا تو کہاں تھا... وہ کیا سنگل پیرنٹ کے طور پر اسفند کی پرورش کر رہی تھی؟ شوہر اگر نہیں بھی تھا تو کوئی خاندان کا اور فرد تو ہوتا... اس کی ماں اور بہنیں... وہ مزید کچھ نہیں سوچ سکا... عائشہ نے ایک دم اس سے کہا تھا۔

”آپ جاملیں... میں مینج ریلوں کی سب کچھ... اس کی آواز جیسے کسی گھر سے نہیں سے آئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ ”سب کچھ“ کس تھا اور جبریل کو بھی اندازہ تھا، وہ کس طرف اشارہ کر رہی تھی۔

ایک روتی بلکتی ہوئی اس کو تسلی دینا آسان کام تھا، لیکن بظاہر ہوش و حواس میں نظر آتی ایک خاموش گم قسم ماں کو تسلی دینا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ صرف چند منٹوں کے لیے اس بچے کی فیملی سے ملنے آیا تھا اور اب یہ ساقاقت ختم کرنا اس کے لیے پہاڑ بن گیا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی مریض کو مرتے نہیں دیکھا تھا، لیکن کسی بچے کو پہلی بار مرتے دیکھا تھا۔ عائشہ عابدین سے مل کر اس کا رنج کچھ اور بڑھا تھا۔ وہ اس آپریشن کو لید نہیں کر رہا تھا، ہی وہ اسفند کی موت کا ذمہ دار تھا، اس کے باوجود یہ احساس اس کا ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھا کہ اس آپریشن میں ڈاکٹروں سے کچھ غلطی ہوئی تھی، آپریشن کے فوراً بعد ڈاکٹروں اور اس کی بات چیت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ عجیب اضطراب اور پریشانی کے عالم میں وہاں سے گئے تھے۔ سب کا اندازہ تھا وہ اس آخری آپریشن کی ناکامی سے اپ سیٹ ہوئے تھے، صرف جبریل تھا جس کا خیال تھا وہ خود بھی اپنی غلطی کا اندازہ لگا چکے تھے لیکن اب اس صورت حال کے درمیان وہ پھنسا کھڑا تھا۔ ضمیر کی چبھن اور انسانی ہمدردی... لیکن اس سے بھی بڑھ کر شناسائی کا وہ پرانا تعلق جو اس کے اور عائشہ عابدین کے درمیان نکل آیا تھا۔

”کوئی دوست ہے یہاں آپ کا؟“ جبریل اب اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ اسے ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے پہچانی ہے یا نہیں اور اسے اس صورت حال میں اپنا تعارف کروانا چاہیے یا نہیں۔

”نہیں۔“ عائشہ نے سر جھکائے اسے دیکھے بغیر کہا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے ان پر نظر میں جمائے، سر جھکائے پھٹی تھی۔ جبریل اس کے برابر ڈولی گری پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”میرا خیال ہے، ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ اپنا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابراراجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	ممتاز مفتی
نگہت عبد اللہ	سباس گل	عنیزہ سید	مستنصر حسین
رضیہ بٹ	زُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم الحق
رفعت سراج	اُمِ ہریم	نایاب جیلانی	ایم اے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہاتھ اس کی گری کے ساتھ پر رکھتے ہوئے جبریل نے اس سے کہنا تھا۔ وہ اسے رانا نہیں چاہتا تھا، لیکن اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا تھا کہ اسے اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے کی ضرورت تھی۔ سکتے کی وہ کیفیت غیر فطری تھی۔

”میں جبریل سکندر ہوں۔ نساء کا کلاس فیلو اور دوست.... اور مجھے بہت افسوس ہے کہ ہم اسفند کو نہیں بچا سکے۔“ وہ مدہم آواز میں اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ عائشہ نے گردن موڑ کر بھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت کسی کو پہچاننا نہیں چاہتی تھی، خاص طور پر ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو۔

”مجھے بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ جبریل نے اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک محسوس کی تھی، یوں جیسے اس نے برف کو ہاتھ میں لیا تھا، وہاں کا نمپر پچر بھی عائشہ عابدین کے وجود کی ٹھنڈک کو غائب کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

”پائیز مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ میری وجہ سے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آپ ڈاکٹر ہیں، کسی کو آپ کی ضرورت ہوگی۔“ اس نے رک رک کر اس سے کہا تھا۔ وہ اب اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے بیچ دبا کر بیٹھ گئی تھی۔ یوں جیسے یہ چاہتی نہ ہو کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑے، اسے تسلی دے۔ کرسی کے کونے پر بیٹھی اپنے وجود کو جوتوں کے پتھوں پر نکالے، وہ آگے پیچھے جمبول رہی تھی، یوں جیسے کسی گہری سوچ میں کسی ذہنی انتشار میں پھنسلے ہوئے شخص کو۔

وہ پہلی بار تھا کہ جبریل نے عائشہ عابدین کو غور سے دیکھا تھا۔ بے حد حیرانی کے عالم میں... سیاہ جینز اور سیاہ ہی جیکٹ، سفید بلوئس، گردن کے گرد ایک گرے رنگ کا سٹار لپٹے اس کی ہم عمر وہ لڑکی اب اس کی ہم عمر نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے گھٹنوں سے نیچے تک لہراتے سیاہ چمک دار بالوں میں جگہ جگہ سفید بال تھے۔ اس کی رنگت زرد تھی اور اس کی آنکھیں سرخ... یوں جیسے وہ عادی رونے والوں میں سے تھی یا پھر ساری ساری رات جاگنے والوں میں سے... اس کے سر پر وہ بجا بھی نہیں تھا جو سالوں پہلے اس کی پہچان تھا۔

ڈاکٹر نورین انہی کے خاندان میں وہ حجاب لینے والی تھی اور واحد لڑکی تھی اور بے حد اچھی خاندانی اقدار رکھنے کے باوجود جبریل جانتا تھا کہ نساء اور اس کے خاندان کا رجحان مذہبی کی طرف نہیں تھا۔ صرف عائشہ عابدین تھی جو مذہبی رجحان اور بے حد واضح طور پر ایسی ہی پہچان بھی رکھتی تھی اور اس کی وجہ سے اس کا پاکستان میں قیام پذیر ہونا تھا۔ جبریل کا اندازہ تھا۔ عائشہ سے اس کی بھی اتنی تفصیلی ملاقاتیں نہیں ہوئیں کہ اسے اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا۔

وہ جس عمر میں اس سے ملا تھا۔ وہ میں آج بھی اور اس عمر میں اب بات بات پر مسکرانے اور ہلش کرنے والی وہ لڑکی غنا، یہ اور ریسیمہ، جن کی لگی تھی۔ اس نے اس سے زیادہ غور اس پر نہیں کیا تھا، اس کے باوجود کہ وہ اس کے فیس بک پر موجود تھی اور کبھی کبھار اس کی تصویروں کو لائیک کرتی نظر آتی تھی، پھر وہ غائب ہو گئی تھی۔ اسے نساء سے پتا چلا تھا کہ میڈیسن کی تعلیم کے دوران ہی اس کی شادی ہو گئی تھی اور اس وقت جبریل نے مبارک باد کا میسج اس کی ڈال پر لگانا چاہا تو اسے پتا چلا کہ وہ اب اس کے کانٹہ کنسن میں تھی۔ عائشہ عابدین سے اس کا وہ پہلا تعارف جس میں اسے تک ہی رہا تھا۔ نساء اور وہ بہت جلد دو مختلف اسٹیشنس کے ہاسٹنلز میں چلے گئے تھے۔ ان کے درمیان ایک دوست اور کلاس فیلو کے طور پر موجود رشتہ بھی کچھ کمزور پڑنے لگا تھا۔ نساء اب کہیں انگیجڈ تھی اور جبریل اپنے پروفیشن میں بے حد مصروف.... اور اس بے حد تیز رفتار سے گزرنے والی زندگی میں عائشہ عابدین کسی اسپڈ بریکر کی طرح آئی تھی۔ جبریل نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنا سیل فون نکال کر اس میں سے نساء کا نمبر ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ چند لمحوں میں اسے نمبر مل گیا تھا۔

”کیا میں نساء کو فون کر کے بلاؤں؟“ اس نے عائشہ سے کہا۔

”نہیں....“ جبریل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ عجیب تھی یا ہو گئی تھی، جبریل کی سمجھ میں نہیں آیا، یا پھر یہ صدمہ تھا جس نے اسے یوں بے حال کر دیا تھا۔

جبریل کو لوگوں پر ترس آتا تھا، ہمیشہ ہی.... ہمدردی اس کی گھنٹی میں تھی، لیکن اس کے باوجود وہ ایک مصروف ڈاکٹر تھا۔ ایک ایک منٹ دیکھ کر چلنے والا.... اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے سوچا تھا.... وہ اسپتال کے متعلقہ شعبے سے کسی کو یہاں بھیجتا ہے، تاکہ وہ عائشہ عابدین کی مدد کرے اور اس کے خاندان کے راز سے راز سے رابطہ کر سکے۔ وہ اٹھنے لگا تھا جب اس نے عائشہ عابدین کی آواز سنی تھی۔

”آپ کو پتا ہے میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟“ وہ رک کر اسے دیکھنے لگا وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی، لیکن خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔

”کیونکہ میں اللہ کی نافرمان عورت ہوں، اللہ نے مجھے سزا دی ہے۔ احسن سعد ٹھیک کہتا ہے۔“

جبریل اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ عائشہ عابدین نے جیسے وہ بوجھ اتار کر اس کے سامنے پھینکنے کی کوشش کی تھی جو اس کے لیے آزار بن گیا تھا۔ احسن سعد کون تھا، جبریل نہیں جانتا تھا اور وہ اس کے بارے میں جو کہتا تھا، جبریل اس کی وجہ سے بھی ناواقف تھا۔ مگر اس کے وہ دو جملے اس دن اس کے پیروں کی زنجیر بن گئے تھے۔



گاڑی پورچ میں آکر رکی اور اندر سے امامہ بڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی تھی۔ گاڑی تب تک رک چکی تھی اور اس کی اگلی سیٹ سے ایرک اتر رہا تھا۔ پہلی نظر میں امامہ اسے پہچان نہیں سکی۔ وہ واقعی بدل گیا تھا۔ لہذا تو وہ پہلے بھی تھا، لیکن اب وہ پہلے کی طرح بست رہا پتلا نہیں رہا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں دو گلاب کی کلیوں اور چند سبز شاخوں کا ایک چھوٹا سا کبے تھا۔ ہمیشہ کی طرح... امامہ کو یاد تھا وہ بچپن میں بھی اسے اسی طرح ایک پھول اور دو پتیوں والی شاخیں اکثر دیتا تھا۔۔۔۔۔۔ جب بھی اس سے کسی خاص پورچ پر ملنے آتا تو اسے اور بعض دفعہ وہ پورا ”گلدستہ“ اس کے گھر کے لان سے ہی بنایا گیا ہوتا تھا۔

ایک اسے سلام کے بعد گلے ملنے کے لیے بے اختیار آگے بڑھا، پھر جھینپ کر خود ہی ہٹکا، شاید اسے کوئی خیال ہی نہ تھا۔ امامہ نے آگے بڑھ کر ٹھیکنے والے انداز میں اس کے گرد بازو پھیلا دیا تھا۔

”میں تمہیں پہچان ہی نہیں سکی، تم بڑے ہو گئے ہو، بہت بدل بھی گئے ہو۔“ اس نے ایرک سے کہا، وہ مسکرایا۔

”لیکن آپ نہیں بدلیں۔ آپ وہی ہی ہیں۔“

وہ ہنس پڑی تھی۔ ”سننے میں کتنا اچھا لگتا ہے کہ کچھ نہیں بدلا۔۔۔۔۔۔ حالانکہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں بھی بوڑھی ہو گئی ہوں۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”بڑھاپے کی Definition (تعریف) اب شاید بدل گئی ہوگی۔“ امامہ نے بڑھتی ہوئی سے کہا، وہ پھر ہنس پڑی۔

”یہ آپ کے لیے۔“ ایرک نے اسے وہ چھوٹا سا گلدستہ تھمایا تھا۔

”تمہاری عادتیں نہیں بدلیں۔۔۔۔۔۔ لیکن پھول بدل گیا ہے۔“ امامہ نے گلدستہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ ملک بدل گیا ہے۔“ اس نے برکت کہا۔

”ہاں یہ بھی ٹھیک، امامہ نے یہ سامان کہاں ہے تمہارا؟“ امامہ کو ایک دم خیالی آیا وہ گاڑی سے اس گلدستے اور ایک چھوٹے بیگ کے علاوہ خالی ہاتھ اتر آتا تھا۔

”ہوٹل میں۔۔۔۔۔۔ میں وہیں رہوں گا، بس آپ سے ضروری ملاقات کرنی تھی، اس لیے آیا ہوں۔“ ایرک نے اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے کہا۔

”پہلے تم ہمیشہ ہمارے پاس آیا کرتے تھے اور یہیں رہتے تھے، اب کسی اور کے پاس آئے ہو کیا؟“ امامہ کو لگا تھا وہ شاید پاکستان اپنے کسی پیشہ ورانہ کام سے آیا تھا۔

”نہیں۔ کسی اور کے پاس تو نہیں آیا لیکن بس مجھے لگا اس بار کسی ہوٹل میں رک کر بھی دیکھنا چاہیے۔“ وہ بات گول کر گیا تھا۔ وہ سچ کا وقت تھا اور اس نے سچ سچ فون پر اس سے ملاقات کے لیے بات کی تھی تو امامہ نے وہی ہر کے کھانے پر خاص اہتمام کیا تھا۔ ایرک کو جو چیزیں پسند تھیں، اس نے بنوائی تھیں اور ایرک نے اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بڑے شوق سے کھانا کھایا تھا۔

کھانے کے دوران گپ شپ میں ایرک اور اس کے درمیان ہر ایک کے بارے میں بات ہوئی تھی سوائے عنایہ کے۔ ایرک نے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور امامہ نے یہ بات فون کی تھی، سب سے حوصلہ افزا بھی یہ بات، لیکن پتا نہیں کیوں اسے غیر معمولی لگی تھی۔ اور اس کی پیمائش اس نے اسے جو شکل دیا تھا، وہ ٹھیک تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھتے ہوئے ایرک نے اپنے بیک سے ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ امامہ ابھی چائے پی رہی تھی۔ وہ بری طرح نمشکی تھی۔
 ”یہ کیا ہے؟“
 ”آپ دیکھ لیں۔“

اس نے امامہ سے کہا، پلک جھپکتے اس خوب صورت لفافے کو کھولنے سے بھی پہلے۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ ایک دم غائب ہوئی تھی۔ وہ اس ایک لمحے سے بچنا چاہ رہی تھی اور وہ پھر بھی سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ لفافے کے اندر ایک خوب صورت کاغذ پر بے حد خوب صورت طرز تحریر میں ایرک نے وہی لکھا ہوا تھا جس کا اسے خدشہ تھا۔ وہ عنایہ کے لیے اس کی طرف سے ایک رسمی پروپوزل تھا۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ اسے بہت خوش رکھے گا اور کافر کے ساتھ کہ وہ اس پروپوزل کے لیے ان کی تمام شرائط قبول کرنے پر تیار ہے۔“

امامہ کی نظرس کچھ دیر اس کاغذ پر جمی رہیں اور ایرک کی اس پر۔ پھر امامہ نے کاغذ کو اس لفافے میں واپس ڈال کر اسے میز پر رکھ دیا تھا۔ ایرک سے اب نظر ملانا اور سامنا کرنا ایک دم مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا وہ سنجیدہ تھا اور گفتگو کا آغاز اسی نے کروا دیا تھا۔

آپ نے کئی سال پہلے مجھ سے کہا تھا۔ میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں پھر آپ سے اس بارے میں بات کریں اور تب تک عین عنایہ سے بھی اس موضوع پر کبھی بات نہ کروں دیکھیں۔ میں نے آپ کی دونوں شرائط پوری کی ہیں۔“ اس نے کہا اور اس کے دونوں جملوں نے امامہ کے لیے جواب کو اور بھی مشکل کر دیا تھا۔
 ”میں جانتا ہوں سز سالار آپ کے لیے نہیں ایک بہت مشکل انتخاب ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک بُرا انتخاب ثابت نہیں ہوں گا۔“ ایرک نے بیسے اس کی مشکل بھانپتے ہوئے خود ہی اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی، بوہ اچھا لڑکا تھا۔ برا ہوتا تو اسے برا بھلا لکھنا کتنا آسان ہوتا۔ امامہ نے دل میں سوچا۔ وہ اپنی طرف سے انکار کی ہر وجہ ختم کر آیا تھا۔ مسلمان بھی ہو گیا تھا، ایک اچھے پروفیشن میں بھی تھا۔ خاندانی اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ پھر بھی اسے انکار کیا کہہ کرے۔ یہ کہہ کے کہ اسے خوف اور خدشات تھے اس کے نو مسلم ہونے کے حوالے سے۔ یہ کہہ کے کہ وہ صرف ایک بالستانی ہے عنایہ کی شادی کرنا چاہتی تھی جو اس کے اپنے کچھ سے واقف ہو۔ اس کے ذہن میں ان دنوں وقت جو بات جیسے بھاگ رہے تھے اور کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو تسلی بخش ہوتا لیکن اس کے باوجود اسے ایک جواب تو دینا ہی تھا۔
 ”تم بہت اچھے ہو ایرک۔“ امامہ نے اچھا لکھا جواب کرتے ہوئے کہا شروع کیا۔
 ”عبداللہ! اس نے امامہ کو بیچ میں نوک کر جیسے اس کی تضحیک کی۔

وہ ایک لحظہ کے لیے خاموش ہوئی پھر اس نے جیسے بڑی مشکل سے اس سے کہا۔ ”عبداللہ... تم بڑے اچھے لڑکے ہو اور میں تمہیں پسند کرتی ہوں لیکن عنایہ کے حوالے سے ابھی کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے میں نہیں جانتی۔ عنایہ تمہارے پروپوزل کے حوالے سے کیا سوچتی ہے... اس کی پسند ناپسند بے حد اہم ہے۔“

وہ جملہ ادا کرتے ہوئے بھی امامہ کو احساس ہو رہا تھا وہ ایک بے کلی بات کر رہی تھی۔ اگر بات عنایہ کی پسند ناپسند کی تھی تو پھر رشتہ پکا تھا۔ ایرک کے لیے اس کی پسندیدگی بہت واضح تھی۔
 ”میں نے عنایہ سے پہلے اس لیے بات نہیں کی کیوں کہ آپ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا میں یہ بات جب بھی کروں گا آپ سے ہی کروں گا۔“ اس نے امامہ کی بات کاٹ کر جیسے اسے یاد دہانی کرائی تھی۔

”میں سالار سے بات کروں گی، تم دو ہفتے پہلے آجاتے تو ان سے تمہاری ملاقات ہو جاتی۔ وہ یہیں تھے کچھ دن۔“ امامہ نے جواباً کہا تھا۔ فوراً ”ہاں کہہ دینے سے یہ بہتر تھا۔“

”وہ جتنا بھی ہوں گے میں ان سے ملنے جا سکتا ہوں میں جانتا ہوں وہ بڑے مصروف ہیں لیکن پھر بھی۔“ ایرک نے اس سے کہا۔ ”آپ کو تو میرے پروپوزل پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“ وہ ایک دم خوش ہوا تھا اور اس کے چہرے سے چھلکنے

والی چوٹ اور اطمینان سے جیسے امامہ کو اجناس جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔
 "میں نے تمہیں بتایا ہے عبد اللہ تم بہت اچھے ہو، لیکن میری خواہش ہے کہ عنایہ کی شادی جس سے بھی ہو وہ صرف نام کا مسلمان نہ ہو، نیک ہو، دین دار ہو، سمجھ بوجھ رکھنے کے ساتھ ساتھ دین کی تعلیمات پر عمل بھی کرتا ہو۔" امامہ نے اس سے کہنا شروع کیا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ وہ اس کی بات بے حد غور سے سن رہا تھا۔

"مرد کو دین کا پیمانہ ہو تو عورت کے لیے بہت مسئلہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک پوری نسل کی تربیت کی بات ہوتی ہے۔ ہم لوگ لبرل مسلمان ہیں لیکن بے دین اور بے عمل نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے ہونا چاہتے ہیں، نہ اپنی اگلی نسلوں کے لیے یہ چاہتے ہیں۔ مجھے نہیں پتا تم کتنے با عمل ہو اور اسلام کے بارے میں تمہارے نظریات کتنے واضح ہیں لیکن عنایہ بہت مذہبی ہے... میں نہیں چاہتی اس کی شادی ایسی جگہ ہو جہاں میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی وجہ مذہبی اعتقادات اور ان پر عمل کا ہونا یا نہ ہونا ہو۔" وہ کہتی جا رہی تھی۔

"تمہیں شاید پتا نہ ہو لیکن میں بھی نو مسلم تھی۔ اپنے مذہب کو ترک کر کے اسلام کی صحیح تعلیمات اختیار کی تھیں میں نے... فیملی گھر سب چھوڑا تھا... بڑے مسائل کا سامنا کیا تھا... یہ آسان نہیں تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ رکی اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ منہ ہی یوں جیسے اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی ہو۔

"یہ آسان کام نہیں تھا۔" اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "لیکن سالار نے بہت آسان کر دیا میرے لیے... وہ با عمل مسلمان ہے اور میں اپنی بیٹی کے لیے اس کے باپ جیسا مسلمان ہی چاہتی ہوں، زندگی میں اتنی تکلیفیں برداشت کر کے اتنی اپنی جدوجہد کے بعد میں اپنی اگلی نسل کو پھر سے بے دین اور بے عمل دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم مسلمان تو ہو لیکن شاید اسلام کی تعلیمات میں اتنی دلچسپی نہ ہو کیوں کہ تمہارے مسلمان ہونے کی وجہ ایک لڑکی سے شادی ہے۔ شادی ہو جائے گی تمہاری دلچسپی دین میں ختم ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ بعد شاید تمہیں یہ بھی یاد رہے کہ تم مسلمان ہو۔ حرام اور حلال کے درمیان جو دیوار ہم اٹھا کر رکھتے ہیں۔ تمہارے لیے وہ اٹھانا ضروری ہے نہ ہو۔ محبت بہت دیر چلے والی شے نہیں ہے۔ اگر وہ انسانوں کے سچے عادات، اعتقادات اور خیالات کی خلیج ہو تو۔"

امامہ نے اس کی گفتگو کے درمیان اسے ایک بار بھی نہیں ٹوکا تھا۔ وہ صرف خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔
 "تم کسی ویسٹرن لڑکی سے شادی کر لو تو تمہاری بہت اچھی نبھے گی۔" وہ اب اسے جیسے مشورہ دیتے ہوئے راستہ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ شکر ادا کیا۔

"کوئی اچھی مسلمان لڑکی جو وہیں سے ہو۔"
 "وہ جو بھی ہوگی، آپ کی بیٹی تو نہیں ہوگی مسز سالار۔" اس بار اس نے اس کی گفتگو کے دوران پہلی بار امامہ کو ٹوکا، امامہ خاموش ہو گئی۔

"آپ نے اچھا کیا یہ سب کچھ کما مجھ سے... جو بھی آپ کے خدشات ہیں، میں اب انہیں دیکھ سکتا ہوں اور آپ کو وضاحت بھی دے سکتا ہوں۔ نو سال ہو گئے ہیں مجھے عبد اللہ بنے... لیکن مجھے لگتا ہے مسلمان میں بہت پہلے سے تھا تب سے جب آپ لوگوں کے خاندان سے ملنا شروع ہوا تھا... وہ بہت سوچ سوچ کر ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔"

"میں بہت زیادہ با عمل اور با کردار مسلمان نہیں ہوں۔ آپ کے بیٹوں جیسا تو بالکل بھی نہیں ہوں لیکن اپنے آس پاس نظر آنے والے بہت سے مسلمانوں سے بہتر ہوں۔ نو سال میں میں نے اپنے دین کے حوالے سے صرف حرام اور حلال ہی کو نہیں سمجھا اور بھی بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے پتا ہے آپ ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتی تھیں۔"

پھر آپ تائب ہو کر مسلمان ہو میں... مجھ سے یہ مت پوچھیں گا کہ یہ مجھے کس نے بتایا لیکن میں یہ جانتا ہوں اور اس لیے آپ سے یہ تو نہ رکھتا ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ ہمدردی رکھیں گی۔ آپ کی طرح میں بھی اپنی اگلی نسل کو اچھا انسان اور مسلمان دیکھنا چاہتا ہوں... صرف مسلمان نہیں اس لیے آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں... ایک اچھی دین دار عورت ہی ایک اچھے گھر کی بنیاد رکھتی ہے... یہ بھی دین نے ہی بتایا ہے مجھے۔"

امامہ اس کی باتیں سن رہی تھی، عبد اللہ اس کے انکار کو بہت مشکل کرنا چاہتا تھا۔ وہ جو بھی اس سے کہتا رہا تھا، وہ رنگی

"مجھے عنایہ بہت اچھی لگتی ہے، محبت کرتا ہوں اس سے لیکن شادی کا فیصلہ صرف محبت کی وجہ سے نہیں کیا نہ ہی مذہب کی تبدیلی محبت کا نتیجہ ہے۔۔۔ میری زندگی میں آپ اور آپ کی فیملی کا ایک بہت پازٹورول رہا ہے۔۔۔ میں آپ لوگوں کے مذہب سے بعد میں متاثر ہوا تھا، آپ لوگوں کی انسانیت اور مہربانی سے پہلے متاثر ہوا تھا۔۔۔ اور میری زندگی کے ایک بہت مشکل فیئر میں مجھے آپ لوگوں کا حسن سلوک یاد ہے، ایک ایک چیز آپ کہیں تو میں دہرا سکتا ہوں میں اس مذہب کے حصار میں آ گیا تھا جو ایسے خوب صورت انسان بنانے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا تھا میں اس وقت بہت چھوٹا تھا، آپ لوگوں کے لیے جو محسوس کرتا تھا اسے آپ لوگوں کو بتا نہیں سکتا تھا۔ اب اتنے سالوں بعد مجھے موقع ملا ہے تو میں بتا رہا ہوں۔"

وہ رکھا۔۔۔ سر تھکائے بہت دیر خاموش رہا۔

"آپ لوگ میری زندگی میں نہ آتے تو میں ایک بہت برا انسان بنتا۔۔۔ پاپا کی موت کے بعد میں ویسے ہی تھا جیسے سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔۔۔ ڈوب جاتی تو ڈوب جاتی۔۔۔ میں اس وقت بہت دعا کیا کرتا تھا کہ مسٹر سکندر کو کچھ نہ ہو، ان کا ٹرینمنٹ صحیح ہو جائے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا آپ کے گھر میں وہ تکلیف آئے جس سے میں اور میری فیملی گزر رہی تھی۔۔۔" وہ جپ ہو گیا۔ امامہ بھی بول نہیں سکی۔۔۔ پانی دونوں کی آنکھوں میں تھا اور درود بھی۔۔۔ اور دونوں اپنے دونوں چیزیں چھپانے کی کوشش میں تھے۔

"میں پاکستان صرف آپ سے بات کرنے اور یہ سب بتانے کے لیے آیا ہوں۔ کہ آپ نے اپنی بیٹی کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔ وہ بہت عزت اور حیا والی ہے اور میں نے اپنے اختہ سالوں میں اس کے لیے محبت کا جذبہ رکھنے کے باوجود ان حدود کا احترام کیا ہے جو آپ نے اس کے لیے طے کی ہیں اور جسے اس نے بھی نہیں توڑا۔ میں آپ کی بیٹی کو اتنی ہی عزت اور احترام کے ساتھ اپنی زندگی اور گھر کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔"

عبداللہ نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر اس لفافے کے اوپر رکھ دی جو اس نے میز پر رکھا تھا۔ اس خوب صورت لفافے کے اوپر ایک خوب صورت سرخ ڈبیا میں عنایہ سکندر کا فہیپ تھا جو اتنا ہی خوب صورت تھا۔ تم آنکھوں کے ساتھ امامہ اس لفافے سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ اس کی مرضی سے کبھی کبھی نہیں ہوتا تھا، لیکن جو بھی ہوتا تھا وہ بہترین ہوتا تھا۔

ڈاکٹر کا کام

"رنگ خوب صورت ہے پر اتنی ہے۔۔۔ حمین نے ڈنر ٹیبل پر بیٹھے، فٹ اور چپس کھاتے ہوئے ڈبیا کو ریمسہ کی طرف سرکایا، جو سارا کا ایک پیالہ کھاتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔ کھلی ہوئی ڈبیا کو منہ کرتے ہوئے اس نے اسی ہاتھ سے اپنے گلاسز ٹھیک کیے اور بڑے تحمل سے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ فٹ اور چپس تقریباً ڈنگل رہا تھا اور ساتھ ہی وی لاؤنج میں ٹی وی کی رگبی کا ایک میچ دیکھ رہا تھا۔ ریمسہ ویک اینڈ گزارنے وہاں آئی تھی، امریکہ واپس آنے کے بعد اور اگلے دن عنایہ بھی وہاں پہنچ رہی تھی اور اس وقت ایک ناسٹ فوڈ سے ہوم ڈیلیوری سروس کے ذریعے منگایا گیا۔ کھانا کھانے میں ممبرز تھے جب ریمسہ نے وہ انگوٹھی اسے دکھائی تھی۔

"تم نے کسی کو دی ہے یا تمہیں کسی نے دی ہے؟" حمین نے میچ دیکھتے دیکھتے چلی سانس کی بوتل تقریباً اپنی۔۔۔ پلیٹ میں خالی کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہشام نے دی ہے۔" ریمسہ نے کسی تمہید کے بغیر مدہم آواز میں بے حد شجیدگی سے کہا۔ اس بار حمین نے اسکرین سے نظریں ہٹائی تھیں۔

"جب وہ واپس آئے گا تو میں اسے واپس کر دوں گی۔" اس نے ایک لمحہ کے توقف کے بعد اسی سانس میں کہا۔
"رطلب؟" حمین اب شجیدہ ہو گیا تھا۔

”اس نے مجھے پروپوز کیا ہے لیکن میں نے اس کا پروپوزل قبول نہیں کیا۔ میں چاہتی ہوں پہلے دونوں فیملیز آپس میں بات کر لیں۔“ رئیسہ نے اسے مختصراً بتایا۔

”لیکن ہشام تو ابھی اپنی فیملی کے ساتھ بحرین میں ہو گا۔ اس کی فیملی کیا وہاں سے آکر بات کرے گی؟“ حمین نے جواباً اس سے پوچھا۔ وہ دونوں ہشام اور اس کی فیملی کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔

تین دن پہلے بحرین میں ہونے والے رائل فیملی کے اس فضائی حادثے میں وہاں کے حکمران اور اس کی فیملی کے چھ افراد کی ہلاکت ہوئی تھی۔ بحرین کا حکمران ہشام کا تایا تھا اور اس حادثے کی اطلاع ملنے کے فوری بعد ہشام اپنی فیملی کے ساتھ بحرین چلا گیا تھا۔ رئیسہ بھی اس کے ساتھ ہی امریکہ واپس آئی تھی۔

”ہشام تو آجائے گا گلے ہفتے لیکن اس کی فیملی ابھی رہے گی وہاں۔“ رئیسہ نے اس سے کہا۔

”تو پھر کیا ہو گا؟“ حمین نے دوبارہ چہس کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔

”اسی لیے تو تم سے بات کر رہی ہوں تم بتاؤ۔“ رئیسہ نے اسے جواباً کہا۔

”مئی کریں گی صاف صاف دو ٹوک انکار۔“ چلی ساس میں مچھلی کا ٹکڑا ڈبوتے ہوئے حمین نے جیسے مستقبل کا نقشہ دو جملوں میں اس کے سامنے کھینچا۔

”یہاں مجھے پتا ہے۔“ رئیسہ نے گہرا سانس لیا۔

”تمہیں پسند تو نہیں ہے نا؟“ حمین نے اس سے اس طرح سرسری سے انداز میں پوچھا جیسے یہ کوئی عام ہی بات تھی۔

”جیسے“ اس نے نیک لفظی جواب دیا اور ایک پورا زیتون اٹھا کر نگلا۔

”نو بیڈ“ (بست برا) حمین نے جیسے افسوس کرنے والے انداز میں کہا۔

”عناویہ اور عبداللہ کا پتا ہے تمہیں اس کے باوجود تم سے...“

رئیسہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”ہشام پیدائشی مسلمان ہے۔“

”لیکن بحرین جیسے بلکہ خراب ہے۔“ حمین نے اسے بات کھل کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

”وہی تو وہ امریکی ہے۔“ رئیسہ نے جیسے مدافعانہ انداز میں کہا۔

”امریکی تو مئی کو ویسے ہی زہر لگتے ہیں۔“ حمین نے بے حد اطمینان سے تصور کا ایک اور تار دیکھ پہلو اسے دکھایا۔

”اسی لیے تو تم سے بات کر رہی ہوں۔“ رئیسہ نے ہنلا دیکھا نا بند کر دیا۔

”تم ایک بات بتاؤ“ رئیسہ نے پوچھا۔ ”کیسے وہ صرف پسند ہے یا محبت وغیرہ ہے؟“ رئیسہ نے اسے جواباً گھورا۔

”صرف جنرل نانج کے لیے پوچھ رہا ہوں۔“ حمین نے مدافعانہ انداز میں بے اختیار کہا۔

”یہ جنرل نانج کا سوال میں ہے۔“ رئیسہ نے ہنسنے والے انداز میں کہا۔

”کامن سینس کا ہو گا پھر... وہ تو میری ویسے ہی خراب ہے۔“ پلیٹ صاف کرتے ہوئے حمین نے بے حد اطمینان سے کہا۔

”تم کچھ کہتے ہو یا نہیں؟“ رئیسہ نے اس کو اگلا جملہ بولنے سے پہلے کہا۔

”میں صرف کوشش کر سکتا ہوں لیکن اس کا فائدہ نہیں... لیکن سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ تم میری ملاقات ہشام سے کراؤ... میں دیکھنا چاہتا ہوں تمہارے حوالے سے وہ دراصل کتنا سیریس ہے۔“

”وہ میں کراؤں گی وہ مسئلہ نہیں ہے۔“ رئیسہ نے کچھ مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

”اور اگر مئی بابا نہیں مانتے پھر...؟“ حمین نے نیک دم اس سے کہا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے کہا۔

”مجھے وہ اچھا لگتا ہے لیکن ایسی جذباتی وابستگی نہیں ہے کہ میں اسے چھوڑ نہ سکوں۔“

”اتجھے کی امید رکھنی چاہیے لیکن بدترین کے لیے تیار رہنا چاہیے... بابا کو اعتراض نہیں ہو گا، لیکن مئی کا میں کہہ

نہیں سکتا، کوشش کروں گا... لیکن ہشام نے اپنی فیملی سے بات کی ہے تمہیں پروپوز کرنے سے پہلے؟ کیوں کہ اگر اس کی فیملی کو کوئی اعتراض ہو تو مئی بابا میں سے کوئی بھی اس پروپوزل پر غور نہیں کرے گا۔“ حمین کو بات کرتے کرتے خیال

”اپنی فیملی سے بات کر کے ہی اس نے مجھ سے بات کی ہے، اس کی فیملی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ رئیسہ نے اسے جیسے یقین دہانی کرائی۔

حمین اس کی بات سنتے ہوئے اپنے میز پر دھرے فون کی اسکرین پر کچھ دیکھ رہا تھا اور اپنی انگلی سے اسکرین کو اسکرول کر رہا تھا، رئیسہ کو لگا اس نے اس کی بات غور سے نہیں سنی۔

”تم میری بات سن رہے ہو؟“ رئیسہ نے جیسے اسے متوجہ کیا۔

”ہاں... میں ہشام کو سرچ کر رہا ہوں۔“ اس نے جواباً کہا۔

”کیا؟“ رئیسہ چونکی۔

”ہشام کو اور اس کی فیملی کو پتا ہے کہ تم ایڈاپٹڈ ہو؟“ حمین اسی طرح اسکرین اسکرول کر رہا تھا۔

”ہشام کو پتا ہے تو ظاہر ہے اس کی فیملی کو بھی پتا ہو گا۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے کھٹکی اور پھر بولی۔

”اوہ....“ حمین اپنے فون کی اسکرین پر کچھ پڑھتے پڑھتے بے اختیار چونکا تھا۔

”کیا ہوا؟“ رئیسہ چونکی۔

”تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے اور شاید بری بھی۔“ حمین نے ایک گہرا سانس لے کر سر اٹھایا اور اسے دیکھا اور پھر اپنا فون اس کے سامنے رکھ دیا۔



وہ شخص دیوار پر لگی رئیسہ کی تصویر کے سامنے پچھلے پیدرہ منٹ کے کھڑا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر، پاندھے اس

لڑکی کا چہرہ دیکھتے ہوئے... چہرے میں کوئی شبہت تلاش کرتے ہوئے... سالار سکندر کے شجرہ میں دبے آتش فشاں کی

شروعات ڈھونڈتے ہوئے... اگر وہ اس شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا تو اسی ایک جگہ سے بنا سکتا تھا۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے پیچھے

بربزا بھی رہا تھا... خود کلامی... ایک اسکیڈل کا تانا بانا تیار کرنے کے لیے ایک کے بعد ایک مکرو فریب کا جال... وجوہات...

تعلق کو چھپانے... وہ ایک گہرا سانس لے کر اپنے عقب میں بیٹھے لوگوں کو کچھ ہدایات دینے کے لیے مڑا تھا۔

سی آئی اے ہیڈ آفس کے اس کمرے کی دیواروں پر لگے بورڈز چھوٹے بڑے نوٹس، چارٹس، فونو گرافس اور ایڈریسز

کی چٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔

کمرے میں موجود چند آدمیوں میں سے تین اس وقت بھی کمپیوٹر پر مختلف ڈیٹا کھنگالنے میں مصروف تھے، یہ کام وہ پچھلے

ڈیڑھ ماہ سے کر رہے تھے۔ اس کمرے میں جگہ جگہ بڑے بڑے کھلے پڑے تھے جو مختلف فائلز، ٹیپس، میگزینز اور

نیوز پیپرز کے تراشوں اور دوسرے ریکارڈز سے بھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں موجود ریکارڈ کیبنس سے ہی بھری ہوئی

تھیں، کمرے میں موجود تمام ڈیٹا ان کمپیوٹرز کی ہارڈ ڈسکس میں بھی محفوظ تھا۔

کمرے میں موجود دو آدمی پہلے ڈیڑھ ماہ سالار سکندر کے بارے میں آن لائن آنے والا تمام ریکارڈ اور معلومات اکٹھی

کرتے رہے تھے۔ کمرے میں موجود تیسرا شخص سالار اور اس کی فیملی کے ہر فرد کے ای میلز کا ریکارڈ کھنگالتا رہا تھا۔ چوتھا

شخص اس کی فیملی اور مالی معلومات کو چیک کر رہا تھا۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ ان تصویروں اور شجرہ نسب کی صورت

میں ان بورڈز پر موجود تھا۔

وہ چار افراد عوا کر سکتے تھے کہ سالار اور اس کی فیملی کی پوری زندگی کا ریکارڈ اگر خدا کے پاس موجود تھا تو اس کی ایک کاپی

اس کمرے میں بھی تھی۔ سالار کی زندگی کے بارے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ان کے علم میں نہیں تھی یا جس کے

بارے میں وہ ثبوت نہیں دے سکتے تھے۔

سی آئی اے کے اسٹنگ آپریشنز سے لے کر اس کی ٹین ایج کی گرل فرینڈز تک اور اس کے مالی معاملات سے لے کر اس کی

اولاد کی پرسل اور پرائیویٹ لائف تک ان کے پاس ہر چیز کی تفصیلات تھیں۔

لیکن سارا مسئلہ یہ تھا کہ ڈیڑھ دو ماہ کی اس محنت اور پوری دنیا سے اکٹھے کیے ہوئے اس ڈیٹا میں سے وہ ایسی کوئی چیز

نہیں نکال سکے تھے جس سے وہ اس کی گزارش کر سکتے۔ وہ نیم جو پندرہ سال سے اس طرح کے مقاصد پر کام کرتی رہی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی سرتوڑ محنت کے باوجود اس شخص اور اس کے گھرانے کے کسی شخص کے جوابے سے کسی قسم کا اسکینڈل ڈھونڈ نہیں پائی تھی۔ دو سو پوائنٹس کی جو چیک لسٹ انہیں دی گئی تھی وہ دو سو کراسز سے بھری ہوئی تھی اور یہ لڑکی کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ انہوں نے ایسا صاف ریکارڈ کسی کا نہیں دیکھا تھا۔

کسی حد تک ستائش کے جذبات رکھنے کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کر رہے تھے۔ ایک آخری کوشش... کمرے کے ایک بورڈ سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے بورڈ تک جاتے جاتے وہ آدمی سالار کے فیملی ٹری کی اس تصویر پر رکا تھا۔ اس تصویر کے آگے کچھ اور تصویریں تھیں اور ان کے ساتھ کچھ بلٹ پوائنٹس... ایک دم جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے اس لڑکی کی تصویر کے نیچے اس کی تاریخ پیدائش دیکھی پھر مرکز کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ سال بتاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو اس سال ان ڈیٹس پر یہ کہاں تھا؟“

کمپیوٹر پر بیٹھے ہوئے آدمی نے چند منٹوں کے بعد مسکریں پر نمودار ہونے والی تحریر پڑھتے ہوئے کہا۔
”پاکستان!“

سوال کرنے والے آدمی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آئی تھی۔

”کب تک؟“

اس آدمی نے اگلا سوال کیا، کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے کی بورڈ پر انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے مسکریں پر دیکھتے ہوئے اسے تاریخیں بتائیں۔

”آخر کار انہیں کچھ مل ہی گیا۔ اس آدمی نے بے اختیار ایک سہی بجا گئے ہوئے کہا تھا۔ انہیں جہاز ڈوبنے کے لیے بازیڈول گیا تھا۔“

یہ پندرہ منٹ پہلے کی روداد تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ اب جانتا تھا کہ اسے اس آئٹس نشان کا منہ کھولنے کے لیے کہا کرنا



اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو انہیوں کی طرح پھینک کر کھولا، ایک بار... دوبارہ... تین بار... پھر اپنی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے مسلا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، اپنی لمبی ٹانگوں کو اسٹڈی چیر کے نیچے رکھے فٹ ہولڈر پر سیدھا کرتے ہوئے وہ جیسے کام کرنے کے لیے ایک بار پھر تازہ دم ہو گیا تھا... پچھلے چار گھنٹے سے مسلسل اس لیپ ٹاپ پر کام کرتے رہنے کے باوجود جو اس وقت بھی اس کے سامنے لکھا ہوا تھا اور جس پر چمکتی گھڑی اس وقت سوئٹزرلینڈ میں رات کے ڈھائی بج جانے کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ ڈیوس میں ورلڈ اکنامک فورم کا انکی نوٹ سپیکر تھا جس کی تقریر کل دنیا کے ہر بڑے چینل اور اخبار کی شہ سرخی بننے والی تھی تین بج کر چالیس منٹ پر اس نے بالآخر اپنا کام ختم کیا۔ لیپ ٹاپ کو بند کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ موسم سرا تھا اور ڈیوس میں سورج طلوع ہونے میں ابھی وقت تھا... اتنا وقت کہ وہ چند گھنٹے کے لیے سو جاتا... اور چند گھنٹوں کی نیند اس کے لیے کافی بھی نماز کے لیے دوبارہ جاگنے سے پہلے...

وہ اس کی زندگی کا معمول تھا اور اتنے سالوں سے تھا کہ اسے معمول سے زیادہ عادت لگنے لگا تھا۔ صوفے کے سامنے موڈرین سنٹر نیبل پر سوئٹزرلینڈ اور امریکہ کے کچھ بین الاقوامی جریدوں کی کاپیز پڑھی تھیں اور ان میں سے ایک کے سرورق پر حمین سکندر کی تصویر تھی۔

”بنگ گلوبل لیڈرز 500 کی فہرست میں پہلے نمبر پر ارجنٹ اپنی مخصوص شرارتی مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کمرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے۔“

ایک لمحے کے لیے سالار کو ایسا لگا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا... اسی اعتماد، ذہنی اور وقار کے ساتھ جو اس کا خاصہ تھا۔

سالار سکندر کے ہونٹوں پر ہلکے سا بیکٹریا لہرائی ڈالیں۔ جسکے کپڑے میگنیزیم اٹھایا تھا۔ وہ دروازہ اکٹامک فورم میں پہلی بار آ رہا تھا۔ اور دنیا کے اس موثر فورم کا جیسے نیا پوسٹروا بنے تھا۔ زبان پر اکوئی میگنیزیم ایسا نہیں تھا جس میں اس نے حمین سکندر یا اس کی کمپنی کے حوالے سے کچھ نہ پڑھا ہو۔

“Devilishly ‘ Handsome ‘ Dangerously ‘ Meticulous”

سالار سکندر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ وہ ہیڈ لائن حمین سکندر کے بارے میں تھی جس سے اس کی ملاقات کل اسی فورم میں ہونے والی تھی، جہاں اس کا بیٹا بھی خطاب کرنے والا تھا۔ اس نے اس میگنیزیم کو دوبارہ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

اس کے بیڈ سائڈ ٹیبل پر پرائیویٹ فون کھٹکا، بستر پر بیٹھتے ہوئے سالار نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ واقعی شیطان تھا، خیال آنے پر بھی سامنے آجاتا تھا۔۔۔

”جاگ رہے ہیں۔۔۔ وہ حمین سکندر کا نیکسٹ تھا، اسے باپ کی روٹین کا پتا تھا۔ وہ خود بھی بے خوابی کا شکار تھا۔“

”یس! سالار نے جوایا“ نیکسٹ کیا۔

”بڑی اچھی فلم آرہی تھی، سوچا آپ کو بتا دوں۔“ جواب آیا۔

سالار کو اس سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی۔

دو سرائیکسٹ آیا جس میں اس چینل کا نمبر بھی تھا جس پر وہ مودی آرہی تھی اس کی کاسٹ کے ناموں کے ساتھ جس میں چار ٹی وی چینل کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ وہ باپ کو تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مطلع کرنے کا شکر ہے۔

سالار نے ڈیر لب مسکراہٹ کے ساتھ اس کے نیکسٹ کا جواب دیا۔ اس کی بات کا جواب نہ دینا اس سے زیادہ بہتر تھا۔

”ابنیں شہید کی شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

انکا جملہ بے سرو پا تھا۔ سالار سکندر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ دروازہ اکٹامک فورم کا ٹیک سٹار سپیکر تھا جو اپنی تقریر سے ایک رات پہلے باپ سے رات کے اس وقت اس طرح کی بے تکی باتیں کر رہا تھا۔

”واہ! کیا بات ہے اتنی TAI میں چلاؤ۔“ اس نے اسے جوابی ٹیکسٹ کیا اور پھر گڈ نائٹ کامیسیج.... کھٹاک سے ایک مسکراہٹ اس کی آنکھوں پر ابھری تھی.... رات نکالتے ہوئے۔

”آئی ایم سیریس....“ سالار فون رکھ دینا چاہتا تھا لیکن پھر رک گیا۔

”آپشن چاہیے یا آپریشن؟“ اس نے اس بارے میں حد تک سنجیدگی سے اسے ٹیکسٹ کیا۔

”مشورہ۔“ جواب اپنی بیخبر فٹاری سے آیا۔

”ٹی وی بند کر کے سو جاؤ۔“ اس نے جواباً اسے ٹیکسٹ کیا۔

”بابا! میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ رئیسہ اور عنایہ کی شادی سے پہلے میرا شادی کرنا مناسب نہیں، خاص طور پر جب جبریل کی شادی کافی الحال کوئی امکان نہیں۔“

وہ اس کے اس جملے پر اب کھٹکا تھا.... اس کی باتیں اتنی بے سرو پا نہیں تھیں جتنا وہ انہیں سمجھ رہا تھا۔ رات کے اس پیر: فلم سے اپنی شادی اور اپنی شادی سے عنایہ اور رئیسہ کی شادی کا ذکر لے کر بیٹا تھا تو کوئی مسئلہ تھا... اور مسئلہ کیا تھا یہ سالار کو ڈھونڈنا تھا۔

”تو؟“ اس نے اگلے نیکسٹ میں جیسے کچھ اور اگلوانے کے لیے دانہ ڈالا۔ جواب خاص در بعد آیا.... یعنی وہ اب سوچ سوچ کر نیکسٹ کر رہا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا جیسے شطرنج کی ایک بساط بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔

”تو بس پھر ہمیں عنایہ اور رئیسہ کے حوالے سے کچھ سوچنا چاہیے۔“ جواب سوچ سمجھ کر آیا تھا، لیکن مبہم تھا۔

”رئیسہ کے بارے میں یا عنایہ کے بارے میں؟“ سالار نے بڑے کھلے الفاظ میں اس سے پوچھا۔ حمین کو شاید باپ نے اس بے دھڑک سوال کی توقع نہیں تھی، وہ اتنا بے خبر نہیں تھا جس کو وہ پوچھا پوچھا لیتا تھا، وہ سالار سکندر تھا جو اس کی طرح

لحوں میں بات کی سہ تک پہنچ جاتا تھا۔
 ”رہیسہ کے بارے میں۔“ بالآخر ایسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کھانا پڑا، سالار کے لیے جواب غیر متوقع نہیں تھا۔ لیکن حیران وہ اس کی ٹائمنگ پر ہوا تھا۔

”تم خود رہیسہ کے لیے بات کر رہے ہو یا رہیسہ نے تمہیں بات کرنے کے لیے کہا ہے؟“ سالار کا اگلا ٹیکسٹ پہلے سے بھی ڈائریکٹ تھا۔ حمین کا جواب اور بھی دیر سے آیا۔
 ”میں خود کر رہا ہوں۔“ سالار کو اس کے جواب پر یقین نہیں آیا۔

”رہیسہ کہیں انوالوؤ ہے؟“ اس نے اگلا ٹیکسٹ کیا۔۔۔۔۔ جواب ایک بار پھر دیر سے آیا اور یک دم سالار کو احساس ہوا کہ یہ بات چیت دو افراد کے درمیان نہیں ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ تین لوگوں کے درمیان ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ حمین اور رہیسہ۔۔۔۔۔ وہ تاخیر جو حمین کی طرف سے جواب آنے پر ہو رہی تھی، وہ اس لیے ہو رہی تھی۔ کیوں کہ وہ سالار کے ساتھ ہونے والے سوال جواب رہیسہ کو بھی بھیج رہا تھا اور پھر اس کی طرف سے آنے والے جوابات اسے فارورڈ کر رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی بچپن کی عادت تھی، ایک دوسرے کے لیے ترجمان کا رول ادا کرنا۔ اور زیادہ تر یہ رول رہیسہ ہی اس کے لیے کیا کرتی تھی۔

”کوئی اسے پسند کرتا ہے۔“ جواب دیر سے آیا تھا لیکن اس کے ڈائریکٹ سوال کے جواب میں بے حد ڈیپلوئیٹک انداز میں دیا گیا تھا اور یہ حمین کا انداز نہیں تھا۔ یہ رہیسہ کا انداز تھا۔

”کون پسند کرتا ہے۔۔۔۔۔؟ شام؟“ سالار نے جواباً ”بے حد اطمینان سے ٹیکسٹ کیا۔ اسے یقین تھا اس کے اس جوابی سوال کے دونوں بہن بھائی کے پیروں تلے سے کچھ لحوں کے لیے زمین نکالی ہوگی۔ ان کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ سالار اتنا ”باخبر“ ہو سکتا ہے۔

حسب توقع ایک لمبے وقفے کے بعد ایک پورا منٹ کھولے، ہنستی ہوئی اس کا مل آئی تھی۔
 ”گڈ شائ، یہ حمین کا جواب تھا۔“

”رہیسہ کھو آرام سے سو جائے۔۔۔۔۔ شام کے بارے میں آئے سمانے بیٹھ کر بات ہوگی۔۔۔۔۔ میں اس وقت آرام کرنا چاہتا ہوں اور تم دونوں اب مجھے مزید کوئی ٹیکسٹ نہیں کرو گے۔“ سالار نے ایک وائس میسج حمین کو بھیجے ہوئے ٹون بڑھ دیا۔ وہ جانتا تھا اس کے بعد وہ واقعی بھوتوں کی طرح غائب ہو جائیں گے۔ خاص طور پر رہیسہ۔



جبریل نیند سے فون کی آواز پر بڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اسے پہلا خیال ہاسپنل کا آیا تھا لیکن اس کے باہر آنے والی وہ کال ہاسپنل سے نہیں آئی تھی۔ اس پر نسا کا نام چمک رہا تھا۔ وہ غیر متوجہ تھی۔ ایک ہفتے پہلے اسفند کی ٹڈیل کے دوران اس کی ملاقات نسا سے ایک لمبے عرصے کے بعد ہوئی تھی اور اس کے بعد اس طرح رات کے اس وقت آنے والی کال۔۔۔۔۔ کال ریسیو کرتے ہوئے دوسری طرف سے اس نے جبریل سے معذرت کی تھی کہ وہ رات کے اس وقت اسے ڈسٹرب کر رہی تھی اور پھر بے حد اضطراب کے عالم میں اس نے جبریل سے کہا تھا۔

”تم عائشہ کے لیے کچھ کر سکتے ہو؟“

جبریل کچھ حیران ہوا۔ ”عائشہ کے لیے کیا؟“

”وہ پولیس کسٹنڈر میں ہے۔“

”واٹ؟“ وہ ہکا بکارہ گیا ”کیوں؟“

”قتل کے کیس میں۔“ وہ دوسری طرف سے کہہ رہی تھی۔

جبریل سکتے میں رہ گیا۔ ”کس کا قتل؟“ وہ اب رونے لگی تھی۔

”اسفند کا۔“ جبریل کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

وہ بچنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے، چیمے سے اپنے باپ کو کھلا رہا تھا، اس کا باپ لقمے کو چبانے اور ننگے میں تقریباً دو منٹ لے رہا تھا۔ وہ ہر بار صرف اتنی ہی بچنی پیالے میں ڈالتا جس میں ایک کھڑا، وہ جاتا پھر چمچ سے اس

نکلے۔ کو باپ کے منہ میں ڈالنے کے بعد وہ بے حد تھک سے پیالے میں نیا نکلوا ڈالتا جو گرم بخنی میں پھولنے لگتا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں بخنی اس پیالے میں ڈالتا تو بخنی اب تک ٹھنڈی ہو چکی ہوتی۔ بخنی کا ایک پیالہ بیٹھے ہیں اس کا باپ تقریباً "ایک گھنٹہ لگاتا تھا۔ ٹھنڈی بخنی میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے بھی وہ اسی رغبت سے کھاتا جیسے وہ ان گرم لقموں کو کھا رہا تھا۔

سکندر عثمان کے ذائقے کی حس آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی گرم اور ٹھنڈی خوراک میں تمیز کرنا وہ کب کا بھول چکے تھے۔ صرف ان کی دیکھ بھال کرنے والے فیملی کے افراد تھے جو اس فرق کو ان کے لیے اب بھی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اب بھی خوراک کو ان کے لیے ممکنہ حد تک ذائقہ دار بنا کر دے رہے تھے یہ جاننے ہوئے بھی کہ وہ اس ذائقے سے لطف اندوز ہو سکتے تھے نہ اس ذائقے کو یاد رکھ سکتے تھے۔

باپ کو کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ سالار اور امامہ نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے کھانا کھایا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا تینوں وقت کا کھانا باپ کے کمرے میں اسے کھانا کھلاتے ہوئے ہی کھاتا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں یہ ہی کام امامہ اور بچے کرتے تھے۔ ان کے گھر کا ڈرائنگ روم ایک عرصہ سے نہ ہونے کے برابر استعمال ہو رہا تھا۔ اس کے باپ کا بیڈ روم اس کی فیملی کے افراد کی بہت ساری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ اس شخص کو تنہائی سے بچانے کی ایک کوشش تھی جو کئی سالوں سے اس کمرے میں بستر تک محدود تھا اور الزائمر کی آخری سٹیج میں داخل ہو چکا تھا۔

ٹرائی میں پڑا نیپکن اٹھا کر اس نے سکندر عثمان کے ہونٹوں کے کونے سے نکلنے والی بخنی کے وہ قطرے صاف کئے جو چند لمحے پہلے نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے خالی آنکھوں سے اسے دیکھا جن سے وہ اسے ہمیشہ دیکھتے تھے۔ وہ انہیں کھانا کھلاتے ہوئے جواب کی توقع کے بغیر ان سے بات کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کے باپ کی خاموشی کے وقت وہ اب ٹھنڈوں پر محیط ہونے لگے تھے۔ گھنٹوں کے بعد کوئی لفظ یا جملہ ان کے منہ سے نکلتا تھا جس کا تعلق ان کی زندگی کے کسی مجال کی کسی یاد سے ہوتا تھا اور وہ سب اس جملے کو سال کے ساتھ جوڑنے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔

سکندر عثمان کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ ایک تک اسے دیکھتے تھے۔ اب بھی دیکھ رہے تھے۔ سالار جانتا تھا اس کا باپ جیسے ایک اجنبی کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کو کھانا کھلانے کی کوئی احتیاط کوئی محبت کوئی لگن ان کی یادداشت میں کبھی محفوظ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک اجنبی کے ہاتھ سے کھانا کھا رہے تھے اور ان کے ختم ہوتے ہوئے داعی بیٹھے اس کی کسی کے چہرے کو کوئی نام دینے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

سالار جانتا تھا اس کے باپ کو اس کے ہاتھ سے کھانا ہوا وہ دوسرا کھانا بھی یاد نہیں ہو گا۔ وہ جتنی بار اس کے کمرے میں آتا ہو گا وہ اپنے باپ کے لیے ایک نیا شخص "ایک سا چہرہ ہو گا اور صرف وہی نہیں اس کی فیملی کے باقی سب افراد بھی۔ سکندر عثمان شاید حیران ہوتے ہوں گے کہ ان کے کمرے میں بار بار نئے لوگ کیوں آتے تھے... وہ اپنے کمرے میں "اجنبیوں" کے ساتھ رہ رہے تھے۔

اس نے بخنی کا آخری پیچ اپنے باپ کے منہ میں ڈالا۔ پھر سالہ ٹرائی میں رکھ دیا۔ اب وہ اپنے باپ کو کچھ سے پانی پلا رہا تھا۔ اس کا باپ لمبا گھونٹ نہیں لے سکتا تھا۔ امامہ کچھ دیر پہلے کمرے سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کا سامان پہلے ہی ایر پورٹ جا چکا تھا۔ اب باہر ایک گاڑی اس کے انتظار میں کھڑی تھی جو اسے تھوڑی دیر میں ایر پورٹ لے جاتی تھی اس کا اسٹاف بے صبری سے اس کمرے سے اس کے برآمد ہونے کا منتظر تھا۔

سالار نے گلاس واپس رکھتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے باپ کی گردن کے گرد پھیلا ہوا نیپکن ہٹایا۔ پھر کچھ دیر تک سکندر عثمان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس نے انہیں اپنی روانگی کا بتایا تھا اور اس تشکر و احسان مندی کا بھی جو وہ اپنے باپ کے لیے ہمیشہ محسوس کرتا تھا 'خامس طور پر آج... سکندر عثمان خالی نظروں سے اسے دیکھ اور بن رہے تھے۔ وہ جانتا تھا وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ لیکن یہ ایک رسم تھی جو وہ ہمیشہ ادا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد باپ کے ہاتھ جو مے پھر انہیں لگا کر کبل اوڑھ دیا اور کچھ دیر بے مقصد بیڈ کے پاس کھڑا نہیں دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بتا نہیں کب وہ اپنے باپ کے پاس آنے کے قابل ہوتا۔ سالار یہ نہیں جانتا تھا وہ آخری کھانا تھا جو اس نے اپنے باپ کے ساتھ کھایا تھا۔

تاشن کا ٹرپ کا پتہ چھینا جانے والا تھا اور "مہلت" ختم ہونے والی تھی۔ (باقی آئندہ ماہ۔ ان شاء اللہ)



تخلیق کار،

میرے گھر کی بالکنی میں
تنکوں کے چھوٹے سے گھر میں
پنکھ سمیٹے آنکھیں میچے

وہ جو چپ چپ سی بیٹھی ہے
اک انجانی کبوتری ہے

وہ شاید بہری ہے
اس نئے ریل کی سٹی سٹی نہیں ہے

گھیرا کے وہ اڑی نہیں ہے

وہ شاید اندھی ہے

اسے پتا نہیں ہے

چھاؤں کدھر ہے، دُھوپ کہاں ہے

اس کا جہاں ہے

انڈوں کے جوڑے بننے تک

وہ بہری ہے، وہ اندھی ہے

کبوتری ہر ماں جیسی ہے

نذرا فاضلی

تو بگڑتا بھی ہے، خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ
پھول کھلتے ہیں ترے شعلہ آواز کے ساتھ

ایک بار اور بھی کیوں عرض تمنا نہ کروں
کہ تو ان کار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ

لے جو ٹوٹی ٹوٹی لہو صد آہنی شکست دل کی
رگ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگ سار کے ساتھ

تو پکارے بھی تو چمک اُٹھی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

احمد ندیم قاسمی

زندگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جبر بن مطعم نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”رشتے داروں سے تعلق توڑنے والے اور ان سے بدسلوکی کرنے والے کو جنت کے اندر داخل نہیں ہونے دیا جائے گا“

زندگی،

زندگی کب سے ہے اور کب تک ہے، کون جلنے ازل سے ابد تک۔ ازل سے پہلے اور اس کے بعد بھی زندگی ہے۔ تخلیق سے پہلے خالق کے ارادے میں زندہ تھی۔ اور کھل کے بعد خالق کے رویہ و حاضر کر دی جائے گی۔ زندگی بہر حال زندگی ہی رہے گی۔
(داصف علی وداصف)

عظیم ماں،

تھامس ایڈیسن مشہور عالم سائنس دان حیات بچہ تھا، وہ اسکول سے آیا اور ایک سر سے لفظ اپنی والدہ کو دیا۔ استاد نے دیا تھا کہ اپنی ماں کو دے دو۔
ماں نے کھول کر بڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر اس نے بااواز بلند پڑھا۔ تمہارا بیٹا ایک جینس ہے۔ یہ اسکول اس کے لیے بہت چھوٹا ہے اور اتنے اچھے استاد نہیں کہ اسے پڑھا سکیں۔ سو آپ اسے خود ہی پڑھا لیں۔“

سالوں بعد جب تھامس ایڈیسن ایک سائنس دان کے طور پر دنیا بھر میں مشہور ہو گیا تھا اور والدہ وفات پا چکی تھی وہ اپنے خاندان کے پرلنے کاغذات میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے وہی خط ملا، پر اس پر لکھا تھا

”آپ کا بیٹا انتہائی عیبی اور ذہنی ناکارہ ہے۔ ہم اسے مزید اسکول میں نہیں رکھ سکتے۔“
اس دن ایڈیسن نے اپنی ڈائری میں لکھا۔
”تھامس ایلو ایڈیسن ایک ذہنی ناکارہ بچہ تھا۔ ہر ایک عظیم ماں نے اسے صدی کا سب سے بڑا سائنس دان بنا دیا۔“
اقصی ناصر۔ کراچی

حکمت،

حقیقت کی فارغ المانی ان کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ جو شخص گرمی میں جمع کرتا ہے، عقل مند ہے۔ پر جو کسان کے وقت سوتا ہے، باعث شرم ہے۔

بچے بڑے ہمیشہ قائم رہیں گے لیکن چھوٹی زبان دم بھری ہے۔ صاحبِ فہم ہر ایک جھڑکی احسن پر ہو اور دل سے زیادہ اشرکتی ہے جو بات سننے سے پہلے اس کا جواب دے یہ اس کی حماقت اور خجالت ہے۔ احمق بھی جب تک خاموش ہے عقل مند گنا جاتا ہے۔
بھگڑنے کی شروعات پانی پھوٹ نکلنے کی مانند ہے اس لیے لڑائی سے پہلے جھگڑنے کو چھوڑ دو۔
احمق کی تعظیم کرنے والا گویا پتھر کو جواہر کے ڈھیر میں رکھتا ہے۔

دشمن سے ہر وقت بچتے رہو مگر دوست سے اُس وقت بچو جب وہ تمہاری بے جا تعریف کرتے لگے۔

انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتی کیونکہ بڑے کام کو وہ باقاعدہ مشورے سے کرتا ہے۔

گدگدایا شاہ۔ کبر و ڈنڈا

دوسرا فائدہ

شبنم نے ندیم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ تو ندیم نے اپنے محبت نامے واپس مانگ لیے۔
 ”تم اپنے محبت نامے واپس کیوں لینا چاہتے ہو؟“
 شبنم نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں ڈر ہے کہ میں خطوط کے ذریعے تمہیں بلیک میل کروں گی؟“
 ”نہیں، مجھے ایسا کوئی خوف نہیں ہے۔ دراصل میں تمہیں محبت نامے ایک معروف ادیب سے بھاری معاوضے پر لکھوائے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ

وہ آئندہ بھی میرے کام آتے رہیں۔ کم از کم یہ احساس ہو کر پیسے دھول ہو گئے۔“ ندیم نے قد لے پچھکیا ہٹ کے یعد جواب دیا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

قبل مسیح

- ۱۔ 3,400 قبل مسیح مصر میں جانوروں کی شکل کے برتن بنائے گئے۔
- ۲۔ 3,400 قبل مسیح مشرق وسطیٰ میں اسی کا بودا کپڑوں کی بنائی میں استعمال ہونے لگا۔ مہری اون استعمال نہیں کرتے تھے۔
- ۳۔ 3,300 قبل مسیح مصریوں نے تحریر کا فن دریافت کیا۔ یہ تصویر برقی رسم الخط تھا۔ جو آج سب سے زیادہ آوازوں اور خیالات پر مبنی تھا۔
- ۴۔ 3,000 قبل مسیح سومیروں نے دنیا میں پہلی لائبریری قائم کی جس کے لیے مٹی کی تختیوں پر لکھی گئی کتابیں استعمال کی گئیں۔

(تاریخ کا سفر)

دُعائے سحر انا صاحب۔ فیصل آباد

عورت

ایک ہاتھ میں لپ اسٹک

دوسرے میں موبائل

ایک کان ٹکڑ کی سیبی

دوسرا واٹس ایپ کی نوٹیفیکیشن بر

ایک آنکھ فی ٹری پر
 دوسری شوہر۔ کی حرکتوں پر
 کون کہتا ہے عورت کی زندگی آسان ہے

دل بھی نگر مٹھا،

ہم اتنی دور کہاں تھے کہ پھر پلٹ نہ سکیں
 سوادِ شہر سے کوئی صدا نہیں آئی
 سنا تھا دل بھی نگر مٹھا، زسا بسا بھی تھا
 جلا تو آنچ بھی اہل وفا نہیں آئی
 نوزیہ عمر بٹ۔ بکرات

اسکول جانا ہے

ایک خاتون اپنے بیٹے کو بستر سے اٹھا رہی

تھیں۔

”اسکول کا وقت ہو گیا ہے۔ جلدی اُٹھو
 نہیں اسکول جانا ہے۔“
 ”مجبوری اسکول نہیں جاؤں گا مجھے اسکول سے
 سخت نفرت ہے۔ مجھے پسند نہیں کرتے۔
 پتھر تو مجھے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں بلکہ اسکول
 کا سارا اسٹاف ہی مجھے ناپسند کرتا ہے۔“
 ”مگر تمہیں اسکول جانا ہے۔“ اس کی مٹی نے کہا۔
 ”تم اب مجھے نہیں ہو چالیس برس کے ہو اور اسکول
 کے ہیڈ ماسٹر ہو۔“
 ہانیہ عمران۔ بکرات

چہرہ و پیمان

نئی نوٹلی دلہن نے شادی کے چند روز بعد اپنے

شوہر سے اٹھلا کر پوچھا۔

”سستو جی! کیا واقعی تم مجھ سے بے حد محبت
 کرتے ہو اور تا عمر اسی طرح مجھ کو چاہتے رہو گے۔“

تمہاری محبت میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔“

”بے شک ڈیرا، شوہر نے بڑی اپنائیت سے

کہا۔ مگر پھر اپنا سر کھجاتے ہوئے کہنے لگا۔ لیکن

میری سبھی مٹی یہ نہیں آتا کہ ہر لڑکی مجھ سے اسی قسم کے

سوالات کیوں کرتی ہے؟“

عذرا ناصر۔ کراچی

وہ صاف گوئی سے نقصان بہت کھوڑا ہوتا ہے
مگر فائدہ بہت ہے۔

(لارڈ میکملے)

وہ اگر تمہیں پرستش کرتے والے اور دل پسند تو کر کی
تلاش ہے تو اپنا خادم خود بنو۔

(بنجامن فرینکلن)

ندا طارق۔ فیصل آباد

اچھی بات،

پریشان ہونے والوں کو کبھی نہ کبھی سکون مل
جاتا ہے لیکن پریشان کرنے والے ہمیشہ سکون کی
تلاش میں رہتے ہیں۔

ثمینہ اکرم۔ بہار کالونی

حکمت کے موتی،

عقل مند لوگوں کی غلطیوں سے سبق لیتے

ہیں جبکہ بے وقوف اپنی غلطیوں سے سبق لیتے
ہیں۔

عقدہ کرتے کا مطلب ہے، ہم دوسروں کی
غلطیوں کا انتقام اپنے آپ کے لیے لیتے ہیں اور
یہ کبھی حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بات ہے۔

(پوپ الیکزیندر)

دوست کمزور ہو جائیں تو دشمن خود بخود طاقت
ہو جاتا ہے۔

(داصف علی واصف)

احتیاط دانشمندی کی سب سے بڑی بیٹی ہے۔

(وگنر ہوگنو)

تقت عقل کا اندازہ اکثر کلام سے ہوتا ہے۔

(بو علی سینا)

تعلیم کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ علم کی قوت
بیدار کرنا ہے۔

(ہربرٹ اسپنسر)

لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں، قابلیت
پر نہیں۔

(ٹیولین)

ضمیر ہمارے اندر کی آواز ہے جو ہمیں متنبہ کرتی
ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

(میکلن)

صرف عمران۔ کے ڈی، اے سوسائٹی

اقوال دانش،

وہ موجودہ دور میں انسانیت کا خطرناک دشمن
انسان ہے۔

(سٹیکسیر)

صدق،

وہ وکیل ہی وہ لوگ ہیں جنہیں قانون سے لاعلمی
کی سزا نہیں ملتی۔

(جرمی)

وہ کامیابی کا سب سے بڑا راز ہر حالت کے لیے
تیار رہنا ہے۔

(جینی فورڈ)

وہ کامیابی کا راز تو یہ نہیں بتا سکتا لیکن ناکامی
کا راز ضرور بتا سکتا ہوں۔ امداد وہ ہے ہر کسی
کو خوش کرنے کی کوشش۔

(ہربرٹ سوپ)

وہ بڑھاپا ایک بڑی عادت کی مانند ہے جس
کے لیے مصروف شخص کے پاس وقت نہیں۔

(مورس)

سیدہ نسبت۔ لہرا کٹر وڈ پکا

ہرمن میلوں کہتا ہے،

وہ دنیا ایک جہاز ہے جو سمت در میں چل رہی ہے
اس کا سفر کبھی پورا نہیں ہوتا۔

وہ دنیا میں جتنے آلات ہیں ان میں انسان سب
سے جلدی خراب ہوتا ہے۔

وہ جتنی چمیریں انسان کو ذلیل کرتی ہیں وہ
سب بے جسم ہوتی ہیں۔

وہ مہذب آدمی بیمار پڑے تو اسے اچھے ہونے
میں چھ مہینے لگتے ہیں۔ جنگلی بیمار ہو تو ایک دن
میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔

ندا طارق۔ فیصل آباد





فرزانہ مغل ————— واہ کیمنٹ

طوفان کر رہا تھا میرے عزم کا طواف
دُنیا سمجھ رہی تھی کشتی بھور میں ہے

ایضاً انا ————— چکوال

دُنیا کو سنبھالیں کہ دل زار کو دیکھیں
ہم نیم نفس کون سے بیمار کو دیکھیں
آنکھوں میں چمکا جو مذہبے سینے میں اندھیرا
سورج سے نبھائیں کہ شب تار کو دیکھیں

شہزادہ ہاشمی ————— کتدیاں

مجھے رہے گا تو اے نا خدا کیا غرق ہوئے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
خوش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قربوں میں

ایضاً صادق ————— بہاول پور

میرا سارا شہر ہی بہہ گیا
میرے سارے لوگ ہی اتر گئے

مدد بکھ نورین مہک ————— برنالہ

جب بھی ہوتی ہے گھر سے وحشت مجھے
درو دیوار پہ تیری تصویر لگا دیتا ہوں

آبرو چوہدری ————— سرگودھا

گزرے پھولوں اور تیلیوں کے تنگ جو ہیں لمحے
یاد آ آ کے ہمیں اکشراب تڑپاتے ہیں
خزاں کے پتوں کی طرح بکھر گئی زندگی
اب بہار کے پھول میرا مذاق اڑاتے ہیں

عظمتی شفیق ————— جڑالوالہ

بہتر ہے اسے گھر کے کسی طاق میں دکھ دو
ٹوٹا ہوا دل لے کے کہاں جانے لگے ہو
آشوب نظر سے بھی بھڑکتی ہے سمجھی آنکھ
تم یہ نہ سمجھنا اسے یاد آئے لگے ہو

توال افضل گھمن ————— کراچی

کسی مانوس لمحے میں کسی مانوس چہرے سے
محبت کی نہیں جاتی، محبت ہو ہی جاتی ہے

فہمیدہ گل ————— لاڑکانہ

کچھ وقت کی روانی تے ہمیں یوں بدل دیا محسن
وفا پر اب بھی قائم ہیں، محبت چھوڑ دی ہم نے
گرہ یا شاہ ————— گہوار پکا

عرض نیا ز عشق کے قابل نہیں
جس دل پہ ناز تھا، وہ دل نہیں رہا
سلی سبیل شاہ ————— اٹک

ساری عمر ہم بھی بھول کر رہے
دھول چہرے پہ تھی اور آئینہ صاف کرتے
چوہدری فرخ آبرو ————— گجرات

ہم ہی وفا شکن تھے جلو ہم ہی بے وفا
تم تو وفا شناس تھے، تم کیوں بدل گئے
ملائکہ کوثر ————— بسم اللہ پور

پھر میرے شہر سے گزرا وہ یادوں کی طرح
دست گل چھیلا ہوا ہے میرے آنچل کی طرح
عذرا نامہ، اقصی ناصر ————— کراچی

وہ حیران ہیں ہمارے ضبط پہ کہہ دو قہقہ ان سے
جو دامن پر نہیں گرتا، وہ آنسو دن بہ گرتا ہے
حراق قریشی ————— ملتان

رنگ و بو کی جگہ دھول سے خاک کی
پھول گلزار سے خار کھاتے رہے
سانس لینے کی فرمت کہاں تھی ادا
یاد آنے کو وہ یاد آتے رہے



حان کی ڈاڑھی

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جڑ سکی
 وہی دیر دیر نہ جو کام تھے، مجھے کھا گئے
 جو کھلی کھلی تھی عداوتیں مجھے راس بھیس
 یہ جو نہ ہر حقد سلام تھے، مجھے کھا گئے

سیدہ نوبا سجاد کے ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریر یہ نظم ان سب قارئین کے لیے جو سب میں موجود ہو کر بھی موجود نہیں ہوتے۔

مجھ سے یہ لوگ کہتے ہیں
 کہاں دل چھوڑ آئے ہو؟

بہت چپ چاپ رہتے ہو
 نہ سنتے ہو نہ سنو رہتے ہو
 نہ کوئی بات کرتے ہو
 ہمیشہ کھوٹے رہتے ہو
 اذاسی آنکھوں میں لے کر
 ہر اک چہرے کو تکتے ہو

کوئی جب یاد آتا ہے
 تندی آہ بھرتے ہو
 تو کھل کر کیوں نہیں کہتے
 کسی کو یاد کرتے ہو
 کہ تم بھی پیار کرتے ہو

ساروی شبیر کے ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریر سلیم کوڑکی یہ غزل آپ سب کی نذر۔

غم زندگی دے راہ میں، شب آرزو تیری چاہ میں
 جو اجر کیا وہ بسا نہیں جو پھر گیا وہ ملا نہیں

جو دل و نظر کا سرو تھا میرے پاس رہ کر بھی دور تھا
 وہ اک گلاب امید کا میری شاخ جاں پہ کھلا نہیں

مزمہ، اقراء کے ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریر یہ نظم ان لوگوں کے لیے ہے جن کی صلاحتیں اذہانت حالات کی نذر ہوئیں۔

بے دھیانی،

میں ٹھنڈے توڑے کی روٹی ہوں
 مجھے بے دھیانی میں ڈالا گیا
 بے دردی سے بلٹا گیا
 میرے کتے ٹکڑے اٹھ کر گئے
 میں ٹھیک سے سینگی جا رہی تھی
 میں کسی چنگیس میں آنے لگی
 میرا سینا، کندھنا اور پلٹنا
 بے کار گیا، میں ہار گئی
 اک بے دھیانی مجھے مار گئی

انجیل کے ڈاڑھی سے

زیرت بھی عجیب پہلی ہے۔ کبھی یوں بھی بولا ہے
 کہ زندگی ہماری سوچ سے نہیں مل پاتی اور کبھی بھی ہماری
 سوچ زندگی سے میل نہیں کھاتی۔ میری ڈاڑھی میں تحریر
 یہ غزل حساس دل لوگوں کے نام۔

یہ جو تنگ تھے، یہ جو نام تھے، مجھے کھا گئے
 یہ جو خیال پہنچتے جو خام تھے، مجھے کھا گئے

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی یہ نظر نہ کی
 وہی زاویے کہ جو عام تھے، مجھے کھا گئے

میرا ہمسفر جو عجیب ہے، تو عجیب تر ہوں میں۔ بھی مجھے منزلوں کی خبر نہیں، اُسے راستوں کا پتا نہیں

بس اک کاروانِ سرراہ گزر، میں بارہا ہوں تو اس لیے کہ قدم تو سب سے ملالیے، میرا دل کسی سے ملا نہیں

ستبدہ نسبت زہرا کی ڈاڑھی سے

محبتوں کے شاعر ساحر لدھیانوی اپنی نظم "خوبصورت موڑ" میں تعلق توڑنے اور اجنبی بن جانے پر زور دے رہے ہیں لیکن کیا ایسا ہوتا ہے کہ کہہ دینے سے کوئی ہم سے دور، دل کا اجنبی بن جائے۔ ممکن تو نہیں، ہوتا کسی کو بھولنا۔ ساحر لدھیانوی نے لکھے زبردست اچھوتے انداز میں بیان کیا۔ پڑھیے اور محسوس کیجیے۔

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے

نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کاواز نظروں سے چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں تمہیں بھی کوئی اطمینان روکتی ہے سے پیش قدمی سے مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ چلو کے پرکے ہیں میرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی تمہارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں تعارف روگ بن جائے تو اس کا بھولنا بہتر

تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

دو

ماہنامہ

ستمبر 2016 شمارہ شائع

- ✽ عید الاضحیٰ کے موقع پر شیف "روا آفتاب" کا خصوصی انٹرویو،
- ✽ اداکار "یاسر شورڈ" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،
- ✽ اس ماہ "حمیرا" کے "مقابلہ ہے آئینہ"،
- ✽ شادی مبارک ہو "بشری گوئل"۔
- ✽ "آواز کی دنیا ہے" اس ماہ مہمان ہیں "عائشہ خان"
- ✽ سخن مورکھ کی بات نہ مانو، آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- ✽ "راہنزل" تزیلہ ریاض کا سلسلہ وار ناول،
- ✽ "دوست مشیما" حکمت سیماکامل ناول،
- ✽ "تو میری مانگ کا تارا" مصباح علی کا مکمل ناول،
- ✽ "سنگ پازن" مہوش افکار کا ناول،
- ✽ "سانول موڑ مہاراں" بیت بحر کا ناول،
- ✽ "عید محبت" بشری ماہا کا ناول،
- ✽ صدف آصف، صبا آصف، فریدہ فرید اور راشدہ علی کے افسانے اور مستقل سلسلے

ان کتابوں کے ساتھ کون کتاب

عید الاضحیٰ کا دستور خوان

کتاب کے ہر شے کے ساتھ پڑھنے سے مزہ و شہنشاہی



آپ ہماری دیرینہ قاری ہیں۔ پچھلے ماہ آپ کا ایک خط منوصول ہوا تھا، مگر بہت تاخیر ہے۔ اسی لیے رسالے میں جبکہ نہ بنا سکا ویسے ہم نے اسے پڑھ لیا تھا۔ اتنے عرصے سے ہمارا پرچار پڑھتی ہیں، مگر تبصرہ صرف دو ناولوں پر کیا ہے امید ہے آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئیں گی۔ پروردگار سے دعا ہے کہ آپ کے شوہر کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

فریال آرائیں۔۔۔ جام پور ڈیرہ غازی خان

22 اپریل کو اپنے والدین کے ہمراہ عمرہ کی سعادت حاصل کرنے گئی۔ خیر تو جب جارہی تھی خیال آیا کہ 12 مئی کو واپسی ہے۔ میرے پیارے رسالے حتم نہ ہو جائیں۔ سوچا جس ڈھابے والے سے لیتی ہوں اس کو ایڈوانس جمع کرواتی جاؤں پھر سوچا ابھی تو پائی پائی کی ضرورت ہے۔ اللہ مالک ہے جب واپس آؤں گی اللہ کے بچے ہوئے ہوں تو جب 12 مئی کی صبح ہم ٹوک پاکستان آگئے تو سب سے ملنے کی خوشی اپنی جگہ رہمانوں کا خیال اپنی جگہ۔ بلکہ ایک دو بار مدینے میں بھی خیال آیا جب جام پور کا مشہور نرینقت چوک آیا۔ میری نظر اٹھی تو میں اٹھی رہ گئی۔ سامنے ہی دشمن جاں ننگ رہے تھے۔ ”آنا فنا“ گاڑی رکوائی۔ وہ تو شکر ہے ایک سسٹر ایک ماموں اور میں تھے۔ میری ٹھوڑی تک سرے تھے پھولوں کے۔ ہمارے

نادرد خاتون

سہارا

خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین، مارچ 37 - اردو بازار، کراچی

Email: info@khawateendigest.com

مسرتہ اسلم لاہور

جب خواتین آیا تھا سب سے پڑھتی ہوں مطالعہ ہم سب بہن بھائیوں کو دراشت میں ملا ہے جب تک کچھ پڑھ نہ لیں، سوتے نہیں ہیں۔ خواتین سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے جب جب کسی معاملے میں پریشان ہوں، خواتین نے میری رہنمائی کی۔ آسیہ رزاقی، رضیہ بٹ، رفعت سراج اور اب عمیرہ احمد زبردست لکھنے والی ہیں۔ ان کے قلم میں بہت زور ہے۔ اب حیات بہترین ناول ہے اور نمل، نمبرہ احمد کا ایک مکمل دین کی راہ دکھانے والا ہے۔ نمبرہ احمد بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ عمیرہ احمد کا پیر کامل بھی پڑھا ہے۔ یہ نین نے اپنی بچیوں کو بھی پڑھوایا۔ خواتین میں کن کن روشنی میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ میرے شوہر کو فنانس ہوا ہے آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ دعا میں ضرور یاد رکھیں۔

ہاں رواج ہے پھولوں والے سر سے پہنانے کا جب کوئی راج یا عمرہ کر کے آئے۔ گاڑی رکوائی۔ اسے پیارے رسالے لیے۔ ان کو بیگت میں رکھا تاکہ کوئی دیکھنے کے لیے بھی نہ آئے۔

ج۔ پیاری فریال! عمرہ کی مبارک باد اور خواتین ڈائجسٹ سے اتنی محبت کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ بلاشبہ یہ آپ کی محبت ہے جو ہمیں خواتین کو مزید بہتر بنانے کا حوصلہ دیتی ہے۔

مدیرہ نوید۔۔۔ اختر کالونی، کراچی

خواتین کے ٹائٹل بہت اچھے ہوتے ہیں اور سلسلے وار ناولز تو سب ہی بیسٹ ہیں، مگر مجھے لگتا ہے آپ کی ساری توجہ اب سلسلے وار ناولز پر ہی رہ گئی ہے۔ افسانے تو چلو ایک آدھ بہتر نکل ہی آتا ہے، مگر مکمل ناولز، ناولٹ تو بالکل بورنگ ہوتے ہیں۔ سارہ رضامجھے بہت پسند ہیں، مگر ہر ماہ

ج۔ محترمہ مسرتہ اسلم! یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

سندھ فاروق، عظیمی فاروق۔ ضلع رحیم یار خان
نمل بہت لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی وجہ سے
رسالہ لیتی ہوں۔ آب حیات بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔
مختصر سا تعارف میرے تعلق رحیم یار خان کی تحصیل
لیاقت پور کے ایک گاؤں سے ہے۔ گاؤں میں ایک
لڑکیوں کا ہائی اور لڑکوں کا پرائمری اسکول ہے یہاں کے
لوگ بہت ملتسار اور محنتی ہیں۔ لیاقت پور کو دنیا کی سب
سے بڑی گڑکی منڈی کہتے ہیں۔
ج۔ پیاری سدرہ! نمل اب اختتامی مراحل میں ہے۔
آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔

حیاء شمالی۔۔۔ کنویں یا ک سندھ

سب سے پہلے تو میں تعریفی کلمات لکھوں گی عمیرہ
احمد کے لیے جن کی وجہ سے ننہ میں قلم اٹھانے کا شوق پیدا
ہوا۔ اف ف ف۔۔۔ کہانی کا نام ہی اتنا اچھا اور کہانی اس
سے بھی کہیں زیادہ اچھی لگی۔ مزا آ گیا پڑھتے ہوئے اور
ری بات نمروہ جی کی اسٹوری نمل کی تو اس ناول نے تو دھوم
مچا دی ہر جگہ بس جب پڑھنے لگیں تو بنا سانس روکے ہی
پڑھتے چلے گئے۔ آمنہ ریاض کا دشت جنون کالی اچھا ناول
ہے سب کتابیاں پڑھ کر میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں ہر ماہ
آپ کو کمشنرین دوں لیکن ہمارا چھوٹا شہر ہے۔ یہاں ایک
ہی دکان پہ ڈائجسٹ لکھتے ہیں اور وہ بھی پانچ مارچ کے بعد
ہی آتے ہیں اس لیے اگر آپ ڈائجسٹ پورا پڑھ کر خط لکھ
کر ارسال کروں تو وہ شائع نہیں ہو پاتے اس لیے نہیں
بجواتی۔

ج۔ پیاری حیا! آپ اور باقی قارئین جو تبصرہ لکھنا
چاہیں۔ دل کھول کر ضرور لکھیں اور ہمیں بھیج دیں۔ اس
سے ہمیں آپ لوگوں کی پسند ناپسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط
کی اشاعت میں تو بہت ساری باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے،
مگر رچے کو آپ لوگوں کے ذوق کے مطابق ترتیب دینے
میں آپ کی آرا اور فرمائشوں کا خصوصی خیال رکھا جاتا
ہے۔

ہاجرہ عمران خان۔۔۔ لاہور

جن ہاتھوں میں تاریکی دور کرنے کے لیے چراغ ہیں وہ
ہاتھوں سے جگہ لکھتی ہیں۔ ان ہاتھوں میں آپ کے ہاتھ بھی
ہیں۔ یہ ہاتھ سلامت رہیں یا قیامت کریں۔

نہیں۔ عائشہ ناز نیا نام تھا میں نے تو پہلی بار ہی پڑھا ہے مگر
رخ مریم اور تیمور کے بوائے ہوئے بیچ سے خوب خوش
ہوئے۔ صدف آصف کبھی بہت اچھا تو کبھی مناسب لکھتی
ہیں، مگر آؤٹ اسٹینڈنگ نہیں جیسا کہ حیا بخاری ہیں
افسانہ لکھیں یا ناول ان کی تحریر ہر طرح سے نمل ہوتی ہے
کہیں ادھورا پن محسوس نہیں ہوتا۔ آب حیات میں
بہت لمبی جھلا ننگ لگائی ہے نئی نسل پورا تو اناور خست بن گئی
ہے۔ مجھے تو ابھی سے تیسرے حصے کا انتظار ہے۔ نمروہ جی کی
ایکشن اسٹوری بھی عروج پر ہے جس میں سعدی کی ہیروئن
کا انتظار ہے۔ افسانوں میں صباحت یا سمین نے عورت کو
خوب خراج تحسین پیش کیا بہت مزہ آیا پڑھ کر۔ ہاجرہ
ریحان کے افسانے کا ناپک بہت اچھا تھا۔ انداز تحریر بھی
اچھا تھا، مگر آخری لائن میں کہ میں آصف کے ساتھ زیادہ
محفوظ ہوں عجیب سی لگی۔ یہاں حفاظت کی نہیں دیکھ
بھال کی کیسے کی بات ہونی چاہیے تھی۔ بہت سحر مجھے پسند
ہیں مگر اہلی اچھا نہیں لگا۔

ج۔ پیاری ناز! آپ خاطر جمع رکھیں۔ ہم شیطان کی
باتوں میں آئے والے نہیں۔ ویسے آپ کا خط ہم سمجھ نہ
سکے۔ آپ نے افسانوں کی تعریف کی ہے اور ناول کی بھی
اور ساتھ یہ شکوہ بھی کیا ہم صرف سلسلہ دار ناولوں پر توجہ
دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری مستغنیں اب زیادہ تر
طویل تحریریں لکھ رہی ہیں اور نمل اور ناولت کی بھی
ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن یہ غلط ہے کہ ہم صرف
سلسلہ دار ناولوں پر توجہ دیتے ہیں۔

فمیدہ گل۔۔۔ لاڑکانہ

مجموعی طور پر خواتین ڈائجسٹ ایک شاہکار ہے ہماری
محبت اور دلچسپی کا گراف جو پہلے ہی بلند تھا مزید بڑھ گیا
ہے۔ نمروہ احمد کی نمل جس طرح لکھی گئی ہے اس طرح
کسی نے نہیں لکھا۔ یہ صرف پیار میں گھریلو سیاست پر
نہیں ہے۔ نمروہ جی فارس اور زمر میں تھوڑا رومانس
دکھائیے، بہار کی دستک، زندگی اک کہانی اور کبھی عشق ہو
تو بہت اچھی لگیں۔

ج۔ پیاری فمیدہ! مصروفیت کے باوجود آپ نے وقت
نکال کر ہمیں خط لکھا، بہت شکر ہے۔ متعلقہ مستغنیں تک
آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

نمرہ احمد کا ناول ”نمل“ ہمارا مونسٹ فیورٹ ناول ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی جان ہے یہ ناول۔ آب حیات بھی بہت اچھا ناول ہے۔ بنت سحر، حیا، بخاری، عطیہ خالد، حاجرہ رحمان کے افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ آپنی ہمارے ماحول میں رسالوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بہت باتیں سننا پڑتی ہیں اس کے باوجود بھی ہم پڑھتے ہیں۔ سرفراز احمد اور عاطف اسلم کا انٹرویو بھی ضرور شامل کریں۔ ہمارے کزنز قدیر، عتیق، نوید اور زبیر کہتے ہیں خط پوسٹ تب کریں گے جب ہمارا اسلام لکھا جائے گا سوان کی طرف سے ڈھیر سارا سلام۔

ج۔ لہنی، اقراء، آساء، اے حد خوشی ہوئی آپ نے ہمیں یاد کیا ہمیں احساس ہے کہ آپ ان لوگوں کو پرچا حاصل کرنے اور پھر تبصرہ لکھ کر ہمیں بھجوانے کے لیے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ کے کزنز کو ہماری طرف سے وعلیکم السلام۔

نہانیہ شعل اشرف۔ جو ملی لکھا، تحصیل ڈیپال پور، اوکاڑہ

سرورق مجھے اس پیڈل فن کی طرح لگ رہا ہے جس کا ”نمل“ عین میری طرف ہے۔ جی ہاں! اٹھنڈا اٹھارہ گل ہمارے ”دشت جنوں“ کو نہ پا کر باپوسی ہوئی۔ نمرہ احمد! اشعار کی کمی بے حد محسوس ہوتی ہے۔ ”آکاس نیل“ پڑھا۔ میرے اللہ... ایسی چلتی عورتیں ہی کہہ دیر ان کر دیتی ہیں۔ ”املی“ بڑا اچھا لگا۔ ذہرہ بنت سحر جی! عائشہ ناز علی نے بے حد اچھا پیغام دیا ہے۔ ”محموظ“ میں مریم نے اچھا فیصلہ کیا۔ خطوط بھی خوب رہے۔ حیا بخاری نے تمہیں اکرم کے بارے میں تو جیسے میرے دل کی بات ہی کہہ ڈالی۔ ”بہار کی دستک“ مسکراتی آنکھوں اور لبوں کے ساتھ پڑھا تھا۔ آسیہ رزاقی میری پسندیدہ ترین مصنفین کی فہرست میں شامل ہیں۔

ج۔ ثانیہ اجامع تبصرہ کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ تندور کی گھی والی روٹی دریا زہری مرچ کی چٹنی کی دعوت کھانے ضرور آئیں گے۔ آپ تیار کر کے رکھیے گا۔

سنیل ملک اعوان۔ ونڈالہ دیال شاہ

آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے صائمہ اکرم چوہدری کا انٹرویو دیا۔ یہ صائمہ نے اپنی تصویر شاوی والی دی ہے۔ تازہ

میں اپنا تبصرہ حیا بخاری کی تحریر ”چاند ہم تو اہوا“ سے شروع کر دیں گی۔ جس کی گل پرو بے حد معصوم نازک اور بے ضرری لگی۔ عطیہ خالد کی ”آس“ نے یہ احساس دلایا کہ شوہر بیوی کی محبت لازماً ہوتی ہے۔ فریدہ فریدہ کا ”فیصلہ“ کے عمر یاز نے ”مس ٹاپ آف آل“ کو کچھ زیادہ ہی باتیں سنا دیں۔ آخری جملہ نے تو ہلا کر رکھ دیا، ”عورت جسمانی لحاظ سے آزاد ہو سکتی ہے مگر اپنی فطرت کے باعث ذہنی طور پر کبھی بلند پرواز نہیں ہو سکتی“ اے! یہ سلگانے والا جملہ... عورت کو ذہنی طور پر یہ سماندہ کہنا، کم پرواز سمجھنا، اس کی ترویج نہیں ہونی چاہیے۔ بنت سحر کی ”املی“ سچ میں کھٹی بیٹھی لگی۔ صدف آصف کی ”بتاشا“ کبھی عشق ہو تو ”میں نڈر اور باحوصلہ“ انا اور عزت نفس کی محافظ

لگی۔ ویسے اس بار پورا ڈائجسٹ ہی معصوم، پیوں جیسی ہیروئنوں پر مشتمل تھا کہ بے ساختہ ان پر پیار آنا رہا۔ نمرہ احمد کے کیا ہی کہنے اس بار تو ہمیں بھی ”نمل“ کے کرداروں کی طرح ”عالم تویم“ میں ہی رکھا ہے۔ صباحت یا سمین کا ”اف“ یہ عورتیں ”انتہائی خوب صورت سوچ کا عکاس ٹھہرا خائن کر کے یہ جملہ اف یہ عورتیں بھی نا... چاہت سے نکھرتی ہیں، چاہت سے جلتی ہیں، عمر بھر چاہت کے لیے مرنی رہتی ہیں اور چاہت ملے تو جی اٹھتی ہیں، ہارٹ آف دی اسٹوری تھا۔

”آکاس نیل“ شازبیہ الطاف کی اچھی کاوش رہی۔ ہاجرہ رحمان کا افسانہ ”محموظ“ میں آصف کا کردار ساثر کن رہا۔ مختصر پیرائے میں بڑی کیفیت... اچھی کاوش رہی۔ عمیرہ احمد خوب صورتی سے آب حیات کا جاہ اپنے قارئین کو پیش کر رہی ہیں۔ کیری آن عمیرہ، ویل ڈن گڈ جاب... نیوز اینڈ کر محمد جنید سے ملاقات امیر سوری۔ باقی سارے سلسلے بھی دلچسپ اور حسب معمول معلوماتی تھے۔

ج۔ پیاری ہاجرہ! صفحات محدود ہونے کے باعث آپ کا طویل تبصرہ شائع نہ کر سکے لیکن ہم نے پوری توجہ اور غور سے آپ کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔

آپ نے خط کا آغاز دعا سے کیا، اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمارے قارئین کو بھی سلامت رکھے۔ ہماری کامیابی میں درحقیقت آپ سب شامل ہیں۔

لہنی زبیر، اقراء، نوید، آساء، رحیل، سندھی، بہاء الدین

نہیں مطلب۔ 5 سال پرانی تصویر۔ اب حیات بہت زبردست، بہت عمدہ ہے۔ ایرک کا کردار بھی بہت اچھا ہے۔ ایرک کا قرآن مجید کو پڑھنا اور سیکھنا، پھر اس پر عنایہ کے رشتے کے لیے بات کرنا۔ سالار کا بڑے ہی اچھے طریقے سے سمجھانا۔ بہت اچھے جملے استعمال کیے ہیں۔ اس کے بعد دو سرا بڑا ناول، نمل، نمروہ جی کا جو کہ خواتین ڈائجسٹ کی جان ہے کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں جملوں کے استعمال سے لے کر پس منظر، کردار سازی، ہر چیز اعلا سے اعلا ہے۔ اور اس خوب صورت مصنفہ کو بھی انٹرویو میں شامل کریں جیسے آپ نے صائمہ اکرم چوہدری کا ناول چھپنے کے بعد انٹرویو کیا۔ ویسے ہی آپ عمیرہ اور نمروہ کا بھی انٹرویو کریں۔ آپ کو نہیں پتا کہ میں کس قدر خوار ہو کر پیہ رسالے لیتی ہوں۔ میں کوئی تین، تین چکر لگاتی ہوں ایک شاپ کے پھر کہیں جا کر مجھے رسالے دیکھنا نصیب ہوتے ہیں۔

حج - پیاری سنبھل! ہمیں احساس ہے کہ بہت ہی دور دراز جگہوں اور گاؤں دیہات میں پر جا بہت تاخیر سے پہنچتا ہے اور ہماری قارئین کو پر جا حاصل کرنے میں بہت پریشالی ہوتی ہے۔ ہم غور کر رہے ہیں کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ آپ سب آسانی سے پر جا حاصل کر سکیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ صائمہ جی کی تصویر پانچ سال پرانی ضرور ہے، لیکن پانچ سال اتنی طویل مدت بھی نہیں کہ انسان تبدیل ہو جائے۔ آپ ان کی تصویر کو تازہ ہی سمجھیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ بٹ۔ لاہور

شمارہ ہاتھ میں آتے ہی پہلی ہی جست میں نمل پر پہنچتی ہوں۔ نمروہ جی بہت اعلا بہت عمدہ از مراد فارس کی کیمسٹری

کمال کی ہے۔ سینس سے بھرپور دشت، جنون بھی نہایت عمدگی سے چل رہا ہے۔ نارلٹ افسانے بھی سب اچھے ہوتے ہیں۔ بٹ ہو کر عفت سحر طاہر کے بٹ ہاؤس کو بھول جاؤں؟ کہاں لکھا ہے بھئی۔ عفت جی آپ کا بٹ ہاؤس ہمارے بٹ ہاؤس میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ میرا بھائی سیف، ڈائجسٹ نہیں پڑھتا مگر مہینے عفت جی کے بٹ ہاؤس کا ضرور پوچھتا ہے۔ (آیا عفت جی نے حاضری دی ہے یا نہیں) پلیز نمروہ احمد اور ہماری پیاری آپا شاہین رشید کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں۔

حج - پیاری عائشہ! آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر۔۔۔ نمروہ احمد اور شاہین رشید نے انٹرویو دیا تو ضرور شامل کریں گے۔ بٹ ہاؤس تو ہمیں بھی بے حد پسند ہے۔ کئی بار عفت سے فرمائش کر چکے ہیں۔ وعدہ تو کئی بار کیا ہے انہوں نے۔۔۔ مگر مسئلہ فرصت نہ ملنے کا ہے۔ آج کل وہ شعاع میں ناول لکھ رہی ہیں۔

حراسہ ہاڑی

ہیں، میری بڑی سسٹرز اور میری بھانجیاں رسالے سے شوق سے پڑھتی ہیں لیکن خواتین ڈائجسٹ کا باقاعدہ قاری ”نمل“ نے بتایا۔ نمروہ آپی اس ناول کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ میرے بھائی بھی نمل کو باقاعدگی سے ہر ماہ پڑھتے ہیں اور نہ صرف رسالہ لا کر دیتے ہیں بلکہ میرے ساتھ تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ اب حیات بہت ہی اچھی لگاتی ہے۔ دشت، جنون انٹرنٹنگ اسٹوری ہے۔

حج - پیاری حراسہ! یہ جان کر اچھا لگا کہ آپ کے گھر میں سب لوگ خواتین ڈائجسٹ شوق سے پڑھتے ہیں اور بھائی بھی جو نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ آپ کو لا کر بھی دیتے ہیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔

سانحہ ارتحال

خواتین ڈائجسٹ کی مدیرہ خصوصی امت الصبور کی ہمشیرہ اسما شعیب اس وارفانی سے رحلت فرمائیں۔

انا اللہ وانا الیہ راجعون

ادارہ خواتین ڈائجسٹ امتل الصبور کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومہ کی خطاؤں کو دور کر کے اپنی جوار رحمت میں جگہ اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

(صباحت یا صبحین) اتنے معصوم تھو نہیں ہوتے جتنا اس میں دکھائے گئے ہیں۔ افسانہ پڑھ کر نہ خوشی ہو رہی ہے نا غم۔ ”محفوظ“ ہاجرہ ریحان۔ اس کہانی میں کیا لکھوں اگر کوئی تبصرہ نہ کروں تو برا نہ مانے گا۔ چھوٹی بچی نے پہلی دفعہ جائے بنائی ہے تو کیا ہوا اگر دزدہ زیادہ ڈل گیا۔ جی اسٹونگ ہو گئی۔ ہماری بچی ہے آخر کسی کو کیا اس سے۔ زندگی ایک کہانی۔ عائشہ ناز علی، ہیروئنوں نے وہی نہیں میں اچھل کر یا لہنگوں میں الجھ کر ضرور گرنا ہوتا ہے اور نام کروڑ سا نئے سے آجاتے ہیں۔ اناجی کا کرکٹر مضبوط تھا۔ ڈائریلاگ تھے اور ”بس ایک کہانی ہی تھی“ جو لکھاری نے اپنی وسعت کے مطابق کھینچی اور خوب کھینچی۔ بھالی بڑی ہی اچھی کہانی ہے۔

اکاس نیل شازبہ الطاف ہاشمی۔ ٹریڈی نہ لکھیں تو بتر ہے۔ زندگی میں پہلے ہی لوگ منکان اور غربت کے ہاتھوں مر رہے ہیں۔ یہ ناول نی وی والوں کے لیے لکھے ہیں سارے نہیم خواتین ڈا جسٹ سے لکھا۔ جاتے ہیں اور لکھاری کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں بس معصوم سنا خواتین ڈا جسٹ جہاں تھا وہیں ہے۔ خدا کے لیے اچھا لکھیں بوزیو لکھیں امید لکھیں ناامیدی مت لکھیں۔ کبھی عشق ہو تو (صدف آصف) پلکیں خم زاہد ہوں تو کیا ہو جانا تھا۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ انہی ساری پلکیں نوج لوں۔ فضول کہانی ڈیڈ کے فضول ایمیشن ہیروئن کی غیر فطری زندگی کسی لوگیا متاثر کرے گی۔ عام قاری کے لیے بے انتہا کشش ہے اس میں۔ نزل نزل کالوں کو ہاتھ سے گھمانا۔ گھنٹا لگے ہال اب ٹوئسٹ ڈال دیا کہ وہ ماں بننے کے عمل سے گزرا جائے گی۔ ”جنت کے پتے“ کے بعد قاری کی امیدیں بہت بڑھ گئی تھیں جو اس ناول میں پوری نہ ہو سکیں۔ کرن کرن روشنی میں بتا دیتے کہ مجبور کی جانے والی عورت جو مجبوری سے یہ پیشہ اپناتی ہو کسی کے مجبور کرنے پر کرتی ہو اس کی معافی ہے۔ ”آب کا باورچی خانہ“ چونکہ پھوڑا ہے۔ کچھ آتا تو نہیں، لیکن جب جاتی ہوں تو کچھ کر کے نکلتی ہوں۔

ناول، افسانے اب پہلے جیسے دلچسپی سے بھرپور نہیں ہوتے لیکن اتنے برے بھی نہیں ہوتے کہ بڑھنا چھوڑ دیں۔ عمیرہ احمد کو تو میں پڑھے بارہ نہیں سکتی۔ نمرہ احمد مجھے بے حد پسند ہیں ان کی جنت کے پتے تو کیا ہی کہنے مگر نمل بھی کسی سے تم نہیں مگر دیرہ جی زرا اس بات پر توجہ دیں کہ کہ ان کی تحریر میں ایک مخصوص مکتبہ فکر کی چمک صاف محسوس ہونے لگی ہے۔ صدف آصف بہت واضح سیدھا سادا لکھتی ہیں بہت سحر کی المی کی تعریفوں پر مشتمل تحریر بھی اچھی تھی۔ صباحت یا صبحین نے مزے کا لکھا۔ ہاجرہ ریحان بھی مقبول رہیں مگر آکاس نیل نے دل بوجھل کر دیا۔ خدار افسانوی دنیا کو حقیقت کا تلخ جام نہ پلا میں۔ فیصلہ ”انتہائی میچور جان دار اور سبق آموز تحریر تھی۔ وقت سے لکھتی ہیں۔ مگر جاندار لکھتی ہیں عمر یا زکی باتوں نے خوب شعور دیا۔

بج۔ پیاری سلمی! آپ کی تنقید اور تعریف اچھی لگی۔ میں اتنا نہیں ہے کہ ہماری مصنفین کی تحریروں میں فصاحت و بلاغ کا ریحان بڑھتا جا رہا ہے اور کوئی بھی چیز جو حد سے بڑھ جائے اپنا اثر کھو دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کچھ ہلکی پھلکی کہانیاں بھی شامل کرتے ہیں۔ نمرہ احمد ہوں یا کوئی اور مصنفہ ہم کسی بھی مکتبہ فکر کی نمائندگی نہیں کرتے ہم صرف نقاب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت پر پیشینہ دیکھتے ہیں۔ اور پڑھنے والے اسی کے مطابق تحریریں شامل ہوتی ہیں۔

تجزیہ نگار۔ شجاع آباد روڈ ننگران

میری پیاری لکھاریوں، لاج دلا ریوں سب کچھ لکھو بس بے مقصد نہ لکھو۔ اس سرائ کا بہترین ”ناول“ عبد الست تنزیلہ ریاض صاحبہ کا ہی رہے گا۔ پیاری نمرہ احمد آپ مجھے یہ بتائیے کہ یہ کورٹ پکری اک عام قاری کو کس طرح متاثر کرے گی؟ عمیرہ احمد کیا آپ ہائی ایلیٹ سے

تعلق رکھتی ہیں۔ اتنے بھاری بھر کم الفاظ کہاں سے لاتی ہیں۔ کہانی اچھی ہے۔ طول دینے کے چکر میں سراس بھی کبھی سو سبھی بن نہ جائے۔ ”المی“ کہانی اچھی تھی ہم تو اچھل اچھل کر لیٹ کر بھی کوئی نیکی کریں کسی کو بھی نظر نہیں آتی۔ بہر حال افسانہ اچھا تھا۔ آف یہ عورتیں

کہانیاں ہیں، لیکن لکھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ میں ایم اے انگلش ہوں اور پڑھی لکھی فیملی سے تعلق ہے۔ اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں قاتلہ رابعہ جیسی اعلا پائے کی لکھنے والی مصنفہ کے شہر گوجرہ سے ہوں۔

ج۔ شانہ! آپ اتنے طویل عرصہ سے ہمارے ساتھ ہیں اور آپ کو مطالعہ کا شوق بھی ہے۔ لکھنا چاہتی ہیں تو پوچھنے کی ضرورت نہیں، ہم نئے لکھنے والوں کی پوری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

مسرت شاہین... پن جڑوہ آزاد کشمیر

پندرہ سولہ سال سے خاموش قاری ہوں۔ نمل بہت اچھا ہے۔ اب حیات کی تو کلیات ہے۔ آج میں سمیرا حمید کے ”بورشے“ کی وجہ سے لگھ رہی ہوں۔ سچ کیا عمدہ لکھا ہے سمیرا نے۔ ان کی تحریریں بہت زبردست ہوتی ہیں۔ زندگی بہت اندھیری تھی تو بورشے پڑھا۔ یوں لگا ایک دم سے روشنیاں بھر گئی ہوں۔ ان کے لفظوں نے مجھے زندہ کر دیا۔ ”محبت میں التجا نہیں کرنی چاہیے اہتمام کرنا چاہیے۔ التجا تو بھکاری کرتے ہیں۔“ تو مجھ بھکاری کیوں نہیں؟ اہتمام ہم کر نہیں سکتے تو سب اللہ یہ چھوڑ دیا اور ماریہ کی جو حالت لکھی ہے وہ جیسے میری حالت ہو، فرق یہ ہے اس کے پاس بورشے اور جگنو تھے میرے پاس دو سروں کے لیے اچھی بیوی ہے۔

ج۔ پیاری مسرت! اچھی سوچ بورشے اور جگنو سے کم نہیں جو دونوں میں محبت کو جنم دیتی ہے اور آپ کی اور دو سروں کی زندگی کو آسان بناتی ہے اور یہ بھی اللہ کا انعام ہے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ ہماری دیرینہ قاری ہیں۔ آپ کو محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔



میں ہر چیز مانتی ہے۔ خرید کر لگائیں۔ محمود ریاضی صاحب انشائی کے بڑے بھائی ہیں۔ انشائی کی تحریر پر بصرہ بہت خوب!

نمل کے بارے میں آپ کی معلومات میں اضافہ کر دیں کہ خواتین کی قارئین نمل کو بے حد پسند کر رہی ہیں اب ”عام“ قاری کے بارے میں ہمیں نہیں پتا وہ کون ہیں اور نمل سے متاثر نہیں ہوں گے اور عمیرہ احمد نے تو کبھی بھاری بھر کم الفاظ استعمال کیے ہی نہیں، وہ بہت سادہ اور رواں انداز میں لکھتی ہیں ان کی کہانیوں میں ”بھاری بھر کم الفاظ“ ہمیں حیرت ہو رہی ہے۔

اللہ کا بڑا کرم ہے کہ ”معصوم“ سے خواتین ڈائجسٹ کو اللہ نے بڑی عزت سے نوازا رکھا ہے، یہ وہیں کا وہیں نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت بھی بڑھتی رہی ہے۔

عائشہ صدیقہ... چیچھ وطنی گٹو شالہ

میری نمرہ احمد سے ایک درخواست ہے اگر آپ ان تک پہنچا دیں گا پلیز نمرہ احمد جی آپ ”بخت کے پتے“ کا پارٹ ٹو لکھیں جس میں بتائیں کہ حیا اپنی بیٹی کی تربیت کس طرح سے اسلامی ویلیوز کے مطابق کرتی ہے کہ اس کی بیٹی وہ تمام ویلیوز کو اپنے اوپر بوجھ سمجھنے کے بجائے اسے دل سے قبول کرتی ہے۔

ج۔ عائشہ! آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ اس لیے رائے دینے سے قاصر ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد تک آپ کی فرمائش ان طور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

شانہ شمیم... گوجرہ

مجھے بچپن سے ہی مطالعے کا بے حد شوق ہے، اب ماشاء اللہ سے چھبیس اپریل کو میں نے اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ منائی ہے، لیکن جنون اب بھی ویسا ہی ہے۔ آپ کے ادارے کی قابل تحسین بات یہ ہے کہ آپ نئے لکھنے والوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ میرے دل میں بھی بہت سی جگ بیتیاں، آپ بیتیاں افسانے

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ کسی بھی صورت میں ان کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت کی اشاعت یا اور مالی شکل کو برداشت کرنا کسی بھی طرح کے اشتغال کے لئے یا کسی اور مقصد کے لئے یا کسی اور ادارہ کو فنڈ چارج کرنے کے لئے یا کسی اور مقصد کے لئے نہیں کی جائے گی۔

خبریں و سنیں

واصفہ ہیل

بھارتی فلم انڈسٹری کے معیار میں بہت بڑا فرق ہے۔ (آپ کے والد کو یہ فرق نظر نہ آیا۔؟) میں نے آج تک کسی پاکستانی فلم میں کام نہیں کیا۔ (کسی نے ویسا ہی نہیں کیا۔۔۔) لیکن میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ پاکستانی انڈسٹری کے مقابلے میں بولی وڈ زیادہ گرم جوش اور شفقت بھرا ہے۔ بولی وڈ کے لوگ ایک خاندان کی طرح کام کرتے ہیں۔ (تو باہر کے لوگ۔۔۔؟) ہندی فلم کرنے کے بعد میں بطور اداکارہ ٹھہری ہوں۔ (یہ تو فلم دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔۔۔؟)

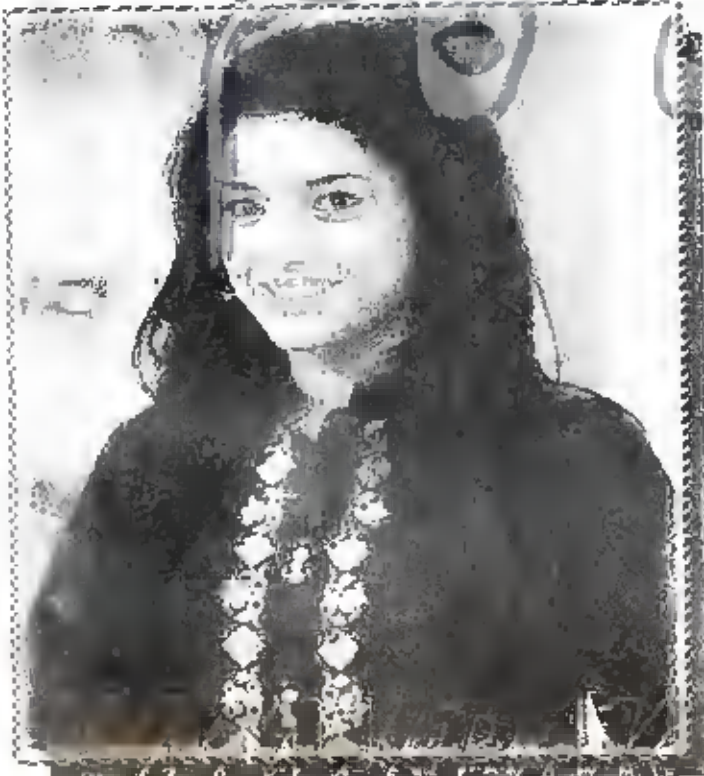


شوق

صنم جنگ باتیں بہت اچھی بناتی ہیں (اسی لیے توئی کی کامارنگ شو اتنی کامیابی سے چلا رہی ہیں) لیکن کھانا بنانا اتنا اچھا نہیں آتا (یہ بات صنم اپنے شو میں بھی بتاتی ہیں) اکثر انہیں ناشتا بھی ان کے شو ہر بنا کر دیتے ہیں (ہائیں!) کیا ٹنگ کو کو کنگ۔۔۔ کی ٹریننگ

چاپلوسی

ہمارے اکثر فنکار جب بولی وڈ جاتے ہیں تو کچھ عرصے بعد انہیں پاکستان انڈسٹری میں خامیاں اور بولی وڈ میں خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ (بھئی۔۔۔) کام میں جان نہیں ہوتی وہ تو ایسا ہی کہیں گے) ان ہی لوگوں میں مول شیخ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ پاکستان میں جب اداکاری ڈانڈا لگ ڈلیوری مارٹنگ شو کی میزبانی ہر طرف سے فیل ہو کر وہ اپنے والد کے حوالے سے بھارت جا پہنچیں اور ”بھاگ بھئی بھاگ“ نامی فلم کے ذریعے بولی وڈ میں قدم رکھا۔ خیال رہے مول نے پاکستان میں کوئی فلم نہیں کی۔ (سپاٹ لوج اور تاثرات سے عاری چہرہ۔ فلم تو کیا ڈراما بھی نہ ملے۔) اس کے باوجود موصوفہ کو بھارتی انڈسٹری کے لوگ پاکستانی انڈسٹری کے لوگوں سے زیادہ پیار دینے والے لگتے ہیں۔ ایک بھارتی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے مول نے کہا کہ ”پاکستان اور





بھی دی جاتی ہے؟) لیکن اب صنم بھی سکھ بننے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ ایک شیف سے کلاسز لینا شروع کر دی ہیں۔ (ارے صنم! چیتل پر بھروسا نہیں ہے آپ کو۔؟) ویسے صنم جس طرح آپ کھانا پکانا پکانے میں دلچسپی لے رہی ہیں مستقبل قریب میں کوئٹہ شوکی میزبانی کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ (آخر سکھ شوہر کو متاثر بھی تو کرنا ہے نا۔)

حوصلہ افزائی

اولپک گیمز کے پہلے ایونٹ میں ہی پاکستان کے تمام کھلاڑی اولپک سے باہر ہو گئے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اولپک کی کوئی تیاری نہیں کی جاتی۔ اس کے فنڈز کہاں جاتے ہیں اس کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں (جواب تو اس شرمندگی کا بھی نہیں ہے جو اس صورت حال میں عوام کو ہوئی۔) پاکستان کے ویٹ لفٹر نوح دستگیر بٹ بھی یہی شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”ہمیں کسی ادارے کا تعاون ہی حاصل نہیں میں کسے کسی ایونٹ میں حصہ لینے کا ارادہ کروں۔“ (بالکل سچ کہہ رہے ہیں آپ ابھی تک محمد آصف کو بھی انعامی رقم نہیں ملی۔) انہیں الہ نوح دستگیر کہتے ہیں کہ ”میں اگر سترہ سال کی عمر میں 212 کلو گرام وزن اٹھا سکتا ہوں تو اولمپکس میں حصہ کیوں نہیں لے سکتا۔ (بھئی آپ کے پاس کوئی سفارش نہیں ہوگی نا ورنہ۔؟) وہاں تو میری ویٹ کھٹگری کے ویٹ لفٹر کو زیادہ سے زیادہ 250 کلو گرام وزن ہی اٹھانا تھا۔“

اواکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اواکار کا خوش شکل ہونا ضروری ہے اس بارے میں فیروز خان کہتے ہیں کہ ”بالکل نہیں اچھی شکل صرف ایک فیکٹر ہے۔“

جسے کچھ دیر کے لیے اسکرین پر برداشت کیا جا سکتا ہے۔ (جیسے کسی بھی آپ خود بھی تو اپنا ذہن استعمال کریں ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔؟) لیکن اچھا اواکار وہ ہوتا ہے جو اپنے کردار کو سمجھے اس کے مکالموں کی اداکاری کا خیال رکھے (جیسے کہ آپ؟) اور اپنے کردار کو اس طرح سے نبائے کہ دیکھنے والوں کو اصل کا گمان ہو۔ کسی اواکار کے لیے سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کردار میں اپنے آپ کو کس طرح ڈھالتا ہے۔ (فیروز! آپ یہ باتیں عمیمہ کو کیوں نہیں سمجھاتے۔؟)۔

معیار

فنکار گھرانے سے (بھئی عمیمہ ملک اور دعا ملک کے بھائی جو ہیں) تعلق رکھنے والے فیروز خان نے اپنے پہلے ڈرامے سے ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ سرے اور میرے ڈرامے میں بھی اپنی اداکاری سے اپنے معیار کو قائم رکھا۔ اچھا



گوشت کے پیکولن

خالہ جیلانی

ہر ادھنیا، پودینہ، ہری مرچیں، وہی، لہسن اور ک پیس بیس۔ اب ایک پیلی میں تیل ڈال کر گرم کر لیں اس میں باریک کٹی ہوئی اور ک ڈال کر بھونیں پھر اس میں پسا ہوا آمیزہ ڈال کر کچی شامل کر دیں۔ جب اس کا پانی خشک ہونے لگے اور کچی گل جائے تو اسے بھون کر چولہے سے اتار لیں۔

ڈش میں نکال کر اور ک، ہر ادھنیا، پودینہ اور لیموں چھڑک کر گرم گرم نان کے ساتھ نوش فرمائیں۔

یوں تو خاتون خانہ کے دن کا بیشتر حصہ کچن میں ہی گزرتا ہے۔ مگر عید الاضحیٰ میں تو یہ مصروفیت انتہا پر جا پہنچتی ہے۔ گوشت کی وافر مقدار کے ساتھ ساتھ فرمائشوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے جو گھر کے خوش خوراک اور کھانے پینے کے شوقین افراد کی جانب سے مہیا کی جاتی ہے۔ خود خاتون خانہ کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ وہ روزمرہ کے کھانوں سے ہٹ کر نئے نئے پکوانوں سے گھر والوں اور مہمانوں کی تواضع کریں۔

اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم نے عید الاضحیٰ کے لیے کچھ خصوصی پکوان آپ کے لیے منتخب کیے ہیں۔ امید ہے تعریف سمیٹتے ہوئے ہمیں داد و ثناء نہیں بھولیں گی۔

نمک گوشت

اجزاء :

- ایک کلو گائے کا گوشت
- دو کھانے کے چمچے پسا لہسن اور ک
- ایک چمچے نمک
- ایک کھانے کا چمچے پسی کالی مرچ
- آدھا کھانے کا چمچے لال کٹی مرچ
- چار سے پانچ ہری مرچیں
- تین سے چار لیموں

ترکیب :

گائے کا چربی اور بڈی ملا گوشت لے لیں۔ ایک کھلے منہ والی دیکھی میں گوشت ڈال کر پانی اتنا ڈالیں کہ گوشت اچھی طرح ڈوب جائے پھر اس میں نمک، لال کٹی مرچ، پسی کالی مرچ اور ہری مرچیں ڈال کر دھیمی آنچ پر چڑھا دیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور گوشت اچھی طرح گل جائے تو اسے بھونیں دو سے تین منٹ کے لیے پھر اور ک اور لیموں چھڑک کر

ہر امسال کچی

اجزاء :

- کچی
- وہی
- ہر ادھنیا
- پودینہ
- ہری مرچیں
- پسا لہسن اور ک
- پسی کالی مرچ
- لال کٹی مرچ
- نمک
- تیل

ترکیب :

کچی میں پسا لہسن اور ک اور چار گلابی پانی ڈال کر چڑھا دیں۔ جب کچی اڑھ گئی ہو جائے تو چھان لیں۔

لیں۔ ایک بڑے پیلیے میں پہلے آدھے چاولوں کی تہ لگائیں۔ اس کے اوپر تیار کیے ہوئے گوشت کے آمیزے کو ڈالیں۔ اس کے بعد بقیہ چاولوں کی تہ لگائیں۔ زعفران کو گرم دودھ میں بھگو کر چاولوں کے اوپر ڈالیں۔ ہر ادھنیا و پورینہ ڈال کر دم پہ لگا دیں۔ مزیدار و بری بریانی تیار ہے گرم گرم سرو کریں۔

ہانڈی کباب

- ایک کلو
- ایک کھانے کا چمچ
- دو کھانے کے چمچے
- حسب ذائقہ
- دو عدد
- تین ثابت چینی باریک کٹی ہوئی
- ایک عدد
- ایک پیالی
- دو کھانے کے چمچے
- ایک چائے کا چمچ
- دو عدد
- ایک کھانے کا چمچ
- آدھا کلو
- ایک گھنٹی
- تین سے چار عدد

- اجزاء :
- گائے کا قیمہ
 - لال کٹی مرچ
 - خشک دودھ
 - نمک
 - لیموں
 - ہری مرچ
 - پیاز
 - تیل
 - چینی
 - کالی مرچ کٹی ہوئی
 - ڈبل روٹی کے سلائس
 - پسا اورک لہسن
 - ٹماٹر
 - ہرا ادھنیا
 - لیموں
- ترکیب :

سب سے پہلے قیمے میں سلائس کا درمیانی حصہ بیسن (بیسن کو پہلے گھی میں بھون لیں) ہری مرچ اور نمک ملا کر پیس لیں۔ ایک انڈا قیمے میں ملا کر اس کو گوندھ لیں پھر چھوٹے چھوٹے سیخ کبابوں کی طرح کباب بنا کر ہلکی آج پر تل لیں۔ جب کباب شہری ہو جائیں تو نکال لیں۔ اب ایک پیلی میں تیل ڈال کر پیس ہوئی پیاز ڈال دیں جب گلابی ہو جائے تو ٹماٹر، سرخ مرچ، کالی مرچ، پسا لہسن اورک، نمک اور ہری مرچ

- اجزاء :
- گوشت
 - چاول
 - پسا لہسن اورک
 - پیاز
 - نمک
 - پسی لال مرچ
 - پسا ادھنیا
 - ہلدی
 - آلو بخارے
 - دہی

- دو عدد
- ایک چائے کا چمچ
- آدھا چائے کا چمچ
- ایک چوتھائی چائے کا چمچ
- چھ سے آٹھ عدد
- ایک کپ
- دو عدد
- ایک چائے کا چمچ
- ایک عدد
- تین عدد
- دو عدد
- حسب ضرورت
- دو کھانے کے چمچے
- ایک چائے کا چمچ
- حسب ضرورت

پتیلی میں گھی گرم کریں۔ اس میں پیاز ڈال کر سنہرا ہونے تک تلیں۔ اس کے بعد اس میں گوشت، نمک، پسا لہسن اورک ڈال کر پانی خشک ہونے تک پکا میں۔ پھر اس میں لال پسی مرچ پسا ادھنیا، ہلدی، آلو بخارے، دہی، جھوٹی الائچی اور بڑی الائچی ڈال کر بھون لیں اور ایک کپ پانی شامل کر کے ڈھک کر ہلکی آج پر گوشت گلنے تک پکا میں۔ ایک پیلی میں چاول ڈالیں اس میں پانی، نمک، بادیاں کے پھول، لونگ، کالی مرچ ڈال کر چاولوں کو ایک کنی رہنے تک ابال لیں۔ اس کے بعد پانی نھار کر چاولوں کو الگ رکھ

ملا لیں پھر گوشت رکٹ لگا کر مسالا اس پر لگا دیں۔ اب مسالا لگے گوشت کو کم از کم پانچ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پانچ گھنٹے بعد گوشت کو ابال لیں، اسے گوشت کے ٹکڑے کاٹ لیں پھر ان کو چاہیں تو اسی طرح کھالیں، زیادہ ذائقہ دار بنانے کے لیے تھوڑے سے تیل میں تل لیں۔

ڈال کر پکنے دیں۔ جب پانی سوکھنے لگے تو ہلکا سا بھون لیں، پھر تلے ہوئے کباب پھیلا کر ڈال دیں اور پورے لیموں کا رس اور ہر ادھنی ڈال کر ہلکی آگ پر دم پر رکھ دیں۔ مزید ادھنی کباب تیار ہیں۔ گرم نان کے ساتھ نوش فرمائیں۔

بارہنی کی بوٹی

اجزاء :

گائے کی بوٹی (انڈر کٹ) ایک کلو

پسا ہسن اور ک

ایک چائے کا چمچ

پسی لال مرچ

دو چائے کے چمچے

دو کھانے کے چمچے

دو کھانے کے چمچے

حسب ذائقہ

کباب چینی (پسی ہوئی) آدھا چمچ

ترکیب :

گوشت کو اچھی طرح دھولیں۔ اس پر نمک، وہی،

پسیٹا، ہسن، اور ک لال مرچ، کباب چینی اور گھی لگا کر

ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ تینوں پر بوٹیاں لگا میں

اور اوون میں بیک کریں۔ چاہیں تو کونک پر تین سینک

سکتے ہیں۔ مزید ادھنی کی بوٹی تیار ہے۔ تینوں سے

اتار کر پلیٹ میں رکھیں اور سردی کے ساتھ سروس کریں۔

ہنشریف

اجزاء :

ران کا گوشت

ایک کلو

ہسن

ایک گھنٹی درمیان

سرکہ

ڈیزھ پیالی

ادرک

ایک ٹکڑا

نمک

ایک کھانے کا چمچ

ترکیب :

ہسن اور ک کو پین کرا نمک اور سرکہ بھی اس میں

ڈرائی فروٹ شیر خرمہ

اجزاء :

دودھ

چینی

سویاں

گھی

چھوٹی الائچی

تاریل، چھوہارے

پستہ، بادام، کشمش

پسے چاول کا آٹا

ترکیب :

دینیچی میں گھی گرم کر کے الائچی ڈال کر

کڑا کر لیں۔ سویاں، چھوہارے، پستہ، بادام اور

کشمش ڈال کر بھون لیں۔ پھر اس میں پہلے دودھ اور

چینی ملا میں اور الگ سے تھوڑے سے دودھ میں

چاول کا آٹا گھول کر ڈال دیں۔ دس منٹ تک ہلکی آگ

پر پکا میں اور جو لہا بند کر دیں۔ سردنگ ڈش میں شیر خرا

نکال کر میوے سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔



لازمی پکیتی ہے۔ آپ بھی قرآنی سنیے کا۔
 3۔ بھئی ہم تو قرآنی میں بھر پور حصہ لیتے ہیں۔ گوشت بناتے ہیں۔ پیک کرتے ہیں۔ بھائیوں کے ترلے منٹیں کر کے انہیں لوگوں کے گھروں میں دینے کے لیے بھیجتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے گھروں کے مردوں کو گوکنگ کا زیادہ شوق ہے۔ کمال کے لک بھی ہیں۔

نوال افضل گھن۔ گلستان جوہر کراچی

1۔ بقرہ عید چونکہ قرآنی پر ڈیٹنڈ ہوتی ہے۔ تصاب کب دستیاب ہو اور کب گوشت کی وصولی ہو۔ ویسے پہلا دن ہمارے ہاں اور دوسرا دن میری عزیز از جان دوست عارفہ معین کے ہاں ماڈل ٹاؤن میں جہاں بانو قدسیہ جی سے بھی ملاقات کا شرف نصیب ہو جاتا ہے۔

3۔ جی جناب کیوں نہیں اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انٹرنیشنل لیول پر ڈیٹنڈ مردوں ہی کے ہاتھ ہیں۔ پی سی ہو مل وغیرہ میں اور سب فائو انٹار اور سیون اشارز میں مزہ می ملاشبہ اعلا یا بے کے شیفٹ ہیں۔ تو میرا ہم سفر واقعی بہت میری بہت مدد کرتا ہے ہر کام میں ماہر یہ میری لکت ہے۔

استعمال کریں منک خوشبو، ذائقہ لذت، سب ہی چھ اس منٹن اسٹیشنل میں ملے گا۔ ہمیشہ کھانے والا بس انگلیاں چاٹنا رہ جائے گا ساتھ میں چاہے سفید چاول سرو کریں چاہے گھر کے آنے کی نرم خوشبودار بھابھ اڑانی چیتاں یا پھر روغنی (کشمیری خوراک) خمیری روٹی + نان کچے گرم گرم سالاد ساتھ ضرور بنائیں لیوں سے سجا کر مزانہ آیا تو پھر کہہ سے گا۔ ہاں اہم بات تو شیئر کرنا بھول چلی تھی۔ غلو ص محبت اور خاص طور پر مہمان نوازی اللہ کریم کو پسند ہے۔ یہ نیت کر کے پکائیں، کھلائیں اور کھائیں گی تو سچا مزا آئے گا دلی خوشی ملے گی۔

3۔ سچ کہتے ہیں میٹھی عید لڑکیوں بالیوں، بچوں بچیوں کی پیچھے، میکے میں تو والد محترم ساتھ مل کر پکاتے کھلاتے پلا کھا چجاتے تھے مگر سسرال میں مرد ویسے دینی تھے مگر گھر کے کاموں میں ہاتھ لگانا بالکل اچھا نہیں سمجھتے تھے ذاتی طور پر

مجھے گھر کے کام اپنے ہاتھوں سے کرنے بہت اچھے لگتے ہیں البتہ صحت احازت نہ ہے تو پھر بوجھ لگتا ہے ورنہ کبھی نہیں کیونکہ ہمارے ابو جی کی تربیت خالص اسلامی تھی مہمان بو تھ نہیں رحمت ہے اور واقعی رحمت ہی ہوتا ہے۔ آزما کر عقل سے دیکھیے گا۔

طہ محمد مصطفیٰ فاروق آباد

1۔ مہمان زیادہ انوائٹنڈ نہیں ہوتے تو کونکہ سب ہی کی طرف قرآنی ہوتی ہے تو عید مل کے سب اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں اور ہاں بھئی سارا دودھیال ایک ہی محلے میں آباد ہے۔ البتہ فرینڈز کو بلایا جاتا ہے تو خوب موج میلا ہوتا ہے۔ دعا میری چھوٹی سسر اس کی ذمہ داریاں صرف اور صرف گوکنگ کرنا۔ میرا صفائی و ستھرائی اور امی جان کا روٹی وغیرہ پکانا۔

2۔ گوشت کی کوئی بھی خاص ڈش نہیں۔ مجھے تو گوکنگ کا کچھ خاص پتا نہیں۔ البتہ دعا ہوتی تو بتاتی وہ محترمہ پاسٹل میں زیر تعلیم ہیں۔ البتہ ابلا ہوا تمکین گوشت مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تھوڑا سا نمک پانی اور گوشت پر پشکر میں ڈال کر بند کریں۔ پندرہ منٹ بعد بوا ملڈ میٹ تارے۔ فاروق آباد کی مشہور اور مرغوب عذائے ہے۔ یہ ہر گھر میں

خواتین ڈائجسٹ

کی بہت سے بہنوں نے لکھا ہے اور ناول

شوہر بخاری

قیمت: 300 روپے

مکھانے کا پتہ:

کیمبرج ٹاؤن 37، سہیل کراچی، فون نمبر: 3273



6. "سازی؟"
- "میں شادی شدہ ہوں اور تقریباً ساڑھے چار سال ہو گئے ہیں شادی کو... اور ماشاء اللہ سے، ویسے میں میرے۔"
7. "تعلیمی قابلیت؟"
- "بی کام۔"
8. "شور میں آؤ؟"
- "اپنی ایک دوست کی کرن نے مجھے اس طرف راغب کیا اور ماڈلنگ سے ابتدا ہوئی۔"
9. "پہلا ڈراما؟"
- "تھوڑا سا آسمان۔"
10. "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"
- "کام پر توجہ دے۔ کام ہو تو صبح کی ڈرنڈ آرام سے اٹھتا ہوں۔"
11. "ناشتہ ڈٹ کر کرتے ہیں؟"
- "بالکل جی صبح اٹھ کر شور لے کر اچھا سا ناشتہ کرتا ہوں۔"

میری پہلی میری بھائی کا اہم کردار

ڈراما کرام عیاسی سے

شعبان رحیم

12. "والدین کے لاڈلے تھے؟"
- "جی الحمد للہ... مگر بد قسمتی سے والدہ بیمار اساتھ جلدی چھوڑ گئیں۔"
13. "کوئی کھانا جو بالکل پسند نہ ہو؟"
- "ماش کی ہال کے علاوہ سب کچھ کھا لیتا ہوں۔"
14. "اپنے آپ کو مکمل سمجھتے ہیں؟"
- "اگر جسمانی لحاظ سے دیکھا جائے تو مکمل ہوں۔ باقی تو ہر انسان میں کمی بیشی ہوتی ہی ہے۔"
15. "شدید بھوک کو کس طرح کم کرتے ہیں؟"
- "کچھ بھی مل جائے کھا لیتا ہوں۔"

1. "اصلی نام؟"
- "اکرام عباسی۔"
2. "تاریخ پیدائش؟"
- "27 جولائی 1984ء۔"
3. "پیار کا نام؟"
- "آگی۔"
4. "قد/ستارہ؟"
- "5 فٹ 10 1/2 انچ۔"
5. "بہن بھائی؟"
- "تین بھائی ایک چھوٹی بہن دو بھائی اور بہن چھوٹی ہے۔"

30. "گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟"

"میرا ہی تیز ہے۔"

31. "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں؟"

"کوئی کمی نہیں... اللہ نے بہت سی نعمتیں دی ہوئی ہیں۔"

"ہیں۔"

32. "پرائز بانڈ لیتے ہیں؟"

"نہیں شوق ہی نہیں ہے۔"

33. "مشترکہ اکاؤنٹ کس کے ساتھ ہونا چاہیے؟"

"کسی کے ساتھ نہیں اپنا اکاؤنٹ ہی اپنا ہوتا ہے۔"

34. "بچت کس انداز میں کرتے ہیں؟"

"پرائیوی اور گولڈ کی صورت میں۔"

35. "ڈبل شہریت کا شوق ہے؟"

"نہیں جی... اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔"

36. "شاپنگ کے شوقین ہیں؟"

"بے انتہا شوقین ہوں... لڑکیوں سے بھی زیادہ بچے شاپنگ کا شوق ہے۔"

37. "فضول خرچ ہیں؟"

"بالکل جی... دل کھول کر خرچ کرتا ہوں۔"

38. "آپ کو ڈر لگتا ہے؟"

"اللہ کی ذات سے کہ میری کوئی بہت بڑی کوئی فضول خرچی اسے بری نہ لگ جائے۔"

39. "مشکلات میں وقت گزارا؟"

"بہت شدید مشکلات میں وقت گزارا... شادی سے

زیرا سا سال پہلے اور شادی کے ایک سال بعد تک۔"

40. "موڈ خراب ہو تو؟"

"پانی پیتا ہوں، تھوڑی تازہ ہوا کھاتا ہوں اور بس پھر

ٹھیک ہو جاتا ہے موڈ... زیادہ ٹائم نہیں لگتا۔"

41. "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

"ایک اچھی سی مسکراہٹ۔"

42. "شاپنگ میں برانڈز کو ترجیح دیتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں... جو چیز پسند آجائے... میرے پاس پانچ سو

والا جو تاج بھی ہے اور پانچ ہزار والا بھی... پسند پر منحصر

ہے۔"

16. "دوستوں میں دل لگتا ہے یا رشتے داروں میں؟"

"میرا ایک ہی دوست ہے... باقی کام میں ہی بہت

مستروف رہتا ہوں۔"

17. "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"ہر لمحہ... کیونکہ اللہ نے مجھے بہت نوازا ہے۔"

18. "آپ کو انتظار رہتا ہے؟"

"کوئی ایسا دن نہیں ہے۔"

19. "تہوار؟"

"عید۔"

21. "خوشی کو کس طرح سیلبرٹ کرتے ہیں؟"

"مجھے سربراہ تزدینے کا بہت شوق ہے۔ بیگم سے بات

چھیلتا ہوں اور سسپینس کری اٹ کرتا ہوں اور پھر کچھ

ٹائم کے بعد تاتا ہوں۔"

22. "بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی تک موجود ہو؟"

"بھوک بہت لگتی ہے... کچھ کھائے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

23. "نوجوانی کی کوئی بری عادت؟"

"رات کو جاگنے کی عادت... اب کچھ کم ہو گئی ہے۔"

24. "آپ کی کوئی چھپی ہوئی خوبی یا خامی؟"

"جو اوگ مجھ سے ملتے ہیں انہیں قطعی احساس نہیں

ہو تا کہ میں غصے کا بہت تیز ہوں اور خوبی یہ کہ غصہ اٹھتی ہو

جاتا ہوں۔"

25. "غصے میں کیفیت؟"

"دل کرتا ہے کہ پتھر مار کر دیوار توڑ دوں۔ چیزوں کو نقصان

نہیں پہنچاتا... بس دل چاہتا ہے۔"

26. "پسندیدہ دن سات دنوں میں؟"

"جس دن میں اپنے بچوں کے ساتھ ہوتا ہوں۔"

27. "پسندیدہ موسم؟"

"مربوں کا۔"

28. "لڑکیوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"کبھی غور نہیں کیا۔"

29. "کوئی لڑکی گھورے تو؟"

"کوئی ایک گھورے تو رسی ایکشن بھی آئے۔ سب ہی

ہے۔"

43. ”طبیعت میں لاپرواہی ہے؟“
- ”بانگل بھی نہیں.... صبح اٹھتا ہوں تو اپنے بیڈ کی چادر خود ٹھیک کرتا ہوں.... اور دیگر کام بھی۔“
44. ”چھٹی کا دن کہاں گزارتے ہیں؟“
- ”پارک میں، مالز میں اور پھر کھانا کھا کر گھر آجاتے ہیں۔“
45. ”سچی محبت کس میں دیکھی؟“
- ”صرف اور صرف ماں میں۔“
46. ”کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟“
- ”اگر آپ کسی سے سچی محبت کرتے ہیں تو اسے کبھی آزمائش میں نہ ڈالیں۔“
47. ”لڑکی پسند کرتے وقت کیا بات مد نظر رکھنی چاہیے؟“
- ”پہلے نصیحت، پھر صورت۔“
48. ”گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟“
- ”صرف اپنے کمرے میں، حالانکہ سارا گھر ایسا ہوتا ہے۔“
49. ”کیا ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتے ہیں؟“
- ”صرف بیگم کو فوراً، جواب دیتا ہوں۔“
50. ”بوریت ہو رہی ہو تو؟“
- ”درود شریف کی سچی پڑھنے لگتا ہوں۔“
51. ”والٹ کی تلاش کیسے کرتے ہیں؟“
- ”تو ہزار ڈیڑھ ہزار کیش نکلے گا۔ آئی ڈی اور اے ٹی ایم کارڈ.... اور بڑے بیٹے کی نوٹوں کے زیادہ چیزیں لے کر نہیں نکلتا۔“
52. ”اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟“
- ”ایجوکیشن لازمی کر دوں گا، خواتین پہ تیزاب پھینکنے والوں کے ہاتھ توڑنے کا قانون بنا دوں گا.... اور وی آئی پی پر نوٹو کول ختم کر دوں گا۔“
53. ”کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟“
- ”ویسے تو پیسے جمع کرنے کا شوق ہے مگر کپڑے اور جوتے جمع کرنے کا بھی شوق ہے۔“
54. ”فیلڈ میں آنے کے بعد ایک قیمتی چیز جو آپ نے خریدی؟“
- ”جاؤں۔“
- ”گاڑی خریدی ہے۔“
55. ”کب کنجوسی نہیں کرتے؟“
- ”جب بیگم اور بچوں کو کچھ چاہیے ہوتا ہے۔“
56. ”کہاں کھانے کا مزہ آتا ہے... ڈائننگ ٹیبل۔ اپنا بیڈ یا چٹائی؟“
- ”دستر خوان لگا کر زمین پہ چٹائی پر بیٹھ کر کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔“
57. ”کون سا کھانا مسلسل بھی کھائیں تو مزہ آتا ہے؟“
- ”اپنی بیگم کے ہاتھ کا کھانا۔“
58. ”انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟“
- ”زیر فیصد... سب کچھ فینک لگتا ہے۔“
59. ”اپنے آپ کو ساتویں آسمان پر کب محسوس کرتے ہیں؟“
- ”ابھی تو نہیں... شاید فوج میں کروں۔“
60. ”کھانے کس قسم کے پسند ہیں؟“
- ”اپنے دسی کھانے... اس سے آگے کچھ نہیں۔“
61. ”منضبوط اعصاب کا کون ہوتا ہے۔ مرد یا عورت؟“
- ”میرے خیال سے عورت۔ وہ ہر روپ میں اسٹرونک ہوتی ہے۔ خواہ بیوی کا روپ ہو، بیٹی یا ماں کا یا بسن کا۔“
62. ”عشق کے بخار چڑھتے؟“
- ”نویں کلاس سے بڑھتے... مگر شکر کہ بگڑا نہیں۔“
63. ”محبت اندھی ہوتی ہے؟“
- ”انریکشن ہوتی ہے... کہ آپ کو اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔“
64. ”کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟“
- ”نہیں... کسی سے نہیں۔“
65. ”شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟“
- ”انگوٹھی پہنانے کی رسم۔“
66. ”کوئی ایسی شخصیت جس کو آپ اغوا کرنا چاہتے ہیں اور تادان میں کیا لینا چاہتے ہیں؟“
- ”بہت مزے کا سوال ہے... کسی ایسے نیک انسان کو اغوا کرنا چاہوں گا، جس کے ساتھ رہ کر میں بھی نیک انسان بن جاؤں۔“

67. "پسندیدہ تاریخی شخصیت؟"
"کوئی نہیں۔"
68. "موبائل نمبر تبدیل کرنے کا شوق ہے؟"
"نہیں۔۔۔ بس ایک ہی بار کیا۔۔۔ بار بار تبدیل کرنے سے لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔"
69. "کیا کچھ لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟"
"گاڑی کی چابی۔۔۔ موبائل وغیرہ۔"
70. "گھر میں کوئی ناراض ہو جائے تو؟"
"نہیں اللہ کا شکر ہے کوئی ناراض نہیں ہوتا اور کوئی ہو بھی جائے تو ایک سکیوز کر لیتے ہیں۔"
71. "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"بالکل کر لیتا ہوں۔"
72. "اپنے آپ کو دوسروں سے الگ سمجھتے ہیں؟"
"ہاں۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ میں دوسروں سے تھوڑا سا الگ ہوں۔۔۔ کلہ جرنے زیادہ بگاڑ نہیں ہے۔۔۔ بہت سبیل انسان ہوں۔"
73. "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"
"دونوں کی۔۔۔"
74. "اچھی اور بری عادت؟"
"غصہ بہت آتا ہے اور فرینڈز بہت ہوں۔"
75. "غصہ کھانے پہ نکلتا ہے؟"
"بالکل نکلتا ہے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہوں۔"
76. "خواتین تو شہرت سے گھبراتی ہیں اور آپ۔۔۔؟"
"نہیں میں نہیں گھبراتا۔۔۔ ہاں کبھی ٹیلی کے ساتھ کھانا کھا رہے ہوں تو مسئلہ ہوتا ہے۔"
77. "نیند فوراً آجاتی ہے؟"
"نہیں جی۔۔۔ ٹائم لگتا ہے۔"
78. "اپنے سرہانے کیا کیا رکھ کر سوتے ہیں؟"
"موبائل۔"
79. "کھانا کن چیزوں کے بغیر اُدھورا لگتا ہے؟"
"پانی۔۔۔ بہت ضروری ہے۔"
80. "خدا کی حسین تخلیق؟"
"سب کچھ۔۔۔ کوئی ایک چیز نہیں۔۔۔ پوری کائنات۔"
81. "زندگی میں کس چیز کی کمی ہے؟"
"کچھ نہیں۔۔۔ رب نے سب کچھ دیا ہے۔"
82. "نیند کے دھنی ہیں؟"
"بالکل۔۔۔ گہری نیند سے کوئی اٹھا دے تو ہڑبڑا کر اٹھ جاتا ہوں۔ یعنی گھبرا جاتا ہوں۔"
83. "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
"کبھی کبھار پروجوشن کے حساب سے۔"
84. "بدلہ لیتے ہیں؟"
"نہیں کبھی نہیں۔"
85. "اپنی پرسنالٹی میں کیا تبدیلی کرنا چاہتے ہیں؟"
"کچھ نہیں۔۔۔ جیسا بنایا ہے بہت اچھا بنایا ہے۔"
86. "دن کے کس حصے میں فرینڈز محسوس کرتے ہیں؟"
"جب 'جم' سے آتا ہوں۔"
87. "آپ کا پسندیدہ چینل؟"
"راے بہت شوق سے دیکھتا ہوں تو بس حال ڈراما آرہا میرا پسندیدہ وہ دیکھتا ہوں۔"
88. "گھر آکر پہلی خوں ش؟"
"بچوں کو گلے لگانے کی۔"
89. "موبائل رحمت یا زحمت؟"
"ضرورت ہے۔۔۔ میں اس معاملے میں اتنا کریزی نہیں ہوں۔"
90. "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"میں چلتے پھرتے فقیروں کو بہت کم دیتا ہوں۔ کسی ٹرسٹ میں دے دیتا ہوں۔"
91. "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش ہمارا ہوتا؟"
"میں نے جتنا مشاہدہ کیا ہے تو محسوس کیا ہے کہ اپنے ملک سے بہتر کوئی ملک نہیں۔"
92. "ملک میں کیا تبدیلی ضروری ہے؟"
"ہمیں خود تبدیل ہونا پڑے گا۔ اپنی سوچ کو بدلنا پڑے گا۔"
- "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"اللہ کی مرضی۔۔۔ عروج کو زوال تو آتا ہی ہے۔ اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔"

عساکر



س۔ الف، گجر خان

آپ کی دوست نے بڑی غلطی کی ہے۔ ایک بھٹکی ہوئی عورت جو اپنے شوہر کو دھوکا دے کر رشتوں کا تقدس پامال کر رہی تھی۔ آپ کی دوست نے اس غلط کام میں اس کا ساتھ دیا اور آپ کی دوست خود بھی اسی راستے پر گامزن ہو گئی۔ یہ آپ کی دوست پر اللہ کا کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کسی بڑی برائی سے محفوظ رکھا۔

اس طرح آپس میں لڑکا لڑکی کے فون پر ”قبول ہے“ کہنے سے کوئی نکاح نہیں ہو جاتا۔ نکاح کے لئے چار گواہ ہونا ضروری ہیں اور اس کے بعد باقاعدہ اس کا اعلان ہونا بھی ضروری ہے۔

اپنی دوست سے کہیں کہ اس کی عافیت اسی میں ہے کہ بے غیرت لڑکے اور بے حیا عورتوں کو بھول جائے اور آئندہ کبھی بھول کر بھی اس سے رابطہ نہ کرے۔

والدین بھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ رشتوں کا معاملہ اپنے والدین پر چھوڑ دے اور جہاں وہ رشتہ کریں وہاں شادی کر لے یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔

صائمہ خان، پشاور

س : میرا رشتہ خاندان میں رشتے کے چچا کے گھر طے ہوا ہے۔ شادی سے پہلے میں نے اس لڑکے کو دیکھا ہوا تھا۔ میری اس سے بات چیت نہیں تھی۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس نے بھی یقیناً مجھے دیکھا ہو گا کیونکہ تقریبات میں کئی بار آنا سامنا ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دو بار اپنے والدین کے ہمراہ وہ ہمارے گھر بھی آیا تھا۔ جب ان کے ہاں سے رشتہ آیا تو والدین نے پسندیدگی ظاہر کی۔ مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں نے یہاں کر دی۔ منگنی کے بعد اس نے فون پر بات چیت شروع کر دی۔ اس کی بہن نے میرا فون نمبر سے دیکھا لیکن جس قسم کی باتیں وہ کرتا ہے اس نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ اسے میرے دہلے پن پر اعتراض ہے۔ قد چھوٹا لگتا ہے۔ بار بار جھانکے کہ میں زیادہ بڑھی گئی نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ جب اسے اتنے اعتراض ہیں تو اس نے منگنی کیوں کی۔ اپنے والدین کو منع کر دیتا وہ یہاں رشتہ نہ کرتے۔ اس پر اس نے کہا کہ میں تو مذاق کر رہا تھا تم خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئیں۔ لیکن دو چار دن بعد پھر اسی طرح کی باتیں شروع کر دیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ منگنی اس کی مرضی کے بغیر ہوئی ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ بد دل ہو کر میں انکار کر دوں تاکہ اس پر بات نہ آئے۔

ہمارے خاندان کا جو ماحول ہے اس میں رشتہ طے ہونے کے بعد رشتہ توڑنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ ایک لڑکی کا انکار... میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

ج : اچھی بہن! آپ کا اندازہ کسی حد تک درست ہو سکتا ہے لیکن ممکن ہے کہ اس طرح کی گفتگو اس کے عادت میں داخل ہو... کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے دوسروں میں بلاوجہ کے نقص نکالتے ہیں اور نکتہ چینی کرتے ہیں۔ بہر حال یہ اس کی عادت ہو یا اس رشتہ کے لیے ناپسندیدگی دونوں صورتوں میں آپ کی تشویش بجا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنی والدہ کو تمام باتیں بتائیں پھر وہ جو فیصلہ کریں کیونکہ عادت خاندان کی ہے اس لیے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



شادی کے بعد ایک بھرے پرے سسرال میں آئی۔ ساس سسر کی خدمت اور نندوں اور دیوروں سے محبت کو اپنا فرض سمجھا۔ خلوص اور فرماں برداری کی انتہا کر دی۔ مگر پھر بھی لگتا ہے سسرال والے خوش نہیں۔ میکے بہت کم جانا ہوتا ہے۔ ساس ڈھکے چھپے لفظوں میں دل دکھاتی رہتی ہیں۔ شوہر سعودی عرب میں کام کرتے ہیں۔ میرا بھی ویزا لگ گیا ہے۔ جلد ہی وہاں چلی جاؤں گی مگر سوچتی ہوں کہ ایک شہر میں رہ کر بھی اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے اتنے جتن کرنے کے بعد ملتی تھی۔ وہاں سے کیسے آؤں گی؟ ٹیلیفون کرنے پر بھی پابندی ہے۔ اچھا گھر زیورات، شوہر کی محبت سب کچھ ہے مگر اپنوں سے دوری نے مریض بنا دیا ہے۔

ج : اچھی بہن! اس میں شک نہیں کہ دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہونے کے باوجود بے جا پابندیاں لگائی جائیں تو انسان گلشن محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو کچھ ”حاصل“ ہے اس کا شکر کر کے اللہ کی رضا پر راضی اور خوش رہا جائے تو انسان بہت ہی پریشانیوں سے بچ جاتا ہے۔

آپ کی ساس نے آپ پر پابندیاں لگائیں، میکے نہیں جانے دیا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ کے شوہر دور تھے۔ آپ ساس کے ساتھ رہتی تھیں، انہیں آپ کا خیال رکھنا تھا کیونکہ کسی اور سچ کی صورت میں وہ اپنے بیٹے کے سامنے جواب دہ ہوتیں کہ انہوں نے آپ کا خیال نہیں رکھا۔

اب جبکہ آپ کا ویزا لگ گیا ہے اور آپ سعودی عرب جانے والی ہیں تو پریشان نہ ہوں، آپ کے شوہر اپنے گھر والوں سے ملنے پاکستان آئیں گے تو آپ بھی اپنوں سے مل سکیں گی۔ ضروری نہیں کہ یہ پابندیاں ہمیشہ رہیں۔ ویسے بھی بچے ہونے کے بعد عورت بہت مضبوط ہو جاتی ہے۔

انجم شاہین نلسٹان

ج : میرے شوہر بیٹے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ بے حد نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔ مگر ان کا دہرا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مالی لحاظ سے مشکل نہیں مگر گھر میں نپا تلا خرچا دیتے ہیں۔ ضروریات کے لیے بھی پیسے مانگو تو کہتے ہیں کہ مردوں کو ایسی عورتیں سخت بری لگتی ہیں جو ہر دقت پیسوں کا مطالبہ کرتی ہیں، سہانوں کے برعکس میرے سامنے یوں بچھے جاتے ہیں جیسے ان سے بڑھ کر میرا چاہنے والا کوئی نہیں۔ بہت رحم دل ہیں خاص طور پر صنف نازک کے حوالے سے۔ میری ایک طلاق یافتہ دوست کا مفت علاج کیا۔ آپ انصاف اور مظلوم عورت کا سہارا بننے کی خاطر اس عورت سے شادی کرنے کے درپے ہیں۔ عدنان بھائی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نیکی سے انہیں کیسے روکوں؟ میرے چار بچے ہیں اور ابھی پڑھ رہے ہیں۔

ج : پیاری بہن! شوہر کی اس ”رحم دلی“ پر آپ کی پریشانی بجا ہے۔ جب وہ ابھی خرچ دینے میں اتنی کنجوسی کرتے ہیں تو دوسری شادی کے بعد ان کا کیا حال ہو گا۔ اب سوال یہ ہے کہ انہیں دوسری شادی سے کیسے روکا جائے۔ وہ دوسری شادی کا تہیہ کر چکے ہیں اور جب آپ کے سامنے اپنا ارادہ بھی ظاہر کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی دوست بھی ان سے شادی پر رضامند ہیں۔ آپ کے منہ کرنے پر اگر وہ رک سکتے ہیں تو آپ یہ کوشش کر کے دیکھ لیں۔ بھروسہ دیگر آپ ان سے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کوئی سیکورٹی حاصل کریں۔ گھر اپنے نام کرائیں اور ان سے اپنے اور بچوں کے لیے ماہانہ خرچ لکھوائیں۔

ویسے وہ جس طبیعت اور مزاج کے مالک ہیں، اس سے تو لگتا ہے کہ آپ کی دوست کنوئیں میں چھلانگ لگانے جا رہی ہیں لیکن اس وقت آپ اپنی دوست کو کچھ بھی بتائیں گی تو وہ یقین نہیں کریں گی۔ اگر دوست کو کسی طریقے سے سمجھا سکتی ہیں تو ایک بار کوشش ضرور کریں۔



گول چہرے والی خواتین بلش آن کو ہونٹوں سے کانوں کی طرف لگائیں۔ اس سے چہرہ لمبائی کا تاثر دے گا۔ دیگر ساخت کے چہروں پر بلش آن ٹاک سے گالوں کی طرف لگایا جاتا ہے۔

اب آنکھوں کا میک اپ کیجیے۔ آنکھوں کے میک اپ کے لیے آئی لائنو، آئی شیڈز اور مسکار سکی ضرورت ہوتی ہے۔ بھنوں کے نیچے ہلکے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں، تاکہ یہ جگہ نمایاں ہو جائے۔ اس سے آنکھیں بڑی لگتی ہیں۔ پوٹوں کے درمیانی حصوں پر گہرے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں۔ انگلی سے ہلکا سا مل لیں، تاکہ دونوں آئی شیڈز کے کنارے واضح نہ ہوں اور وہ الگ الگ نہ محسوس ہوں۔ اب پلکوں پر مسکارا لگائیں۔ کالے رنگ کا مسکارا ہر طرح کی آنکھوں کے لیے سب سے بہتر رہتا ہے۔ اگر آپ نیلا براؤن یا کسی اور رنگ کا مسکارا لگانا چاہتی ہیں تو پھر آئی لائنو



عید میک اپ پلان

عید پر خوب صورت لباس کے ساتھ ساتھ سلیقے سے کیا گیا میک اپ آپ کی جاذبیت میں اضافہ کرتا ہے۔

بھی اسی رنگ کا لگائیے۔ اگر ہلکی پلکیں ہیں تو مسکارا لگانے سے پہلے پلکوں پر تھوڑا سا ٹالکھ پاؤڈر لگائیں پھر مسکارا لگائیں۔ اس سے پلکیں گھنی لگیں گی۔ میک اپ کے آخر میں لپ اسٹک لگائیے۔ لپ اسٹک میک اپ کا سب سے اہم جز ہے، کیوں کہ یہ میک اپ کا مجموعی تاثر اجاگر کرتی ہے۔ لپ پینل سے ہونٹوں کی ساخت نمایاں کیجیے۔ ہونٹ زیادہ پتلے ہیں تو پینل کی مدد سے ہونٹوں سے باہر کی طرف لائن کھینچیے۔ ہونٹ اگر موٹے ہیں تو اندر کی طرف لگائیں۔ پھر لپ برش کی مدد سے لپ اسٹک لگائیے۔ ایک نرم ٹشو پیپر لے کر اسے دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھ کر ہلکے

میک اپ سے قبل اپنا چہرہ اچھی طرح صاف کریں۔ اس کے بعد چہرے اور گردن پر اچھا سا مونسچو انر لگا کر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیں۔ تاکہ وہ اچھی طرح جذب ہو جائے، یہ آپ کی جلد کی نمی کو برقرار رکھتا ہے۔ پھر میک اپ کا آغاز کیجیے۔ سب سے پہلے فاؤنڈیشن کی تہ لگائیے۔ خشک جلد

والی خواتین لیکوئڈ فاؤنڈیشن کا انتخاب کریں۔ فاؤنڈیشن کا انتخاب اپنے چہرے کی رنگت کی مناسبت سے کریں۔

والی خواتین لیکوئڈ فاؤنڈیشن کا انتخاب کریں۔ فاؤنڈیشن کا انتخاب اپنے چہرے کی رنگت کی مناسبت سے کریں۔

اپنے لباس کی ہم رنگ پینل بلش لگائیں۔ اب آپ کا میک اپ مکمل ہے۔ اچھا سا ہیٹو اشائل بنائیے اور دیکھیے اس عید پر آپ کی جج دج کس قدر نرالی ہے۔

فاؤنڈیشن کے بعد فیس پاؤڈر لگائیں۔ پاؤڈر کے رنگ کا انتخاب فاؤنڈیشن کے رنگ کی مناسبت سے کریں۔ اس کے بعد بلش آن لگائیں۔ اگر آپ کا چہرہ بیضوی ہے تو بلش آن اپنے گالوں کی ہڈیوں پر لگائیں۔